سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

اگست 2022

جشن آزادی مبارک

قیمت 150 روپے

بانی

معراج رسول

باغی: ایک دوشیزہ کی داستان جو خود میں منفرد ہے

درد آزادی: قیام پاکستان کے وقت کی ایک عجیب سی سچ بیانی

شان وطن: عورت ہے لیکن وطن کی خاطر نہایت خطرناک کام کرتی ہے

جشن آزادی کے سرور سے مرصع پاکیزہ کا گولڈن جوبلی نمبر 2 خوش ذوق قارئین کی نذر

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

دلشاد نسیم اور **ناہید سلطانہ اختر** کے لاجواب ناولوں کی دلچسپ اقساط

سینئر قلمکار **نبیہ نقوی** کی حیرت انگیز واپسی وہ بھی ایک خوب صورت تحریر کے ساتھ

فرحت انصاری اور **نبیلہ ابر راجا** کے ماہرانہ قلم کی شاہکار کاوشیں

شبینہ گل لائی ہیں خوب صورت منی ناول..... **قصۂ دل**

معروف رائٹر

افشاں آفریدی کی ہماری

بزم میں خوشگوار آمد

ماہنامہ **پاکیزہ** کی

پچاسویں سالگرہ پر ممتاز سماجی

اور ادبی شخصیات کی معتبر آرا

شمع ہدایت کے سلسلے میں پڑھیے **اختر شجاعت** کا پُرروح مقالہ

اس کے علاوہ

علاوہ ازیں مایہ ناز قلمکاروں کی دلکش تحریریں جن میں **دُردانہ نوشین خان**، **سعدیہ حما شیخ**، **غزالہ فرخ**، **غزالہ رشید** و دیگراں شامل ہیں۔

پُرتنوع سلسلوں سے سجا، خوب صورت تراشوں پر مبنی، شعر و شاعری سے مرصع اور حسن و صحت کے متعلق متن سے آراستہ ماہنامہ پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے.....

قرشی

گیسٹوفل

گیس، سینے کی جلن اور بدہضمی کیلئے

گیسٹوفل لو

سب ہضم ہو!

QarshiNaturalHealth | www.qarshi.com | www.qarshihealthshop.com

سرگزشت — 07 — **عطاء** — ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادرروزگار کا تعارفِ خاص

گفت و شنید — 08 — **شہرِخیال** — مدیر/قارئین
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت — 14 — **باغی** — زویا صفوان
اس خاتون کا تذکرہ جس نے عجب فیصلہ کیا

خراجِ تحسین — 43 — **شانِ وطن** — حفصہ محمد فیصل
ایک بہادر دوشیزہ کی خطرناک نوکری کا تذکرہ

مناظرِ عالم — 46 — **صنفِ آہن** — اے حنیظ
عورتیں ہر میدان کو سر کررہی ہیں

تاریخ — 49 — **وقتِ آخر** — عنایشہ چوہدری
موت کی آہٹ سن کر کہے گئے الفاظ

فلم نگری — 69 — **ہدایت کار** — اعجاز احمد نواب
پاکستان کے مایہ ناز ہدایت کار کا احوال

جرم و سزا — 81 — **نمک حرام** — ذوالفقار علی بخاری
ایک انوکھے جرم کی تفتیش کا قصہ

تذکرہ — 87 — **ترقی پسند** — زین مہدی
اس قلم کار کا احوال جو انقلاب پسند تھا

شکاریات — 99 — **خونی مگرمچھ** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
شکار کی کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے تحفہ

109 — **جادوگرنی** — ناظم راضیہ
روس کے بڑے بڑے لوگ اس کے معتقد ہیں

112 — **روسیاہ** — عاطر شاہین
ایک شوہر پرست نوجوان کی داستان جس نے خیری

پہلی سچ بیانی — 144 — **دردِ آزادی** — نگہت بانو
ایک دل دکھا دینے والی سچ بیانی

دوسری سچ بیانی — 167 — **خوابِ ناتمام** — خالد شیخ طاہری
ووفق سچ کی تلاش میں دکھا حت

تیسری سچ بیانی — 177 — **مُنّا** — حبیب الرحمٰن
ایک مختصری دلچسپ سچ بیانی

چوتھی سچ بیانی — 182 — **پُراسرار شادی** — قمر الحسن
زندگی کے کھیل نرالے ہوتے ہیں

پانچویں سچ بیانی — 201 — **سراب** — ظہیر ملک
انسان خوابوں کا اسیر ہوتا ہے

چھٹی سچ بیانی — 204 — **چراغِ آزادی** — تنزیلہ احمد
آزادی کی راہ قربانی مانگتی ہے

ساتویں سچ بیانی — 209 — **سوتیلی ماں** — ڈاکٹر اظہر محمود
ایسی کہانیاں جو ہمارے معاشرے کی پہچان تھیں

آٹھویں سچ بیانی — 215 — **موہنی** — گل بانو
قیامِ پاکستان کے وقت کی دلدوز سچ بیانی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

جلد 32 ❖ شمارہ 05 ❖ اگست 2022ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

❖❖❖

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

❖❖❖

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 150 روپے ❖ زرِ سالانہ 2000 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

عوام اور پریشانیاں لازم و ملزوم بنادی گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مہنگائی کے عفریت کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ پانچ سال میں جس تیزی سے مہنگائی بڑھی ہے، روپے کی قیمت گری ہے پاکستان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کورونا کا حملہ کیا ہوا کہ مہنگائی کو پر لگ گئے۔ جنوری 2020ء میں بسوں کا کرایہ زیادہ سے زیادہ بیس روپے تھا جو اب اسّی روپے ادا کرنے پڑ رہے ہیں بسکٹ کا ہاف رول دس روپے کا تھا جو اب پچیس روپے کا مل رہا ہے غذائی اجناس وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ سفید پوش حضرات سب سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ اگر اس خامی پر ارباب اختیار نے توجہ نہ دی تو سفید پوش طبقہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔

عطاء

مولانا بہاالحق بنیادی طور پر کشمیری تھے لیکن امرت سر کی تہذیب و ثقافت میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ اکثر لوگ انہیں امرتسری پنجابی سمجھتے۔ وہ ایم اے او ہائی اسکول میں پڑھاتے تھے اور مقامی مسجد کے امام بھی تھے قابل اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شہر بھر میں خاص عزت تھی۔ ہندو مسلم سکھ سب ہی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بہت سارے مرید بھی تھے۔ اسلامی احکام گھر میں پوری طرح نافذ تھا۔ اسی گھر میں یکم فروری 1943ء کو اس کا جنم ہوا۔ اسلامی احکامات کے مطابق پورے رسوم ادا ہوئے۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اسے گھر میں ہی حرف شناسی سکھائی جانے لگی۔ ابھی ابجد سکھانے کا عمل جاری تھا کہ سیاسی افق گدلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی چپقلش نے خون کا چولا پہن لیا۔ ہر طرف قتل و خوں ریزی شروع ہوگئی۔ لوٹ مار آتش زنی کا بازار گرم ہوگیا۔ گھر کے گھر اجڑنے لگے۔ ایسے وقت میں مولانا بہاالحق نے امرت سر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور وزیر آباد اٹھ آئے۔ ان دنوں وزیر آباد بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ مولانا مع اہل و عیال آ گئے تھے۔ پاکستان بن چکا تھا۔ نئے سرے سے زندگی شروع کرنا تھی۔ مولانا نے ابتدا میں وزیر آباد میں ہاتھ پاؤں مارے لیکن شہر چھوٹا تھا اس لیے وہ کامیابی نہ مل سکی جس کی چاہ میں وہ وزیر آباد آئے تھے۔ مجبوراً ایک دوست کے مشورے پر لاہور آ گئے۔ لاہور نسبتاً بڑا شہر تھا یہاں اسکوپ بھی بہت تھے۔ انہیں اپنا پیر جمتا ہوا محسوس ہوا۔ بچوں کو اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ بچے نے بھی لاہور کو قبول کرلیا تھا۔ اسکول کے تیز طرار طالب علموں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس نے میٹرک بھی نہایت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور ایم اے او کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ اسی دوران میں اسے نوائے وقت میں بحیثیت سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی۔ اس نے قلم کے سحر کو آزمانا شروع کردیا۔ اسی کے ساتھ اس نے کراچی کے جنگ میں بھی کالم لکھنا شروع کردیا۔ اخبارات میں شائع شدہ کالمز کو کتابی صورت میں بعنوان روزنِ دیوار لایا جسے آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا پھر ایک اور مجموعہ سامنے آیا۔ ''علاؤالدین کے جن کا زوال'' کہنے کو یہ بھی کالموں کا مجموعہ تھا مگر اس میں چھوٹی چھوٹی منی کہانیاں تھیں جسے نہایت خوبصورت انداز میں سمویا گیا تھا۔ 1997ء سے 1999ء تک اس نے بطور سفیر تھائی لینڈ اور ناروے میں خدمت وطن کی، پی ٹی وی کے لیے لکھے گئے ڈرامے پہلے سے ہی مشہور ہو چکے تھے۔ ''آپ کا خادم۔ شب دیگ۔ شیدا ٹلی کو مقبولیت مل چکی تھی۔ 2015ء میں لاہور آرٹ کونسل جو الحمرا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے چیئر پرسن منتخب ہوگئے۔ 2015ء میں ہی انہیں پی ٹی وی چیئر پرسن منتخب کرلیا گیا۔ ان کی مشہور کتابوں میں ''دنیا خوبصورت ہے، گوروں کے دیس میں، غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور، جرم ظریفی، قند مکرر، ملاقاتیں ادھوری ہیں، شوق آوارگی، معاصر وغیرہ۔ سفرنامہ، کالم نویسی وغیرہ کی طرح ان کی کافی ساری غزلیں بھی مشہور ہوئیں۔ انہیں ہم عطاء الحق قاسمی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

شہرِ خیال

مدیر قارئین

قارئین کرام! آپ پرچے کی ضخامت دیکھ کر چونک گئے ہوں گے کہ یہ ہوشربا مہنگائی کا نتیجہ ہے۔ کچھ حد تک یہ بات صحیح بھی ہے کہ اب دو روپے کی چیز دس روپے میں ملنے لگی ہے لیکن جو چیز بازار سے بالکل ہی غائب ہو تو تاجران اس کی قیمت منہ مانگی مانگتے ہیں۔ اس وقت بازار میں نیوز پرنٹ بھی کمیاب ہو چکا ہے۔ پھر بھی ہم کسی نہ کسی طرح حاصل کر رہے تھے یہ بھی غور نہیں کر رہے تھے کہ ادارہ کس قدر دباؤ میں آرہا ہے لیکن اب نقصان برداشت سے باہر ہے۔ ہم بے بس ہو رہے ہیں اس لیے اب معزز قارئین کرام سے التماس پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آپ مشورہ دیں، اب کیا کیا جائے۔ فی الحال تو اس مہینے کچھ صفحات کم کردیے ہیں لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ کئی اداروں نے قیمت بڑھا کر دو سو کر دی ہے۔ اس ذہنی خلجان کے وقت آپ کا مشورہ اہم ہے کہ صفحات اتنے کردیے جائیں یا قیمت بڑھادی جائے۔ ہم شدت سے جواب کے منتظر ہیں۔

☆ اعجاز حسین سٹھار کا بھرپور خط نور پور تھل سے۔ ''پرچا رواں ماہ کی 27 تاریخ کو ملا ہے۔ ہر ماہ پوسٹ آفس والوں کی سستی، غیر ذمہ داری اور بے پروائی کا ماتم کر کے خود ہی تکلیف محسوس کرتا، ٹینشن میں مبتلا ہوتا اور پریشانی اٹھاتا ہوں اور آخر خود کو سمجھا بجھا کر نارمل زندگی کی طرف لے آتا ہوں کہ یہ مسائل عمر بھر کے ہیں۔ ''یادیں'' میں سعید احمد کے نام، کام سے ہم کم واقفیت رکھتے ہیں لیکن انہوں نے کئی چھپے رازوں سے پردہ اٹھا کر معلومات ضرور دی ہیں اور کلبوں سے وابستگی، ذاتی انا اور سیاست نے جو ملک کو نقصان پہنچایا۔ کئی کھلاڑی اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر دوسرے شعبوں میں چلے گئے ہیں۔ اس بد دیانتی پر وہ یہاں نہیں لیکن اللہ کے حضور ضرور جواب دہ ہوں گے۔ ''باکمال'' میں کمال کے ہنر مندوں سے تعارف ہوا ہے۔ سب اپنے شعبے میں کارہائے نمایاں سرانجام دے گئے ہیں۔ پاشا فیملی کی تخلیقی صلاحیتوں نے دل موہ لیے ہیں۔ ہر کام موقع محل کے مطابق نہایت عقل مندی سے انجام دیا پھر قسمت نے بھرپور ساتھ دیا اور ڈھیروں ڈھیر کامیابیاں سمیٹ کر شہرت، عزت اور دولت سمیٹی، کتنے نئے ہنر مندوں کو بنا سنوار کر روزی روٹی پر لگا دیا بلکہ انہوں نے بھی زمانے میں اپنا نام بنایا ہے، یہ صدقہ جاریہ ہے جس کا فائدہ دونوں باپ بیٹے کو مل رہا ہوگا۔ اب محمد کمال پاشا کی زمانہ شناسی، قابلیت اور خود اعتماری کے قائل ہو گئے ہیں اور مزید کامیابیوں کے لیے دعاگو ہیں۔ امیر حسین چمن اور اعجاز احمد نواب، انور فرہاد کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پُر کر رہے ہیں تاکہ ہماری دلچسپی کا سامان ہوتا رہے۔ میری خوش گمانی دیکھیے کہ انہیں جواں سال یا ادھیڑ عمر سمجھ رہا ہوں (انور فرہاد عمر میں اعجاز احمد نواب سے بہت بڑے تھے) کیوں کہ مقبول اور شہرت رکھنے والوں کے جنازے اٹھا کر اور فاتحہ پڑھ پڑھ کر موت سے خوف زدہ ہوگیا ہوں بس اب آنے والے دنوں، ماہ و سال کے صدموں سے بچائے۔ ''اسیر'' میں روسی قید خانوں کی سختیاں، پابندی، مشکلات اور کم خوراکی سے متعلق پڑھ کر اپنے جیل خانوں، سہولیات اور عیاشیوں پر حیرت کے ساتھ فخر کا احساس ہوا ہے۔ اب سچ بیانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''صبر کا پھل'' نے تجسس، سنسنی اور انکشافات سے مزہ دوبالا کر دیا ہے، پل پل بدلتے حالات ہمارے اندازوں کو مات دیتے رہے۔ ملیحہ کو صبر کے ساتھ مقدر کا پھل بھی ملا ہے۔ ماں بیٹی نے کسی مرحلے اور مشکلات میں صبر کا

ساتھ چھوڑا نہ گھبرا کر، جلد بازی میں کسی سے الجھنے، جلد بازی میں قدم اٹھانے کی کوشش کی اور معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیا، یوں راہیں آسان ہوتی گئیں۔ ملنے والوں میں ہمدرد اور خدا ترس انسانوں کی تعداد زیادہ رہی جس میں اپنی میانہ روی کا ہاتھ تھا۔ رب نواز بھی وڈیرے کی اولاد ہونے کے باوجود نیک فطرت جوان تھا جس نے سوچ بچار اور عقل مندی سے معاملات سنبھال لیے۔ ڈاکٹر شائستہ انسانی شکل میں فرشتہ تھی۔ نیکی، بھائی چارے اور انصاف کے ہر کام میں فرنٹ پر رہی۔ صلہ اللہ دے گا لیکن ہم بھی خلوص نیت سے دعا کر سکتے ہیں۔ ''دراز'' کے آخر میں معاشرتی مسائل کا حل آسان جان کر بتایا گیا ہے کہ دولت، جایداد اور مال کی ہوس چھوڑ دیں کیونکہ یہ ہمیشہ کسی ایک کے پاس رہنے والی شے نہیں، یہ مشکل ترین کام ہے بھلا یہ سہولیات، محل، نوکروں کی فوج اور لگژری گاڑیاں چھوڑنے کو کس کافر کا دل چاہے گا سب خواب، خیال اور کتابی باتیں ہیں ورنہ معصوم انمول بھینٹ نہ چڑھتی۔ کتنے مشکل حالات میں دن گزارے، بیٹی کو جنم دیا اور بیماری سے نبرد آزما رہی۔ دراصل یہ دیہی زندگی کی قباحتیں ہیں جنہیں باسیوں کو سہنا اور زندان میں زندہ رہنا ہے۔ اب محنت مزدوری کے مواقع ملے ہیں۔ آمد و رفت کے وسیلے بنے ہیں۔ تعلیم کا رجحان ہوا ہے تو خود اعتمادی سے آمدنی میں اضافے سے ماحول تبدیل ہوا ہے یہ خوش آیند ہے لیکن بہت سفر کی ضرورت ہے، ہر دروازہ کھٹکھٹا کر ہمت بڑھانے اور رہنمائی کی ضرورت ہے جب آپ کی، میری محنت رنگ لائے گی تب کتنا خوشگوار نظارہ ہوگا جسے دیکھ کر دل و دماغ میں اتارنے والی آنکھیں غیر مشروط طور پر خوش قسمت کہلائیں گی۔ ''آتش حسد'' میں کتنے جال بچھائے گئے، منصوبہ بندی کے ساتھ سازشیں تیار ہوئیں اور حیرت میں مبتلا کر دینے والے ڈرامے اسٹیج کیے گئے لیکن دولت اصل مالکوں کے پاس رہی، منفی سوچ رکھنے والے سارے کردار طبعی عمر سے پہلے دار فانی سے کوچ کر گئے۔ شہر یار اس سرکس میں رہ کر بھی شرافت، ایمانداری اور انصاف پسندی کا دامن پکڑے رہا، وہ بے حساب داد کا حق دار ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس خاندان سے تو ہم پرستی ختم ہو چکی ہے۔ ''یہ رشتے'' میں عظیم اپنے نام کی حقیقی تصویر ہیں جس نے رشتے، دوستی اور انسانیت کی لاج رکھی اور ساری عمر کے لیے دعاؤں کے حق دار ٹھہرے، دو دلوں کو جائز رشتہ دے کر نیکی کی اور سب کی نظروں میں معتبر ٹھہرے، لالچ میں آجاتے تو دولت، زمین جایدادیں اپنے کرتوتوں اور کبھی حادثاتی طور پر چلی جاتی ہیں کبھی حد بندی پر جھگڑا ہو جائے تو گولی سے بچ گئے تو جوانی جیل میں ضرور گزرے گی۔ ''بدکار موبائل'' میں سارا بوجھ اس ایجاد پر ڈال دیا گیا ہے ہم کبھی بلا ضرورت لڑکے لڑکیوں کو خرید کر دیتے ہیں پھر ان کی مصروفیات پر نظر نہیں رکھتے، یہی حال کم عمر لڑکوں کو موٹر سائیکل خرید کر دینے کا ہے، ٹی وی اور اخبارات آئے روز حادثات کی خبریں دیتے ہیں تو سوائے افسوس کے کیا کیا جا سکتا ہے بس ہر کام میں اعتدال کی ضرورت ہے ورنہ موبائل سے سفر کی بچت اور موٹر سائیکل سے رقم کم خرچ ہوتی ہے یہاں جو جنسی جنون جاوید پر سوار تھا شکر کیجیے اس نے تصویریں کسی سے شیئر نہیں کیں اسے بروقت نکیل ڈال دی گئی ہے اور مدیحہ ناز کی خوش قسمتی میں کیا شک ہے کہ عدت کے فوراً بعد شادی ہو گئی وہ بھٹکنے، تڑپنے، پچھتانے اور انتظار کی کوفت سے بچ گئیں وہ اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے ورنہ کچھ وقت گزر جاتا تو وہ جن حالات سے گزری ہیں، نفسیاتی مریضہ بن جاتیں۔''

☆ بینا راجپوت، اسلام آباد سے لکھتی ہیں۔ ''جولائی کا شمارہ میرے لیے بہت خاص تھا، اس لیے بہت بے صبری سے منتظر تھی۔ جب ڈائجسٹ موصول ہوا تو بے اختیار سب سے پہلے فہرست کھولی۔ فہرست میں اپنا نام دیکھنا ہر بار ایک خوبصورت احساس ہوتا ہے اور مجھ جیسے اتفاقیہ قلمکار تو ویسے بھی زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مدیران گرامی کا خصوصی شکریہ جو ہم جیسے نو آموز لوگوں کی تحاریر کو ایک مؤقر جریدے میں جگہ دیتے ہیں۔ کتب بینی سے میرا تعلق دو دہائیوں سے زیادہ سہی مگر لکھنے پر طبع آزمائی کا باقاعدہ آغاز میں نے گزشتہ دو سال سے ہی شروع کیا ہے۔ اب منتظر ہوں کہ ناقدین میری تحریر پر کیا تبصرہ فرماتے ہیں۔ شہر خیال میں ہمیرا ارشد کو کرسی صدارت کی بہت مبارکباد۔ ان کے علاوہ بھی سارے نام جانے پہچانے تھے۔ سلوئی بنت رفیق اور محمد بن کریم کے تبصرے بہت پسند آئے۔ محمد بن کریم کا انداز تحریر کافی منجھا ہوا ہے۔ اُمید ہے ان کے تبصرے آئندہ بھی نظر آتے رہیں گے۔ قیصر خان اور رانا محمد شاہد نے اپنے تبصروں میں یاد رکھا اس کے لیے شکر گزار۔ شدید ترین مہنگائی میں بحیثیت امت مسلمہ عید کے علاوہ بھی ہمیں اپنے کچھ زائد خرچوں کی قربانی دے کر غرباء و مستحقین کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ ہمارے اردگرد بہت سے سفید پوش لوگوں کے لیے آج کل ضروریات زندگی پوری کرنا مشکل تر ہو چکا ہے۔ اللہ سب کے لیے آسانیاں فرمائے (آمین)۔ محمد منشا یاد کی ذہانت و کامیابیوں کی یک شخصی داستان لاجواب تھی۔ خالد شیخ طاہری صاحب کی اداکاری بہت عمدہ تھی۔ ملک عزیز کے جو حالات چل رہے ہیں ان میں ہمیں بہت احتیاط سے رہنا چاہیے اور کسی بھی انجان مرد و عورت حتیٰ کہ بچے تک کو اپنے گھر میں داخلے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ دلشاد صاحب کی فیملی کو انسانی ہمدردی مہنگی پڑ گئی۔ محمد یٰسین صدیق صاحب کی

ٹوٹے خواب بھی اچھی تھی۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں سمیٹ کر زندگی میں آگے بڑھنا مشکل کام ہے۔ طاہرہ اور شہزاد کو بھی اس کرب سے گزرنا پڑا۔ کہانی میں کچھ باتیں بہت مبہم سی تھیں جن کو میں کوئی معنی نہیں پہنا سکی۔ جیسے شہزاد اور طاہرہ کا بخار والا مکالمہ تھوڑا عجیب لگا۔ کراچی سے سعدیہ صاحبہ کی کھیل قسمت کا اپنے مرکزی خیال کے حوالے سے متاثر کن تھی۔ کسی طلاق یافتہ سے نکاح کرنا خاص طور پر اس کی اولاد کو اپنا نام دینا قابل ستائش ہے۔ یقیناً اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور ہر فرد کے لیے فلاح کا راستہ ہے مگر ہماری بدقسمتی کہ ہم اس کو چھوڑ کر دنیا داری میں گھرے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے، ایک ایسا فقرہ ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی ہنستی کھیلتی زندگیوں کا سکون تباہ کر لیتے ہیں۔ شاہینہ نے ملیحہ کو بہو بنا کر گھر لانے سے پہلے اپنی کہانی بیٹیوں کو سنا کر بہترین فیصلہ کیا۔ باقی ڈائجسٹ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

☆ ساجد محمود کا خط یو کے سے۔ ''سرگزشت کا مطالعہ ہائی اسکول کے دور سے شروع کیا ہوا ہے جب سے اس کا نیا نیا اجرا ہوا۔ تبصرہ کرنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہا ہوں بلکہ شکیل بدایونی کے الفاظ میں ''وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے۔ مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں۔'' جب سرگزشت وقت پر ملتا تھا تو تبصرہ کرنے میں سستی ہوتی رہی اور اب سات سمندر پار فرنگیوں کے دیس میں شمارہ یا تو ملتا ہی نہیں اور اگر مل بھی جائے تو ایک ماہ پرانا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس بار خوش قسمتی سے ایک عزیز پاکستان سے آ رہے تھے تو جون اور جولائی کا شمارہ لے آئے جو عیدالاضحیٰ کا بہترین تحفہ محسوس ہوا۔ ماہ جون میں تو چونکہ احقر کی اپنی تحریر بھی شامل اشاعت تھی تو یادگار رہے گا۔ خیر اپنی رام کہانی کے بجائے جولائی کے شمارے کی بات کروں تو سرورق بہت پیارا لگا۔ حسینہ کو دو ماورائی ہاتھ گلے میں لاکٹ پہنا رہے ہیں اور اس پر حسینہ کی خودسپردگی اور حیا سے لبریز جھکی ہوئی نگاہوں کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ اداریے میں انتہائی اہم جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ لندن کے گرینفل ٹاور میں آتشزدگی سے کئی زندگیاں ضائع ہو گئیں تو مغربی ممالک میں گوروں کی خوب جگ ہنسائی ہوئی۔ وطن عزیز میں ایسے سانحات آئے روز سامنے آتے رہتے ہیں لیکن بے حسی بھی کوئی بے حسی ہوگی کے مصداق کبھی تدارک کا نہیں سوچا گیا۔ ان کی نظر میں شاید انسانی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ جون کے شمارے میں احمد ندیم قاسمی کا مختصر احوال پڑھا تو جولائی میں ''ادب کے معمار'' میں منشا یاد صاحب کا مختصر لیکن پُراثر تعارف پڑھ کر بہت مزا آیا۔ شہر خیال میں بہت سے جانے پہچانے چہرے نظر آئے جنہوں نے میری کاوش ''واردات'' پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمایا جس کے لیے بہت زیادہ شکرگزار ہوں۔ بمیرا ارشد فاروقی کا ناپا تلا تبصرہ واقعی کرسی صدارت کا مستحق تھا جس کے لیے انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے آیندہ بھی سیر حاصل تبصرے کرتی رہیں گی۔ سب سے پہلے زویا مغوان کا ''آہنگ صحافت'' پڑھا۔ قیام پاکستان کی خوشی اور پھر سقوط ڈھاکا اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے محمد سعید کا قصہ بہت دلگداز تھا۔ ''شہر اسلام'' بینا راجپوت کی عمدہ تاریخی تحریر ثابت ہوئی۔ ویلڈن بینا۔ فرزانہ نکہت کی ''ممتا کی جیت'' عمدہ منظر نگاری اور اسلوب کی وجہ سے کافی زیادہ پسند آئی۔ اوتک جیسے برے کردار لوگوں کی زندگی جہنم بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ امیر حسین چمن کی ''یادیں'' میں اپنے زمانے کے مایہ ناز ٹیسٹ کھلاڑی سعید احمد کی یادداشتوں پر مبنی دلچسپ تحریر لگی۔ کرکٹ میں سیاست اس وقت بھی ہوتی تھی اور آج کے دور میں بھی تمام روایات قائم ہیں۔ فلم نگری سے اعجاز احمد نواب ''باکمال'' میں انور کمال پاشا صاحب کے حالاتِ زندگی کے ساتھ وارد تھے۔ سینما اسکرین پر صرف پاشاہی لکھا دیکھا تھا آج ان کی سرگزشت پڑھ کر بہت لطف اندوز ہوئے۔ آفت کا پرکالہ میں مشہور ہالی ووڈ ہدایتکار رولینڈ ایمرک کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا اور ان کی کامیابیوں کا خوبصورتی سے تذکرہ کیا گیا۔ زین مہدی کی ''جال'' اچھی کہانی تھی۔ کہانی کے آغاز سے ہی ڈاکٹر روتھ پر شک تھا اور جب کہانی کھلی تو واقعی سارا کھیل اس کے لالچ کا استعارہ نکلا۔ سنی کی موت افسردہ کرنے والی تھی۔ مستقل سلسلوں میں پہلی سچ بیانی، غلام قادر کی ''صبر کا پھل'' ایک ڈرامائی تاثر لیے ہوئے تھی۔ شروع میں ایک روایتی کہانی نظر آئی لیکن ملیحہ کی وجیہ کی ماں سے ملاقات اور پھر چھوٹا سا حادثہ تاثر بدلنے پر مجبور کر گیا۔ کہانی نے ایک دلچسپ موڑ تب لیا جب رب نواز نے ملیحہ سے نکاح کر لیا۔ رب نواز کی موت کا راز اختتام پر کھلا تو کہانی یکسر بدل گئی۔ سحرش اعجاز کی مختصر آپ بیتی ''دراز'' میں انمول کی زندگی اور موت کا دردناک احوال افسردہ کر گیا۔ سلمیٰ غزل کی ''آتش حسد'' ایک دلچسپ تحریر تھی جس میں اتفاقات کا عمل دخل کچھ زیادہ محسوس ہوا۔ کہانی کا اصل عقدہ تو اس وقت کھلا جب میمونہ اور رضوانہ کا جڑواں ہونے کا پڑھا۔ اچھی کاوش تھی۔ عابدہ صبا کی مختصر سی سچ بیانی ''یہ رشتے'' ایک اچھی تحریر ثابت ہو سکتی تھی لیکن وقت کی کمی کے باعث مختصر ہی پڑھ سکا۔ ''بدکار موبائل'' ایم الیاس کی اچھی تحریر تھی۔ سوشل میڈیا کے اس پرفتن دور میں وہی کامیاب ہے جو اسے سمجھ کر اور مثبت طریقہ سے استعمال میں لائے۔ خالد شیخ طاہری کی ''اداکار'' ایک اچھی سچ بیانی تھی۔ پاگل بڑھیا زبردست اداکارہ نکلی۔ شیخ صاحب اب سچ

بیانیوں سے آگے بڑھیں اور کوئی طویل تحریر لکھیں۔ یاسین صدیقی کی ''ٹوٹے خواب'' جیسی کہانیاں اب پسند نہیں آتیں اس لیے کچھ خاص متاثر نہ کر پائی۔ بلال احمد کی ''بادشاہ'' پڑھ کر خوب محظوظ ہوئے۔ اچھے اسلوب کی کہانی میں بابر کو اس کی محنت اور لگن نے ایک معمولی انسان سے واقعی بادشاہ بنا دیا تھا۔ سعدیہ کی ''کھیل قسمت کا'' دیارِ غیر میں طے کردہ رشتوں ناتوں پر عمدہ تحریر تھی۔ ایسے واقعات کا عینی شاہد ہوں تو تمام تحریر غور سے پڑھی۔ رقاصہ، گیم کوار اسیر دلچسپ تحاریر تھیں۔ سوچا تھا ان پر سیر حاصل تبصرہ لکھوں گا لیکن عید کے ایام اور پھر رات کی جاب نے مہلت ہی نہ دی۔ مصنفین کی آیندہ کی تحاریر اب ادھار رہیں۔ مجموعی طور پر جولائی کا شمارہ بہت پسند آیا۔ اُمید ہے آیندہ بھی ایسی ہی معیاری اور خوبصورت تحاریر پڑھنے کو ملتی رہیں گی۔ اگلی بار پرچہ وقت پر مل گیا تو ان شاء اللہ شہر خیال میں پھر سے حاضری دینے کی کوشش کریں گے۔''

☆ زرینہ شاہ، پنڈی کینٹ سے لکھتی ہیں۔ ''دلکش سرورق کے ساتھ جولائی کا شمارہ اس بار بھی وقت پر مل گیا۔ فکر انگیز اداریے نے ملول کر دیا۔ واقعی شہر کنکریٹ کے جنگلوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس بے حسی میں جو زیادتی ہم اپنے ماحول کے ساتھ کر رہے ہیں اس کا ہمیں ادراک ہی نہیں ہے۔ مالی فائدے نے عقل پر ایسا پردہ تان رکھا ہے کہ کسی کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں کہ آنے والی نسلوں کے لیے ہم کیسی دنیا چھوڑ کر جائیں گے؟ شہر خیال میں بہت سے جانے پہچانے نام جگمگا رہے تھے۔ ابتدا منفرد سلسلے ایک صفحے کی سرگزشت سے ہوئی۔ دنیائے ادب کی قد آور شخصیات کی پوری زندگی کو ایک ورق میں سمونا کمال ہے۔ ''آہنگ صحافت'' بہت اچھی تحریر تھی۔ بینا راجپوت کی تحریر شہر اسلام نے دل چھو لیا۔ شروع سے آخر تک مربوط اور رواں تحریر تھی۔ مستند حوالہ جات کے ساتھ لکھی گئی تحریر بہترین معلومات پر مبنی تھی۔ اختتام پر جب سلطان کی جانب سے مؤذنوں کو حکم اذاں دیا گیا اور سلطان محمد فاتح نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ پڑھی اس منظر نے آنکھیں نم کر دیں۔ بینا راجپوت کو ایک شاندار تحریر لکھنے پر مبارکباد۔ فرزانہ نکہت کے قلم سے نکلی تحریر ''ممتا کی جیت'' عمدہ منظر نگاری کے باعث بہت پسند آئی۔ کی کک کا کردار ساری کہانی پر چھایا رہا۔ الگوز میں بھوک اور افلاس کی تفسیر بنے بچے ہوں یا کوک کی حالت زار کا بیان ہر چیز کی منظر کشی اتنی مکمل اور مفصل تھی کہ سب کچھ سامنے محسوس ہو رہا تھا۔ منجمد جھیل پر مچھلیاں پکڑتا ہالو اور لکڑی کے تختوں پر زندگی بچانے کی جدوجہد کرتی کی کک سب بہت عمدہ انداز میں قلمبند کیا گیا۔ سب سے برا کردار اوتک کا تھا۔ ایسے لوگ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگیاں بھی جہنم بنائے رکھتے ہیں۔ ''جال'' اچھی کہانی تھی۔ پہلے سے ہی ڈاکٹر روتھ پر شک تھا اور جب کہانی کھلی تو واقعی سارا کھیل اسی کی لالچ کا رچایا ہوا تھا۔ سنی کی موت نے دل افسردہ کر دیا۔ مستقل سلسلوں سے ہوتے ہوئے سچ بیانیوں کا رخ کیا۔ پہلی سچ بیانی ''صبر کا پھل'' بالکل کسی فلم کی کہانی محسوس ہو رہی تھی۔ ابتدا میں سادہ سی کالج گرل کی کہانی نے ایک دلچسپ موڑ تب لیا جب رب نواز نے ملیحہ سے نکاح کر لیا۔ رب نواز کی موت کا راز اختتام پر کھلا تو کہانی یکسر بدل گئی۔ مختصر آپ بیتی ''درازؔ'' میں انمول کی زندگی اور موت کا دردناک احوال پڑھ کر افسوس ہوا۔ جس دولت کو بچانے کے لیے انمول کی خوشیوں کا گلا گھونٹا گیا اسی دولت کی ہوس نے افضل کو خون کے رشتوں سے بیگانہ کر دیا۔ ''آتش حسد'' قدم قدم پر ڈرامائی موڑ لیے ہوئے داستان تھی۔ شہریار اور اقرا کا ملنا پھر اتفاق سے اقرا کا اپنے دولت مند نانا کی جائیداد کا اکلوتا وارث بننا سب کچھ بہت دلچسپ تھا۔ کہانی میں سب سے بڑا ٹوئسٹ میمونہ اور رضوانہ کا جڑواں ہونا تھا اور یہیں سے ساری کہانی بنی تھی۔ ''یہ رشتے'' کا آغاز اچھا اور پُرتجسس تھا۔ لگتا تھا کہ ایک اچھی تحریر پڑھنے کو ملے گی لیکن بہت جلد ہی کہانی سمیٹ دی گئی۔ ''بدکار موبائل'' عمدہ اور فکر انگیز تحریر تھی۔ موبائل کا استعمال اسے نیک یا بد بناتا ہے۔ منفی ذہنیت کے حامل لوگ جہاں اسے شر پھیلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں وہیں مثبت ذہن معلومات کی اس وسیع دنیا کا حصہ بن کر اپنی زندگیاں بہتر بنا رہے ہیں۔ نسرین کا کردار اچھا رہا۔ آخر میں اس کی زندگی اس کے اچھے کردار کی وجہ سے بدل گئی۔ خالد شیخ طاہری کی تصنیف ''اداکار'' زبردست کہانی تھی۔ شروع میں پاگل عورت کا رویہ پڑھ کر لگا کہ یہ بوڑھے والدین اور نافرمان اولاد کی کہانی ہوگی لیکن بڑھیا زبردست اداکارہ نکلی۔ ایسے لوگ جب اعتماد کو ٹھیس پہنچاتے ہیں تو لوگ مستحق افراد کی مدد کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ ''ٹوٹے خواب'' کچھ خاص متاثر نہ کر پائی۔ یہ بس سیدھی سادی تشنہ محبت کی داستان لگی۔ بلال احمد کی ''بادشاہ'' اچھی تحریر تھی۔ محنت کے ساتھ بابر کی خودداری اور لگن نے اسے ایک معمولی انسان سے واقعی بادشاہ بنا دیا۔ اریان کے کردار نے بابر اور مسکان کی کہانی مکمل کر دی۔ کہانی میں ربط نے بہت لطف دیا۔ ''کھیل قسمت کا'' اچھے پیغام پر مبنی کہانی تھی۔ خواتین کا کردار ان معاملات میں بہت اہم ہے۔ شاہینہ خود ان حالات سے گزر چکی تھی اس لیے اس نے دوسری عورت کے درد کو محسوس کیا۔ دیارِ غیر بیاہ کر جانے والی اکثر خواتین ایسے حالات سے گزرتی ہیں لیکن کم ہی لوگوں کو ڈاکٹر سحر جیسے مددگار اور کامران جیسے مسیحا ملتے ہیں۔ آخر میں اتنا کہوں گی کہ ایک دو کو چھوڑ کر اس بار سچ بیانیوں کا

''امان اللہ!'' ملاقات کی اُمید کے ساتھ فی انتخاب پچھلے ماہ کی نسبت اچھا تھا۔ اگلے ماہ

☆ بیگم پرویز خان کی مانسہرہ سے آمد۔ ''جولائی کا شمارہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ سب سے پہلے ایک صفحے پر مشتمل ''ادب کا معمار'' پڑھا بہت اچھا لگا۔ محمد منشا یاد ایک بہت بڑا نام تھا جون کے شمارے میں احمد ندیم قاسمی کو پڑھا تھا جو بہترین شاعر اور رائٹر تھے۔ شہر خیال میں داخل ہوئے سمیرا ارشد کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ محمد بن کریم کے تبصرے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ شہر خیال میں سب ہی اچھی اچھی رائے دیتے ہیں اور بہت اچھا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہی روسیاہ پڑھتے ہیں۔ عاطر شاہین مبارک ہو بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ پاکستانی علی کے ساتھ ہماری دعائیں اور محبتیں۔ آہنگ صحافت (زویا صفوان) اچھی تھی معنفہ ہمیں ہمیشہ ہی انمول ہستیوں سے متعارف کرواتیں ہیں، شکریہ زویا جی۔ ''گیمکو'' ایک بہت دلچسپ اور معلوماتی تحریر تھی۔ ''صبر کا پھل'' اور ''حسد'' سبق آموز سچ بیانی تھی کہ حاسد اپنی ہی آگ میں جلتا رہا۔ ''بدکار موبائل'' ایک دعوت فکر دیتی سچ بیانی ہے۔ اخلاقی زوال، انسانیت، شرم وحیا اور اخلاقیات کا جنازہ کیسے کیسے نکل رہا ہے۔ پڑھ کر دل کانپ گیا۔ ''دراز'' غلیظ فیصلے کیسے بچیوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیتے ہیں، بہت ہی رلا دینے والی سچ بیانی ہے۔ ''ممتا کی جیت'' نے خون منجمد کر دیا۔ ہمارے پاس اتنی سہولیات ہیں اتنی نعمتیں ہیں لیکن ہم قدر نہیں کرتے۔ شکر ہے کہ ممتا جیت گئی۔ باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ میں نے کچھ تحریریں بھیجی تھیں تا حال کچھ پتا نہیں (آپ ایسی تحریریں بھیجیں جیسی سرگزشت میں چھپتی ہیں)''

☆ محمد عارف قریشی کا خط بھکر سے۔ ''اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ اس خط کا مقصد جون کے شمارے میں ہونے والی ایک فروگزاشت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ہے اور وہ یہ کہ اس کے صفحہ 7 (یک صفحی سرگزشت) میں درج ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر ایک ادبی رسالے ''نقوش'' کی بنیاد رکھی۔ معذرت کے ساتھ اس رسالے کا نام ''نقوش'' بلکہ ''فنون'' تھا۔ ''نقوش'' کے بانی محمد طفیل تھے جنہوں نے بعد میں اپنا نام ہی محمد نقوش رکھ لیا تھا (جی ہاں، شکریہ نشاندہی کی)''

☆ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی غربی بہاول پور سے لکھتے ہیں۔ ''حسب اشتہار، حسب وعدہ، حسب دستور آپ کے شمارے میں مقررہ تاریخ تک مارکیٹ کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ حکومت کے تعلیم کے بارے میں اعلانات بھی بے بنیاد ہیں۔ کاغذ آئے روز مہنگا ہو رہا ہے۔ درجہ چہارم کا طبقہ رو رہا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اب تو نصابی کتب بھی مہنگی ہو چکی ہیں۔ یہی حال رہا تو حکومت کا یہ دعویٰ ''تعلیم سب کے لیے'' ٹرخانے والے عندیہ کے مترادف ہوگا۔ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور۔ یہ محاورہ سنتے سنتے بڑھاپا آچلا۔ ایک افسر اور سولہ ماتحت آفس میں کام دھیلے کا نہیں پھر بھی افسر کے ساتھ دورے کے بہانے کے مصداق یہ منچلے لاڈلے ملازم میلہ گھوم ہی لیتے ہیں۔ انوکھا، لاڈلا، کھیلن کو مانگے چاند رے۔ پنجاب کے لیے سرکاری ملازمتوں کا 32 فیصد کوٹا، چاول ملتا نہیں کنڑیں اور ٹوٹا۔ کپی بانس متی کہاں سے آئے گا؟ کون کھائے گا؟ سوائے سرکاری ملازمین کے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ سب کا رازق اللہ ہے لیکن جب انسان عبادت سے کنی کترائے گا تو رب ذوالجلال کا غضب حرکت میں آئے گا۔ یہ کورونا، سموگ یہ بیماریوں کا زور اور روزگار کا روگ۔ الحمدللہ۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے۔ پاکستان کے کل چار صوبے اور سیاست دانوں کے ہوائی منصوبے۔ آبادی بائیس کروڑ۔ چوالیس کروڑ ہوگئی تو بس سمجھ لو، سب کی قسمت سوگئی۔ آپ اس گرانی کے دور میں بھی اپنے چاروں ڈائجسٹوں کی قیمت اعتدال پر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کی دلی منشا ہے کہ کم منافع پر کام چلایا جائے۔ قارئین پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اچھی سوچ ہے۔ شعبہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں آپ۔ آپ کے چاروں شمارے۔ جیسے بچوں کے ہاتھوں میں خوشنما غبارے۔ دلچسپ کہانیوں سے مطالعے کی عادت فروغ پاتی ہے۔ اللہ ہی اللہ خیر صلیٰ آپ سے یہ معلوم کرنا تھا کہ دو چار ماہ قبل ایک موجودہ ماحول کی عکاس سچ بیانی۔ ''ماں روٹی دے'' بھیجی تھی۔ آپ کو ملی نہ ملی۔ (مل گئی)۔ تاکہ دماغ سے یہ غبار ہٹ جائے کہ محکمہ ڈاک کی بھینٹ تو نہ چڑھ گئی ہماری کہانی۔''

☆ وکیل الرحمٰن کا خط جو کافی تاخیر سے پہنچا۔ ''ہوش بلگرامی کا مضمون دل کو چیر گیا۔ بہت ہی دل ربا تحریر ہے۔ سرسید کا مضمون بھی دلکش ہے، قاری پڑھنے میں کھو جاتا ہے۔ گلزار محل بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ ہم نے بھی کئی بار دیکھا، چنیوٹ کا ہار ہے، بلکہ ہم نے چنیوٹ کا 73 بار سفر کیا ہے۔ چناب نگر کی سیر بھی بہت خوبصورت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سال میں دو چکر ضرور لگائیں۔ بھوننگ کی مسجد میں دو بار جمعہ کی نماز ادا کی ہے۔ بہت ہی خوبصورت مسجد ہے، ہم صادق آباد جاتے تھے اکتوبر کے مہینے میں، بٹیر زندہ، جال لگا کر پکڑتے تھے۔ وہ بھی فجر کے بعد۔ ساتھ ہی نمکین لسی بھی بہت یاد آتی ہے۔ سفرنامہ پڑھنے سے گھر بیٹھے دل باغ باغ

ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم سفرنامہ ضرور شامل کیا کریں۔ سچ بیانیاں پڑھنے کا وقت نہیں ملتا ہے۔ قلم نگری کی باتیں، یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ خط تحریر کرنا بھی ایک کاردارد ہے کہ عمر عزیز 75 ہے لہٰذا باقی باقی۔''

☆ عبدالحکیم ثمر کا تبصرہ کراچی سے۔ ''پرویز بلگرامی صاحب میری پُرخلوص دعا ہے کہ آپ کی صحت اور زندگی ہمیشہ اللہ کی امان میں رہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو اپنی رحمتوں کی چھاؤں میں شاد و آباد رکھے (آمین) سن دو ہزار سے آپ کا عقیدت مند رہا ہوں۔ اس وقت سے جب آپ کا پان، چوپال اور ساتھ ہی وہ قینچی جو چوپالیوں کے خطوط کی درستگی کے لیے بڑی شہرت کی حامل تھی۔ اب تو ایک روحانی عقیدت ہو چکی ہے آپ سے۔ شاید سبب یہ ہو کہ کبھی ہم ایک ہی اجڑے دیار کے باسی تھے۔ ہمیشہ سے آپ کا شکر گزار رہا ہوں۔ اب تک آپ میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ آج پھر زحمت دے رہا ہوں۔ لگتا ہے اب واقعی میں ٹوٹ چکا ہوں، غم تنہائی اور جان لیوا بیماریوں نے دبوچ رکھا ہے۔ میری ضعیفی تفکرات کے اندھیروں میں کراہ رہی ہے۔ آج شہر خیال سے ہٹ کر اپنا آپ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ یہ میرے احساس کی سرگزشت ہے۔ میرے جذبات کی سچ بیانی ہے۔ اُمید ہے اسے نظر انداز کرنے کی بجائے اس کی تراش خراش کے بعد ایک راحت اور عنایت کریں گے۔ چلچلاتی ہیٹ ویو کی بھٹی کے جھلسے ہوئے لوگ قیامت ڈھاتی گرمی کی حصار میں تڑپ تڑپ کر جاں بلب ہو رہے ہیں۔ انہیں سکون چاہیے۔ قرار چاہیے۔ سوال ہے انہیں یہ ملے گی کہاں؟ رہنماؤں کے وعدے جس کے نصیب میں کبھی وفا ہونا لکھا ہی نہیں۔ پھر بھی منصبی کی کرسی چاہیے کیونکہ لیڈر تو کرسی کے بغیر ماہی بے آب ہوتے ہیں۔ اس وقت ہاتھوں میں سرگزشت کا تازہ شمارہ اور لبوں پر کیفی اعظمی کا اجارہ یعنی ان کا مشہور شعر ''تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا۔ زندگی دھوپ تم گھنا سایہ۔'' اور میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اب بھی لوگ سرگزشت پڑھتے ہیں اور دیکھتے بھی ہیں اس تبدیلی کے نتیجے میں اکثر قارئین حسینہ سرورق کی دل آویز حسن کے اسیر ہو چکے ہیں۔ ان کی سیاہ گھنی زلفوں کی چھاؤں میں انہیں آسمان پر چھائی کالی گھٹاؤں کی سی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی تسکین ذوق مطالعہ کے ساتھ اپنا ذوق تسکین نظارہ کی مشق بھی جاری رکھی ہے۔ یقین نہیں آ رہا ہے نا؟ تو دیکھیے وہ تعریفی کلمات جو ٹائٹل گرل کی حسن و جمال کی شان میں ہر ماہ پیش کیے جاتے ہیں۔ میری تنہائیوں اور محرومیاں مجھے پل پل احساس دلاتی رہتی ہیں کہ وقت کی آس آتی ہوئی لہروں پر میری جاتی ہوئی سانسوں کو سنبھالا دینے کے لیے کسی کے پاس دو چار لمحے بھی نہیں جو مجھ پر برباد کرے دل میرا شاد کرے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ میرے پاس جدید سہولتوں سے عاری ایک موبائل بھی ہے۔ جو اکثر میرے ہاتھوں میں رہتا ہے اور میری لرزیدہ انگلیاں اسے تختہ مشق بنائے رکھتی ہیں۔ سکون قلب مجھے پھر بھی میسر نہیں، گھٹن اور بے چینی میرا مقدر ٹھہرا۔ ویسے ایک راز کی بات بتاؤں؟ آج کل زندگی مجھ سے خفا ہے بالکل میرے ان کرم فرماؤں کی طرح جن کے لیے چھوڑ جانے کو میرے پاس کوئی اثاثہ نہیں۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ اچانک سنتوش آنند میرے تصور کے دریچے میں آن کھڑا ہوا۔ وہی بدنصیب شاعر جس پر موت کو بھی ترس آگئی۔ اس نے اسے چھوڑ دیا لیکن زندگی؟ اس کی ساری خوشیاں چھین کر وہیل چیئر پر بیٹھا گئی پھر بھی مایوسیوں کے سینے پر چڑھ کر زندگی کے نغمے الاپ رہا ہے۔ ''ایک پیار کا نغمہ ہے موجوں کی روانی ہے۔ زندگی اور کچھ بھی نہیں تیری میری کہانی ہے۔'' میرے اعصاب اس کی طرح مضبوط نہیں۔ کمزور ہوں اسی لیے اس سے معذرت کے ساتھ اپنا تجربہ پیش کرتا ہوں۔ زندگی صرف پانے کا نام نہیں اس کا ایک نام اور بھی تو ہے ''کھونا'' عموماً زندگی دیتی کم ہے لیکن لیتی کچھ زیادہ ہے۔''

☆ شاہ وار کاکا خیل، حیات آباد پشاور سے رقمطراز ہیں۔ لیکن یہ خط کافی دیر بعد پہنچا ہے۔ ''خوبصورت ٹائٹل والا سرگزشت بروقت موصول ہوگیا۔ سرورق کا معائنہ کرنے کے بعد سب سے پہلے فصیل کو پھلانگ کر اپنے پسندیدہ شہر خیال میں وارد ہوئے۔ سب کے خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ گزشتہ ماہ شیخ امام بخش صہبائی کے متعلق پہلی دفعہ پڑھا۔ غالب جیسے عظیم شاعر سے مقابلہ سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ میری دانست میں غالب اردو زبان کا شیکسپیئر ہے اور باقی تمام شاعر طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب جیسی ہمہ گیر شخصیت کے سامنے، بہرحال امام بخش صہبائی صاحب کے حالاتِ زندگی پڑھ کر ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔ مقابلہ دل ناتواں نے خوب کیا۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

رضوانہ بشیر، گجرات۔ ریاض الدین، بی۔ نازیہ عاصم، اسلام آباد۔ سلطان خان، بنوں۔ نوازش خان، کوئٹہ۔ نوشاد اختر، ساہیوال۔ حسنین میمن، حیدرآباد۔ سحر علی، لاہور۔ افسر حسین، راولپنڈی۔ شاہد حسین، مظفر گڑھ۔

باغی

زویا صفوان

کچھ لوگ بغاوت کے خمیر سے جنم لیتے ہیں۔ وہ قدم قدم پر خود کو منفرد کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی دوشیزہ تھی جو ہمیشہ الگ راہ کو منتخب کرتی۔ وہ ہزار دقعت خون کی ندی عبور کرکے پاکستان پہنچی اور پھر لوٹ گئی۔ شوہر اشتراکی نظریات کا حامی تھا وہ بھی اس کے رنگ میں رنگ گئی۔ بچوں کو راہِ مستقیم پر لانے کی بجائے اسی راہ پر چلنے دیا۔ بزرگوں نے کیا خوب کہا ہے کہ ادب سیکھا کس سے؟ بے ادبوں سے۔ اسی خیال کے تحت اس دوشیزہ کی روداد کو منتخب کیا ہے کہ غور کریں کہ قائد اعظم نے کتنا پہلے بھانپ لیا تھا کہ ہمیں اپنی سرزمین نہ ملی تو آنے والی نسل بے بہرہ ہوجائے گی۔

ایک باغی دوشیزہ کی روداد حیات

اس خاندان میں بغاوت کی یہ جڑیں آباؤاجداد سے ہوتی قمر کے والدین تک منتقل ہوئی تھیں۔ اس کے والدین ایک بغاوت ہی کے نتیجے میں 1921ء میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ والدہ کشمیر النسل تھیں اور خاندان کے کئی لڑکے ان سے رشتہ کے خواہش مند تھے۔ قمر کی نانی بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہتی تھیں لیکن بیٹی اس لڑکے کو ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان کو بھی سخت ناپسند کرتی تھی۔ مروت و شرم میں وہ خود تو والدین سے کچھ نہ کہہ سکی البتہ چھوٹی بہن سے اپنا انکار کہلوا بھیجا۔ والد نے بیٹی کی مرضی و خواہش کا بھرپور احترام کیا اور اس کے فیصلے کی تائید بھی کی۔ والدہ کو یہ بات اس قدر ناگوار گزری کہ انہوں نے بطور احتجاج بیٹی کی شادی میں شرکت ہی نہ کی، ناراضگی کا یہ عالم تھا کہ وہ کھڑکی سے نکل کر پڑوس میں بیٹھی رہیں۔

قمر کے والد کا نام اختر علی آزاد تھا۔ وہ جھانسی کے تحصیل دار تھے۔ ان کے رشتے کا سلسلہ اس زمانہ کی مشہور مضمون نگار خاتون نذر سجاد حیدر کے توسط پروان چڑھا۔ وہ اختر علی آزاد کی گہری دوست اور قرۃ العین حیدر کی والدہ تھیں۔ ایک طویل عرصے سے اختر کے رسالے 'پیام امید' میں مضامین بھی لکھتی رہیں۔ اس شادی نے دو خاندانی رسمیں توڑ دیں۔ قمر کی والدہ اپنے خاندان کی پہلی کشمیری خاتون تھیں جنہوں نے غیر برادری میں شادی کی۔ اس کے بعد وہ شوہر کے ساتھ یوپی میں جھانسی منتقل ہو گئیں جسے پنجاب میں رہائش پذیر کشمیری ہندوستان کے نام سے یاد کرتے تھے۔

قمر کی پیدائش 1926ء میں ہوئی۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی والدین کو مختلف تعمیری و ادبی معاملات میں مگن پایا تو لاشعوری و بے اختیاری طور پر خود بھی اسی جانب مائل ہونے لگی۔ اس کی والدہ کو مطالعہ کا شدید شوق تھا۔ وہ اپنی کثیر اولاد اور شوہر کی مسلسل علالت کے باوجود یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح برقرار رکھتی تھیں۔ ہزارہا مصروفیات کے باوجود اپنے بچوں کو بھی خود ہی پڑھاتیں۔ ان کی فطرت کے باغیانہ جراثیم شادی اور اولاد کی پیدائش کے بعد بھی ختم یا کم نہیں ہوئے تھے۔ ان کی غیر روایتی روش تاحال جوں کی توں برقرار تھی۔ وہ بچوں کی خوشیاں' رسم بسم اللہ' ختنے' منگنی، سالگرہ اور لمبے چوڑے جہیز بنانے کی سرے سے قائل ہی نہیں تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے وسائل اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت میں صرف کرنے کو ترجیح دی۔ بچوں کی تعلیم آگے بڑھانے کے لیے اپنا زیور اور زمین تک فروخت کر دی۔ تحصیلوں میں تعلیم نسواں کا کوئی باقاعدہ بندوبست

اور رواج نہ ہونے کے باعث انہیں ہاسٹل میں بھی داخل کروایا تاکہ ان کی تعلیم میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔

وقت کچھ مزید سرکا تو قمر کی نانی کا غصہ سرد ہونے لگا اور ان کی بیٹی کے گھر آمد و رفت کا آغاز ہوگیا۔ دھیرے دھیرے داماد کے جوہر کھلنے پر وہ ان کے مزاج و فطرت کی بھی گرویدہ ہوگئیں۔ انہوں نے بیٹی کے گھر آمد پر عضو معطل بن کر رہنے کی بجائے قمر سمیت دیگر بہن بھائیوں کو قرآن اور اردو پڑھانا شروع کردیا۔

ہوش کی وادی کے نقوش کچھ اور واضح ہوئے تو قمر کو اپنے خاندانی پس منظر و خصائل سے مزید واقفیت ہوئی۔ اسے علم ہوا کہ ان کا دودھیال شاعروں، مصنفوں اور مذہبی عالموں پر مشتمل تھا۔ گذشتہ چھ سو سال کی تحریری تاریخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ عباسیوں کی ایک شاخ عرب سے آکر 'فرخ آباد' (یوپی) میں آباد ہوئی تھی۔ وہاں ان کی انسان دوستی، خدا ترسی اور علم و فضل کا اتنا شہرہ ہوا کہ بادشاہ وقت نے مزید کئی علما سمیت انہیں بھی بلا کر نہ صرف 'کاکوری' میں جاگیر دی بلکہ 'قاضی القضاۃ' کے عہدے پر بھی فائز کردیا۔ اس کے دادا 'جعفر علی شیون' ایک مشہور فارسی شاعر تھے۔ پرانے ادبی تذکروں میں ان کا نام اپنے وقت کے اعلیٰ فارسی شاعروں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فن موسیقی کے ماہر بھی تھے۔ ہر صبح راگ بھیروی میں اس طرح قرآن پاک کی تلاوت کرتے کہ سڑک پر چلنے والے دم بخود ہو کر رک جایا کرتے۔ تلاوت ختم ہو جانے تک وہ اپنی جگہ سے جنبش کر لینے سے قاصر رہتے۔ 1857 کی بغاوت میں وہ اپنی جایداد کے کاغذوں سے محروم ہوگئے۔ ان کی آخیر عمر مفلسی میں ہی کٹی۔ پریشانیوں نے زندگی میں اس قدر ڈیرے جمائے کہ وہ اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھے اور اسی کیفیت میں عمر بھر کی کمائی یعنی اپنا دیوان نذر آتش کردیا۔

قمر کے والد اظہر علی آزاد ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ وہ جھانسی کے تحصیل دار تھے۔ اس سرکاری ملازمت کے باوجود انہوں نے ادبی سرگرمیاں کسی نہ کسی طور برقرار رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک مستقل مضمون نگار، فارسی، اردو کے شاعر اور کئی رسالوں کے ایڈیٹر بھی رہے۔ خود بھی کئی برسوں تک ایک ادبی رسالہ نکالا۔ اسی وجہ سے قمر کے گھر کا ماحول آغاز ہی سے خالصتاً علمی و ادبی رہا۔ شعر و شاعری، بحث و مباحثہ، نظم خوانی اور داستان گوئی تو گویا روز کا معمول تھی۔ قمر کے علاوہ اس کے دیگر بہن بھائیوں کو بھی بچپن میں ہی فارسی اور اردو کے سینکڑوں اشعار یاد ہوگئے۔ انہیں مطالعہ کے لیے اعلیٰ درجے کے ادبی مجلے، پرانی کہانیاں اور مختلف زبانوں کے مترجم ناول میسر تھے۔ اس زمانے میں بچوں کے ادب میں 'کھلونا' اور 'پیام تعلیم' نامی دو رسائل نکلتے تھے۔ یہ دونوں ہی رسائل ان کے گھر باقاعدگی سے آیا کرتے لیکن قمر کا یہ عالم تھا کہ اسے 'داستان امیر حمزہ'، 'طلسم ہوش ربا' اور فسانہ آزاد' قسم کی داستانوں کی لت لگ چکی تھی۔ بچوں کے رسائل ابلی ہوئی کھچڑی کا سا مزہ دیتے۔ یہ پسند و فوقیت بغاوت کی جانب قمر کا پہلا قدم تھی۔

☆☆☆

وقت کا دریا اپنی مخصوص روانی سے بہتا اس داستان کے کرداروں میں تغیرات و کمالات ملاحظہ کرتا رہا۔ ہر کردار اپنی زندگی اور ذہنی شعور کے مزید کئی مدارج طے کر گیا۔ اظہر علی آزاد اس دوران بجا طور پر اس تفاخر میں مبتلا رہے کہ ان کی اولاد کی رگوں میں بے ایمانی اور رزق حرام کی رتی بھر آمیزش نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے سرکاری عہدے کا ناجائز استعمال کبھی بھی نہیں کیا۔ انہیں زندگی میں اپنے عہدے کے ناجائز استعمال سے 'زمین' جائیداد اور مالی منفعت حاصل کرنے کے ان گنت مواقع ملے لیکن اس کے باوجود ان کے ارادوں میں کسی قسم کی کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ ان کی بے نیازی اور ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ دیگر سرکاری افسران کے برعکس اپنی خاندانی جایداد سے بھی کبھی کوئی تحصیل وصول کرنے میں دلچسپی نہ لی۔ عمر بھر کرایہ کے مکانوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے ان کی مصروفیات کا مدار شعر و شاعری اور دیگر ادبی سرگرمیوں تک ہی محدود رہا۔ ان کی زندگی کی واحد دولت کتابیں اور اکلوتی خوشی اپنی اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت تھی۔ قمر کے لیے ان کی سادہ مزاجی، زندہ دلی، زندگی کے مثبت پہلو دیکھنے، توکل الٰہی اور صوفی خشانہ طبیعت بہت سحر انگیز تھی۔ قمر نے انہیں مذہب، ذات اور برادری کے جھگڑوں میں بھی کبھی الجھتے نہ دیکھا۔

اظہر علی آزاد پیوند در فوزدہ کپڑے پہن کر بلا تکلف باہر چلے جاتے۔ کسی کے بھی اعتراض یا استفسار پر بڑی متانت و اعتماد سے جواب دیتے۔

''میری جائز آمدنی میں جو کچھ بھی مجھے میسر ہے میں اسی میں خوش ہوں بھئی!''

قمر نے انہیں کبھی بھی اپنے علم و فضل پر اتراتے یا زندگی سے شکوہ کناں نہیں دیکھا۔ وہ سال بھر میں چھ ماہ علیل

ہی رہتے تھے۔ اس کے باوجود اپنی سرگرمیوں اور تخلیق نگاری میں کسی قسم کا تعطل نہ آنے دیتے۔ انہیں سر ما بھر دمہ کی شدید تکلیف رہتی۔ سانس لینے کی بے ہنگم آوازیں گھر کے ہر کونے میں سنائی دیا کرتیں۔ قمر کو ان کی اس کیفیت پر بہت رنج و اذیت ہوتی۔ وہ اپنا اضطراب اور آنسو چھپائے گھر میں کوئی ایسا گوشہ تلاش کرتی پھرتی جہاں یہ کربناک آوازیں اس کی سماعت تک نہ پہنچ سکیں لیکن یہ صدائیں ان کا پیچھا چھوڑ کے ہی نہ دیتیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں سمیت زیادہ تر وقت صحن یا باغیچے میں صرف کیا کرتی۔ اسے علم تھا کہ اظہر اس تکلیف کے باوجود اپنا فارسی دیوان مکمل کرنے میں مگن رہتے تھے۔ والد کی یہ اداس کے کردار و مزاج میں بھی راسخ ہونے لگی۔ اسے والد کی زود رنجی اکثر آزردہ کر دیا کرتی۔ وہ اپنی طبیعت اور اذیت سے بلکان ہو کر بچوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈانٹ پھٹکار دیا کرتے تاہم غصہ اترتے ہی ان سے بلا جھجک معافی بھی مانگ لیا کرتے تھے۔

بچپن کا پڑاؤ عہد شباب میں ڈھلا تو زندگی نے اپنے نت نئے رنگوں سے آشنا کروانا شروع کردیا۔ ان دنوں تقسیم ہند کا غلغلہ بلند تھا۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والی ان اقوام کے لیے علیحدگی کا ناگزیر وقت اب قریب تھا۔ اظہر علی آزاد ان دنوں اپنی ملازمت سے سرکاری طور پر سبکدوش ہو چکے تھے۔ قمر کے بڑے بھائی اصغر علی عباسی کشمیری گیٹ پالی ٹیکنک میں انگریزی کے لیکچرار اور کمرشل میوزیم کے کیوریٹر تھے۔ وہ لوگ تیار پور لانسرز روڈ پر واقع کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔ اصغر نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر سرکاری طور پر پاکستان منتقلی کا حتمی عندیہ دے دیا تھا۔ اظہر بیٹے کے اس فیصلے سے بالکل خوش نہیں تھے لیکن کیا کیا جا سکتا تھا بھلا؟ وہ ذاتی طور پر ایک ریٹائرڈ شخص تھے اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ گھر بھر کا خرچ اصغر نے ہی اٹھایا ہوا تھا اس لیے خاموشی سے پاکستان منتقلی کے سرکاری احکام کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

لانسرز روڈ کے اس محلے میں مسلم گھرانے صرف دو ہی تھے۔ محلے کے دیگر گھرانوں نے انہیں مکمل حفاظت فراہم کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ رات بھر کئی مسلح افراد پہرہ بھی دیا کرتے۔ اس وقت تک حالات قدرے متوازن تھے۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح وہاں کسی قسم کا کوئی فساد برپا نہیں ہوا تھا اس لیے عوام بھی قدرے پُرسکون اور بے فکر تھے لیکن پھر حالات میں یکدم ہی تغیر پیدا ہوگیا۔ تیار پور کے ایک سرکاری خاندان میں بم پھٹنے کے بعد گھر بھر موت کی آغوش میں چلا گیا تو علاقہ بھر میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا۔ اسی شام ان کے پڑوسی ملاقات کے لیے چلے آئے۔ قمر چلمن کی اوٹ سے وہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے شرما صاحب؟'' اظہر نے تاسف سے دریافت کیا۔

''ہم نے تو پہنے میں بھی کبھی ایسا وچار نہیں کیا تھا اظہر میاں!'' اودھیڑ عمر شرما نے شرمندگی جتائی۔

''دیکھیں اظہر چاچا! ہم صاف اور سیدھی بات کریں گے۔'' شرما کے بیٹے نے سنجیدگی سے انہیں مخاطب کیا۔ ''حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ اب ہم آپ کی سرکھشا نہیں کر سکیں گے۔ ہماری مانیے تو یہاں سے کہیں دور کسی رشتہ دار کے پاس چلے جائیے۔ اس کے بعد پاکستان جانے میں بھی بالکل دیری نہ کیجیے گا۔''

''ہندستان کا کون سا ایسا علاقہ ہے جہاں فسادات کی یہ آگ نہیں پھیلی۔'' اظہر نے رنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ہم چاہے کہیں بھی چلے جائیں اس آگ کی تپش اور پیش ہر صورت میں دل سوختہ کریں گی۔''

''لیکن جیون تو سرکھشت رہے گا ناں!'' شرما نے کہا۔ ''یہاں رہے تو کبھی بھی کوئی درگھٹنا ہو سکتی ہے۔ جوان بچیوں کا ساتھ ہے۔ اس بڑھاپے میں انہیں کیسے سنبھالتے پھرو گے؟''

شرما کی یہ بات اظہر کے دل کو لگی۔ اس نے تشکر کے بھرپور جذبات سے اپنے ان دیرینہ ہمسایوں کو رخصت کر دیا۔ اس کے بعد حالات میں در آنے والے تغیرات کا تناسب یکدم ہی کئی گنا بڑھ گیا۔ اگلے ہی روز اطلاع ملی کہ کراچی تک پہنچائے جانے کے لیے روانہ کیا گیا سامان اسٹیشن پر لوٹ لیا گیا ہے۔ اظہر اور قمر کے ذہنی تناؤ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے اپنا باقی ماندہ سامان تھیلوں میں باندھا اور نئی دہلی جانے کے لیے بس اسٹاپ پہنچ گئے۔ سوئے اتفاق بس بھی جلد ہی مل گئی۔ ان کے ہمراہ قمر تھی۔ اصغر اور اس کی بیوی دو بچے، چھوٹی بیوی بلقیس اور تقریباً پندرہ سالہ بیٹا جمال تھے۔

اس وقت تک اصغر کا یہی گمان تھا کہ وہ چند روز نئی دہلی میں قیام کرنے کے بعد بہ آسانی کراچی روانہ ہو جائیں گے لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بس دہلی پہنچی تو کشمیری گیٹ پر رک گئی۔ علم ہوا کہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر کرفیو

نافذ کر دیا گیا ہے۔ سبھی مسافروں کو وہیں اتار دیا گیا۔
قمر اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ ایک نکڑ پر کھڑی اس افتاد پر حیرت زدہ یہ سوچ رہی تھی کہ اب ان کا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ وہ اپنی مسافت کیونکر مکمل کر سکیں گے؟ مختلف علاقوں سے اٹھنے والے سیاہ دھوئیں کے بادل آسمان پر پھیلے تھے۔ ہر ایک کا دل دہلا ہوا تھا کہ کسی بھی وقت ہندو بلوائی ان پر حملہ کر سکتے ہیں۔
''باجی! اب کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟'' بلقیس کی خوفزدہ سرگوشی اس کی سماعت میں پڑی۔
''میرا دل کہتا ہے کہ اللہ پاک ہمارے لیے ضرور کوئی نہ کوئی بہتر سبب پیدا کرے گا۔'' اس نے بہن کو تسلی دی تاہم دل کسی نہ کسی طور لرزیدہ ہی تھا۔
وہ سب جانے کتنی ہی دیر اس مقام پر تنہا' بے یار و مددگار اور خاردار سوچوں میں گھرے کھڑے رہے۔ ان کے دل کسی مدد کے لیے دعا گو تھے اور پھر مدد خود ہی ان کے پاس چلی آئی۔ اتفاقاً ادھر سے 'حمید ہاشمی' کا گزر ہوا۔ حمید اصغر کا دیرینہ دوست تھا۔ قمر اس شخص اور اس کے مکمل خاندانی پس منظر سے واقف تھی۔
ہاشمی خاندان ہندوستانی سماجی اور سیاسی ڈھانچے میں خاصہ فعال اور کسی حد تک 'باغی' ہی تھا۔ حمید کا دوسرا بھائی انیس مسلم لیگ دہلی اسٹیٹ کے سیکریٹری کی حیثیت سے ہر دلعزیز اور ایک باوقار انسان تھا۔ مسلم لیگ کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ بائیں بازو کے نظریات کا حامی تھا۔ احباب اس کی اشتراکیت پسندی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ حمید ہاشمی کانگریس میں رہ کر بائیں بازو کی سیاست پروان چڑھانے کی کوشش کیا کرتا۔
قمر جانتی تھی کہ ان کے آبا ؤ اجداد نہ صرف 1857ء کی جنگ آزادی میں باغیوں کے ہمنوا رہ چکے ہیں بلکہ کانگریس کے ساتھ مختلف ادوار میں برطانیہ مخالف تحریکوں میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ انہوں نے تقسیم کی صورت میں ہندوستان میں ہی مقیم رہنا تھا اور اس سلسلہ میں وہ کشمیری گیٹ کے اس گھر کی خریداری کے لیے بھی قطعی سنجیدہ تھے جہاں وہ گذشتہ تیس برس سے کرایہ دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھے۔
حمید اور اصغر کی دوستی کاروباری مراسم کی وجہ سے استوار ہوئی تھی۔ حمید اس کے سرکاری شعبہ میں فرنیچر مہیا کیا کرتا تھا۔ حمید کو اس لمحہ وہاں دیکھتے ہی قمر کے دل میں آس کے کئی چراغ جگمگا اٹھے۔ حمید اب اصغر سے یہاں آمد کی وجوہات جاننے کے بعد ایک ہی بات پر بضد تھا۔
''کیا سوچ رہے ہیں؟ میرے ساتھ چلیے! اور اب آپ جا بھی کہاں سکتے ہیں؟ ہر طرف خطرہ ہے۔''
اصغر نے ایک بے بسی بھری نگاہ اپنے اہلِ خانہ پر ڈالی اور بے بس ہو کر حمید کے ہمراہ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔
ہاشمی خاندان کے گھر یہ قیام ایک ہفتے پر محیط رہا۔ اس دوران حمید کی والدہ کی کارکردگی' ہمت اور فراخدلی دیکھنے کے بھی لمحہ بہ لمحہ مواقع ملے۔ ان خاتون کو سارا محلہ 'اماں جی' کہا کرتا تھا۔ اماں جی نے ان کی شاندار مہمان نوازی کی۔ ان دنوں میں زیادہ تر کرفیو نافذ ہونے کے باوجود انہوں نے گھر میں راشن کے طور پر اناج' گیہوں اور چاول کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر پہلے چکی میں آٹا پیستیں۔ گھر میں بوئی ہوئی ترئی کی بیل سے تریاں توڑ لی جاتیں۔ اس دور میں امریکا میں فوج کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ سوکھی سبزیاں اور انڈے کا پاؤڈر بھی بازار میں ملتا تھا۔ اصغر کہیں سے اس کا کچھ ذخیرہ بھی لے آیا۔ دالیں بھی گھر میں ہی موجود تھیں۔ اماں جی بڑی سہولت سے بیس' پچیس افراد کا ناشتا تیار کر لیا کرتیں۔ دو وقت کا کھانا بھی وہ خود ہی بناتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی 'ورک شاپ کامپلکس' کے کاریگروں کا اناج کم پڑ جانے کی صورت میں انہیں بھی خود کھانا پہنچا دیتیں۔ قمر کو وہ گھر کسی لنگر خانہ سے مشابہ معلوم ہوا کرتا۔ بہرحال جو بھی تھا قمر اور اس کے اہلِ خانہ کی اماں جی اور ان کے خاندان سے کافی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ ہنسی مذاق اور دلچسپی کے مواقع بھی نکل آتے۔ اماں جی کے تین بیٹوں میں سے صرف بڑا بیٹا انیس ہی شادی شدہ تھا۔ اس کے تینوں بچے بھی قمر کے ساتھ بے حد مانوس ہو گئے۔ منجھلے بیٹے حنیف کے بارے میں البتہ علم ہوا تھا کہ وہ کچھ ماہ پہلے ہی Quit India تحریک کا حصہ بننے کی پاداش میں چار سال جیل کاٹ کر رہا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اسے گھر میں غیر معمولی تکریم و مقام حاصل تھا۔ ہر بچہ' بڑا اس سے کسی 'ہیرو' کی طرح برتاؤ کرتا تھا۔
کشمیری گیٹ کے اس گھر میں ایک ہفتے سے مقیم قمر ریڈیو اور اخبارات کے توسط بیرونی دنیا کے حالات سے کسی نہ کسی طور واقف ہی رہتی۔ دہلی میں فسادات کی آگ مکمل طور پر بھڑک چکی تھی۔ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے محلے مکمل طور پر تباہ کر دیے گئے تھے اور اب بڑے محلوں پر حملے

ہو رہے تھے۔ ہندو بلوائی یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ کون کانگریسی ہے، کون اشتراکی اور کون مسلم لیگی ہے۔ ہر ایک کو مسلمان ہونے کی وجہ سے قتل کر رہے تھے۔ گھروں کو جلا رہے تھے۔ صرف کشمیری گیٹ ہی اس آگ کے شعلوں سے محفوظ تھا۔ یہ کوئی اتفاقی امر بالکل نہ تھا۔ اس محلے میں رہائش پذیر مختلف مذاہب کے افراد نے فیصلہ کر کے ایک محلہ کمیٹی تشکیل دی ہوئی تھی جس میں ہندو' سکھ' پارسی اور مسلمان رات کو گھوم پھر کر پہرا دیتے تھے۔ ایک اتفاق بہرحال یہ تھا کہ کشمیری گیٹ کا مقامی پولیس افسر ایک سردار اور قطعی غیر متعصب انسان تھا۔ اس نے محلہ کمیٹی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ کشمیری گیٹ کے علاقے میں کوئی قتل یا آتش زنی کا سانحہ نہیں ہونے دے گا۔ اس کے سپاہی بھی رات بھر گشت پر رہتے تھے۔
سردار افسر نے اپنا وعدہ ایفا کیا۔ کشمیری گیٹ حیران کن طور پر ایک طویل عرصہ تک ایسے کسی بھی سانحے سے محفوظ ہی رہا۔ اس وقت آبادی کا تناسب بھی بہرحال کچھ اس طرح تھا کہ علاقہ میں تقریباً ستّر فیصد مسلمان آبادی معاشی لحاظ سے کافی مستحکم تھی۔ اس کے علاوہ کشمیری گیٹ میں سلطان سنگھ کی حویلی کے عقب میں واقع چابی گنج میں سو سے زائد کاریگر موجود ہوتے تھے جنہیں حنیف نے کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے بچاؤ کے لیے تربیت دے رکھی تھی۔ پھاٹک پر بھی ہر وقت دو آدمیوں کا پہرہ رہتا۔ دروازوں کے پیچھے بالٹیوں میں چونا اور مرچیں گھول کر رکھی ہوتی تھیں۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ کسی بھی حملے کی صورت میں یہ سیال شرپسندوں کے چہروں اور آنکھوں میں پھینک دیا جائے۔ اس افتاد پر وہ یقیناً بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے اور کسی بھی قتل و غارت کی نوبت ہی نہ آتی۔
یہ متفرق حکمت عملیاں طے کر لینے کے بعد وہ سبھی قدرے مطمئن تھے کہ انہیں کسی بھی نوعیت کی ہنگامہ خیزی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا تاہم انہیں کیا علم تھا کہ تقدیر نے ان کے لیے ایک 'سرپرائز' تیار کر رکھا ہے۔ ایک رات دس بجے کے قریب انہیں مختلف سمتوں سے گولیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گھر میں موجود لڑکوں میں سے چند ایک نے خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے چھت کا رخ کیا تو علم ہوا کہ ہر جانب آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ یہ آگ اور فائرنگ کشمیری گیٹ سے کافی فاصلہ پر ہونے کے باوجود اس قدر ہولناک تھیں کہ آوازیں مکمل شدت سے ان سبھی کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ دریا گنج اور اطراف کے علاقے پر حملے ہو رہے تھے۔ پرانی دلی ریلوے اسٹیشن کے عقب میں سادات کا بہت بڑا محلہ تھا۔ پنجہ شریف ادھر سے بھی شعلے اٹھتے نظر آ رہے تھے۔ اس واقعہ سے دو دن پہلے انیس کے ساتھ بھی ایک ہولناک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ انیس کناٹ پلیس میں تلوار دھاری سکھوں اور ہندوؤں کے نرغے میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ زندگی اور موت کے درمیان بال برابر ہی فرق بچا تھا۔ قدرت نے اس کی زندگی بچانے کا وسیلہ ایک ایسے دوست کو بنا دیا جو اتفاقی طور پر ہی اپنی کار میں وہاں سے گذر رہا تھا۔ انیس اپنی طویل قامتی کے باعث اسے دور سے ہی دکھائی دے گیا۔ اس نے بے جگری سے کار دشمنوں کے درمیان گھسائی اور پھرتی سے دروازہ کھول کر انیس کو گاڑی میں گھسیٹ لیا۔
انیس نے واپس آ کر یہ واقعہ اپنے والد ادریس ہاشمی اور اماں جی کو سنایا تو وہ بھی کسی متوقع نقصان کے خدشے سے لرز کر رہ گئے۔ انہوں نے باہمی صلاح مشورے سے پاکستان روانگی کا فیصلہ کیا اور راتوں رات ہی اپنا سامان بھی باندھ لیا۔
قمر اس نئی صورتِ حال پر خاصی تشویش زدہ تھی۔ اس نے انیس کی بیوی کو خوب دلاسہ دیا۔
''فکرمند نہ ہوں بھابی جی! پروردگار سب اچھا کرے گا۔''
''میں تو یہ سوچ کے ہی ادھ موئی ہونے لگتی ہوں کہ خدانخواستہ اگر انہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو بچوں اور میرا کیا بنتا؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔
''آپ ہی ایسے ہمت ہار گئیں تو باقی سب کو کون سنبھالے گا۔ خود کو مضبوط کیجیے!'' قمر نے خلوص سے کہا۔
''میں تو اب یہاں ایک لمحہ رکنے کی روادار نہیں ہوں۔ حمید میاں اور انہوں نے اپنے تعلقات لڑائے ہیں۔ یہ لوگ جہاز پر پاکستان جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا۔'' اس نے قمر کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔
قمر خاموش ہو کر رہ گئی۔ اگلی صبح گاڑی کا انتظام کر کے دونوں خاندان پرانے قلعے کے 'رفوجی کیمپ' منتقل ہو گئے۔ انہیں قیام کے لیے ایک شکستہ محراب اور ٹوٹے پھوٹے فرش کا قطعہ دیا گیا۔ اگلے دو روز میں حمید اور انیس نے کسی طرح چارٹر جہاز کا بندوبست کر لیا۔ اظہر اور قمر کی خودداری

اورعزت نفس نے یہ بات گوارا ہی نہ کی کہ کرایہ کی مکمل رقم نہ ہونے کے باعث وہ بلا معاوضہ ہی ان کے ہمراہ چل دیں۔ انہوں نے بڑی سہولت سے معذرت کرلی۔

ہاشمی خاندان کی روانگی کے بعد وہ اگلے روز خصوصی ٹرین پکڑنے کے لیے نظام الدین اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ مشکلات ہنوز ہم رکاب تھیں۔ انہیں اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے کوئی سواری نہ مل سکی۔ والدین کی ناتوانی اور ننھے بھتیجے بھتیجیوں کی بے بسی قمر کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کررہی تھی لیکن اور کیا بھی کیا جاسکتا تھا؟ وہ سب کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے ریلوے اسٹیشن پہنچے تو وہاں ایک اور افتاد ان کی منتظر تھی۔

ریلوے اسٹیشن پر راجستھان سے آئے 'میو' اور 'بندھانی' کئی روز سے وہیں پڑے کسی ٹرین کے منتظر تھے۔ گاڑی آتے ہی وہاں قیامت خیز بھگدڑ مچ گئی۔ قمر کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے سامنے انسانی سیلاب امڈ آیا ہو۔ ایسا سیلاب جس کا کہیں کوئی کنارہ ہی نہیں تھا۔ وہ سب پلیٹ فارم سے باہر کھڑے بے بسی سے یہ ہولناک منظر دیکھ رہے تھے۔

''اس گاڑی پر سوار ہونا بہت مشکل ہے۔ ہم تو یہاں کچل کررہ جائیں گے۔'' اظہر نے نقاہت سے کہا۔

''تو پھر اب کیا کریں ہم؟'' والدہ نے بھی دہائی دی۔

''واپس چلتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟'' اظہر نے اپنی رائے دی۔ ''ایک دوروز میں دوبارہ کسی گاڑی میں سفر کرلیں گے۔''

اہلِ خانہ کے پاس یہ تجویز تسلیم کیے بغیر اور چارہ بھی کیا تھا؟ وہ اسی طرح گرتے پڑتے واپس قلعہ آئے تو اعصاب شکنی کے لیے ایک اور جھٹکا ان کا منتظر تھا۔

''کہاں سے آرہے ہو بھئی تم لوگ؟ میرا خیال ہے اسی کیمپ میں ہی دیکھا تھا میں نے تم لوگوں کو پہلے۔'' دروازے سے داخلہ دینے والے افسر نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں! گاڑی میں سوار ہونے گئے تھے لیکن جگہ ہی نہیں مل سکی۔'' اصغر نے بے دھیانی میں بتادیا۔

''یعنی تم لوگ ایک بار کیمپ سے رخصت ہوچکے ہو۔ اب اصولی طور پر تمہیں یہاں دوبارہ داخلہ نہیں مل سکتا۔'' افسر نے آگاہ کیا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے بھئی! یہ کیسا اصول ہے؟'' اصغر تلملا گیا۔

''یہ انتظامیہ کا کیا دھرا ہے۔ میرا تو اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔'' وہ بھی بے بس تھا۔

''یا خدایا! اب ہم کیا کریں گے۔ بزرگوں اور بچوں کے ساتھ کہاں خوار ہوتے پھریں گے؟'' قمر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''میں اگر آپ کی مدد کرسکتا تو ضرور کرتا میری بہن!'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''ابھی میں صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ ہمایوں کے مقبرے چلے جائیں۔ وہاں بھی ایک کیمپ موجود ہے۔ اُمید ہے آپ لوگوں کو وہاں جگہ مل جائے گی۔''

اصغر اور اظہر اس کا شکریہ ادا کرتے مقبرہ ہمایوں پہنچ گئے۔ ستمبر کا حبس بھرا مہینا اور بھوک کی نقاہت نے بھی کے وجود میں توانائی کی کمی کررکھی تھی۔ مقبرہ پہنچنے کے بعد انہوں نے ایک خالی قطعہ زمین پر اپنا مختصر سامان رکھا اور خود بھی وہیں ڈھے گئے۔

''یہاں سے خیمہ پتا کروالو! اگر دیر ہوگئی تو پھنا پرانا مال ہی حصے میں آئے گا۔'' قریب سے کسی کی آواز سماعت میں پڑی۔

قمر نے ایک نظر اظہر کی جانب دیکھا۔ وہ تھکاوٹ اور نقاہت کے باعث حرکت کرنے سے ہی قاصر تھے۔ اصغر بے حسی سے آنکھوں پر بازو رکھے وہیں براجمان تھا۔ جمال ابھی یوں بھی بہت کم عمر تھا۔ قمر کے دل میں دیگر تین بھائیوں کی یاد نے شدت سے چٹکی لی۔ وہ تینوں ان کی افتاد سے بے خبر اپنے پیشہ وارانہ فرائض نبھانے کے لیے دوسرے شہروں میں مقیم تھے۔ اب لے دے کے بلقیس ہی بچی تھی۔ قمر کا دل ہی نہ مانا کہ چھوٹی بہن کو اس پریشانی سے نمٹنے کے لیے آگے بھیج دے۔ وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے خود ہی اٹھی تاکہ خیمہ کے ساتھ کھانے پینے کا بھی کچھ بندوبست ہوجائے۔

خیمہ کا بندوبست ہوا تو اصغر خاموشی سے اٹھا اور جمال کے ساتھ اسے زمین میں گاڑنے لگا۔ قمر نے بلا ارادہ نظریں گھما کر اطراف کا جائزہ لیا تو اظہر کو غیر موجود پاکر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''ابا جان کہاں ہیں؟'' وہ متوحش ہوئی۔

''ابھی تو یہیں تھے۔ کہاں چلے گئے؟'' والدہ کی بھی

وہی کیفیت تھی۔

قمر بے تابی سے اٹھی اور والد کو پکارتی ہوئی مقبرے کے مرکزی دروازے تک چلی آئی۔ اظہر کو ایک نوجوان کے ساتھ گفتگو میں مشغول دیکھ کر اس کے وجود میں بجلی بھر گئی۔ اظہر کے ہاتھ میں اپنی زندگی بھر کی کمائی شاعرانہ کلام اور مضامین کے مسودے تھے۔ وہ پل بھر میں ہی ساری صورت حال سمجھ گئی تھی۔

''یہ بزرگوار مجھ سے ضد کررہے ہیں کہ انہیں یہاں سے شہر لے جاؤں لیکن ان کی حالت دیکھ کر میں ہامی نہیں بھر رہا تھا۔'' نوجوان نے اسے بتایا۔

''آپ کا بہت شکریہ بھائی! اللہ پاک آپ کو اس کا بہت اجر دے گا۔'' قمر حقیقتاً ممنون تھی۔

''چھوڑ دو مجھے! جانے دو۔'' اظہر نے مچل کر کہا۔

''ہم یہاں جانے کے لیے ہی تو آئے ہیں ابا جان!'' وہ نرمی سے کہنے لگی۔ ''بس حالات میں کچھ بہتری آجائے تو پھر ہم لاہور چلے جائیں گے۔''

''مجھے نہیں جانا لاہور!'' وہ مزید مچلے۔ ''میں لاہور جانا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے ہندوستان سے دور مت لے کر جاؤ۔ میری مٹی مجھے لاہور لے کر جارہی ہے۔ میں نہیں جانا چاہتا۔''

قمر آزردگی سے ان کی بے ربط گفتگو سنتی رہی۔ پھر نرمی سے کہنے لگی۔ ''لاہور جاتے ہی سب ٹھیک ہوجائے گا۔ حالات بدل جائیں گے۔''

''میرے اللہ! مجھے بس دو تین سال کی زندگی اور دے دینا۔ زیادہ نہیں بس دو تین سال ہی۔ میں اپنا دیوان مکمل کرلوں۔ بس اس کے بعد چاہے مجھے اپنے پاس بلوا لینا۔'' اظہر نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر التجا کی۔

قمر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر انہیں اس مقام تک لے آئی جہاں خیمہ نصب ہوچکا تھا۔ گیلی گھاس پر انتظامیہ کی جانب سے ہی فراہم کردہ دریاں بھی بچھادی گئی تھیں۔

اگلے چند روز انہوں نے ہر پل اپنی عزت نفس کا شیرازہ بکھرتے اور سمیٹتے ہوئے گذارا۔ انہیں ایک لمبی قطار میں لگنے کے بعد کھانا نصیب ہوتا اور کھانا بھی ایسا جو ماضی قریب میں اپنے کسی جانور کو بھی کھلانا پسند نہ کرتے۔ کھانے کے لیے تھوڑا سا چاول، دھلی دال کا راشن ملتا تھا اور دونوں ہی چیزیں باسی ہوا کرتیں۔ کھانا پکانے کے لیے لکڑیوں کا انتظام بھی قدرت کی مہربانی سے کچھ یوں ہوا کہ کوئی بیوپاری اپنا 'نمبر' کا ذخیرہ چھوڑ کر پاکستان چلا گیا تھا۔ کیمپ کے اکثر لوگ یہی لکڑی استعمال کررہے تھے۔ قمر نے بھی وہاں سے چند تختے اٹھوا کر اپنے خیمے کی گیلی زمین پر بچھوا دیے۔

اس کیمپ میں ان کا قیام نومبر تک جاری رہا۔ شدید بارشوں نے مشکلات میں ہر لمحہ اضافہ ہی رکھا۔ تمام رات آنکھوں میں کٹتی۔ گیلے کپڑوں میں ٹھٹھرتے ہوئے نیند آتی بھی تو کیسے؟ اس سردی اور بے آرامی کے باعث اظہر کو شدید بخار بھی رہنے لگا۔ وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود کیمپ کی زندگی سے مانوس نہیں ہو پارہے تھے۔ ان کا بڑھاپا اور نقاہت ان مسائل سے نبرد آزما ہونے میں ناکام ہوچکی تھی۔ رفع حاجت کے لیے خندقیں بھی بہت دور بنائی گئی تھیں۔ ان کے لیے وہاں تک جانا بھی چیونٹی کے لیے پہاڑ سر کرنے کے مترادف بن چکا تھا۔ ان دگرگوں حالات کو کسی نہ کسی طور برداشت کرتے بالآخر وہ پیچش کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔

ان حالات و مشکلات نے اصغر کی بدمزاجی اور بیزاری سوا تر کردی۔ وہ کسی نہ کسی طرح پاکستان ہائی کمیشن کے دفتر جا کر اپنی تنخواہ تو لے آیا کرتا تاہم اس موجودہ کسمپرسی نے اسے شدید تلخ بنادیا تھا۔ اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ہائی کمیشن پر دباؤ ڈالا کہ ہندوستان میں مختلف مقامات پر بھٹکتے سرکاری افسران کے لیے خصوصی ٹرین چلوائی جائے۔ یہ وہ افسران تھے جن کا نام ہندوستانی دفتری انتظامیہ سے خارج ہوچکا تھا اور اب وہ پاکستان پہنچنے کی آس میں یہاں وہاں بھٹکتے رہتے تھے۔

اصغر کی یہ کوششیں بالآخر رنگ لے آئیں۔ نومبر کے پہلے ہفتے میں ہائی کمیشن سے اطلاع ملی کہ سرکاری افسران کے لیے خصوصی گاڑی کا بندوبست کردیا گیا ہے۔ یہ خبر صیغہ راز میں رکھنے کے باوجود عوام تک پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس گاڑی پر سوار ہونے کے لیے عوام جم غفیر کی صورت میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ قمر اور اس کے اہلِ خانہ کو گرتے پڑتے کسی نہ کسی طور ایک ڈبے میں بیٹھنے کی جگہ مل ہی گئی۔ قمر کو اُمید تھی کہ دہلی تا لاہور یہ سفر جلد ہی ختم ہوجائے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ سفر اگلے اڑتالیس گھنٹے کے بعد بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کھانا، پانی اور روشنی کی عدم موجودگی نے آزار مزید بڑھا دیے۔ راستے بھر مسافر ایک دوسرے سے اپنا دکھ درد بیان کرتے رہے۔

ہر داستان ابھی رنگ تھی۔

اس گھمبیر سفر میں قمر کو اپنی گاڑی کے ساتھ ایک جیپ بھی متواتر چلتی دکھائی دیتی رہی۔ اس کے خدشات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی گاؤں کے قریب سے گذرتے ہوئے 'ہر ہر مہادیو' اور 'جو بولے سو نہال' کے نعرے روح تک میں دہشت بھر دیتے۔ دیگر سوار بھی ایسے ہی خوف و دہشت میں مبتلا تھے۔ پہلی ہی شب ان کے خدشات مجسم روپ اختیار کر گئے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس برہنہ تلواریں لیے تقریباً دو درجن افراد نے گاڑی کو گھیر لیا تھا اس موقع پر قمر نے اسی جیپ کو دوبارہ حرکت میں آتے دیکھا اور کچھ ہی دیر میں ان تلوار برداروں کا نجم تتر بتر ہو گیا۔

یہ مصیبت ٹلتے ہی قمر نے ہزار بار شکرانہ ادا کیا لیکن ایک امتحان تو ابھی باقی تھا۔ اگلی شام چند فوجی تلاشی لینے کے بہانے گاڑی میں آ گھسے۔ قمر نے تو اس موقع پر خاصے اعتماد کا مظاہرہ کیا تاہم بلقیس اضطراب و وحشت سے مغلوب ہو گئی۔ اس نے بلا سوچے سمجھے اپنی نوکری سے پھل تراش چاقو نکال کر لباس میں چھپا لیا۔ فوجیوں کی عقابی نگاہوں سے اس کی یہ حرکت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ اس سے بدگوئی کرتے ہوئے یکدم ہی اپنی نیت خراب کر بیٹھے۔ ایک فوجی اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے جانے لگا تو قمر کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے سلگتی نظروں سے ڈبے کی سواریوں کی جانب دیکھا۔ ہر کوئی سراسیمگی سے یہ منظر بے حس و حرکت دیکھتا رہا تھا۔ وہ ان اغیار سے کیا گلہ کرتی۔ اس کا سگا بھائی ہی بیوی کی جانب سے عقب سے کھینچ لیے جانے پر اپنی نشست پر براجمان تھا۔ جمال قدرے دور تھا اور ڈبے میں چھائے ملگجے اندھیرے کے باعث یہ منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔

قمر پر ایک جنون طاری ہو گیا۔ اس نے لحیم شحیم فوجی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور پوری طاقت سے جھنجھوڑ دیا۔ اس کی زبان بے تحاشا مغلظات اگل رہی تھی۔ اس کی والدہ نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے حس و حرکت کھڑی بلقیس کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس دوران کوئی اور شخص ان کی مدد کے لیے نہ اٹھا تھا۔ قمر نے اس فوجی کو اپنے دانتوں سے بے طرح کاٹ ڈالا۔

''لعنت ہو تم سب پر! نامردو ہیں کیا یہاں سب کے سب؟'' وہ چلاتی ہوئی اپنے ہم سفروں سے کہنے لگی۔

اس کی دھاڑ اور مغلظات بالآخر رنگ لے آئیں۔ چند مسافروں میں جنبش ہوتے ہی ان فوجیوں نے وہاں سے فرار میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ شب بے حد بوجھل تھی۔ قمر بچپن سے اب تک ذہن نشین ہر دعا کا ورد کرتے ہوئے سفر بخیریت ختم ہونے کی دعائیں مانگتی رہی۔

☆☆☆

خدشات و واہموں سے لبریز یہ سست رفتار سفر اگلے روز بھی جاری رہا۔ انہیں راستے بھر جنگلوں اور مختلف مقامات پر منتشر، بے آس اور بے سہارا سامان دکھائی دیتا رہا جن کے مالکان کے ساتھ جانے کیا بیتی تھی۔ دہلی سرحد کے اختتام پر انہیں جا بجا مردہ وجود دکھائی دیے۔ ان کی بے نور نظریں اور چہروں پر آس و کرب کے تاثرات قمر کا دل بوجھل کرتے رہے۔ ہجرت کا خواب لیے ایک نئی منزل کی جانب گامزن ان مسافروں کو کیا علم تھا کہ وہ اپنی موت کی مسافت طے کر رہے ہیں۔

گھسٹتی رفتار سے چلتی گاڑی اب میاں میر اسٹیشن تک پہنچ گئی تھی۔ اس مقام پر گاڑی کے ساتھ پاکستانی انجن لگنے کی صورت میں ہی سفر مزید آگے جاری رہ سکتا تھا۔ بھوک و پیاس اور خدشات سے نڈھال لوگوں کے چہرے اُمید کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔ اسی دوران ہر ڈبے میں کئی رضاکار روٹی، پتے کی دال اور گوشت فراہم کرنے چلے آئے۔ اناج پیٹ میں جاتے ہی انہیں اپنی توانائیاں بحال ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ اسی اثناء میں گاڑی کے ساتھ انجن کی تنصیب ہو چکی تھی۔ نئے انجن کے ساتھ مسلمان فوجیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ وہ سب بھی سر سے کفن باندھ چکے تھے کیونکہ جگہ جگہ ٹرینوں کو روک کر مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ یہ ٹرین سرکاری افسران کے لیے جو پاکستان پہنچ کر ملک کی مشینری چلانے کے حصے دار بننے، اس وجہ سے یہ ٹرین زیادہ خطرے میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس ٹرین کا خاص انتظام تھا۔ یہ ٹرین بغیر کسی اسٹیشن پر رکے چلتی چلی گئی اور وہ لاہور پہنچ گئے جہاں گاڑی سے اترتے ہی انجینئرنگ لگانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

اسی مقام پر قمر کو کسی ڈاکٹر کی زبانی علم ہوا کہ ان کی ٹرین کے ساتھ ایک رضاکار جیپ عازم سفر تھی۔ تلوار برداروں کے مبینہ حملہ کے بعد انہی کی اطلاع پر نزدیکی اسٹیشن انچارج کو دھمکایا گیا تھا کہ لاہور اسٹیشن پر ہندو سکھ ان کے پناہ گزینوں سے بھری دو گاڑیاں روانگی کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ پاکستان آنے والے مسافروں کو رتی بھر

نقصان کی صورت میں ان لوگوں کا انجام بہت برا ہوگا اور اس کے ذمہ دار خود یہاں والے ہوں گے۔ سیاست اور طاقت کے اس کھیل کے مکروہ پہلوؤں نے قمر کے وجود میں شدید تلخی بھر دی۔

لاہور آمد کے بعد انہیں سب سے پہلے رہائش گاہ کا مسئلہ درپیش تھا۔ قمر کی والدہ انہیں چوبرجی میں واقع اپنی بہن کے گھر لے آئیں۔ قمر کو صرف یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ نو افراد کی آمد اس کنبہ کے لیے معاشی بوجھ ثابت ہوگی۔ خالہ نے ان سب کا گرمجوشی اور آنسوؤں سے استقبال کیا۔ وہ ان کی جانب سے کئی ماہ بعد بھی کوئی جوابی خط نہ پا کر اپنے تئیں انہیں مردہ ہی سمجھ بیٹھی تھی۔ انہوں نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر سہولیات فراہم کیں۔

اظہر کی پیش تاحال برقرار تھی۔ جمال نے انہیں میو اسپتال داخل کروا دیا جہاں چند روزہ علاج کے بعد وہ صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئے۔ اس دوران مکان کی تلاش بھی جاری رہی۔ کچھ روز بعد ایک ایسے مکان کے متعلق اطلاع ملی جس کا مالک ہندوستان روانہ ہو چکا تھا۔ وہ بلا تاخیر وہاں منتقل ہو گئے۔ گھریلو استعمال کے برتن اور کپڑوں کا بندوبست کرنے کے لیے 'شعبہ مہاجرین' سے رابطہ کیا گیا لیکن ضروریات کی تکمیل میں ابھی کچھ تاخیر کا سامنا تھا۔ ان کی بے بسی دیکھتے ہوئے کئی قریبی عزیزوں نے خاموشی سے ضروری بستر اور کپڑوں کے علاوہ دیگر سامان بھی فراہم کر دیا۔ ان کے خلوص میں کسی قسم کا شائبہ نہ ہونے کے باوجود قمر کی عزت نفس ہر لحہ مجروح ہو رہی تھی۔ اظہر کی اُمید بھری نظریں اصغر پر ہی مرکوز رہتیں۔ اس نے افسران بالا سے رابطہ تو کر لیا تھا تاہم ملازمت کا آغاز کرنے کے لیے اسے کراچی روانہ ہونا پڑتا۔ اہل خانہ کو اس کسمپرسی میں چھوڑ کر جانے کا خیال بھی مضطرب کیے ہوئے تھا۔

یہ تذبذب اور کشمکش کچھ روز یونہی جاری رہی پھر قدرت نے ازخود ان کی یہ مشکل آسان کر دی۔ ایک روز بڑے بھائی طاہر کی اچانک آمد نے انہیں حیرت و استعجاب سے گنگ کر دیا۔ ابتدائی جذباتی دھچکے سے سنبھلنے کے بعد گفتگو کا آغاز ہونے سے علم ہوا کہ طاہر کئی ہفتوں سے ان کی تلاش میں تھا۔ طاہر کلکتہ میں کاروبار سے منسلک تھا۔ دہلی سے ان کی جانب سے جوابی خطوط نہ ملنے پر وہ سخت تشویش زدہ ہوا تھا۔ اپنے تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے اس نے کشمیری گیٹ سے لے کر قلعہ میں قیام تک کی کھوج تو لگوا لی تاہم اس کے بعد حالات سے باخبر نہ ہو سکا۔ وہ اس بات سے بھی شدید برافروختہ تھا کہ اگر اظہر یا اصغر اسے اطلاع دے دیتے تو وہ ہوائی جہاز پر ان کی آمد کا بہ آسانی بندوبست کر دیتا۔

اگلے چند روز میں حالات تیزی سے تبدیل ہوئے۔ اصغر کراچی روانہ ہو گیا۔ طاہر نے بھاگ دوڑ کے بعد انہیں بھائی گیٹ کے پیچھے سول لائنز میں ایک مکان میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد اسے اپنے بیوی بچوں کی کلکتہ سے یہاں برآمدگی پر تشویش ہونے لگی۔ دوسری پریشانی یہ بھی تھی کہ وہ کلکتہ میں شستہ عمارات کا کام موقوف کر کے یہاں آیا تھا اور اب اپنے مطلب کا کوئی کام نہ پا کر مایوسی کا شکار بھی ہو رہا تھا۔ اس پریشانی کا خاتمہ بہرحال جلد ہی ہو گیا۔ کچھ ہی عرصہ میں اسے کویت کی جہازراں کمپنی میں ملازمت مل گئی اور وہ انہیں مستقبل کے ڈھیروں سنہرے خواب دکھاتا کویت روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

زندگی کا دھارا قدرے پُرسکون ہوا تو حیران کن طور پر ہاشمی خاندان سے دوبارہ ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی لاہور آمد کے بعد تاحال جدوجہد میں ہی مصروف تھے۔ حمید 'امروز' اور انیس 'پاکستان ٹائمز' میں قلیل تنخواہوں پر ملازمت کر رہے تھے۔ حنیف البتہ تاحال دہلی میں ہی تھا۔ وہ اپنے فرنیچر سازی کے آبائی کاروبار سے حاصل ہونے والی رقم کا کچھ حصہ اہل خانہ کو بھجوا دیا کرتا۔

ہاشمی خاندان سے یہ ملاقات قمر کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس نے حمید کے توسط 'امروز' میں ایک مضمون اشاعت کے لیے بھیجا۔ وہ مضمون نہ صرف اتوار کے میگزین سیکشن میں شائع ہو گیا بلکہ ایڈیٹر چراغ حسن حسرت نے ہر ہفتہ ایک مضمون شائع کرنے کی پیشکش بھی کر دی۔ قمر کو اپنی خودداری قدرے مندمل ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے صرف مضمون نگاری پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک پڑوسن کی مدد سے انارکلی کی کسی دکان سے دیا گیا سلائی کا کام بھی کرنے لگی۔ قدرت ازخود اس کے لیے راہیں ہموار کر رہی تھی۔ کچھ عرصہ مزید گذرا تو اسی دکاندار نے اسے اپنی بیٹی کو ٹیوشن پڑھانے کی پیشکش کر دی جسے قمر نے قدرے تذبذب سے قبول کر لیا۔ والدہ کو اس کا کسی کے گھر جا کر ملازمت کرنے پر کئی تحفظات تو تھے تاہم موجودہ حالات میں اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

قمر نے لڑکی کو خوب لگن و محنت سے پڑھایا جس کا نتیجہ

یہ برآمد ہوا کہ اسے بڑے لڑکے کی ٹیوشن بھی دے دی گئی۔ اب اس کی کل آمدنی سو روپے کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ مضروب انا اور شکستہ عزت نفس قدرے سکون محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ حمید ہاشمی کے ہمراہ مختلف سیاسی میٹنگز میں بھی جانے لگی۔ چند ایک بار خواتین کے کیمپ میں شریک ہوئی جہاں اس کی ملاقات احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے ہوئی۔ اس کے بعد میکلوڈ روڈ ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں باقاعدہ آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان جلسوں میں برصغیر پاک و ہند کے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور نوجوان شاعروں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ اشعار، کہانیاں، رپورتاژ، تبصرے اور مباحثے سننے کو ملتے۔ حلقہ احباب میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

ان ہلکی پھلکی تبدیلیوں سے قطع نظر قمر کے اہلِ خانہ کی زندگیوں میں معاشی جمود جوں کا توں برقرار تھا۔ وہ بقیس کے ہمراہ قطب روڈ سے میکلوڈ روڈ تک کئی میل پیدل سفر کرتی۔ اس کے علاوہ قمر کا سلائی لینے اور واپس کرنے کے لیے انارکلی اور پھر ٹیوشن کے لیے مال روڈ پیدل سفر بھی جاری رہا۔ جمال ایئرفورس میں داخلے کے لیے بھاگ دوڑ میں مگن تھا۔ ابتدائی امتحانات میں کامیابی کے بعد سائیکولوجیکل ٹیسٹ میں ناکامی پر شدید مایوسی کے بعد وہ بحریہ میں داخلہ کی تیاری کرنے لگا۔ اظہر کی مایوسی و خستگی البتہ جوں کی توں برقرار تھی۔ دسمبر 1947 میں ان کی طبیعت ایک بار پھر خراب ہو گئی۔ جمال نے انہیں اسپتال داخل کروا دیا اور اگلے تین ہفتے ان کی بھرپور خدمت و تیمارداری کی۔ انہیں اُمید تھی کہ اظہر اس بار بھی اپنی علالت کو پچھاڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ بیس جنوری کی ایک سرد ترین شام کو وہ خاموشی سے کسی سے کہے سنے بغیر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔

ان کٹھن ترین حالات میں والد کے شفیق وجود سے محرومی ان کے لیے ایک نیا امتحان ثابت ہوئی تھی۔ جمال کی اداسی سنبھالے نہ سنبھلتی۔ وہ کچھ ہی عرصہ بعد ڈھاکا چلا گیا۔ والدہ اب شب و روز دونوں بیٹیوں کی باعزت رخصتی کے لیے دعاگو رہتیں۔ ان کی یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ حمید نے قمر کے لیے حنیف ہاشمی کا رشتہ پیش کر دیا۔ اس رشتے سے انکار کا کسی کے پاس بھی کوئی جواز نہ تھا۔

حنیف ہاشمی سے رشتہ پکا ہونے میں ایک قباحت تھی۔ جس ملک پر وہ تھوک آئی تھی وہیں اسے جانا پڑتا۔ اس نے کئی راتیں اسی فکر میں گزار دیں مگر کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ پھر اسے ایک بھولا بسرا خواب یاد آیا۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے کا خواب۔ اس شادی کی صورت میں وہ اپنی یہ دیرینہ تمنا بآسانی پوری کر سکتی تھی۔ اس نے بلا تامل شادی کے لیے حامی بھر لی اور فروری 1948 میں دوبارہ دہلی چلی آئی جہاں ایک نئی زندگی اور جدوجہد اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

باغی خاندان کی اس نورِ چشم قمر کی شادی بھی رسم و رواج سے بغاوت کی طرح ہی ہوئی۔ قمر اپنے بڑے بھائی طاہر کے ساتھ دہلی آئی تھی۔ حنیف ایک روز کے لیے بھی دہلی اور اپنا کاروبار چھوڑ کر پاکستان نہیں آسکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس بات کا قوی امکان تھا کہ کارخانے اور شوروم پر غاصبانہ قبضہ کر لیا جائے گا۔

نکاح کے بعد اماں جی، قمر اور حنیف کے ہمراہ تقریباً دو ماہ تک رہیں۔ اس دوران انہوں نے قمر کو گرہستی چلانے کے اپنے گھریلو امور سے مکمل آشنا کر دیا تھا۔ ان کی واپسی کے بعد قمر نے حنیف کو چند ایک بار پاکستان منتقلی کے لیے زور دیا لیکن پھر اسے خود ہی اندازہ ہو گیا کہ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن ہی نہیں تھا۔ ہاشمی خاندان کے دہلی سے ہجرت کر جانے کے بعد حنیف نے کاروباری امور تن تنہا سنبھال رکھے تھے۔ فرنیچر سازی کا کام بھی کچھ ایسی نوعیت کا ہوتا ہے کہ اسے تنہا چلانا بھی کوئی آسان امر نہیں۔ اسے ہمیشہ مختلف دائروں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ حنیف کے لیے ان مختلف محاذوں کو سنبھالنا بہت کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ ستم ظریفی بہرحال یہ تھی کہ اس کی محنت اور لگن کے باوجود ان کا کاروبار بتدریج زوال کا شکار ہو رہا تھا۔

وہ بھی کڑھن کا شکار تھی اس کی کڑھن میں ایک اور اہم مسئلہ شامل تھا جو اسے چین لینے نہیں دیتا۔ ہندوستان میں رہ گئے مسلمانوں کو اپنی بقا کے لیے کانگریس یا کمیونسٹ پارٹی کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ حنیف نے بھی سی پی آئی کا سہارا لے لیا تھا۔

قمر کی شادی کے ابتدائی سال اسی دھوپ چھاؤں کی نذر ہو گئے۔ وہ حنیف کی شب و روز محنت کو اکارت ہوتے دیکھتی اور کڑھتی رہی۔ اس دوران صبیحہ، شہلا اور سہیل کی پیدائش نے اخراجات میں بھی اضافہ کر دیا تاہم آمدن میں بہتری کے کہیں کوئی آثار نہ تھے۔ فاقہ مستی کے یہ حالات طویل ہونے لگے تو قمر نے دہلی کالج میں 'انٹرنیشنل مانٹیسوری

تربیتی کورس' میں داخلہ لے لیا تاکہ ایک تکنیکی سند ملتے ہی کہیں ملازمت کا آغاز کر کے گھریلو ضروریات پوری کر سکے۔

حنیف اس کے داخلے پر جزبز دکھائی دیتا تھا۔

"تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ اتنی مشقت اٹھا سکو۔ ایسا نہ ہو کوئی نقصان اٹھانا پڑ جائے۔" اس نے قمر کو تنبیہ کی۔ ان دنوں اسے اپنے وجود میں ایک اور ننھی زندگی کی نمو پانے کی نوید ملی تھی۔

"اللہ بھلی کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ میں مکمل خلوص نیت سے اپنے شوہر اور گھر کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔" قمر نے متانت سے جواب دیا۔

حنیف پیشانی پر بل لیے خاموش ہو گیا۔ اسے بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ کاروبار بدترین تنزلی کی طرف مائل ہے۔ کام کا شدید فقدان تھا اور آمدنی نہ ہونے کے برابر۔ کاروباری مسابقت کا یہ عالم تھا کہ اسے سڑک پر بیٹھ کر فرنیچر بنانے والے مہاجروں کا بھی سامنا تھا۔ وہ چند آنے کے نفع پر بھی کرسیاں میزیں بیچ لیا کرتے تھے۔ یہ روش اپنانا اس جیسے خاندانی کاروبار کرنے والوں کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس پہ مستزاد مسلم دشمنی کے اثرات بھی بھگتنے پڑتے۔ گاہک کے بازار میں آتے ہی اسے مسلمانوں کی اکلوتی دکان کے بارے میں بتا دیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہی نکلتا کہ گاہک اس جانب پھٹکنے کا نام ہی نہ لیتا۔

انہی حالات و واقعات کے پیشِ نظر قمر نے مونٹیسوری ٹریننگ لی اور صفدر کی پیدائش سے چند روز قبل امتحانات سے بھی فراغت حاصل کر لی۔ اس دوران مجموعی کاروباری صورتِ حال میں یہ فرق آیا کہ حنیف کو ایک ماہر تعمیر دوست اور جرمن ڈیکوریٹر کے توسط سفارت خانوں کا کام ملنا شروع ہو گیا۔ ان دنوں آزاد ہندوستان سے تعلقات کے فروغ کے لیے نت نئے دفاتر کھولے جا رہے تھے۔ انہی دفاتر کے لیے فرنیچر و آرائش کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ کاروباری فائدہ کے تحت حنیف نے اپنی رہائش گاہ بھی تبدیل کر لی۔ کچھ عرصہ تو بہت پُرسکون انداز میں گزرا لیکن پھر ایک کلب کی جانب سے رقم وصول نہ ہونے پر حالات بدترین مندی کا شکار ہو گئے۔ بچوں کے لیے بھی اس یکدم تغیر سے سمجھوتا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ کارخانہ کی رونق یکایک اداسی میں کیوں بدل گئی ہے؟ ابو اب ان سے پہلے کی طرح ہنستے بولتے کیوں نہیں ہیں؟ کھانے کے وقت اب صرف دال روٹی کیوں ملنے لگی ہے؟

قمر کے پاس ان کے سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ تو خود ان تبدیل شدہ حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے زندگی میں ایسے تغیرات صرف تقسیم ہند کے موقع پر دیکھے تھے۔ امن کے حالات میں ایک رچے بسے درمیانی طبقہ کے گھر کا دانے دانے کو ترس جانا اس کے لیے انوکھا تجربہ تھا۔

آہ رے آزادی ہند! تو نے اور کون کون سے رنگ دکھانے تھے؟

☆☆☆

حالات کی تنزلی بے قابو ہوئی تو قدرت نے ان کے لیے غیب سے مدد روانہ کر دی۔ ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین دہلی آئے ہوئے تھے۔ وہ ادریس ہاشمی کے دیرینہ دوست تھے۔ حنیف کی زبوں حالی کا علم ہوا تو اسے علی گڑھ آمد اور یونیورسٹی میں ملازمت کی پیشکش کر دی جسے حنیف نے قدرے تامل سے قبول بھی کر لیا۔ کارخانے کا پرانا اور ناقابل استعمال لوہا کباڑیے کو فروخت کر کے کرایہ کا بندوبست کیا گیا۔ کچھ رقم کارخانے پر صرف کر دی تاکہ قمر اور بچوں کو اخراجات پورے کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اگلے ڈیڑھ سال کے دوران یونیورسٹی میں حنیف کی محنت سے اس کے قدم علی گڑھ میں جمنے لگے۔ اس نے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں وہ ایک کرائے کے برساتی نما کمرے میں رہائش پذیر تھا۔ اس کے اہل و عیال کی آمد اور بچوں کے شور شرابہ پر مکان مالکہ جزبز رہنے لگی۔ وہ ان سے خاصے روکھے اور لیے دیے انداز میں ملتی۔ قمر نے بھی اس سے دوستانہ مراسم استوار کرنے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اسے اپنا پندار اور ذاتی وقار آج بھی بہت عزیز تھا۔ مکان مالکہ کے رویے میں تبدیلی اس وقت در آئی جب ایک مذہبی تقریب کے دوران کسی خاتون نے بالائی منزل پر قمر کی جھلک دیکھ لی۔ وہ خاتون اس کی خاندانی اور ذاتی ادبی حیثیت سے واقف تھی۔ اس نے مکان مالکہ کے سامنے قمر کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ اس کے بعد وہ قمر سے نزدیک ہونے کے جواز تلاش کرتی رہی لیکن قمر نے لیے دیے رہنے کی اپنی روش ترک نہ کی۔ اس نے علی گڑھ سوسائٹی سے موصول ہونے والے دعوت نامے بھی قبول نہ کیے۔ اس کے لیے ایسے

ماحول میں ظاہری طمطراق سے شریک ہونا ممکن نہیں تھا۔ دوسری صورت میں بچوں اور اپنی ذات کے لیے کم مائیگی کا احساس بھی گوارا نہیں تھا۔

قمر کے اس نپے تلے رویے نے آبائی کے نام سے مشہور اس مکان مالکہ کو مزید چیں بہ جبیں کر دیا۔ اس نے بچوں کے رویے پر بے جا شکایات کا آغاز کر دیا۔ قمر اور حنیف نے اس رہائش گاہ کو الوداع کہا اور تصویر محل کے نزدیک نواب پہاسو کی جاید اد' پہاسو ہاؤس' میں ایک آرام دہ' کشادہ گھر میں منتقل ہو گئے۔ کارخانے کے لیے جگہ بھی مل گئی کیونکہ انجینئرنگ کالج ورک شاپ میں ذاتی کارخانہ چلانا ممکن نہیں تھا۔

پہاسو ہاؤس میں اگلے کئی برس قدرے پُرسکون انداز میں بیت گئے۔ اس دوران بچوں کی تربیت بھی فطری انداز میں ہوتی رہی۔ مٹی کی سوندھی خوشبو سے پیار' دوستوں میں برابری کا رشتہ قائم رکھنے' ہر کھانے پینے کی چیز بانٹ کر کھانے' ہر ایک کے دکھ سکھ میں فوری طور پر شریک ہونے جیسی اقدار انہوں نے اسی ماحول میں سیکھیں۔ اس کے علاوہ کارندوں کی بے ایمانی جیسی منفی اقدار سے شناسائی بھی حاصل کی۔

ان ہی دنوں حنیف کی ملاقات حامد الہ آبادی نامی ایک شخص سے ہوئی۔ اس کے پاس سوویت لٹریچر کی بھرمار تھی۔ وہ یونیورسٹی میں گھوم پھر کر کتابیں فروخت کرتا تھا۔ دن بھر کتابیں بیچتا اور رات کو سونے کے لیے کوئی نہ کوئی ٹھکانا تلاش کر لیتا۔ اکثر کسی دکان کی پٹری یا پیڑ کے نیچے بچی ہوئی کتابوں کا بنڈل رکھ کر سو جایا کرتا۔ حنیف اسے اپنے گھر لے آیا اور کوٹھری میں رہائش دے دی۔ وہ صفدر سے بے حد مانوس ہو گیا۔ صفدر کو بھی اس کی کتب پڑھنے میں مزہ آنے لگا۔ قمر نے بھی اس کے عالمی ادب کے ذخائر سے خوب استفادہ کیا۔ یہ سلسلہ البتہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا اور انہیں چند وجوہات کی بناء پر پہاسو ہاؤس سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ نئے گھر میں جگہ کی کمی کے باعث حامد نے اپنا بندوبست از خود ہی کہیں اور کر لیا۔ بچے حامد اور اس کی کتب کو بہت یاد کرتے۔ قمر نے اپنی مطالعہ شدہ کتب سے مختصر کہانیاں بچوں کو سنانی شروع کر دیں۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے سوویت جانبازوں کی بیسیوں کہانیاں ان کے گوش گذار یں۔ داروسن کی آزمائش' Story of Zoya and Shura, Story of A Real Man, Footless Pilot جیسی کہانیاں سہل انداز میں بچوں کو سنا کر ان کا ذہنی افق دھیرے دھیرے وسیع کرتی رہی۔

کچھ عرصہ بعد قمر نے بچوں کو ان کے دودھیال اور ننھیال کے بارے میں حقائق سے بھی آگاہ کیا۔ وہ جنگ آزادی میں ان کے عمل دخل سے بھی انہیں آشنا کرتی رہی۔ اس آشنائی نے بچوں کی ذہنی تربیت پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے۔ ان کے کردار میں دلیری' بے باکی اور حق گوئی جھلکنے لگی۔ قصہ المختصر یہ کہ ان بچوں میں بھی بغاوت کے جراثیم پروان چڑھنے لگے تھے۔

☆☆☆

قمر اور حنیف کی زندگی کی گاڑی سست رفتاری سے گھسٹتے ہوئے چلتی رہی۔ بچے اب شعور کی وادی میں قدم رکھنے لگے تھے۔ ان کی سمجھ بوجھ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے قرب وجوار کے ماحول کی ناہمواریاں بھی بخوبی سمجھنے لگے تھے۔ اسی دوران قمر کے ہاں ایک اور بیٹی شبنم کی ولادت ہوئی۔ مصروفیات میں یکدم ہی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ دیگر بچوں کی سرگرمیاں بھی مخصوص انداز میں رواں رہیں۔

دوسری جانب پاکستان میں مقیم اہلِ خانہ کی بابت بھی خبریں ملتی رہتیں۔ ہاشمی خاندان نے وہاں اپنے قدم خوب جما لیے تھے۔ ادریس ہاشمی ان سے ملاقات کے لیے حضرت نظام الدین کے عرس میں شرکت کا عذر کیے چلے آئے۔ انہوں نے حنیف اور قمر کو اپنے ساتھ پاکستان منتقلی کے لیے قائل کرنے کی کافی کوشش کی لیکن وہ دونوں ہی ایک اور ہجرت کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انیس ہاشمی کا بھی ہندوستان آنا ہوا۔ اس نے بھی پاکستان روانگی کے لیے کافی زور لگایا تو قمر نے ادب ومتانت سے جواب دیا۔

''اب بہت دیر ہو چکی ہے آکا بھائی! وہاں پہنچنے اور آمدنی ہونے کا درمیانی عرصہ بہت دشوار ثابت ہوگا۔ پھر بچے بھلا کس طرح اس نئے ماحول اور نئی زبان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالیں گے؟''

''میرے کاروبار میں ساجھے داری کر لینا بھئی! اور بھی بہت سے رستے نکل سکتے ہیں۔'' انیس نے مخلصانہ تجویز دی۔

''نہیں آکا بھائی! ساجھے داری رشتوں کا خلوص اور چاشنی زہر آلود کر دیتی ہے۔ اس بات کو یہیں چھوڑ دیجیے۔''

اس نے مزید متانت سے کہا۔

انیس گہری سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ وہ بہرحال بھتیجے بھتیجیوں کی اپنی اولاد کے ساتھ محبت اور ذہنی ہم آہنگی دیکھ کر بہت خوش تھا۔ وہ سب خوشگوار یادیں لیے پاکستان لوٹ گئے۔

☆☆☆

حنیف ہاشمی کے معاشی حالات میں اب قدرے بہتری آ چکی تھی۔ مالی آسودگی میسر آتے ہی قمر کے دل میں بی اے کرنے کی ایک دیرینہ تمنا مچلنے لگی۔ اس کی تعلیم میں تقسیم ہند کے وقت تعطل آیا تھا۔ مانٹیسوری تربیت مکمل کرنے کے بعد وہ تا حال یہ خواب مکمل نہیں کر پائی تھی۔ حنیف نے بھی بلا تامل اسے اجازت دے دی۔ قمر نے خوشی خوشی تعلیم کا آغاز کیا تو ابتداء میں ہی کئی مسائل سے دوچار ہو گئی۔

سب سے پہلے تو اس کے پاس کتابیں ہی پوری ہو کے نہ دے رہی تھیں۔ کوئی مدد کرنے والا بھی میسر نہ تھا۔ ایڈوانسڈ ہندی کے انتخاب نے بھی خاصے آزار میں مبتلا رکھا۔ بہرکیف اس نے کسی نہ کسی طور سپلیمنٹری کے ساتھ امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں گریجویشن کا پڑاؤ عبور کر لیا۔

کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ نئی دہلی میونسپل کمیٹی میں نرسری ٹیچرز کے لیے جگہوں کا اعلان ہوا۔ قمر نے درخواست دے دی۔ کچھ روز بعد انٹرویو ہوا اور اسے ہیڈ مسٹریس کے عہدے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

''بچوں کا کیا انتظام ہوگا؟'' حنیف نے سنجیدگی سے پوچھا۔

قمر اس سوال پر خاموش ہو گئی۔

''وہ علی گڑھ میں ہی رہ لیں گے۔'' وہ بدقت بولی۔

''اچھا! ماں کے بغیر کیسے رہتے ہیں بچے؟ مجھے بھی سمجھاؤ ذرا!''

قمر کو حنیف کے بظاہر نرم انداز میں پوشیدہ سرد مہری اور رکھائی واضح محسوس ہوئی لیکن یہ وقت کسی بے باک فیصلے کا تھا۔ ان کی معاشی حالت تا حال اسی ازلی کشمکش میں مبتلا تھا۔ قمر کے لیے لگی بندھی تنخواہ اور ملازمت ناگزیر ہو چکی تھی۔

حنیف نے بہرحال اس کے فیصلے کا خیر مقدم کیا اور جولائی 1961 میں قمر کی دہلی روانگی کے بعد بچوں کی کئی ذمہ داریاں خود سنبھال لیں۔ وہ بچوں کو نہلا دھلا کر ناشتا کروانے کے بعد تیار کر کے رکشے سے اسکول بھیج دیتا، پھر ان کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام کر کے ذاتی تیاری کے بعد اپنے کام پر روانہ ہو جاتا۔ رات گئے تک بچوں کی سبھی ذمہ داریاں اور اپنے دفتری فرائض سنبھالتے اسے حلقہ احباب کی تضحیک نما ہمدردی اور طنز کے نشتر بے طرح خلش میں مبتلا کرتے۔ وہ اس کی ان اضافی ذمہ داریوں پر ہمدردانہ انداز میں کئی کچوکے لگاتے۔ بچوں کو بھی نت نئے چبھتے سوالات سے زچ اور آزردہ کیا جاتا۔ ان کے رویے میں دھیرے دھیرے اکھڑپن پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اس آزار کی شکایت ماں تو در کنار باپ سے بھی نہیں کر پاتے تھے۔

دوسری جانب شوہر اور بچوں کی اس داخلی جنگ سے بے خبر قمر اپنی ذمہ داریاں مکمل خلوص سے نبھاتی رہی۔ وہ مختصر عرصہ میں ہی اس علاقے کی سب سے ہر دلعزیز استانی بن گئی۔ والدین کے ساتھ اس کے تعلقات مثالی تھے۔ اس نے ان والدین کے ذریعے کئی اقسام کے تعلیمی' ثقافتی اور سماجی پروگرام کیے۔ جلد ہی اس کے ادارے کی شہرت علاقہ بھر میں پھیل گئی۔ اس مثبت شہرت کے ساتھ علاقہ کی کئی خواتین نے چہ میگوئیاں بھی شروع کر دیں۔ وہ خواتین یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ قمر آخر کس قسم کی عورت ہے جو میک اپ نہیں کرتی' بندی نہیں لگاتی اور تو اور چوڑیاں تک نہیں پہنتی۔ ان میں سے کچھ افراد کا یہ گمان تھا کہ قمر بیوہ ہونے کے باعث اس بنیادی بناؤ سنگھار سے کتراتی ہے۔

اس صورت حال نے قمر کو ذہنی طور پر بے حد کوفت زدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس روک ٹوک اور چہ میگوئیوں کے خاتمہ کے لیے اس نے بندی لگانے کا آغاز کر دیا۔ اس پر بھی خاموشی نہ ہوئی تو اس نے وہ علاقہ ہی تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس گھٹے ہوئے ماحول میں اپنی ذہنی وتخلیقی صلاحیتیں کھل کر استعمال ہی نہیں کر سکتی تھی۔

رہائش گاہ کی تبدیلی کے بعد قمر کا گمان تھا کہ اب وہ پُرسکون ہو کر اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریاں نبھا پائے گی لیکن یہ اس کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ کچھ ہی روز گذرے تھے کہ اسے ایک ٹائپ شدہ خط موصول ہوا جس میں قمر کو 'سی آئی ڈی' میں شامل ہونے کی پیشکش کی گئی تھی۔ مگر پالیکا میں 'کور' کے لیے ایک باعزت عہدہ' کوٹھی' ملازم اور گاڑی بھی ملتی۔ قمر اس صورت حال پر بھونچکا رہ گئی۔ اول تو اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اس مقصد کے لیے اسے ہی کیوں

منتخب کیا گیا ہے۔ ذہنی قلابے دوڑانے سے اسے اندازہ ہوا کہ نوکری کے سلسلے میں اس نے اپنے جن احباب کی مدد طلب کی تھی وہ 'اشتراکیت پسند' تھے۔ اسی ضمن میں وہ حمید ہاشمی کے دوست رام چرن اگروال سے بھی ملی تھی۔ اسی دوران ان اعلیٰ افسران تک یہ بات پہنچی ہوگی کہ اس کا تعلق ایک ضرورت مند خاندان سے ہے اور وہ بہ آسانی دام میں آسکتی ہے۔

قمر کے لیے یہ پیشکش قبول کرنا قطعی ناممکن تھا۔ اس نے خط پھاڑ کر پرزے پرزے کردیا۔ اس وقت اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ افسران حنیف کو بھی اسی طرح زچ کررہے ہیں۔ قمر کو راضی کرنے کے لیے اسے بھی ہر قسم کا چارہ ڈالا گیا لیکن اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا کہ:

''اگر میری بیوی میری مرضی کے خلاف تم لوگوں کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو بھی گئی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔''

اس ہٹ دھرمی اور واضح انکار پر وہ افسران اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ مطلقہ ہونے کی صورت میں قمر کا وجود ان کے لیے بالکل ناکارہ ہی تھا۔ قمر نے اپنی جان خلاصی ہونے پر شکرانہ ادا کیا لیکن مصائب نے ابھی اس کا دامن چھوڑا ہی کہاں تھا۔ وہ تو نہایت ادب سے ایک قطار میں دست بستہ اس سے ملاقات کی منتظر رہتی تھیں۔ اس باراں مشکلات نے علی گڑھ میں مقیم اس کے اہلِ خانہ کو ضرب لگائی تھی۔

وہ 1962ء کا زمانہ تھا۔ علی گڑھ میں زبردست فسادات پھوٹ پڑے۔ روزانہ سینکڑوں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے۔ یہ مسلمان بعدازاں درجن بھر سے زائد تعداد میں ایک ہی قبر میں دفن کردیے جاتے۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا۔ بچے رات بھر گولیوں کی متواتر آوازیں' دوڑتے قدموں کی صدائیں اور چیخیں سن کر سہمے رہتے۔ بستر میں دبکے وہ ماں کو یاد کرتے بے آواز آنسو بہایا کرتے کہ کہیں حنیف انہیں اس طرح آزردہ دیکھ کر افسردہ نہ ہو۔

دوسری جانب حنیف بھی اپنے تئیں ان فسادات سے نمٹنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ وہ علاقے کے سرپھروں سے بحث کرتا' حفاظتی اقدامات کے لیے ان سے جھگڑ بھی پڑتا۔ رات کے حفاظتی دستوں کو منظم کرتا اور دن میں حسب سابق اپنی سائیکل پر یونیورسٹی آتے جاتے انہی علاقوں سے گذرتا جہاں فسادات نے زیادہ شورش برپا کر رکھی تھی۔ وہ 'باغی' کسی بھی طور فرقہ واریت سے شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ اس دوران ایک بار بچے بھی حالات خراب ہونے پر اسکول میں پھنس گئے۔ حنیف کا ایک دوست انہیں اپنی جیپ پر کسی نہ کسی طور گھر لے آیا۔ راستے بھر دکھائی دینے والے مناظر نہایت ہولناک تھے۔ بچے سہمی ہوئی آنکھوں سے آر۔ایس۔ایس کے لوگوں کو مسلمانوں سے الجھتے اور انہیں ذبح کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس رات حنیف نے انہیں خوب دلاسہ دیا۔ انہیں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا تخیل دیتے۔ وہ کہیں نہ کہیں اپنی نسلِ نو میں بھی بغاوت کا بیج بو چکا تھا جو مستقبل قریب میں ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔

☆☆☆

دہلی میں اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریاں نبھاتی قمر علی گڑھ کے حالات سے سخت تشویش زدہ تھی۔ وہ خطوط کے ذریعے حنیف سے مسلسل رابطے میں تھی۔ حالات بہتر ہونے پر ابھی اس نے سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ ایک اور افتاد آن پڑی۔ ایک شب گیارہ بجے امیر اللہ نامی واقف کار اپنی بیگم کے ساتھ پاکستانی اخبارات کے تراشے لیے اس کے پاس چلے آئے۔ ان کے چہروں پر چھائی پریشانی دیکھ کر قمر کا دل ہول اٹھا۔

''کیا ہوا ہے؟ سب خیر تو ہے ناں؟'' وہ لرزیدہ آواز میں کہنے لگی۔

''بس بہن! رب کی یہی رضا تھی۔ اس کا مال تھا اسی کے پاس لوٹ گیا۔'' امیر اللہ نے دلاسہ دیا۔

''ہوا کیا ہے آخر؟ آپ مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں؟'' وہ چیخ اٹھی۔

امیر اللہ کی بیگم نے اخباری تراشے اس کے سامنے کر دیے۔ قمر کا وجود پل بھر میں ہی گویا کسی زلزلے کی لپیٹ میں آگیا۔ اخبار میں اس کے بڑے بھائی اصغر علی عباسی اور بھتیجی کشور کی موت کی خبر تھی۔ قمر کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے گذشتہ کچھ عرصہ میں پاکستان سے موصول ہونے والے خطوط سے معلوم کردہ حالات یاد آنے لگے۔ اس نے پل بھر میں ہی ان ناگہانی اموات کی وجہ بھانپ لی تھی۔

اصغر نے ابتدائی کچھ عرصہ میں کراچی ملازمت کرنے کے بعد اپنا تبادلہ لاہور کروالیا تھا جہاں اسے 'الاٹ منٹ آفیسر' کے عہدہ پر تعینات کردیا گیا۔ اصغر نے یہ ذمہ داری حسب سابق و عادت مکمل ایمانداری سے نبھائی۔ اس کام

میں بے اندازہ رشوت کی وصولی کے مواقع ہونے کے باوجود اس نے کبھی خیانت کا تصور بھی نہ کیا۔ وہ ہجرت زدگان کو مناسب مکانات تفویض کرتا اور ان کی دعائیں سمیٹتا رہا۔ چند برس بعد جب یہ کام بالآخر ختم ہوگیا تو اسے بہترین کارکردگی کی بناء پر 'اینٹی کرپشن' میں ایک عہدہ سونپ دیا گیا۔ اصغر نے یہاں بھی اپنی وہی روش برقرار رکھی۔

کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ اس نے ایک سینٹرل منسٹر کا ایسا ٹرک ضبط کروادیا جو سرحد پار ہندوستان سے اجناس اسمگل کرواتا تھا۔ ٹرک ضبط کرنے کے بعد مال سرکاری گودام میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد اصغر کا تبادلہ مغربی پنجاب کے صنعتی شعبہ جات میں کردیا گیا۔ اس کی ایمانداری کے اعتراف میں وہ مختصر عرصہ میں ہی وہاں 'اسسٹنٹ ڈائریکٹر' بنادیا گیا۔ اصغر نے اپنی بھرپور اہلیت کا مظاہرہ کیا۔ عجائب گھر بنوایا' برآمدات کے کئی در کھولے' پاکستانی قالینوں کے لیے نئی منڈیاں تلاش کیں۔ اس بہترین کارکردگی کے باوجود اسے مستقل ملازمت کا پروانہ نہیں تھمایا جارہا تھا۔ ہر چھ مہینے بعد اسے 'ایکسٹینشن' دے دی جاتی۔ ان معمولات میں کئی برس بیت گئے اور پھر وہ وقت بھی آیا جب ڈائریکٹر کے عہدہ پر اس کی بجائے کسی جونیئر افسر کو متعین کردیا گیا۔ اصغر سراپا احتجاج تھا۔ اس نے تنخواہ کی وصولی سے بھی انکار کردیا لیکن وہاں کسے کیا فرق پڑتا تھا؟

یہ معاملہ اگلے ایک برس تک یونہی رواں رہا۔ اسی عرصہ میں اصغر کی بڑی بیٹی کشور کی شادی طے ہوگئی۔ اہلیہ نے جہیز کی تیاری اور شادی کے دیگر اخراجات کے لیے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا۔ اصغر کا ذہنی تناؤ اس قدر بڑھا کہ وہ جنون میں مبتلا ہوگیا۔ ایک روز طبیعت میں شدید بگاڑ آنے سے اسے اسپتال داخل کروانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اس سے ذاتی واقفیت کی بناء پر کاغذات میں 'ہائی بلڈ پریشر' لکھ دینے پر ہی اکتفا کیا۔ علاج معالجہ کے بعد وہ دوبارہ ملازمت پر چلا گیا جہاں نئے ڈائریکٹر کی صورت میں اسے اپنا دماغ ہمہ وقت کھولتا محسوس ہوتا۔

اس ذہنی کیفیت میں وہ بتدریج دوبارہ جنون کی طرف مائل ہونے لگا۔ دوسری جانب گھر سے بھی رقم کا مطالبہ شدید ہوتا جارہا تھا۔ اصغر کی ذہنی حالت اس قدر ابتر ہوئی کہ اس نے کشور کو دوا کے بہانے 'پوٹاشیم سائنائڈ' دیا اور کچھ لمحوں بعد خود بھی پی لیا۔ اخبار میں اس کی موت اور جنازے میں لاکھوں افراد کی شرکت کی خبریں موجود تھیں۔

یہ لاکھوں افراد وہی پناہ گزین تھے جنہیں اس نے نہایت انصاف اور قانونی تقاضوں کے مطابق مکانات تفویض کیے تھے۔ اصغر کے کام' اخلاق اور ایمانداری پر بے تحاشا تقریریں ہوئیں۔ پاکستان کے تمام اخبارات نے سرخیوں میں یہ خبریں شائع کیں۔ سرکاری دفاتر میں دھاندلی' ایماندار افسروں کے ساتھ بے ایمانی اور وزراء کی بدعنوانیاں چھپانے کے خلاف کافی ہنگامے بھی برپا ہوئے لیکن اب اصغر علی عباسی تو دنیا میں واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔

قمر اس صورتِ حال اور بھائی کا آخری دیدار تک نہ کر پانے پر تڑپ اٹھی تھی۔ اس وقت وہ پاسپورٹ کی سہولت سے بھی محروم تھی۔ پاسپورٹ بننے کی بھی کہیں کوئی سبیل نہ تھی۔ سب سے پہلے تو مطلوبہ رقم کا بندوبست ہی کار دشوار تھا۔ صبر کیے بغیر کہیں کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ روتی 'تڑپتی' بلکتی رہی۔

☆☆☆

اصغر کی موت کے صدمے سے سنبھلتے 1962ء اختتام پذیر ہونے لگا۔ علی گڑھ میں بچے اور حنیف ہنوز اپنی زندگی کے اسی دائرے میں مقید تھے۔ قمر چھٹی ملنے پر ان سے ملاقات کے لیے جایا کرتی اور چند روز گذار کر دوبارہ دہلی میں اپنے فرائض سنبھال لیتی۔

انہی دنوں حنیف نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا آغاز کردیا۔ وہ گذشتہ کئی برسوں سے یہ کام سیکھنے کے درپے تھا۔ راتوں کو دیر تک اس تخلیقی کام کی مشق بھی کرتا رہتا۔ اپنے منتخب کردہ ڈیزائن لیے وہ ایک تعارفی خط کے ساتھ بمبئی کی ایک مشہور ٹیکسٹائل مل بھی گیا۔ انہوں نے وہ نمونے دیکھنے کے بعد یہ کہہ کر ٹال دیا کہ چند دن بعد جواب دیں گے۔ پھر چھ ماہ بعد ڈیزائن واپس بھیج کر یہ عذر کیا کہ نمونے ان کے معیار سے مطابقت نہیں رکھتے۔ حنیف سخت دلبرداشتہ ہوا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جب اس پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ ڈیزائن ایک ایک کرکے کپڑوں پر چھپنے شروع ہوگئے ہیں تو اس کی مایوسی اور شکستگی کا کوئی عالم نہ تھا۔ احباب نے اسے قانونی کارروائی اور احتجاج کرنے کا بھی مشورہ دیا لیکن وہ اپنی ہر اُمید ترک کر بیٹھا تھا۔

حنیف کی مشکلات صرف یہیں تک محدود نہ رہیں۔ حالات اس قدر خراب ہوئے کہ علی گڑھ یونیورسٹی بھی شدید سیاست کی زد میں آگئی۔ اپنے ذہنی تناؤ اور دلبرداشتگی سے

مغلوب ہو کر حنیف نے اسٹیوارڈ آفس سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ خبر احباب کے لیے ایک اور جھٹکا تھی۔ انہوں نے اسے سمجھانے بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اپنے ذہن وقلب پر مضبوط قفل لگا چکا تھا۔ اس نے استعفیٰ واپس لینے کی بجائے کسی نہ کسی طور'شعبہ تاریخ' میں نئی ملازمت حاصل کر لی۔ اس تمام تر عرصہ میں وہ بیوی کی کمی محسوس کرتے رہنے کے باوجود اس سے کبھی شکوہ کناں نہ ہوا۔ حنیف نے شکایات اور گلے اپنے وجود کے نہاں خانے میں پوشیدہ رکھ کر کڑھتے ہوئے جینا سیکھ لیا تھا۔ وہ پیشانی پر ایک بھی شکن لائے بغیر بچوں کے بھی فرائض سرانجام دیتا رہا لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ قمر کو انہیں دہلی بلاتے ہی بنی۔

☆☆☆

اس روز کارخانے میں چھٹی تھی۔ حنیف کسی کام کے سلسلے میں گھر سے غیر حاضر تھا۔ بچے اپنے روزمرہ کاموں میں مشغول تھے۔ اسی دوران کسی نے باہر سے کڑک کر آواز دی۔ ''حنیف ہاشمی ہیں؟''

تیرہ سالہ صبیحہ دروازے پر پہنچی اور اعتماد سے کہنے لگی۔

''کیا بات ہے؟ وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔''

''تمہارے گھر اور کارخانے کی قرقی ہونے والی ہے۔ میں ابھی قرق امین اور پولیس کو لے کر آرہا ہوں۔ سب سامان باہر نکال لو۔ پھر نہ کہنا ہمیں اطلاع نہیں دی گئی۔''

صبیحہ یہ سن کر سخت تشویش زدہ ہوگئی۔ بارہ سالہ سہیل' نو سالہ شہلا اور سات سالہ صفدر بھی اسی کیفیت میں اس کے پاس چلے آئے۔ چار سالہ شبنم البتہ اندر ہی تھی۔

''اب کیا ہوگا باجی؟ ابو تو کافی دیر سے آئیں گے۔ اب ہم کیا کریں گے؟'' سہیل نے دریافت کیا۔

''ہم اپنے گھر کو بچائیں گے۔'' صفدر نے یکدم کہا۔

''لیکن کس طرح؟'' شہلا مضطرب ہوئی۔

''مجھے پتا ہے کس طرح۔'' صبیحہ نے عزم سے جواب دیا۔

اس کے بعد فوری منصوبہ تیار کیا گیا اس نے بہن بھائیوں کو مچھر دانی کے بانس پکڑائے اور سب کے ساتھ خود بھی مخصوص مقام پر کھڑی ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد دو افراد اندر داخل ہوتے دکھائی دیے۔ وہ چہرے مہرے سے ہی بدمعاش معلوم ہو رہے تھے۔ صبیحہ اور سہیل کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ درحقیقت جرائم پیشہ افراد ہیں اور ان کے گھر میں کسی بڑے کی عدم موجودگی سے واقف ہونے کے باعث ہی 'سائنسی' انداز میں لوٹ مار کرنے آئے ہیں۔

وہ چاروں ان کے اندر داخل ہوتے ہی بانسوں سمیت پل پڑے۔ نشانہ ان کے کندھے اور سر تھے۔ نووارد اس افتاد سے بوکھلا گئے۔ صبیحہ اور سہیل نے مزید حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شور وغل بھی شروع کر دیا۔

''بچاؤ! بچاؤ! یہ غنڈے گھر میں گھس آئے ہیں۔''

اس شور نے کئی محلے داروں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اس صورت حال نے ان جرائم پیشہ افراد کو اس قدر دہشت زدہ کیا کہ انہیں دم دبائے بھاگتے ہی بنی بصورت دیگر وہ محلے داروں کے ہاتھوں مزید درگت کا شکار بھی بن سکتے تھے۔

بعد ازاں ہر محلے دار اور واقف کار نے حنیف کو بچوں کی اس بہادری و جرأت پر انفرادی طور پر مبارک باد دی۔ بچے بھی اپنے اس غیر معمولی کارنامے پر بہت خوش تھے لیکن حنیف سخت تناؤ زدہ تھا۔ اس نے قمر کو بلا کم وکاست اس صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ بھی اس غیر متوقع صورت حال پر سخت تشویش زدہ تھی۔ ان جرائم پیشہ افراد سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ انتقام کی غرض سے دوبارہ ان کے گھر کا رخ کر لیتے۔ اس نے حنیف کی رضامندی سے بچوں کو دہلی لانے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس صورت میں بھی کئی مشکلات کا سامنا تھا۔

علی گڑھ میں بچے اردو میڈیم اسکولوں میں زیر تعلیم تھے۔ اب دہلی منتقلی کے بعد ہندی میڈیم میں امتحان دینا بہت دشوار ہوتا۔ دہلی آکر داخلہ ملنے میں بہرحال کوئی مسئلہ نہ ہوا۔ صفدر اور شہلا کو گھر کے پاس ہی 'این ڈی ایم سی' کے ایک پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ وہاں کی عیسائی ہیڈ مسٹریس اردو سے آشنا اور سوئے اتفاق قمر کی دیرینہ واقف کار بھی تھیں۔ انہوں نے قمر کو کافی دلاسہ دیا کہ وہ بچوں کے پرچے اردو میں لے کر پڑتال بھی خود ہی کر لیں گی۔ شبنم نرسری جماعت میں ہونے کے باعث اس کے ساتھ ہی اسکول چلی جایا کرتی۔

ان تینوں کی جانب سے تو بے فکری ہوگئی۔ اب اسے سہیل اور صبیحہ کے لیے تشویش تھی۔ سہیل کو گھر سے کافی دور ایک ماڈل اسکول میں بذریعہ بس لکشمی بائی نگر جانا ہوتا تھا۔

صبیحہ بھی بس سے ہی گول مارکیٹ جاتی۔ سہیل کو سنسکرت کا انتخاب کرنا پڑا تھا۔ اسے سال بھر کا نصاب اگلے ڈیڑھ ماہ میں بہرصورت مکمل کرنا تھا۔ قدرت نے اس موقع پر قدوائی نگر کے ایک پرائمری ٹیچر مسٹر پاٹھک کو ان کی مدد کا وسیلہ بنا دیا۔ انہوں نے سہیل کو اس قدر تیاری کروادی کہ وہ سنسکرت میں پاس ہوگیا۔ اس موقع پر سہیل اور صبیحہ کی ہندی شناسی بھی کافی کام آئی۔ انہوں نے اپنے پرچے ہندی میں ہی دیے تھے۔ چاروں بچوں کی امتحان میں کامیابی کے بعد قمر ذہنی طور پر قدرے پرسکون ہوگئی۔

☆☆☆

وقت گذرتا رہا۔ بچے بتدریج تعلیمی مدارج طے کرتے رہے۔ قمر نے بے حد خواری سے ہی سہی تاہم ایک قدرے وسیع اور علیحدہ سرکاری مکان بھی حاصل کر لیا۔ اس کا دماغ اب کسی حد تک پرسکون ہوا ہی تھا کہ ماضی نے ایک بار پھر خود کو دہرا دیا۔ اس کے ساتھ آغاز ہی سے شاید یہی مقسوم تھا۔ زندگی میں قدرے سکون میسر آتے ہی تقدیر کوئی نہ کوئی کاری وار کرنے چلی آتی تھی۔ اس بار بھی یہی ہوا۔

نئے مکان میں منتقل ہونے کے چند دن بعد ہی ایک معلمہ نے اسے بتایا کہ پاکستان کا کوئی جہاز حادثے کا شکار ہو کر تباہ ہوگیا ہے۔ قمر کے پاس ان دنوں اخبار نہیں آتا تھا۔ وہ سٹپٹائی اور مضطرب سی گھر لوٹی تو بچوں سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کیا بات ہے امی جان؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟'' صبیحہ نے محبت پاش نظروں سے والدہ کو دیکھا۔

''آج اسکول میں پلین کریش کی ایک خبر سنی ہے۔ جانے کیوں میرا دل بے حد ہول رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کوئی روح کو اپنے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑ رہا ہے۔ کاش کہیں سے اخبار مل جاتا مجھے!'' اس نے اضطراب سے جواب دیا۔

''سہیل بھی اس وقت گھر پر نہیں ہے ورنہ وہ کہیں سے لے ہی آتا اخبار۔'' صبیحہ کو تاسف ہوا۔

''مجھے پتا ہے اخبار کہاں سے ملے گا؟ میں لے آتا ہوں۔'' دس سالہ صفدر نے جوش سے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا ہے؟ خاموش ہو کے بیٹھے رہو!'' قمر نے اسے گھر کا۔ وہ بچوں کو اسکول کے بعد سڑک پر تنہا نہیں بھیجتی تھی۔ اسے سڑک پر بے پناہ ہجوم اور سواریوں کی بے ہنگم آمد ورفت سے وحشت ہوتی تھی۔

''سینٹرل نیوز ایجنسی سے مل جائے گا۔ میں بس تھوڑی دیر میں لے آتا ہوں۔'' صفدر نے عجلت میں کہا اور ماں کی نیم رضامندی بھانپ کر فوراً روانہ ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ 'ٹائمز آف انڈیا' کی ایک کاپی لے آیا۔

''بڑی مشکل سے ملا ہے۔ شام ہونے والی تھی اور یہ شاید آخری کاپی تھی اس کے پاس۔'' وہ ہانپتے ہوئے بتانے لگا۔

''تو تمہیں کیسے دے دی اس نے؟'' قمر حیران ہوئی۔

''میں نے اسے کہا تھا کہ پلین کریش میں ہمارے عزیز بھی تھے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

قمر کو اپنے اس بیٹے پر ہمیشہ کی طرح ٹوٹ کر پیار آیا۔ وہ اپنی معصومیت' سادگی اور مقناطیسی شخصیت سے ہر ایک کو یونہی گرویدہ بنا لیا کرتا تھا۔ اس نے فوراً اخبار کے مندرجات پر نظر دوڑائی، پلین کریش میں جرنلسٹ ایسوی ایشن کے سیکریٹری 'حمید ہاشمی' کے انتقال کی خبر درج تھی۔ گھر بھر میں یک لخت افسردگی اور سناٹا چھا گیا۔ بچے حمید سے اپنے بچپن میں ہی ایک بار ملے تھے تاہم تصویروں اور خطوط کے باہم تبادلے سے وہ اس کے اہلِ خانہ سے بھی مکمل طور پر واقف تھے۔ قمر کا دل حنیف سے ملاقات کے لیے بے طرح مچل اٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس مشکل وقت میں اسے قمر کی بے حد ضرورت ہوگی۔

اس موقع پر ایک پڑوسی خاتون نے بچوں کی ذمہ داری سنبھالنے کی ہامی بھر لی۔ پندرہ سالہ صبیحہ اور چودہ سالہ سہیل نے بھی والدہ کو خوب دلاسہ دیا اور وہ پہلی ہی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ہوگئی۔ رات گیارہ بجے کے قریب جب وہ حنیف کے پاس پہنچی تو اس کی شکستہ حالت دیکھ کر خود بھی بکھر سی گئی۔ وہ رات گئے حمید کے بارے میں باتیں کرتے اپنا دلی بوجھ ہلکا کرتے رہے۔ قمر کی آمد سے حنیف کو حقیقتاً بہت حوصلہ ہوا تھا۔ اس سے قبل اپنے احباب کی آمد اور تعزیت اسے مزید ذہنی دباؤ میں مبتلا کرتی رہی تھی۔

قمر علی گڑھ میں دو روز قیام کے بعد دہلی لوٹ آئی۔ اسے پاکستان میں حمید کی اہلیہ اور بچوں کا تصور اکثر اسے راتوں میں بھی بے چین رکھتا۔ ادریس ہاشمی جانے کیسے ان کا خیال رکھتے ہوں گے۔ بیٹے سے دائمی جدائی کا صدمہ تو ان کے لیے بھی جانکاہ تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد پاکستان سے ایک

ایسی اطلاع موصول ہوئی جس نے اس کی رہی سہی ہمت بھی منتشر کردی۔

حمیدے انتقال کے بعد اس کے خاندان کے مسئلے پیدا ہونے سے ادریس ہاشمی نے مجبوراً اس بڑھاپے میں دوسری شادی کرلی تھی۔ اس فیصلہ میں دہلی ہی میں مقیم ان کی بہن اور انیس ہاشمی کی رائے و رضامندی بھی شامل تھی لیکن حنیف یہ بات بالکل برداشت نہ کرسکا۔ وہ اماں جی کی جگہ کسی دوسری خاتون کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے والد سے مکمل مقاطعہ کا اعلان کردیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ادریس ہاشمی دہلی آئے۔ انہوں نے حنیف کو علی گڑھ میں اپنی آمد اور ملاقات کی اطلاع بھی بھجوائی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے قمر کو واضح طور پر لکھ بھیجا کہ اباجان کو علی گڑھ لانے کی صورت میں وہ اپنے بوریا بستر سمیت کہیں روپوش ہو جائے گا۔ ادریس ہاشمی دلبرداشتگی سے پاکستان لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ بعد آکا بھائی بھی حنیف کو منانے کے لیے ہندوستان آئے لیکن وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

اس کشمکش میں دو برس مزید بیت گئے۔ بچوں کی تعلیمی کارکردگی میں ہر گذرتے دن کے ساتھ نکھار پیدا ہو رہا تھا۔ ان کے امتحانی نتائج شاندار ثابت ہوتے۔ قمر بھی ان کی صلاحیتوں کو جلا دینے میں بھرپور وقت اور توجہ صرف کررہی تھی۔ اس نے سب بچوں کو 'بال بھون' کا رکن بنوادیا تاکہ وہ اپنا پسندیدہ کام چن کر اسے بھرپور انداز میں کرنے کا اعتماد حاصل کرسکیں۔

صبیحہ نے شروع میں مصوری، سہیل نے ادبی میدان، شہلا اور صفدر نے چکنی مٹی سے مجسمہ سازی اور تخلیقی آرٹ کا انتخاب کیا۔ شبنم کو البتہ کھیلوں میں دلچسپی تھی۔ اس نے مختلف کھیلوں میں داخلہ لے لیا۔ بال بھون کی ایک منفرد روایت یہ بھی تھی کہ وہاں ہر دو ماہ بعد اپنا شعبہ تبدیل کرلینے کی سہولت بھی موجود تھی اس لیے وہ سبھی ادل بدل کرکے مختلف تجربات حاصل کرتے رہے۔ سب بچوں نے گانا، رقص، موسیقی، گیمز، کلے ماڈلنگ، ویونگ، ڈراما اور مباحثوں میں وقتاً فوقتاً حصہ لیا۔

زندگی بہت مشکل سے ہی سہی تاہم ایک مخصوص دھارے میں بہنے لگی تھی۔ خلش تھی تو صرف یہ کہ حنیف کی آمد کا کوئی سبب نہیں بن پاتا تھا۔ انہی دنوں اسے 'شعبہ آثار قدیمہ' میں کچھ ذمہ داریاں تفویض کردی گئیں۔ وہ اس شعبہ کے عجائب گھر کا 'مہتمم' بن چکا تھا۔ حنیف نے بھی اس شعبہ کو ترقی دینے میں شب و روز خوب محنت کی۔ اس دوران فرصت ملنے پر وہ دہلی چکر لگالیا کرتا تھا تاہم مستقل رہائش ہنوز ایک خواب ہی تھی۔ بیوی بچوں کی غیر موجودگی میں احساس تنہائی اور بیزاری بھی مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کر دیتی تاہم وہ اپنی ملازمت چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ درحقیقت وہ دونوں ہی اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے مدار میں مقید ہوکر رہ گئے تھے۔ ان کی یہ حالت و کیفیت خود ان کے سوا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ دوست احباب اکثر حنیف کو 'مظلوم' کہہ کر قمر کے بارے میں منفی رائے کا اظہار بھی کرجاتے لیکن قمر نے ہر منفی رائے کا خندہ پیشانی سے ہی سامنا کیا۔ وہ اپنے بچوں کو بھرپور محنت اور توجہ سے پروان چڑھا رہی تھی۔ ان کی غذائی ضروریات تک کسی عام گھریلو خاتون کی طرح پوری کرتی اس نے بچوں کی خواہشات و ضروریات سے کبھی چشم پوشی نہیں کی تھی۔ رہی حنیف سے دوری کی بات۔ تو اس ضمن میں وہ خود کو یہ سوچ کر بہلا لیتی تھی کہ قریب رہ کر معاشی بدحالی میں ایک دوسرے سے ذہنی و روحانی دوری برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ مالی آسودگی کے عوض وقتی جسمانی دوری برداشت کرلی جائے اور وہ دونوں یہی کرتے آرہے تھے۔

حنیف نے اس کے فیصلوں پر بھی کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اس برس گرما کی چھٹیوں میں جب اس نے ادریس ہاشمی کے مسلسل اصرار پر پاکستان روانگی کا ارادہ کیا تو حنیف نے خاموشی سے اجازت دے دی۔ پاسپورٹ بننے کے بعد کسی نہ کسی طور رقم کا بندوبست بھی کرلیا گیا اور تعطیلات کا آغاز ہوتے ہی وہ بذریعہ ٹرین اپنے بچوں کو ان کے پہلے لمبے سفر پر لیے روانہ ہوگئی۔

ادریس ہاشمی ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر ہی موجود تھے۔ وہ بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے تاہم ان کی کراچی روانگی کی اطلاع سے افسردہ ہوگئے۔

''کچھ عرصہ لاہور رہ لیتیں قمر!'' وہ آزردگی سے بولے۔

''ضرور رہیں گے اباجی! ضرور رہیں گے۔'' اس نے مکمل خلوص سے یقین دہانی کروائی۔

صبیحہ نے دادا کو اپنا پینٹ کیا ہوا ایک میز پوش دیا۔ ادریس ہاشمی کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ ان بچوں میں حنیف کی

خوشبو محسوس کرتے نڈھال ہو رہے تھے۔ قمر نے بھی انہیں اپنی زمین کی پیداشدہ ڈھیروں سبزیاں دیں جو وہ خصوصی طور پر انہی کے لیے بطور تحفہ لائی تھی۔ ادریس ہاشمی نے ان کے لیے راستے کے کھانے، کراچی کے ٹکٹ اور سفر خرچ کا بندوبست کرکے افسردگی سے رخصت کردیا۔

''جلدی آنا! سارا وقت کراچی میں ہی ختم نہ کر دینا۔'' انہوں نے محبت بھری تنبیہ کی۔

''بے فکر رہیں۔ بہت جلد آپ کا دماغ کھانے آجائیں گے ہم۔'' قمر مسکرائی۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ حنیف بھی تم لوگوں کے ساتھ چلا آتا۔'' انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ان کا انتظار کرتے تو شاید ہم بھی اس برس نہ آپاتے۔'' قمر نے ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا۔ ''علی گڑھ میں کام کرنے والوں کا پاسپورٹ لکھنؤ سے بنتا ہے اور وہاں ان کی کوئی واقفیت ہی نہیں۔''

''چلو رب بھلی کرے بس۔'' وہ آزردگی سے اتنا ہی کہہ سکے۔

قمران سے رخصت ہوکر کراچی پہنچی تو وقت بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہوسکا۔ کراچی میں اس کے میکے اور سسرال کے اتنے قریبی عزیز تھے کہ ایک ایک دن ہر گھر میں رہنے پر بھی وقت گویا ہوا کی طرح اڑ گیا۔ قمران سے بیس سال بعد مل رہی تھی۔ ان سب نے بچوں کو اور بچوں نے اپنے ان رشتہ داروں کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ بچے اپنے ہم عمر افراد سے مل کر بھی بہت خوش اور پُرجوش تھے۔ ان میں بہت جلد دوستانہ تعلقات استوار ہوگئے۔ اس کے علاوہ انہیں زندگی میں پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ والدین کے علاوہ بھی کہیں اور پیار محبت مل سکتے ہیں۔ دوسری جانب عزیز رشتہ داروں نے بھی ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کی آمد پر گھروں کو اس طرح سجایا گیا گویا کسی شادی یا تہوار کا موقع ہو۔ نئے پردوں اور نئے برتنوں تک کا اہتمام کیا گیا۔

اپنے سبھی عزیز و اقارب سے ملاقات کرتے ہوئے قمر کے دل میں جمال سے ملنے کی خلش برقرار رہی۔ وہ پندرہ سال کی عمر میں مرچنٹ نیوی کا کام سیکھنے کے لیے ڈھاکا گیا تھا اور اب وہاں سینئر الیکٹرک انجینئر کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ وہ اس کی بیوی اور دو بچوں سے نہ مل پانے پر دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

ان ملاقاتوں میں وقت پر لگائے اڑ گیا اور کراچی میں قیام کا آخری روز بھی چلا آیا۔ وہ جذباتی لحاظ سے ایک سخت دن تھا۔ تحفوں کی ایسی بھرمار تھی کہ سامان باندھنا تک مشکل ہوگیا۔ اسٹیشن پر سب بھائی بہن اور عزیز و اقارب انہیں رخصت کرنے آئے۔ گاڑی کے پلیٹ فارم پر آتے ہی ان سبھی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ مجید ماموں تو فرط جذبات میں گاڑی کے ساتھ دوڑنے لگے تھے۔ قمر کا دل بے طرح دکھا۔ اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ وہ آخری بار ماموں کا چہرہ دیکھ رہی ہے۔ اب دوبارہ جانے کب یہاں آنا نصیب ہوتا۔ تقسیم کی لکیر نے تو رشتوں میں صدیوں کی سی مسافت پیدا کردی تھی۔

قمر اور بچوں کی اگلے روز لاہور آمد ادریس ہاشمی کے لیے کسی خزانے کی نوید سے کم نہ تھی۔ اسٹیشن پر حمیدی بیوہ بچوں کے علاوہ اور بھی کئی رشتہ دار ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ادریس ہاشمی انہیں تانگہ میں بٹھا کر رحمت کالونی میں واقع اپنے گھر لے آئے۔ قمر کو لاہور کی طرز بود و باش اور عمارتوں میں دہلی کی سی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ ادریس نے ان کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قمر نے اس دوران حمید اور اصغر کی بیواؤں سے تعزیت کا فریضہ بہت کڑے دل سے نبھایا تھا۔ آنسوؤں کا پھندا حلق چیر دینے کے لیے بے تاب تھا لیکن دنیاداری کا یہی تقاضا تھا اور اسے ہر حال میں نبھانا ہی تھا۔

☆☆☆

اڑھائی ماہ پاکستان میں گذارنے کے بعد وہ واپس دہلی لوٹ آئے۔ بچوں نے والد کو نہایت جوش و خروش سے دادا کی محبت، تڑپ اور بے چینی سے آگاہ کیا۔ حنیف کا دل ہر بار ان کے تذکرے پر پگھل کر رہ جاتا۔ اس دوران اس کا غصہ کچھ سرد ہو ہی چکا تھا۔ اس نے والد سے ملاقات کے لیے پاسپورٹ کی تیاری کا انتظام شروع کردیا لیکن باپ بیٹے کی یہ ملاقات مقسوم ہی نہیں تھی۔ ادریس ہاشمی کی بذریعہ تار ملنے والی وفات کی خبر نے ان دونوں کو ہی دُکھا کر رکھ دیا۔ حنیف نے شدید صدمہ سے بے حال ہوتے پاکستان روانگی کا بندوبست کیا اور چند رشتہ داروں سے مل کر لوٹ آیا۔ والد سے دائمی محرومی کا دکھ اس کے دل میں جان لیوا خلش بن گئی تھی۔

پاکستان سے واپسی کے بعد حنیف کو بالآخر علی گڑھ چھوڑ کر دہلی منتقل ہونا ہی پڑا۔ ان دنوں قمر چند ہی ماہ میں ٹائیفائیڈ اور سانس کی تکلیف میں مبتلا ہوکر دمہ کا شکار

ہو چکی تھی۔ اس خراب صحت کے ساتھ اس سے گھر اور باہر کا کام سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس دوران دہلی میونسپل کمیٹی کی جانب سے سرکاری اراضی پر ناجائز قبضہ ور ہائش کا کیس اس کے اعصاب کے لیے نیا امتحان ثابت ہوا۔

اس مرحلے سے کسی نہ کسی طور نمٹتے حنیف نے 'سوویت انفارمیشن سینٹر' میں ملازمت کی درخواست دے دی۔ سوئے اتفاق انہی دنوں کچھ لوگوں کو ماسکو بھیجا گیا تھا اور دہلی میں ان کی جگہیں خالی تھیں جنہیں فوراً پُر کیا جانا تھا۔ حنیف کی درخواست بھی جلد منظور ہوگئی اور اپریل 1969ء میں اسے پروانہ تقرری مل گیا۔

حنیف کی جانب سے دلی و ذہنی سکون میسر آتے ہی اس کی بچوں کی جانب توجہ کا دائرہ وسیع تر ہوگیا۔ اس دوران صفدر نے ہائر سیکنڈری کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرکے حنیف کی خواہش کے مطابق 'سٹیفنز کالج' میں داخلہ لے لیا۔ حنیف کی رائے تھی کہ اس کالج سے فارغ التحصیل طلبہ کو فوراً ملازمت مل جاتی ہے۔ قمر جانتی تھی کہ حنیف کی اس سوچ کے عقب میں کیا وجہ در پیش ہے۔ مناسب ڈگری نہ ہونے کے باعث اس نے اپنی زندگی میں بے حد دشواریوں کا سامنا کیا تھا اسی لیے اس کی دلی تمنا تھی کہ بچے کوئی نہ کوئی ایسا شعبہ اختیار کریں جس سے روزگار ملنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسے سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر کالج میں چھ سال گذار لینے کے بعد بھی ڈگری نہ لے پانے کا بہت قلق تھا۔ صفدر سے تو یہ اُمیدیں کچھ اور بھی بڑھ گئی تھیں۔

صفدر نے بہت جلد کالج میں اپنی ذہانت اور تخلیقی قوتوں کے بل بوتے پر بہترین مقام بنا لیا۔ وہ سہیل سے بھی زیادہ توانا اور پُرجوش ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے چند لڑکوں کے ساتھ مل کر 'انڈین پیپلز تھیٹرز' (اپٹا) میں شمولیت اختیار کر لی۔ بچوں کی پڑھائی کا دورانیہ بھی گویا چشم زدن میں ہی بیت گیا۔ صفدر کو تعلیم مکمل ہوتے ہی گڑھوال میں ملازمت مل گئی۔

گڑھوال ملازمت کا یہ دورانیہ ان ماں بیٹے کو بہت قریب لے آیا۔ وہ خطوط کے ذریعے مسلسل رابطے میں رہتے۔ صفدر اسے ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بتایا کرتا۔ ان کی ذہنی ہم آہنگی اور گفت وشنید اس قدر بڑھ گئی کہ سہیل اور شہلا اکثر ایک ہی گلہ کرتے پائے جاتے۔

"امی کو صفدر کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا ہے۔ ہمیں تو جیسے کسی دربار سے اٹھایا تھا انہوں نے۔"

"ارے بھئی! تمہاری امی کو صفدر کے سامنے میں بھی کہاں نظر آتا ہوں؟" حنیف نے بھی اس شکایتی پروگرام میں اپنا حصہ ڈالا۔

"اتنے بڑے ہوگئے ہو سب لیکن بچپنا نہیں گیا تم لوگوں کا۔" اس نے شوہر سمیت سب کو گھرکا اور موضوع گفتگو تبدیل کر دیا۔ اس کے باوجود ذہن میں ایک سوال بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ صفدر اسے اتنا عزیز کیوں ہے؟ اس وقت کہاں علم تھا کہ صفدر اس کے پاس کچھ ہی عرصہ کا مہمان ہے اور وہ اس دنیا سے دائمی روانگی سے قبل اپنے حصے کی محبتیں سمیٹ اور لٹا رہا ہے۔

☆☆☆

وقت اپنے کئی پڑاؤ عبور کر چکا تھا۔ معاشی آسودگی اور بچوں کی ملازمت حاصل کر لینے کے بعد جب قمر کو محسوس ہونے لگا کہ زندگی اب سہل ہوگئی ہے تو تقدیر نے ایک اور کاری وار کر دیا۔ حنیف کو خرابی طبع کے باعث اسپتال داخل کروایا گیا لیکن ڈاکٹرز کی غفلت اور بیماری کی صحیح تشخیص نہ ہونے کے باعث وہ مکمل صحت یاب ہی نہ ہو سکا۔ گھر واپسی کے بعد بھی طبیعت میں کسی طور بہتری آ کے ہی نہ دے رہی تھی۔ قمر نے تیرہ جولائی 1976ء کو اسے 'ولنگڈن اسپتال' میں داخل کروا دیا جہاں ایک نئے سرے سے تفتیش وعلاج کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

قمر اور بچے حنیف کی صحت یابی کے لیے شدید کوشاں اور دعا گو تھے لیکن اس کی بیماری دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ڈاکٹرز چند اُمید افزا جملے بول دینے پر ہی اکتفا کرتے۔ قمر کو ایسا محسوس ہوتا کہ طبی عملہ حنیف کا مرض تشخیص ہی نہیں کر پا رہا ہے۔ صبیحہ، سہیل، شہلا، صفدر اور شبنم سخت سراسیمہ رہتے۔ انہوں نے زندگی بھر والدین کے سوا کسی قریبی رشتے کو اپنے نزدیک نہیں دیکھا تھا۔ وہ بچپن میں حنیف کی قربانیوں اور اپنی پرورش کے لیے اٹھائی گئی مشقتوں کے بھی شاہد تھے۔ اس نے قمر کی غیر موجودگی میں انہیں ہر ممکن طور پر بہترین انداز میں سنبھالا تھا اور اب وہ شفیق، باہمت وجود ان کے سامنے دھیرے دھیرے موت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ سکون بھلا آتا بھی تو کیسے؟

سہیل دن رات کی پروا کیے بغیر ادویات کے پارسل وصول کرنے ائیرپورٹ بھاگ دوڑ کیا کرتا۔ عزیز واقارب کو دواؤں کے لیے ٹیلی گرام بھیجتا۔ ہر روز پانچ یونٹ خون

کے لیے دوستوں کے بلڈ ٹیسٹ کرواتا۔ پھر خون کی بوتلیں لیے آرمی اسپتال کی جانب دوڑتا اور وہائٹ بلڈ کار پسلو علیحدہ کروا کے خون کی مخصوص تھیلی برف میں رکھے فوراً ڈاکٹرز کے پاس آتا کہ اسے فوراً حنیف کی رگوں میں منتقل کیا جائے۔ اس کے پاؤں سخت زخمی ہو چکے تھے لیکن اس نے کسی بھی قسم کا آرام خود پر تج لیا تھا۔

شہلا کے لیے امتحان ختم ہونے سے قبل وہاں آمد سخت دشوار تھی۔ وہ ان دنوں تدریسی شعبہ سے منسلک ہو چکی تھی اور اب اپنی مجبوری کے باعث دن رات باپ کی یاد میں تڑپتی اس کی صحت یابی کے لیے دعا گو رہتی۔

شبنم اپنی کم عمری اور خاموش طبع کے باعث افسردہ اور دلگیر رہتی۔ صفدر بھی دہلی آکر سہیل کی مدد اور باپ کی خدمت کے لیے تڑپتا لیکن ملازمت کی بندشیں اسے بھی سفر سے روکے ہوئے تھیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح سنیچر شام کو وہاں پہنچتا اور ایک پورا روز اسپتال میں گذارنے کے بعد دوبارہ اپنی ملازمت پر روانہ ہو جاتا۔

اسی اثناء میں چھٹیوں کا دور شروع ہوگیا۔ پچیس ستمبر کی شام صفدر دہلی پہنچ گیا۔ اسی روز پاکستان سے آکا بھائی اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ چلے آئے۔ شہلا کو بھی دس روز کی چھٹیاں مل گئی تھیں۔

اگلے دو روز بے حد کٹھن تھے۔ رات نو بجے ڈاکٹر آخری راؤنڈ کرنے آیا۔ حنیف کے جسم میں خون، گلوکوز اور آکسیجن کی ترسیل جاری تھی۔ 'ہارٹ مانیٹر' دل کی ڈوبتی دھڑکنوں کی واضح چغلی کھا رہا تھا۔ اپنے مجازی خدا کو اس تکلیف میں دیکھ کر قمر کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ انیس کے بچے بھی چچا کی اس حالت پر اعصابی شکستگی میں مبتلا تھے۔ وقت لمحوں کی صورت میں دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ اس وقت حنیف کے پاس قمر اور صفدر ہی تھے۔

"میرے کپڑے بدلوا دو صفدر!" اس نے بیٹے کو مخاطب کیا۔

صفدر نے فوراً حکم کی تعمیل کی تاہم حنیف ایک کپڑا بدلتے ہی تھک گیا۔

"تھک گئے ہیں یہ۔ پانچ منٹ بعد دوسرا بدلوا دیں گے۔" قمر نے صفدر کو تجویز دی۔

"پانچ منٹ بعد تو کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔" حنیف نے سرگوشی میں کہا۔ شاید اسے اپنے آس پاس نادیدہ آہٹیں واضح محسوس ہو رہی تھیں۔

پھر بالآخر اجل نہایت دیدہ دلیری سے ان سبھی کے درمیان حنیف کا بدن روح سے خالی کر گئی۔ اس کی گردن کا منکا یکدم ڈھلک گیا۔ قمر کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ پانچ منٹ قبل اس سے گفتگو کرنے والا شوہر یکدم اسے تنہا کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے حنیف کی بے نور آنکھیں بند کر دیں۔

اسی وقت سہیل اور انیس بھی کمرے میں چلے آئے۔ وہ کوئی دوائی لانے کی غرض سے کچھ دیر پہلے ہی باہر گئے تھے۔ قمر اور صفدر کے چہروں پر نظریں پڑتے ہی سہیل سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل وہیں زمین پر گرا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے احساس غم میں ایک خلش یہ بھی شامل تھی کہ وہ گذشتہ تین ماہ سے رات دن ایک کیے والد کی خدمت کر رہا تھا۔ اپنے زخمی پاؤں کی پروا کیے بغیر ہر سو بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ علاج میں کبھی کہیں کوئی کسر نہ چھوڑی اور انجام کار آخری وقت میں وہی والد کے پاس نہ تھا۔ انیس بھی اپنے چھوٹے بھائی کے بے جان وجود کو افسردگی اور خاموشی سے دیکھتا آنسو بہانے لگا۔ ان میں سے کسی کے اندر بھی ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ سبھی اپنے اپنے انداز میں احساس زیاں سے نبرد آزما تھے۔

"حنیف کی میت پاکستان میں ابا جی کی قبر کے ساتھ دفن ہو جاتی تو بہتر نہ ہوتا کیا؟" کچھ لمحوں بعد انیس کی رندھی ہوئی آواز نے وہ ساکت فضا مرتعش کی۔

"ایسا ممکن ہی نہیں آکا بھائی!" قمر نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے متانت سے کہا۔

"کیوں ممکن نہیں؟ میں سارا بندوبست خود ہی کر لوں گا۔ تم اخراجات یا بھاگ دوڑ کی فکر ہی نہ کرو۔" وہ فوراً بولا۔

"ایسا پھر بھی ممکن نہیں آکا بھائی! حنیف نے کل ہی ایک تحریری وصیت کی ہے کہ ان کے جسد خاکی کے ساتھ کوئی مذہبی رسم ادا نہ کی جائے۔ قمر اتنا کہہ کر ایک بار پھر رونے لگی۔

"باغی تھا نا، بس!" انیس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"ساری زندگی باغی رہا اور مرنے کے بعد بھی اپنی روش نہ چھوڑی۔"

☆☆☆

حنیف کی موت کے بعد زندگی ایک نئی ڈگر پر رواں ہوگئی۔ بچے دستورِ زندگی کے مطابق اپنی اپنی سرگرمیوں میں

مشغول ہوگئے۔قمر کے پیشہ وارانہ معاملات بھی حسبِ سابق جاری تھے۔کچھ روز بعد سہیل سنجیدہ صورت لیے اس کے پاس چلا آیا۔قمر پل بھر میں ہی بھانپ گئی کہ وہ اس سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔قمر نے اپنا کام موقوف کیا اور پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''کہو! کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے ناں؟'' اس نے محبت سے دریافت کیا۔

''مجھے ایم فل میں وظیفہ مل رہا ہے۔'' اس نے مختصراً بات کا آغاز کیا۔

''تو تمہاری مرضی کیا ہے؟''

''میں پارٹی کا کل وقتی ممبر بننا چاہتا ہوں۔'' سہیل نے ہمت مجتمع کر کے کہا۔

''فضول بات نہ کرو! سیاست میں کچھ نہیں رکھا۔ تمہارے ابا جان کو کیا مل گیا تھا آخر سیاست میں؟'' قمر کے لہجہ میں سختی در آئی۔

''ہر دور کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ضروری نہیں جو ابا جان کے ساتھ ہوا وہ میرے ساتھ بھی ہوگا۔'' سہیل بضد رہا۔

''میں تمہیں کسی بھرم میں نہیں رکھوں گی میرے بچے!'' قمر نے نرمی سے جواب دیا۔''میرے لیے اپنی محدود آمدنی میں شبنم کی تعلیم مکمل کروانا ہی بے حد مشکل ہے۔تمہارے اخراجات کیونکر اٹھاؤں گی؟''

''میں اپنا بوجھ خود ہی اٹھاؤں گا۔آپ پر کسی قسم کا بار نہیں آئے گا۔'' اس کا انداز بھی چٹانی تھا۔

''پارٹی کا کام کل وقتی ممبر ہوئے بغیر بھی تو ہو سکتا ہے۔'' قمر نے جز بز ہو کر کہا۔

''میں سنبھال لوں گا سب کچھ! آپ پریشان نہ ہوں۔'' سہیل کی ضد برقرار رہی۔

اسی لمحہ قمر کی نظر سہیل کے عقب میں دروازے کے پاس کھڑے صفدر پر پڑی۔وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔اس نے قمر کو آنکھوں سے سہیل کی بات مان لینے کا مخصوص اشارہ کیا اور اس کے اٹھتے ہی والدہ کے پاس آ بیٹھا۔

''یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا ہے صفدر! بڑے بھائی کو سمجھاؤ کچھ۔'' وہ مضطرب تھی۔

''وہ سمجھانے بجھانے کی حدود سے باہر نکل چکے ہیں۔میں نے اس مسئلہ پر ان سے بات چیت کی تھی لیکن وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار ہی نہیں۔'' صفدر نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

''اس کا یہ فیصلہ ہم سب کی زندگیوں پر اثر انداز ہو گا۔خاندان کی ذمہ داریوں کا سارا بوجھ تم پر چلا جائے گا۔'' وہ دور اندیشی سے معاملہ کا ہر پہلو دیکھ رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔میں اپنی بساط کے مطابق یہ ذمہ داریاں نبھانے کی بھرپور کوشش کرتا رہوں گا۔آپ بھائی جان کے فیصلے کی مخالفت نہ کریں۔اس سے ہمارے خاندان میں تناؤ پیدا ہو جائے گا۔ہمارا خاندان پہلے ہی کون سا وسیع ہے۔یہ جو چند رشتے بچے ہیں انہیں سمٹے ہی رہنے دیجیے۔'' وہ آزردگی سے کہنے لگا۔''دادا' چچا اور اب والد کی وفات کے بعد وہ بہت افسردہ اور شدید حقیقت پسند ہو چکا تھا۔

قمر نے اس کے بعد سہیل سے کوئی اختلاف نہ کیا۔ صفدر نے معاشی بہتری کے لیے مزید ہاتھ پاؤں مارنے کا آغاز کر دیا۔وہ لیکچرار شپ کے علاوہ بھی کوئی ایسا کام تلاش کرنے لگا جس میں آمدنی زیادہ ہو سکے اور وہ والدہ کو مناسب رقم بھیج سکے۔اسے انتظامیہ کی جانب سے مشرقی جرمنی روانگی کی پیشکش بھی ہوئی۔صفدر جانتا تھا کہ بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان میں بہترین ملازمت کے مواقع مل سکتے تھے لیکن اس دوران وہ قمر کو گھر کے اخراجات اور شبنم کی پڑھائی کے لیے وسائل کہاں سے فراہم کرتا؟

اس دوران صفدر نے کالج میں ڈرامیٹک سوسائٹی بھی قائم کر دی۔بیٹے کی ان تخلیقی صلاحیتوں اور غیر روایتی سوچ پر خوش ہوتی قمر کو علم نہ تھا کہ یہی تخلیقیت اور روایات سے انحراف ایک روز اسے صفدر سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دے گا۔

☆☆☆

کچھ عرصہ مزید گذرا تو کالج میں تنخواہ ملنے کی بے قاعدگی اور انتظامی سیاست سے تنگ آ کر صفدر نے کشمیر یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اس ملازمت کا آغاز اس کے لیے بہت خوش کن ثابت ہوا۔اس نے اپنے طلبہ کو تھیٹر سوسائٹی کی طرف مائل کیا۔ٹی وی کے پروگرام کے لیے بنگالی مصنف مانک بینرجی کی کہانی پر مبنی ایک اسکرپٹ تیار کیا جسے ٹی وی انتظامیہ نے فوراً سند پسندیدگی بخش دی۔

قمر اس کے خطوط کے توسط سے تمام تر حالات سے آگاہ ہوتی رہی۔اس دوران اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ

کشمیر میں مہنگائی کا تناسب قدرے زیادہ ہے۔صفدر کے لیے تنخواہ اور اخراجات میں توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔اس نے بیٹے کو دہلی لوٹ آنے کی صلاح دے دی۔ ان دنوں دہلی کالج کی جانب سے ایک ملازمت کا اشتہار سامنے آیا تھا۔دو سال کا معاہدہ بہ آسانی ہو جاتا۔

صفدر نے یہ پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی۔قباحت یہ تھی کہ دو سال بعد ایک بار پھر ملازمت کی تلاش میں خوار ہونا پڑتا۔دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کشمیر میں اپنے معمولات سے بہت خوش و مطمئن تھا۔اس نے خط میں واضح طور پر لکھا۔

''میں کشمیر میں اپنی ذمہ داری محسوس کرنے لگا ہوں۔ کچھ وعدے پورے کرنے ہیں۔میرا باس بھی بہت اچھا ہے۔میں اس کے ساتھ پی ایچ ڈی مکمل کرنے پر بھی سوچ رہا ہوں۔شہلا کا خط ملا تھا۔وہ کروڑی مل کالج کی پوسٹ کے لیے درخواست دینا چاہ رہی ہے۔اگر وہ ڈلہوزی سے واپس نہیں آتی تو میں واپسی کا کچھ سوچ لوں گا۔شبنم کے ماسکو جانے کی کوئی صورت بنی یا نہیں؟ میں جلد ہی اس کے لیے کچھ رقم بھیج دوں گا۔''

قمر نے خط کا کاغذ اپنی آنکھوں سے لگایا اور بیٹے کی لکھائی دیوانہ وار چومنے لگی۔اس لمحہ اسے صفدر کے وجود میں بھی ایک باغی نمو پاتا واضح محسوس ہوا تھا۔قمر کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔صفدر نے کچھ ہی عرصہ میں طلبہ و طالبات کے ساتھ 'ناٹک' کی مشقیں شروع کر دیں۔اس کی ہدایت کاری میں ایسا فطری سحر تھا کہ اداکار اور اداکاراؤں کی ناتجربہ کاری کے باوجود وہ بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کروا لیتا۔اسی دوران ٹی وی پروڈیوسر سے جھگڑا بھی ہوا۔ وہ اس کے اسکرپٹ میں تبدیلی کرنا چاہتا تھا اور صفدر کے لیے یہ بات بالکل ناقابلِ قبول تھی۔وہ ہر کام اپنی شرائط پر کرنے کا خواہش مند تھا۔

کشمیر میں معاشی حالات کچھ بہتر ہوتے ہی صفدر نے قمر کو کچھ عرصہ اپنے پاس رہنے کے لیے بلا لیا۔وہاں رہائش کے دوران قمر حقیقی معنوں میں بیٹے کی جدوجہد اور کاوشوں سے آشنا ہوئی۔وہ اپنے ناٹک کے ہر شو کی تیاری بھرپور انداز میں ذاتی طور پر کیا کرتا تھا۔ہال کی بکنگ' اسٹیج لائٹ کا انتظام' پوسٹروں کا ڈیزائن بنانا' پرنٹ کروانا' انہیں چپکانا' ٹکٹوں کی بکری' مہمانوں کو مدعو کرنا' ریہرسل اور شو کے درمیان ریفریشمنٹ کا انتظام' اسٹیج پر استعمال ہونے والے سامان کو ہال تک پہنچوانا' میک اپ کا سامان خریدنا' لٹری اور پولیس یونیفارم ادھار لینا' پردوں کا انتظام کرنا اور اس کے علاوہ بھی ہزار ہا چھوٹے موٹے کام کرتے دیکھ کر قمر کا دل ہولنے لگتا۔وہ ہمہ وقت اس کی کامیابی اور ترقی کے لیے دعا گو رہتی تھی۔مگر دل تھا کہ ہولتا رہتا۔وہ پوری طرح سمجھ چکی تھی کہ خود کو سیکولر کہنے والے اندر سے پوری طرح تعصبی ہیں۔ہندوستان میں کسی مسلمان کا آگے بڑھنا کسی بھی ہندو کو پسند نہیں۔خواہ وہ کانگریسی ہوں یا کمیونسٹ۔اوپر سے سب ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن اندر سے سب ایک ہیں۔اسی لیے وہ بیٹے کی صحت و سلامتی کی ترقی کی دعائیں مانگتی رہتی۔

قمر کی یہ دعائیں اور صفدر کی محنت رنگ لانے لگی۔ ریاست جموں کا گورنر ناٹک کی سٹیجنگ سے بہت خوش تھا۔ تھیٹر' ریڈیو اور ٹی وی کے لوگوں کو بھی اعتراف تھا کہ انہوں نے ایسے شاندار شو پہلے کہیں اور کبھی بھی نہیں دیکھے۔بہت سے اسکولوں اور کالجوں کے تھیٹر گروپ اسے ہدایت کاری کے لیے مائل کرنے لگے۔دور درشن کا ایک ہدایت کار اس کے ناٹک پر فلم بھی بنانا چاہتا تھا تاہم صفدر انہیں وقتی کامیابیاں سمجھتے ہوئے ایک طویل مسافت طے کرنے کا خواہش مند تھا۔

☆☆☆

کشمیر سے لوٹنے کے بعد قمر کی ذہنی کیفیت عجیب تر تھی۔بیٹا مکمل طور پر باغی بن چکا تھا۔ماحول کا باغی۔ کمیونزم کا پرستار۔وہ اولاد کی کامیابیوں اور ان کے فیصلوں سے خوش ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں جز بز رہتی۔اکثر تنہا بیٹھے وہ اپنی ان کیفیات کا تجزیہ کرتی تو بے حد الجھ کر رہ جاتی۔اسے علم تھا کہ عہدِ شباب میں سبھی بچوں کے ساتھ ایسا ہونا ایک فطری عمل رہا ہے۔اس دور میں ہر انسان اپنی زندگی کی راہیں از خود متعین کرنا چاہتا ہے۔اصولی طور پر اس صورتِ حال کے لیے تیار ہونے کے باوجود قمر اپنے جذباتی بحران کے زیرِ اثر کسی نہ کسی مقام پر اولاد سے الجھ بیٹھتی۔یہ بحران حنیف کی وفات کے بعد اس کے اعصاب و جذبات پر غالب آیا تھا۔تقریباً تین دہائیوں پر محیط اس سفر کے اختتام نے اس کے وجود میں لامتناہی صحرا پیدا کر دیا تھا۔ اس نے اپنے شباب کے بہترین شب و روز فکرِ معاش کے آزار میں شوہر سے دور رہ کر بسر کیے تھے۔اس وقت اپنے فطری تقاضوں کو یہی کہہ کر بہلا لیتی کہ آخیر عمر کے دن

نسبتاً بہتر ہوں گے۔اس وقت پریشانیاں اور بچوں کے مستقبل کے لیے جدوجہد بھی ختم ہو جائے گی۔عمر بھر آس و جدوجہد کے درخت کی آبیاری کے بعد جب اس کی گھنی چھاؤں سے مستفید ہونے کا وقت آیا تھا تو اس کی زندگی میں دائمی خزاں چھا گئی تھی۔

اپنی کیفیات کے اس تجزیے نے اسے احساس شرمندگی سے نڈھال سا کر دیا۔وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھانے لگی۔

''اس بڑھاپے میں اپنا وقار مت کھو دینا قمر! غم اور خوشی کو اندرونی معاملہ رکھنا سیکھو۔تم ایک مشرقی عورت ہو۔ اپنی تربیت کے رنگ اتنی جلدی بھول گئیں کیا؟ آنسو پیو اور خوشی سے بہم کرو۔دکھ جھیلو لیکن چہرے پر کسی جذبے کا اثر نہ ہونے دو۔خود کو ان فلمی جذبات میں مبتلا کیوں کر رہی ہو؟ یہ دنیا تمہارے وقار و متانت کی شاہد ہے۔اپنے اسی تاثر کو برقرار رکھو۔''

اگلے کئی روز خود کو یہ سب سمجھاتے رہنے کے بعد اس نے مزاج میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کی غرض سے صفدر کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اس دوران صفدر بھی کسینر سے لوٹ آیا۔وہ اپنے شب و روز نانک کے فروغ اور تشکیل میں صرف کرنا چاہتا تھا۔ملازمت کے ضابطوں اور تعلیمی اداروں میں جاری سیاست نے اس کا دل ہی اچاٹ کر دیا تھا۔

کشمیر سے واپس آ جانے کے بعد وہ ایک سال تک قمر کے ساتھ ہی رہا تاہم اس کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ سب کو مل بیٹھنے کا موقع کم ہی ملتا۔وہ ناشتے کے بعد صبح سویرے ہی اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو جاتے۔صفدر اور سہیل ان دنوں پارٹی کے متعین کردہ مختلف محاذوں پر کام کر رہے تھے۔سہیل زیادہ تر سیاسی محاذ اور صفدر تحریر و نانک کے ذریعہ عوامی بیداری پیدا کرنے میں مگن تھا۔ان کاموں کے سلسلے میں ان دونوں بھائیوں میں خوب ذہنی ہم آہنگی ہو چکی تھی۔قمر اپنی نوکری اور گرہستی کے پاٹوں میں پس رہی تھی۔اس کے علاوہ اساتذہ کی 'سیاست' اور مختلف شعبوں میں کوئی نہ کوئی رسہ کشی بھی اسے ذہنی طور پر الجھائے رکھتی۔ اس لیے ملاقات کا دورانیہ صبح ناشتے یا رات کے کھانے کے مختصر اوقات تک محدود رہ گیا تھا۔

ان مصروفیات کے باوجود قمر نے اپنا فیصلہ پس پشت نہیں ڈالا تھا۔وہ صفدر کی شادی کروا دینے کے لیے ازحد سنجیدہ تھی۔اس کی یہ تلاش ملیشری پر ختم ہوئی اور 1979ء میں وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

شادی کے بعد فطری طور پر ہی صفدر کی خواہش تھی کہ وہ قمر کے ساتھ ہی مقیم رہے لیکن عملی طور پر ایسا ممکن نہیں تھا۔ قمر کا سرکاری کوارٹر اب ان کی ضروریات کی نسبت چھوٹا تھا۔افراد خانہ کی تعداد زیادہ اور جگہ کم ہو چلی تھی۔قمر نے بیٹے کو کرایہ کا کوئی گھر تلاش کرنے کی صلاح دے دی۔صفدر اپنی اہلیہ کے ساتھ اگلے کئی روز تک اسی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن کامیابی نصیب ہو کے ہی نہ دے رہی تھی۔وہ ہر رات بے نیل و مرام گھر لوٹتا اور قمر کو دیکھتے ہی شرارت سے گنگنانے لگتا۔

''دو دیوانے شہر میں
رات میں اور دوپہر میں
آب و دانہ ڈھونڈتے ہیں
ایک آشیانہ ڈھونڈتے ہیں۔''

''مایوس کیوں ہوتے ہو؟ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہی ہوتی ہے۔''قمر اسے دلاسہ دیتی۔

''اللہ جی کو بھی پتا ہے ناں کہ میں اپنی ماں سے دور نہیں رہنا چاہتا۔بس میری ماں ہی مجھے خود سے دور کرنے پر تلی ہیں۔''اس نے ناراضگی جتائی۔

''اسی میں تمہاری بھلائی ہے بیٹا! ورنہ دل تنگ پڑ جائیں تو رشتوں میں دراڑیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔میں اپنی اولاد میں یہ دراڑیں ہی تو نہیں دیکھنا چاہتی۔''قمر نے افسردگی سے جواب دیا۔

صفدر سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔کچھ روز بعد اسے لکشمی بائی نگر میں رہائش کے لیے ایک کمرا مل گیا جہاں منتقلی کے بعد اس نے اپنا تخلیقی سفر مہمیز تر کر دیا۔کامیابی ہر موڑ پر دیوانہ وار اس کے قدم چوم رہی تھی۔

☆☆☆

وقت دیکھتے ہی دیکھتے پر لگائے اڑ گیا۔صفدر کی شادی کو نو سال کا عرصہ بیت گیا۔اس دوران زندگی نے بہت سے رنگ بدلے لیکن صدر کی محنت اور 'جن نائیہ منج' (جنم) کے لیے اس کی لگن کے علاوہ قمر سے دیوانہ وار محبت میں کوئی کمی نہ آئی۔وہ اکثر و بیشتر ماں سے ملاقات کے لیے چلا آتا۔ایسے ہی ایک روز وہ قمر کے سرکاری کوارٹر آیا تو اسے پژمردہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا ہے آپ کو؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

''ہاں! سب ٹھیک ہے۔بس ذرا سانس کی تکلیف ہو

رہی ہے۔''وہ بدقت بولی۔

صفدر یہ سن کر یکدم ہی بے قابو ہو گیا اور جذباتیت سے سہیل کو کہنے لگا۔''تم گھر پر ہوتے ہو۔دھیان کیوں نہیں دیتے۔پتا ہے ناں کتنی پرانی تکلیف ہے یہ انہیں۔''

''ارے! اس پر کیوں چلا رہے ہو؟ بڑا بھائی ہے وہ تمہارا۔تمیز سے بات کرو۔وہ تو دو دن سے مجھے اسپتال چلنے کے لیے کہہ رہا ہے لیکن میں ہی ایلوپیتھی کی قائل نہیں ہوں۔ سانس کی تکلیف میں آج تک یہ ادویات استعمال نہیں کیں میں نے۔''قمر نے فوراً اسے گھرکا۔

''آپ چلیے ابھی میرے ساتھ!''اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہیں سمجھ کیوں نہیں آ رہی صفدر؟ میں اسپتال نہیں جانا چاہتی۔''قمر کو بھی غصہ آنے لگا۔

صفدر نے اس کی ایک نہ سنی۔وہ آٹو رکشا لے کر آیا اور قمر کو 'صفدر جنگ اسپتال' کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کروا دیا۔کچھ ہی دیر میں اس نے اپنے واقف کار ڈاکٹر تلاش کیے اور اپنی نگرانی میں قمر کا مکمل معائنہ کروایا۔ڈاکٹر نے حسب سابق اسے آکسیجن دے کر انجکشن بھی لگا دیا۔

قمر کو اگلے روز دوپہر کو اسپتال سے چھٹی ملی۔صفدر اسے گھر لے کر جانے کی بجائے مختصر کرے میں لے آیا۔

''یہاں کیوں لے آئے ہو مجھے؟ گھر ہی چلے چلتے ہیں۔''قمر نے دہائی دی۔

''گھر جا کر کیا کریں گی؟ اسکول سے چھٹیاں ہیں لہٰذا ملازمت کا بھی کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔مجھے پتا ہے گھر جا کر آپ دوائی نہیں کھائیں گی اس لیے خاموشی سے میرے ساتھ ہی رہیں کچھ روز۔''اس نے قمر کے لیے کوئی راہ نہ چھوڑی۔

''تم اتنے ضدی کیوں ہو صفدر؟''وہ بے بسی سے بولی۔

''پتا نہیں! لیکن بس میں ایسا ہی ہوں۔''اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنے کمرے میں پلنگ بچھانے لگا۔

''یہاں جگہ بہت کم پڑ جائے گی بیٹا!''قمر نے تشویش سے کہا۔

''دل میں بہت جگہ ہے۔بے فکر رہیں۔''وہ کوئی بھی عذر سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

قمر گہری سانس بھر کے رہ گئی۔صفدر نے اس کی ذمہ داری مکمل طور پر خود سنبھال لی۔اگلے کئی روز تک وہ اسے خود باقاعدگی سے دوا کھلا کر پرہیزی کھانے بھی بنوا تا رہا۔قمر کی طبیعت کے لیے یہ بوجھ ناقابل برداشت تھا۔اس نے زندگی بھر کسی سے اتنی خدمت نہیں کروائی تھی۔بیٹے اور بہو کے لیے اپنی ذات سے پیدا ہونے والے مسائل اسے بے چین رکھتے۔وہ دونوں سینٹ کے فرش پر بستر بچھا کر سویا کرتے تھے۔رات کو کمرے کی بجائے برآمدے میں کھانے کی میز پر اپنا کام کرتے۔قمر نے گھر واپسی کے لیے کتنے ہی عذر کیے لیکن صفدر نے ایک بھی سن کے نہ دی۔وہ اسے کسی نہ کسی طور اپنی گفتگو میں الجھائے رکھتا۔اسے اپنی تحریروں کی بابت بتایا کرتا۔صفدر کے بنائے گئے نانک عوام و خواص میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔

آغاز میں وہ جنم پر وسیم تھیٹر میں کام کرتا رہا۔سیاسی حالات میں تبدیلی پر جب مزدور یونینوں کے لیے پروسیم تھیٹر کا خرچ اٹھانا مشکل ہو گیا تو 'جنم' نے صدر کی ہی تجویز پر 'نکڑ نانک' کرنا شروع کر دیا۔یہ نانک صفدر خود ہی تحریر کرتا تھا۔یہ ڈرامے گلی' محلوں اور بازاروں میں اسٹیج کیے جاتے تھے اور عوام انہیں ٹکٹ کے بغیر بھی دیکھ سکتے تھے۔صفدر نے بے باک انداز میں عوامی مسائل اجاگر کرنے شروع کر دیے۔وہ عوامی تحریکوں میں کام کرنے والوں سے مل کر مسائل کی گہرائی سمجھا کرتا۔اس وقت وہاں کے مزدوروں کی دو معمولی مانگیں تھیں۔چائے کی دکان اور سائیکل کھڑی کرنے کی جگہ۔مالکان سے بات چیت کے بعد بھی جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ انتظامیہ کی جانب سے ہڑتالی مزدوروں پر گولیاں چلا دی گئیں جس کے نتیجہ میں چھ مزدور جاں بحق ہوئے۔اسی واقعہ سے متاثر ہو کر صفدر نے جنم کا پہلا نکڑ نانک 'مشین' تخلیق کیا۔

اس کے بعد 'گاؤں سے شہر تک' اور 'علی گڑھ میں دوبارہ فسادات پھوٹنے پر' 'ہتھیارے' 'احاطہ تحریر میں آئے۔ ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کو منعکس کرتے ہوئے 'عورت' لکھا گیا۔ہر ایک نانک نے پسندیدگی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔اس کے ساتھ ہی وہ تعلیم بالغاں کی کتاب 'کھلتی کلیاں' پر بھی کام جاری رکھے ہوئے تھا۔انہی دنوں صفحتی ہڑتالوں کے دنوں میں 'چکا جام' لکھا گیا۔

''صفدر! میرے بچے! تم تھکتے نہیں ہو اتنا بار

اٹھائے۔'' بیٹے کی زبان سے یہ مصروفیات و کامیابیاں سن کر قمر کہنے لگی۔

''نہیں! تھکاوٹ کیسی؟ مجھے تو مزید توانائی ملتی ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''اچھی خاصی نوکری کرتے ہوئے یہ کس طرف چل پڑے ہو؟''

''سکون ملتا ہے مجھے۔ ایسا سکون جو کہیں کسی ملازمت میں موجود نہیں۔'' اس نے اپنی توجیہہ دی۔

''تم خطروں سے کھیل رہے ہو میرے بچے! تمہارے یہ اشتراکی خیالات کوئی آزار نہ بن جائیں۔ اشتراکیت کبھی متحدہ ہندوستان میں پسند کی گئی نہ ہی تقسیم ہند کے بعد اس کا وجود گوارا کیا جاتا ہے۔'' قمر کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ اسے کیسے قائل کرے۔

''مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں مزدور طبقہ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے مزدور طبقہ سے اپنے رشتے پر فخر ہے۔'' صفدر بے نیازی سے کہنے لگا۔

وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ قمر کے دل سے خدشات ہوا ہو گئے۔ اسے بیٹے کی سوچ و نظریات اور جدوجہد پر فخر بھی محسوس ہوا۔ اس فخر میں ایک سنسنی خیز لذت یہ بھی شامل تھی کہ ہاشمی خاندان میں ایک اور 'باغی' نمو پا چکا ہے۔

☆☆☆

وقت کچھ اور آگے سرکا۔ صفدر کی جدوجہد میں قمر بھی عملی طور پر شریک ہوگئی۔ وہ کٹر ناٹک کو تھیٹر کی ایک زندہ صنف بنانے کے لیے شب و روز محنت کرتا رہا۔ صفدر نے اس موضوع پر کئی مضامین بھی لکھے۔ قمر کو اس کی معاونت کر کے حقیقی معنوں میں لطف آنے لگا تھا۔ وہ ناٹک کے ناظرین میں ایک نئی طاقت کا احساس بجلی کی طرح دوڑتے دیکھتی تو دل میں ایک لہر سی اٹھ کر مضطرب کرنے لگتی کہ خود بھی ان ناٹکوں میں حصہ لینے لگے۔

ان مصروفیات اور کامیابیوں میں وقت تیزی سے بیتتا رہا۔ 1988ء اپنے اختتامی دن طے کر رہا تھا۔ قمر کی طبیعت نے حیران کن موڑ لے لیا۔ وہ یکدم ہی پژمردگی اور وحشت محسوس کرنے لگی تھی۔ مزاج کو بیزاری اور آزردگی کے انوکھے ملاپ نے گھیرا ہوا تھا۔

''کیا معاملہ ہے امی جان؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' صفدر نے تشویش سے دریافت کیا۔

''ہاں! طبیعت تو ٹھیک ہے یا شاید نہیں ٹھیک۔'' وہ الجھے انداز میں بولی۔

''کہیں سانس کا مسئلہ تو دوبارہ شروع نہیں ہوگیا؟'' صفدر کو مزید تشویش نے گھیرا۔

''نہیں! چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ نیا ناٹک کون سا بنا رہے ہو؟'' اس نے موضوع گفتگو تبدیل کرنا چاہا۔

''غازی آباد میں ہی کٹر ناٹک 'ہلہ بول' ہوگا۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ یہ ناٹک لوگوں کو ہلا کر رکھ دے گا۔'' وہ پُرجوش تھا۔

''پروردگار تمہاری ہر مشکل آسان کرے اور تمہیں ڈھیروں کامیابیاں نصیب فرمائے۔'' اس نے دلی دعا دی۔

''آمین! مجھے یقین ہے یہ ناٹک تاریخ رقم کرے گا۔'' صفدر کی آنکھوں میں خوابوں کے ان گنت جگنو چمک رہے تھے۔

قمر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کے دل میں کوئی خلش بار بار اپنے نوکیلے پنجوں سے اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ مزید تکلیف دہ بات تو یہ تھی کہ یہ اذیت اس کے لیے بے حد مانوس تھی۔ اس نے اظہر' اصغر' حمید اور ادریس کی دائمی جدائی سے قبل انہی کیفیات کا آزار مکمل شدت سے جھیلا تھا۔

''الٰہی! میرے بچوں کی حفاظت فرمانا۔ انہیں ہر سرد و گرم سے محفوظ رکھنا۔ ان کی جانب بڑھنے والی گرم ہوا کا رخ کبھی میری طرف کردے میرے مالک۔ بس میرے چراغ کو سدا سلامت اور روشن رکھنا۔'' وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہی لیکن وہ وقت قبولیت کا نہ تھا۔

☆☆☆

1989ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ یکم جنوری کے اس یخ بستہ روز صفدر نے 'ہلہ بول' ناٹک شروع کروادیا۔ عوام بھرپور پسندیدگی و انہماک سے ناٹک دیکھ رہے تھے۔ اس پُرسکون ماحول میں یک دم چند للکاروں اور نفرت آمیز القابات نے ارتعاش سا برپا کردیا۔

''کدھر ہے وہ حرام خور؟ آج اسے سبق سکھا کر ہی جائیں گے۔''

''باہر نکل اوئے غدار مسلے! ہمارے ہندوستان کا ماحول خراب کرنے پر تلا ہے۔'' ایک اور آواز آئی۔

''آج اس کے دماغ کی ساری گرمی نکال کر ہی جائیں گے۔'' دوسری صدا سے ان کے جارحانہ عزائم کا واضح اندازہ ہو رہا تھا۔

صفدر اور دیگر افراد کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ وہ کسی بااثر شخصیت کے بھیجے ہوئے گرگے تھے جو اس کے ناٹک کی مقبولیت اور عوامی موضوعات پر بلبلا کر یہاں بھیجے گئے تھے۔ ان کے یہ خدشات اس وقت مجسم روپ اختیار کر گئے جب انہیں ایک مقامی سیاسی رہنما کی صورت بھی دکھائی دی۔ وہ آتشیں نگاہوں سے صفدر کو گھور رہا تھا۔ اس کے اشارے پر گرگوں نے صفدر پر اپنے ساتھ لائے ہوئے پتھروں کی بارش کردی۔ ڈنڈے اور سریے کا بھرپور استعمال ہوا۔

اگلے چند لمحوں میں وہ اپنے ہی لہو میں نہا چکا تھا۔ ان گرگوں نے ناٹک میں اداکاری کرنے والی لڑکیوں کو بھی اغوا کرلیا۔ حالات شدید منتشر ہوگئے تھے۔ عوام میں پھیلی افراتفری نے صورتِ حال مزید ہولناک بنادی۔ صفدر کو فوری طور پر 'ارون اسپتال' پہنچایا گیا لیکن وہاں سے.... اسکین مشین کی سہولت نہ ہونے کے باعث اسے 'ولنگڈن' لے جانے کی تجویز دے دی گئی۔ صفدر کو بے توجہی سے ایک معمولی کمرے میں داخل کرلیا گیا۔ ڈاکٹر یا طبی عملے کے کسی بھی فرد کا کہیں کوئی نام و نشان نہ تھا۔ راہول' انجو اور دیگر ساتھی سخت بے بسی اور اذیت محسوس کررہے تھے۔ اس روز کئی ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ سینئر نیورو سرجن بھی چھٹی پر تھا۔ صفدر کی حالت دیکھ کر اس کے ساتھیوں سے مزید برداشت نہ ہوا تو ان میں سے ایک نے فون پر کسی ایم پی اے کی آواز کی نقالی کرتے ہوئے ڈاکٹر جین کو اسپتال بلوا لیا۔

''مریض کون ہے بھئی؟'' ڈاکٹر نے آتے ہی صفدر کی حیثیت کا تعین کرنا چاہا۔

''بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔ اس مریض کے ساتھ کوئی بھی بے پروائی بہت مہنگی پڑے گی تم سب کو۔'' اسے واضح لفظوں میں دھمکایا گیا۔

اس اثناء میں قمر بھی اسپتال پہنچ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ بدن بے جان ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہونٹ مسلسل دعا گو تھے۔ صفدر کا... اسکین کرنے سے علم ہوا کہ اسے دماغ میں تین طرف سے چوٹ پہنچی ہے۔ سر کے تین فریکچر ہوئے اور خون بے حد بہہ چکا تھا۔

''صفدر ٹھیک تو ہوجائے گا ناں؟'' راہول نے چلا کر پوچھا۔

قمر کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں مزید تیزی آگئی۔

''ہمیں زیادہ امید نہیں ہے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے پیشہ وارانہ انداز میں بتایا۔

صفدر کے سبھی ساتھی طیش و بے بسی سے بے قابو ہو رہے تھے۔ اس حملے کی اطلاع ہر سو پھیل چکی تھی۔ مزید دوست بھی سراسیمگی میں اسپتال چلے آئے۔ ٹیلی فون' ٹیلی گرام اور ٹیلیکس بھی متواتر آرہے تھے۔ ہر سو ایک بے چینی اور وحشت پھیلی تھی۔

اسی اثناء میں سہیل بھی ڈاکٹر سے ملاقات کے بعد قمر کے پاس چلا آیا۔ اس کا چہرہ بے طرح ستا ہوا تھا۔

''فکر نہ کرو! بالکل فکر نہ کرو!'' قمر نے سرگوشی کی۔ ''مجھے صفدر پر پورا بھروسا ہے۔ اس کی ذات کے ایک ایک ریشے میں زندگی تھرکتی تھی۔ اسے کچھ نہیں ہوسکتا۔''

والدہ کے اس دلاسے پر سہیل اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بے آواز رونے لگا۔ ملیشری بھی ایک کونے میں کسی سنگی مجسمہ کی طرح کھڑی تھی۔ جواں سالہ بہو کو اس حالت میں دیکھ کر قمر کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ دعائیں' دوائیں اور ہر طبی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ صفدر نہایت خاموشی سے محض چونتیس برس کی عمر میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔ قمر کے پانچ چراغوں میں سے روشن ترین چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔ اس کے درد کا کہیں کوئی درماں نہ تھا۔

☆☆☆

صفدر کے قتل کی اس بھیانک واردات سے ہندوستان بھر میں واویلا مچ گیا۔ اس کے جنازے میں پندرہ ہزار افراد نے شرکت کی۔ قمر نے اس صدمے کے باوجود خود کو بکھرنے نہیں دیا تھا۔ وہ پرسہ دینے والے ہر شخص سے ایک ہی بات کہتی۔

''صفدر مرا نہیں ہے، صفدر مر نہیں سکتا، وہ تو ایک سوچ اور نظریہ تھا، سوچ کبھی ختم نہیں ہوتی، وہ ہزاروں' لاکھوں دل و دماغ میں زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔''

تدفین کے بعد ملیشری نے غیر معمولی عزم کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہمت و استقلال کی ایک چٹان ثابت ہوئی تھی۔ اس نے 'ہلہ بول' کو دوبارہ سے شروع کرادیا۔ صفدر کے کئی قریبی ساتھی اس ناٹک کی تکمیل پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ملیشری اور قمر انہیں دلاسہ دیتی رہیں۔

''اس طرح رو کر اس کی روح کو بے چین مت کرو میرے بچو!'' قمر انہیں کہتی۔ ''وہ ایک چراغ نہیں تھا جسے کسی آندھی کا تھپیڑا بجھا دیتا تو راہیں اندھیری ہوجاتیں۔ میرے بیٹے نے عزم و ارادے کے ہزاروں چراغ جلائے ہیں۔''

سفیر کی آنکھیں شعلوں کی مانند چمکنے لگیں۔ وہ ان سب کی ہمت بڑھانے کے لیے ایک ہی شعر بار بار کہتا۔

"سفید اونٹ بچیں گے نہیں تو ہم بھی نہیں بچیں گے۔"

ہر ایک اپنے اپنے انداز میں اس جملے کو دہراتا۔

دلی اور عبادت میں مصروف کے ہمدرد ان کی پکار سن کر جمع ہونے اور اپنے جگر گوشے قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ شاید انھیں کی جانب سے آواز لگائی جانے پر انتظامیہ فوراً میں آئی اور اس کے ذمہ داران کو ہوا کے رخ کے مقصد کو واضح کرایا۔ قمر کے سوئے دل کو کئی بار یہ سمجھانا پڑا کہ یہاں اس کی حیثیت ان لوگوں سے بہت مختلف رہے گی جو کہ اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گے۔ مکمل بھیجے شہلا اور شہزاد کو تسلی دیتے ہوئے کہ تمام کے باوجود مسکراتے ہوئے یہ بات کہی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ فکر کیوں کرتے ہو اگر تم نے مصطفیٰ کے قاتلوں کو نہ پہنچتے دیکھا ہے۔"

"ہم دو دن بہت جلد دیکھیں گے۔ انشاء اللہ بہت جلد ہمیں انصاف ملے گا۔" شہزاد کمزور دل تھا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟" مصطفیٰ جیسے ہر دلعزیز اور پیارے شخص کے ساتھ ایسا سلوک کوئی کس طرح کر سکتا ہے؟" شہلا نے بھی آنکھوں سے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ میں ابھی بھی کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ نہیں مصطفیٰ کے بھتیجہ زندگی سے بھرے ہوئے تھے۔" سکتے کی کیفیت بھی ختم تھی۔ اس نے قمر کی غیر موجودگی میں گھر میں اپنے قبیلے کے دوران اس کی طرح ہی اپنے سب بھائیوں کا خیال رکھا تھا۔

"بیٹا تو بے ہوش۔" قمر نے سر دار آہ بھری۔ "کوئی بھی ہوتے تک بیچتے پھیلے جاتا ہے۔ اپنے پیارے کو دوں کے لیے مصطفیٰ کے پیغام کو آگے بڑھانے کے لیے۔ میرے بچو! چراغ اٹھائے رہو۔ مشعلیں جلائے رہو۔ اپنے دھندے پر قائم رہو اور آنسو پونچھ ڈالو۔ آج مصطفیٰ کو دان کر دو۔ مگر اس کی تصویر کو گلے میں ہار کی کر کے دیتے کو بتا دو کہ ہم مصطفیٰ کو بھولے نہیں ہیں۔ اس کی یاد ہمارے دل میں ہے۔ ہم اس کی یاد میں مشعلوں کا جلوس نکالیں گے جو اندھیروں کا سینہ چیر دے گا۔ جس طرح گوری کے سیروٹو کے دل نے اندھیرے جنگلوں میں روشنی کی شعاعیں پھیلا کر اندھیرے کو دور کیا تھا۔ پھر اس کے محبوب گیت چاروں اطراف گائیں گے۔ ہم اس کی یاد میں ماتم نہیں کریں گے بلکہ ہمیشہ جشن منائیں

گے۔ ہم اس کے گیتوں کو گنگنائیں گے۔ یاد رکھو! ہم اس کے خوشی دن کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ ہم اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات

خوب پڑتی۔ بچپن سے لڑکپن تک یہ سفر بینا انہیں انکھیلوں میں گزارتی گئی۔

☆☆☆

گھر بھر کی لاڈلی اور بھائیوں کی اکلوتی بینا کا تعلق ایک فوجی گھرانے سے تھا، بلکہ اس کے ننھیال اور ددھیال دونوں کے بزرگوں نے 1965 اور 1971 کی جنگوں میں حصہ لیا تھا، وہ جنگوں کی کہانیاں سنتے ہوئے بڑی ہو رہی تھی۔ اس کا بچپن اور لڑکپن فوجی زندگی اور ملک کی حفاظت وعزت کی باتیں سنتے ہوئے پروان چڑھا۔

بینا کے والد یوسف صاحب خود بھی فوج میں جانے کے خواہش مند تھے، لیکن کچھ طبی مسائل کی وجہ سے وہ فوج میں نہ جاسکے۔

اسی وجہ سے ان کا ایک دیرینہ خواب تھا کہ ان کے بچے افواج پاکستان سے منسلک ہوں، اسی سلسلے میں بینا کے دونوں بھائیوں نے کئی بار فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کوشش کی مگر بدقسمتی سے وہ فوجی امتحان میں کامیاب نہ ہوسکے۔

بینا کے اندر جہاں ایک صنف نازک کی خصوصیات تھیں وہاں وہ ایک بہادر صنف آہن بھی تھی۔

یہ 2010ء کی بات ہے جب بینا بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کیمسٹری میں ایم ٹل کررہی تھی۔ تب اس پر یہ بات آشکار ہوئی کہ کیوں نا آئی ایس آئی کے لیے اپلائی کیا جائے اور پھر جب اس نے آئی ایس آئی کے لیے پہلی بار کوشش کرنے کی ٹھانی۔ یہ اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے ایک قابل فخر بات تھی۔ اس امتحان کی تیاری کے لیے یوسف صاحب نے بینا کے ساتھ مل کر خوب محنت کی، بینا کو جسمانی اور ذہنی طور پر فوج کے قابل بنانے کے لیے اس کے والد نے سرتوڑ کوشش کی۔

بینا کی آرزو سراپا دعا بنی ہوئی تھی۔ لاابالی سی بینا اب سمجھدار ہوگئی تھی۔

آخر باپ اور بیٹی کی محنت رنگ لائی اور بینا ایل سی سی سیون ایٹ کی ٹریننگ کے لیے بھرتی ہوگئی۔

جب بینا کو اپنے منتخب ہونے کا خط ملا وہ دن اس کے لیے ناقابل فراموش دنوں میں سے ایک تھا اور بینا کے خاندان کی خوشی انتہا پر تھی۔

یوسف صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خوشی کے شادیانے بجوا ڈالیں۔ خاندان بھر میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ بینا اور اس کے خاندان کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی تھی۔

☆☆☆

ٹریننگ پر جاتے وقت بینا کے ذہن میں کئی بریگیڈ فوجیوں کی سوانح حیات تھیں، جنہوں نے اپنے تجربوں سے بینا کی ذہن سازی کی تھی۔ بینا اس ٹریننگ کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف تھی اور ان سب کے لیے تیار بھی تھیں۔ اس نے خوب محنت کی۔ ٹریننگ کے دوران کئی تھکا دینے والے مرحلے بھی آئے بلکہ مایوس کن حالات بھی پیدا ہوئے، لیکن بینا نے اپنے ارادوں کو متزلزل نہیں ہونے دیا وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی اس کے سامنے روشن منزل تھی۔ آخرکار اس ٹریننگ کو پاس آؤٹ کرنے کے بعد بینا آرمی سے منسلک ہوگئی۔ یہاں آکر بینا کا تعارف بموں سے ہوا۔

☆☆☆

''میں ایک ایسی لڑکی جو ہمیشہ کنگن اور چوڑیوں سے کھیلی تھی، اب بم میرے ہاتھوں میں تھے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میں ایک نوجوان خاتون آفیسر ہوں جو بموں سے کھیلتی ہے۔'' یہ بینا کے وہ جذبات تھے جو بینا نے اپنی ڈائری میں رقم کیے۔

آرمی میں میزائل، روکٹ لانچر اور بڑے بڑے ہتھیاروں کی جانچ پڑتال، اور حفاظت کا ذمہ اس کے شعبے کے افراد کے پاس ہوتا ہے اور بینا ان ہی میں سے ایک شمار کی جارہی تھی، لیکن بطور ایک خاتون اور نوجوان خاتون یہ اس کی خاصیت اور صلاحیت تھی کہ وہ ملکی سطح پر اتنے اہم شعبے سے منسلک ہوئی۔

اسی پڑھائی اور ٹریننگ کے دوران بینا ازدواجی زندگی سے بھی منسلک ہوگئی۔

2018ء میں بینا کے شوہر جو کہ پہلے سے ہی آرمی آفیسر تھے، انہیں بھی ''اے ٹی او'' کورس کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ بینا کے لیے یہ ایک اعزاز کی بات ہے کہ ''یہ دونوں دوسرا پاکستانی افواج کی تاریخ میں جوڑا تھے جسے ''اے ٹی او کپل'' کا اعزاز ملا۔ اس اعزاز کو پانا، اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کورس کو کرنے کے لیے بینا اور اس کے شوہر کو کوئٹہ سے دوسرے شہر آنا پڑا۔ جبکہ اس وقت بینا کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جس میں بیٹی تو صرف چند ماہ کی تھی، اور بینا کو ان دونوں بچوں کو اپنی والدہ کے پاس چھوڑ کر اس کورس کی تکمیل کے لیے آنا پڑا تھا۔

''ایک طرف تو بچوں کی جدائی کا غم تھا جبکہ دوسری طرف یہ خوشی بھی تھی کہ مجھے اعلیٰ تعلیم یافتہ فیکلٹی سے بم کے متعلق بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا ہے، اور اپنے وطن کی حفاظت کے لیے ایک اونچی مسند پر ایک سنہری موقع دیا جارہا ہے۔ مگر میں شکر گزار ہوں اپنے والدین کی جنہوں نے مجھے قدم قدم پر سپورٹ کیا اور اب اس اہم موڑ پر میرے بچوں کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔'' یہ بینا کی ڈائری کا ایک صفحہ تھا جہاں اس نے اپنے جذبات رقم کیے۔

اس کورس کی سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ: ''اس میں اپنے ہاتھوں سے بم ناکارہ کرنے تھے۔ آٹھ مہینوں کے اس کورس کے بعد وہ وقت آیا جب بینا اور اس کے شوہر ایک ساتھ ''بموں کی قبر'' میں اکٹھے بیٹھے تھے۔

ایک ایسا گڑھا جو ناقابل استعمال گولا بارود سے بھرا ہوا تھا، جسے اسٹاف کی رہنمائی سے ٹھکانے لگایا جانا تھا، اس عمل کی کامیابی کے بعد بینا کو آن لائن ٹریننگ پر تعینات کیا گیا اس عمل میں دھماکا خیز مواد سے نمٹنے کا ہر پہلو شامل تھا۔

لانچ کیے گئے میزائل وغیرہ کو ڈسپوز کرنا اس کورس میں شامل تھا۔

2020ء میں بینا کو DRC میں اقوام متحدہ کے امن مشن کے لیے جانے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اگرچہ وہ اپنے خاندان سے ہزاروں میل دور رہی اور ایک مشقت برداشت کررہی تھی، خاص کر کے اپنے بچوں سے دور رہنا ناقابل برداشت تھا لیکن وہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے کہ ''ہر کاتھو بجے میں مجھے اپنے بچوں کی جھلک دکھائی دی۔'' وہاں کئی گھریلو مسائل اور آب وہوا کی بیماریاں دیکھ کر اس کا دل کرتا تھا کہ وہ اس افلاس کو جلدی سے ختم کردیں۔ اسی دوران کوڈ-19 کا بے لگام عفریت نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا وہاں کھانا مانگنے والے بچے بینا سے بھلائے نہیں جاتے۔ پاک فوج اقوام متحدہ کے دائرہ کار کے تحت وبائی امراض سے لڑنے کی اپنی ذمہ داریوں کو انتہائی پختہ ارادوں کے ساتھ نبھا رہا ہے۔

بینا رقم کرتی ہے کہ ''جب تک میں نے وردی نہیں پہنی اور اپنے کندھوں پر بھاری ذمہ داری کا بوجھ محسوس نہیں کیا، میں کبھی نہیں جان سکتی تھی کہ افسر بننا کیسا ہے۔'' یہ احساس مجھے بے پناہ تشکر سے بھر دیتا ہے کہ ''میں ایک ایسے باوقار ادارے میں خدمات انجام دے رہی ہوں، جو بہت سے محب وطن لوگوں کا خواب ہے اور میری اس کامیابی کے پیچھے دو مرد یعنی میرے والد صاحب اور میرے شوہر کا ہاتھ ہے۔ ان دونوں کی محبت، تحفظ اور مجھ پر یقین کی وجہ سے میں نے وہ سب کچھ حاصل کیا جو آج میرے پاس ہے۔''

بینا کی خواہش ہے کہ ''وہ اپنی ان صلاحیتوں کے ذریعے اپنے ملک کے فرائض ادا کرتی رہیں اور یونیفارم پہننے سے جو عزت ووقار اس کو ملا ہے اس کا بدلہ دینے کی کوشش کرے۔''

یہ تھا چوڑیوں سے بموں کا وہ سفر جو نازک اندام لڑکی نے انتہائی جفاکشی سے کیا وہ بیٹی، بیوی اور ماں کے روپ میں رہتے ہوئے ان کامیابیوں کو سمیٹتی گئی اور مزید سمیٹ رہی ہے۔

++

راغب احسن

(1905ء - 1975) تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما اور قائد کے معتمد خصوصی، وہ ضلع ''گیا'' میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی، اپنی سیاسی زندگی کا آغاز خلافت کمیٹی میں شمولیت اختیار کرکے کیا اس پاداش میں جیل بھی کاٹی جیل سے رہائی کے بعد ایم، اے کیا اور اخبار ''اسٹار آف انڈیا'' کے ادارہ تحریر میں شامل ہوگئے جب سرشفاعت احمد نے الٰہ آباد سے انگریزی ہفت روزہ اسٹار جاری کیا تو وہ اس کے ادارہ تحریر میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور انہیں اقوام عالم میں صحیح مقام دلانے میں صرف کی۔ تقسیم سے پہلے وہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن تھے، جہاں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے اور قائداعظمؒ کے ساتھ مل کر انہیں انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ 1931ء میں آل انڈیا یوتھ لیگ بنائی اور اسی اثنا میں میثاق فکر اسلامیت واستقلال ملت کے نام سے ایک فکر انگیز دستاویز مرتب کی۔ 1932ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں سیف الملت کا لقب دیا۔ 1964-1965ء میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب میں مشرقی پاکستان میں بہت کام کیا۔ لاء کمیشن کے رکن کے علاوہ سینٹرل اقبال کمیٹی کے نائب صدر اور سلیمان ندوی اکیڈیمی آف اسلام کے بنیادی رکن تھے۔

مرسلہ: نوید صدیقی، کراچی

صنفِ آہن

اے حفیظ

ہمارا ماضی گواہ ہے کہ صنف نازک ہو کر بھی میدان جنگ میں نمایاں کردار ادا کرنے میں ہماری بہن بیٹیاں کبھی پیچھے نہ رہیں۔ رضیہ سلطان، چاند بی بی، بیگم حضرت محل جیسی پچاسوں معروف مجاہدہ ہیں جنہوں نے میدان جنگ میں دادِ شجاعت دی۔ اس وقت بھی پاک فوج میں اچھی خاصی تعداد میں خواتین شریک ہیں۔ امریکا کی فوج میں بھی اہم عہدوں پر خواتین افسر و سپاہی موجود ہیں۔

میدان جنگ کی سورما خواتین کا مختصر تذکرہ

امریکی فضائیہ میں بہت سے اہم عہدوں پر خواتین خدمات انجام دے رہی ہیں۔ جنگی حکمتِ عملی طے کرتی ہیں، بمبار طیاروں کو ایندھن فراہم کرکے انہیں رواں دواں رکھتی ہیں اور اب تو یہ عالم ہے کہ امریکی فوج سے اگر ان جنگجو عورتوں کو ہٹا دیا جائے تو امریکا کی جنگی صلاحیت بُری طرح متاثر ہوجائے گی، گویا کسی بھی بحران کا مقابلہ ان عورتوں کے بغیر ایک خطرناک آزمائش ثابت ہوسکتا ہے۔

''ساک'' سے وابستہ ایک پوری فضائی کمپنی عورتوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کمانڈر ڈیبی ولکاک ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر امریکا سے کسی کی جنگ ہوتی ہے تو انہیں بر حال میدانِ جنگ کے عین اُوپر یا اس کے قرب وجوار میں رہ کر اپنے فرائض انجام دینا ہوں گے۔ ''واک'' ٹریننگ سینٹر، فورٹ میکلن، الیاما سے فارغ التحصیل خواتین کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔

امریکا کی خواتین سپاہیوں میں ولکاک ہی نہیں، بہت بڑی تعداد میں مختلف عہدوں پر خواتین ہیں۔ کمانڈو طرز جنگ کی ماہر عورتوں کی بھی کمی نہیں۔ کوئی ایک مثال نہیں ہے۔ امریکی فوج میں عورتیں ملاحوں اور پائلٹوں کی حیثیت سے بھی کام کررہی ہیں۔

مختلف النوع خدمات انجام دینے والی ان عورتوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کرتی ہے اور ان کے فرائض زیادہ تر ایسے ہیں جو انہیں میدانِ جنگ سے وابستہ کرتے یا جنگ کے علاقے میں لے جانے کا موجب ہیں۔

حال ہی میں ہونڈراس کی چھاپہ مار جنگ کے دنوں میں ان امریکی عورتوں کو جنگ کے شعلوں کے عین اُوپر پروازیں کرنا پڑیں۔ مغربی جرمنی جو میدانِ جنگ کے لحاظ سے ایک مسلمہ علاقہ ہے۔ اس ملک میں فوجی اڈوں پر عورتوں کی بڑی تعداد کام کررہی ہے۔

یہ عورتیں نہ صرف فوجی اڈوں پر موجود ہیں بلکہ میزائلوں کے پیچیدہ کام بھی کررہی ہیں۔ امریکا کا سب سے ترقی یافتہ طیارہ ''اواکس'' بھی عورتیں اُڑا رہی ہیں۔

جنگی علاقوں میں سپلائی بحال رکھنے کے لیے سازو سامان کے طیارے بھی عورتیں اُڑاتی ہیں۔ ایک خاتون پائلٹ نے لبنان کی جنگ کے دنوں میں امریکی فوجیوں کی مدد کے لیے عین میدانِ جنگ پر اُڑ کر انہیں ساز وسامان فراہم کیا۔

مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ جنگی مشقوں میں بھی خواتین نے سرگرم حصہ لیا۔ اندازہ کیجیے کہ فضائیہ کی تین بڑی ٹیموں کی سربراہ بھی خواتین ہیں۔

جہاں تک قانون کا تعلق ہے تو فضائیہ، بحریہ اور میرین کے ضابطے یہ اجازت نہیں دیتے کہ عورتیں جنگ میں شریک ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ضابطوں کی اب کوئی پرواہ نہیں کی جاتی چنانچہ اب جنگ کے مفہوم کو بدل کر اسے نئے حالات کے مطابق بنایا جارہا ہے۔

عملی حالات نے مسلح افواج کو مجبور کردیا ہے کہ وہ اپنے ضابطوں پر نظرِ ثانی کریں۔ ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ فوج میں عورتوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھی ہے اور اب انہیں نکال کر جنگی صلاحیت کو تباہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔

مزید برآں یہ خواتین انتہائی اہمیت کے نازک فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اس وجہ سے بھی انہیں نکالنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ اس سے جنگی کارکردگی بری طرح متاثر ہوسکتی ہے۔

لہٰذا جنگ کی صورت میں امریکی جرنیلوں کو مجبور ہونا پڑے گا کہ وہ اپنے تمام ضابطوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ کر خواتین کی فوج سے پورا کام لیں۔

گرینیڈا کے بحران میں خواتین کی اس فوج کی ڈرامائی اہمیت کھل کر سامنے آئی۔ یہاں جنگ کے خوں ریز لمحات چار خواتین پائلٹوں نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوج کی سپلائی کو برقرار رکھا۔

ابتدا میں تو یہ کوشش کی گئی کہ خواتین پائلٹوں کو میدانِ جنگ کی طرف نہ لایا جائے چنانچہ تین دفعہ ان خواتین پائلٹوں کو واپسی کا حکم ملا لیکن بالآخر حالات نے ایسی شکل اختیار کرلی کہ انہیں کام کرنے کی اجازت دینا ہی پڑی۔

اس طرح فوج کو اپنی پالیسی ترک کرنا ہی پڑی یا یوں کہہ لیجیے کہ کچھ عرصہ کے لیے اس پالیسی کو نظر انداز کردیا گیا۔ اس سلسلہ میں سارجنٹ ماریانا اینڈرسن نے بتایا۔

''جب ہمیں بالآخر اپنے فرائض انجام دینے کی اجازت ملی تو میں نے محسوس کیا کہ اب پالیسی تو دھری رہ گئی اس وقت مجھے اپنے آپ پر فخر محسوس ہوا کہ ہماری ضرورت کو عملاً تسلیم کرنا پڑا۔''

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ماریان اپنی پہلی پرواز میں نہایت خطرناک حالات سے دوچار ہوئی۔ اس کا طیارہ گھیرے میں لے لیا گیا تھا، لیکن اس نے نہایت دلیری اور مہارت سے اس گھیرے کو توڑا۔

اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مستقبل میں اس سے بھی زیادہ خطرناک مہمیں سرانجام دے سکتی ہے۔ میجر جنرل رابرٹ کا کہنا ہے کہ ''عورتوں کو میدانِ جنگ سے دور رکھنے کے لیے پورے یورپ سے امریکی ہوائی اڈوں کو خالی کرنے کی ضرورت پڑی ہے اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ انہیں اب جنگ سے الگ رکھا جائے۔ ظاہر ہے ہم اپنی طاقت کو تباہ نہیں کرسکتے۔''

اسی طرح جنرل ملڈرڈ کا کہنا ہے۔ ''عورتیں بہر حال اب جنگ میں شامل ہوں گی۔ قطع نظر اس کے کہ ان کے فرائض کیا ہوں گے۔''

جنرل ملڈرڈ خود ایک جرنیل خاتون ہیں جو اس اعلیٰ ترین عہدہ تک اپنی قابلیت سے پہنچی۔ ان کے الفاظ ہیں۔

''ہمیں اپنے نظریات میں مصالحت کا کوئی راستہ نکالنا پڑے گا کیونکہ جب آپ عورتوں کو تربیت دے کر طیارے ان کے حوالے کرتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آخری لمحہ پر ان سے کہا جائے۔ ''دیکھو۔ جانِ من زیادہ اونچا نہیں اُڑنا۔''

فوج اب مجبور ہے کہ عورتوں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرے۔ اس کی بعض وجوہات ایسی ہیں جو فوج کے بس سے باہر تھیں۔ کارٹر انتظامیہ نے 1970ء میں ایک قانون بنا

دیا تھا کہ عورتوں کو بھی بعض نوع کی فوجی خدمات کا استحقاق حاصل ہے۔

قانون کے بعد فوج میں عورتوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ اب امریکی فوج میں عورتوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ کل فوج کا دس فیصد حصہ ہے۔

یہ امر بھی خاصہ دلچسپ ہے کہ فوج کے ٹیکنیکل شعبوں میں مردوں کی تعداد مسلسل کم ہو رہی ہے جب کہ عورتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ خواتین انتہائی پیچیدہ قسم کے مواصلاتی نظام، الیکٹرانکس آلات اور سائنسی کام میں مہارت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

ریگن انتظامیہ نے ایک مرحلہ پر یہ کوشش کی تھی کہ فوج پر عورتوں کے اس بڑھتے ہوئے غلبہ کو روکنے کی کوشش کی جائے چنانچہ ایک جائزہ کے بعد عورتوں کے لیے 23 ایسے شعبے بند کر دیئے گئے جن میں براہ راست جنگ میں حصہ لینے کے امکانات پائے جاتے تھے لیکن جب فوجی ٹیموں نے دنیا بھر کا دورہ کرتے ہوئے امریکی فوجی اڈوں کا جائزہ لیا تو انہیں معلوم ہوا کہ خواتین کی جگہ پر کام کرنے والے تربیت یافتہ مردوں کی تعداد بہت کم ہے۔ خاص طور پر کیمیائی اور انٹی مہارت رکھنے والے مردوں کی تعداد کم تھی۔

اس کے نتیجہ میں عورتوں کے لیے بیشتر شعبے دوبارہ کھول دینا پڑے اور وزیر دفاع نے ایک بیان میں یہ اعتراف کیا۔

''اب ہمیں جنگ کا مفہوم بدلنا ہوگا تاکہ ہم خواتین کی تربیت و مہارت سے استفادہ کر سکیں اور یہ بھی کہ عورتوں کے لیے فوج کے زیادہ سے زیادہ شعبے کھلے رہنا چاہئیں۔''

اس وقت پوزیشن یہ ہے۔ بحریہ میں خواتین، تباہ کن جہازوں پر تو کام نہیں کر سکتیں لیکن تباہ کن جہازوں کے ساتھ وابستہ بعض حصوں میں انہیں کام کرنے کی اجازت ہے۔

بری فوج میں پیدل فوج اور توپ خانہ میں عورتیں شامل نہیں ہو سکتیں لیکن میزائل اور سگنل یونٹوں میں انہیں کام کرنے کی اجازت ہے۔

فوج کے الیکٹرانک جنگی ساز و سامان کی بٹالینوں میں تو عورتیں یونٹوں کی کمانڈر بھی ہیں لیکن وہ پلاٹون لیڈر نہیں بن سکتیں۔

بہرحال، اب خیال یہ کیا جاتا ہے کہ خواتین کو دوسرے شعبوں میں جوان پراب تک بند ہیں شامل کرنا پڑے گا۔ حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس نوع کی تبدیلیاں بہرحال کرنا پڑتی ہیں۔

ساحلی محافظوں میں عورتیں آج کل خاصی بڑی تعداد میں ہیں جب کہ ضابطہ یہ ہے کہ اگر جنگ ہو تو ان عورتوں کو محاذ سے پیچھے ہٹا لیا جائے گا۔ اس نوع کے ضابطے کس حد تک قابل عمل ہیں۔ اس پر ان دنوں قومی دفاعی کمان میں تند و تیز بحث ہو رہی ہے۔

ساحلی محافظوں کے کمانڈر کا کہنا ہے۔ ''میں انہیں پیچھے ہٹانے سے صاف انکار کر دوں گا۔'' ان کا دعویٰ ہے کہ اگر عورت خطرناک سمندر میں پورے بحری جہاز کی کمان کر سکتی ہے تو وہ جنگ میں بھی لڑ سکتی ہے اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بحری جہاز کو عین جنگ کے دوران صرف اس لیے واپس بلا لیا جائے کہ اس کی کمانڈر ایک عورت ہے۔ یہ تو محض ایک اتفاق ہے اس لیے اس ضابطہ کو فراموش کر دینا چاہیے۔''

یہ دلیل بھی دی جا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو جانی نقصان سے بچانے کے لیے انہیں محاذ جنگ سے ہٹانے کی پالیسی اپنائی گئی ہے تو یہ بھی ایک غلط مفروضہ ہے۔

فرض کیجئے کہ اگر یورپ میں جنگ ہوتی ہے تو اس میں ہلاک ہونے والی پانچ صد تعداد لازماً عورتوں کی ہوگی اور اسی طرح پانچ صد عورتیں جنگی قیدی بھی بنیں گی۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دشمن اکثر حالات میں براہ راست محاذ جنگ کے معاون اڈوں کو نشانہ بنایا کرتا ہے۔

اب اگر ایک عورت طیاروں اور لڑاکا طیاروں کو اپنے ٹینکر سے ایندھن فراہم کر رہی ہے تو دشمن کے لیے بمباروں سے بھی پہلے ٹینکر کو تباہ کرنا لازمی ہوگا کیونکہ ایک ٹینکر کی تباہی کا مطلب ہے کئی بمباروں کو ناکارہ کر دیا گیا۔

ان حالات میں اگر کسی سوویت طیارہ کے پاس صرف ایک میزائل ہے اور اس کے سامنے چند بمبار اور ایک ٹینکر (ایندھن فراہم کرنے والا طیارہ) آ جائے تو وہ لازمی طور پر اپنا ایک میزائل ٹینکر پر استعمال کرے گا۔ گویا عورت تو خطرہ میں ہو گی جب کہ بمباروں کے پائلٹ محفوظ ہوں گے۔

فوجی پابندیوں پر سب سے زیادہ پریشانی کا اظہار خود فوج میں کام کرنے والی عورتیں کرتی ہیں۔

''آپ مجھے ایک کام کی تربیت بھی دیتے ہیں اور پھر یہ حکم دیتے ہیں کہ میں یہ کام نہیں کر سکتی صرف اس لیے کہ میں عورت ہوں یہ ایک احمقانہ سی بات ہے۔ یہ تربیت پر خرچ ہونے والی رقم کا ضیاع ہے اور یہ میرے وقت کا بھی ضیاع ہے کہ میں نے اتنا وقت ایک بے کار کام پر صرف کر دیا۔''

++

وقتِ آخر

عنایشہ چوہدری

معروف شخصیات کے وہ الفاظ جو انہوں نے وقت آخر ادا کیے ان الفاظ کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے اسی وجہ سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا تاکہ معلومات میں اضافہ ہو سکے۔

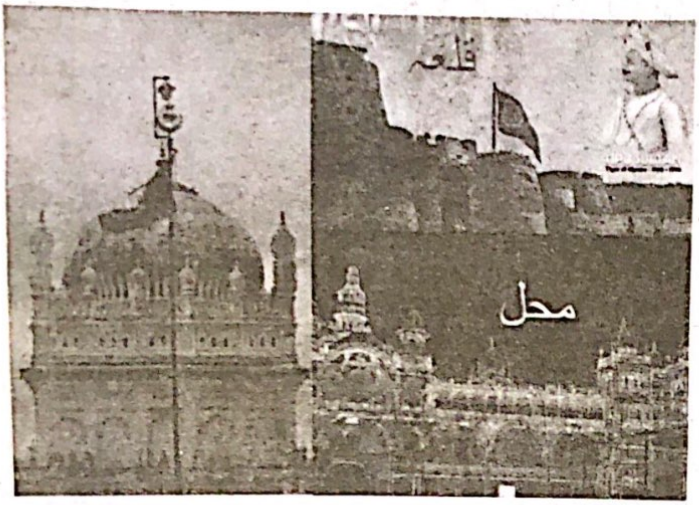

ان الفاظ کو سمجھنے کی ضرورت ہے

آج میں ان معروف ہستیوں کا ذکر کرنے جا رہی ہوں جن کے آخری الفاظ تاریخ کا حصہ بنے۔ سب سے پہلے میں ٹیپو سلطان کا ذکر کروں گی جس کا تعلق ایک ایسے عربی اور قریشی النسل خاندان سے تھا جو حوادث زمانہ کی بدولت مکہ مکرمہ سے بغداد، افغانستان، پنجاب، دہلی اور اجمیر کے بعد گلبرگہ پہنچا تھا۔ ٹیپو کے والد 'حیدر علی' کی عسکری اور سیاسی اہمیت مسلمہ تھی۔ حیدر علی نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ ان کی پہلی شادی انیس سال کی عمر میں صوبہ 'سرا' کے ایک پیرزادہ سید شہباز میاں کی دختر سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون زچگی کے وقت بعض بد احتیاطی کی وجہ سے مفلوج ہو کر مدت

العمر معذور رہی۔ دوسری شادی اس کے کچھ سال بعد ہی پہلی بیوی کے اصرار پر 'کڑپہ' کے گورنر معین الدین خاں کی لڑکی فاطمہ بیگم المعروف بہ فخر النساء سے ہوئی۔ ٹیپو کی والدہ یہی خاتون تھیں۔

فتح علی ٹیپو کی ولادت بیس ذی الحجہ 1163ھ کو بروز سنیچر علی الصبح 'کولار' کے شمال مغرب میں بنگلور سے تینتیس کلومیٹر دور شمال میں دیوان ہلی نامی قصبہ میں ہوئی۔ ولادت کے بعد حیدر نے اسے اپنے والد کا نام 'فتح علی' دیا۔ ٹیپو نام کے اضافے کی بابت البتہ متفرق روایات ملتی ہیں۔ دوسری شادی کے بعد جب ایک طویل عرصہ تک اولاد کے آثار نظر نہیں آئے تو وہ فخر النساء کے ہمراہ دعا مانگنے کے لیے 'ارکاٹ' کے مشہور بزرگ 'مستان ٹیپو' کی درگاہ پر حاضر ہوئے۔

دوسری روایت یہ ملتی ہے کہ پہلی بیوی کو زچگی کے وقت بہت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے دوسری بیوی کے لیے ولادت کے موقع پر آسانی و سہولت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی غرض سے انہوں نے ارکاٹ کے ولی ٹیپو مستان شاہ کے مزار پر حاضری دی۔ دعا قبول ہوگئی اور زچگی کا مرحلہ یہ آسانی مکمل ہوگیا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ حیدر علی کو اولاد نرینہ کی خواہش وتمنا تھی اس لیے انہوں نے مستان شاہ ٹیپو کی درگاہ میں حاضر ہو کر اللہ سے بیٹے کی ولادت کی دعا کی۔ بعد ازاں حیدر نے بچے کا نام اسی بزرگ کے نام پر ٹیپو اور والد فتح محمد کے نام پر فتح علی رکھا۔

فرزند کی ولادت پر حیدر علی نے چالیس دن تک خوشی کا جشن منایا۔ اس وقت وہ میسور کے حکمران نہیں بنے تھے۔ ان کے پاس میسور کی فوج کا صرف ایک اعلیٰ عہدہ تھا۔ اس کے باوجود شہر بھر کی دعوت کی گئی۔ فقراء ومساکین میں رقم تقسیم کی گئی۔ حکومت کے عہدیداروں اور فوج کے ملازمین کو اپنی طرف سے خصوصی انعامات دیے۔

ٹیپو کی ولادت حیدر علی کے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی۔ ان کا ستارہ اقبال یکدم ہی چمک اٹھا تھا۔ وہ دو سال کے اندر ڈنڈیگل کے گورنر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد فوج کی سپہ سالاری سونپی گئی اور اگلے دس سال میں وہ پوری ریاست میسور کے والی بن گئے۔

ٹیپو کی عمر پانچ سال ہوئی تو حیدر علی نے خود ناخواندہ ہونے کے باوجود اس زمانہ کے رواج کے مطابق سب سے پہلے بیٹے کی دینی تعلیم کا بندوبست کیا۔ قرآن پاک اور عربی وفارسی زبان دانی کے لیے معلم مقرر کیے گئے جن میں اس زمانہ کے مشہور عالم وشاعر علی حسین اور نصیر الدین بھی شامل تھے۔ اس کے بعد حدیث وفقہ وغیرہ کی تعلیم دی گئی۔ کنڑو دیگر مقامی زبانوں کے علاوہ انگریزی وفرانسیسی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا۔ ٹیپو فطری طور پر بہت ذہین تھا اس لیے جلد ہی ان تمام علوم وفنون میں ماہر ہوگیا۔ حیدر علی نے اس کی بہترین جنگی فنون 'شہسواری' 'تیراندازی' 'سپہ گری وغیرہ کی تربیت کے لیے غیر ملکی ماہرین بھی مقرر کیے۔ اس کے حکم پر میسور کی فوج کے ایک لائق وقابل افسر 'غازی خاں' نے بھی ٹیپو پر خصوصی توجہ دی۔

ٹیپو کی عمر جب سات سال ہوئی تو اس نے ایک انوکھے واقعہ کا سامنا کیا جس نے ایک طرف اس کے ذہن میں کئی سوال والجھنیں پیدا کیں تو دوسری جانب اپنے بہترین مستقبل کے لیے مثبت تحریک بھی فراہم کردی۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک روز وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ سری رنگا پٹنم میں کھیل رہا تھا کہ وہاں سے ایک فقیر کا گذر ہوا۔ وہ ٹیپو کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا اور ساکت کھڑا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ٹیپو اس کی جانب متوجہ ہوا تو وہ نرمی وملائمت سے کہنے لگا۔

''اللہ تجھے سلامت رکھے! تیرے بخت میں بادشاہت دکھائی دے رہی ہے۔ جب تجھے بادشاہت ملے تو اس جگہ ایک مسجد تعمیر کرنا۔''

ٹیپو نے کچھ ناسمجھی کے عالم میں محض احتراماً اثبات میں سر ہلا دیا۔ (بعد ازاں جب اسے حیدر علی کی وفات کے بعد جانشینی ملی تو اس نے فقیر کی ہدایت کے بموجب ایک 'مسجد اعلیٰ' نامی ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروادی۔)

ٹیپو کو گھڑسواری بہت پسند تھی۔ اسے پالکی میں سوار ہونا سخت معیوب اور مردوں کی شان کے خلاف محسوس ہوتا۔ مختلف ماہرین علم وفن کی نگرانی میں تعلیم وتربیت کا یہ سلسلہ ٹیپو کی جنگوں میں شرکت کے باوجود اکیس سال کی عمر تک چلتا رہا۔

حیدر علی نے اسے تمام جنگی مہمات میں اپنے ساتھ ہی رکھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر تک پہنچتے وہ ایک قابل سپاہی اور لائق افسر بن گیا تھا۔ مختلف مہمات میں اس کی جرأت و بہادری سے متاثر ہو کر حیدر علی نے اسے اپنی ذاتی سلامتی کے لیے متعین پانچ سو فوجیوں کا افسر بھی مقرر کردیا۔ اس کے بعد حیدر علی نے بیٹے سے ایک خصوصی اقرار نامہ تحریر کروایا

تاکہ اسے مکمل نظم وضبط میں مقید رکھ سکے۔ ٹیپو نے بلا چوں چرا یہ اقرار نامہ رقم دیا۔ شرائط ملاحظہ ہوں۔

☆ خداوند نعمت کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کروں گا ورنہ جو سزا مناسب سمجھی جائے دی جائے۔

☆ اگر سرکاری خزانہ میں چوری یا غبن کروں تو پھانسی کی سزا دی جائے۔

☆ جھوٹ اور دھوکا دہی پر پھانسی کی سزا دی جائے۔

☆ والد کی اجازت کے بغیر کسی سے کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہیں کروں گا ورنہ ناک کاٹ کر جلاوطن کردیا جائے۔

☆ امور سلطنت کے علاوہ اور کسی معاملہ میں کسی سے الجھوں تو پھانسی کا مستحق ہوں۔

☆ اگر حکومت کی طرف سے میرے ذمہ کوئی کام لگایا جائے یا میری کمان میں فوج دی جائے تو ان متعلقہ لوگوں کے مشورہ ہی سے اپنے فرائض کو پورا کروں گا جنہیں سرکار کی طرف سے اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بصورت دیگر پھانسی کا مستحق ہوں۔

☆ کسی سے خط وکتابت یا لین دین آپ کی طرف سے مقرر کردہ مشیروں کی رائے سے ہی کروں گا۔

☆ یہ چند جملے اپنی مرضی سے لکھ کر اس کو ذہن نشین کر رہا ہوں۔ ساتھ ساتھ اس کا اقرار بھی کرتا ہوں کہ تمام کام اسی کے مطابق انجام دوں گا ورنہ جو مناسب سزا سمجھی جائے دی جائے۔

حیدر علی نے بیٹے کی شادی بھی بہت جلد کروا دی۔ والد کی وفات کے بعد 1782 میں جب ٹیپو نے عنان حکومت سنبھالی تو رعایا کے نام جاری کردہ پہلے سرکاری فرمان میں ہی اس کے نیک عزائم' رعایا کی خدمت کے جذبات اور حسن نیت وہمدردی کا عکس دکھائی دینے لگا۔ اس فرمان کا مضمون کچھ یوں تھا۔

☆ میں سلطان ٹیپو بحیثیت حکمران ریاست میسور سلطنت خداداد اس بات کو اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں کہ بلا تفریق مذہب وملت اپنے رعایا کی اخلاقی اصلاح کروں۔

☆ ان کی خوشحالی اور معاشی وسیاسی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہوں۔

☆ آخری دم تک سلطنت خداداد کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کروں۔

☆ مسلمانوں کی دینی واخلاقی بنیادوں پر اصلاح کے لیے خصوصی قدم اٹھاؤں گا۔

☆ انگریزوں کو اس ملک سے باہر کرنے کے لیے جو ہمارے حقیقی دشمن ہیں پورے ہندوستان کے لوگوں کو متحد کروں گا۔

☆ مظلوم وبے بس عوام کو جاگیرداروں اور زمینداروں کے ظلم وستم سے نجات دلاؤں گا اور عدل و انصاف کی بنیاد پر ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کروں۔

☆ ملک کے باشندوں کے درمیان پائی جانے والی مذہبی' لسانی وطبقاتی عصبیت کو ختم کر کے ملک کی دفاع کے لیے ان سب کو متحد کروں گا۔

☆ بوقت ضرورت مادر وطن کی حفاظت کے لیے غیر ملکیوں سے بھی فوجی تعاون سے دریغ نہ کروں گا۔ سلطنت میسور میں غیر ملکی تجارت ومصنوعات کو ممنوع قرار دے کر خود یہاں کے تاجروں کی ترقی وخوشحالی کی فکر کروں گا۔

ٹیپو سلطان کو حکومت سنبھالنے پر انگریزوں کی دشمنی وراثت میں ملی تھی۔ ان دونوں فریقین کی یہ رسہ کشی بلا تعطل جاری رہی تاوقتیکہ یہ انگریز یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے کہ وہ صرف اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس کے خلاف فتح یاب نہیں ہو سکتے۔ ٹیپو سلطان کو صرف اس کے سپاہیوں اور عہدیداروں کی وفاداریاں خرید کر ہی شکست دی جاسکتی ہے۔ غداروں کی تلاش کی یہ اہم مہم کرنل ریڈ کو سونپی گئی جس نے نہایت ایمانداری سے اپنا یہ فریضہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ ایک دو نہیں پچاس سے زائد اہم عہدے داروں نے انگریزوں سے ساز باز کرلیا۔

انگریزوں نے چار مئی 1799ء کی صبح 'جنرل بیرڈ' کی قیادت میں اپنے منصوبہ کے مطابق مغربی محاذ سے جنوب میں قلعہ کے اس حصہ پر حملہ کردیا جہاں پہلے ہی شگاف پڑ چکا تھا۔ سلطان کو مصروف رکھنے کے لیے شمال سے بھی یلغار کی گئی جہاں سلطانی محل موجود تھا۔ طے شدہ منصوبہ اور سازش کے مطابق شگاف کی حفاظت پر متعین سلطانی افواج کو 'میر صادق' نے پورنیا سے مل کر تنخواہ کی تقسیم کے بہانے مسجد اعلیٰ بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد میر معین الدین نے سمجھوتا کے مطابق سفید رومال ہلا کر انگریزوں کو شگاف کے خالی ہونے کی اطلاع دے دی۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس طرف متعین پانچ ہزار انگریز سپاہیوں میں سے صرف درجن بھر دشمن کے سپاہی دو دستوں میں بلا مزاحمت فصیل پر چڑھ

کر قلعہ میں بہ آسانی داخل ہو گئے۔ اس کے بعد پوری فوج بہ آسانی قلعہ میں گھس گئی۔

ٹیپو سلطان تک جب یہ اطلاع پہنچی تو وہ اس وقت مختلف فصیلوں کا معائنہ کرکے ایک سایہ دار درخت کے نیچے دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ اطلاع ملتے ہی وہ ہاتھ دھوئے بغیر ہی اٹھا اور اپنا 'طاؤس' نامی گھوڑا منگوا کر ہتھیار باندھ لیے۔ ٹیپو سلطان تیزی سے ڈوڈی دروازہ سے باہر نکلا اور دہلی دروازے تک پہنچ گیا۔ انگریزی فوج سے اس کا مقابلہ بہت دیر تک جاری رہا تاہم دشمنوں کا ہجوم بڑھتے ہی اسے واپس شہر میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آ گئی۔ میر صادق نے جب سلطان کو ڈوڈی دروازہ کی طرف واپس آتے دیکھا تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور خود کمک لانے کے بہانے باہر نکل گیا۔ سلطان کے پاس اب شمالی دروازہ کا رخ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر علم ہوا کہ میر معین الدین کی غداری سے دشمن اس دروازہ کے علاوہ شرقی و جنوبی فصیل پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ قلعہ دار نے بھی دروازہ کھولنے کی درخواست مسترد کر دی۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ سلطان تینوں اطراف سے محصور ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ دلیری سے لڑتا رہا۔ اس کی فائرنگ سے دشمن کے پانچ سپاہی مارے گئے۔ دوسری جانب اس پر بھی گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ جاری تھی۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود استقامت کا مظاہرہ کرتا رہا۔

اب مغرب کا وقت قریب تھا۔ گھمسان کا رن تھا۔ ہر جانب لاشوں کا ڈھیر تھا۔ ٹیپو اس صورت حال سے مایوس ہونے کی بجائے داد شجاعت دینے میں مگن تھا۔ اسی اثناء میں اس کے ایک نومسلم خادم راجا خاں نے اسے صدا دی۔

''حضور! اگر آپ اب بھی اپنی جان کی حفاظت کے لیے خود کو دشمن کے حوالہ کر دیں تو وہ آپ کی جان بخش دیں گے۔''

ٹیپو یہ الفاظ سن کر جلال میں آ گیا۔ اس نے طیش میں بہ آواز بلند جواب دیا۔ ''میرے نزدیک شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد سلطان کے گھوڑے طاؤس کی پیٹھ میں بھی گولی آ گئی۔ گھوڑے کے گرنے سے سلطان بھی زمین بوس ہو گیا۔ اس کی دستار سر سے الگ ہو گئی تھی۔ ٹیپو سلطان نے پا پیادہ ہی دشمن کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی تلوار انگریزوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی۔ اس دیوانہ وار ہمت کے مظاہرے سے قطع نظر گولیوں کے دو شدید زخموں سے اب ٹیپو کی طاقت نقاہت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ وہ تاسف و غم سے اپنے سپاہیوں کی سعی لاحاصل دیکھ رہا تھا جو انہیں انگریزوں پر گولے پھینکنے کی صورت میں درپیش تھی۔ ان گولوں میں بارود کی بجائے میر صادق کی سازش سے مٹی بھری ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں انگریزوں کو نقصان پہنچتا بھی تو کیونکر؟

دوسری سمت غدار کھل کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان کی اطلاع پر دشمن پوری قوت سے اس جگہ سمٹ آیا تھا جہاں ٹیپو ان سے برسرپیکار تھا۔ پیاس اور لہو کے مسلسل اخراج کے باعث ٹیپو کی حالت ناگفتہ بہ ہونے لگی۔ اسی اثناء میں کسی غدار نے اس کی جانب اشارہ کیا اور قلعہ کی فصیل سے گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ ایک گولی ٹیپو کے سینے میں آ گئی۔ وہ نیم جان ہو کر زمین بوس ہوا تو لہو کا اخراج مزید تیز ہو گیا۔ قریب ہی کھڑے ایک انگریز سپاہی نے جب یہ منظر دیکھا تو سلطان کو مردہ سمجھتے ہوئے اس کی کمر سے ہیروں سے جڑے قیمتی شمشیر بند اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹیپو نے اپنی ہمت مجتمع کی اور اس سپاہی پر وار کر دیا۔ وہ سپاہی اپنی بندوق بطور ڈھال استعمال کرکے بچ تو گیا تاہم اس کی بندوق دو ٹکڑے ہو گئی۔ سلطان کے دوسرے وار سے قریب کھڑا ایک اور سپاہی جہنم واصل ہو گیا۔ اس دوران دور سے کسی دشمن نے اس کی کنپٹی کو نشانہ بنا کر گولی داغ دی جو اس کے دائیں کان کے ذرا اوپر لگی۔ ٹیپو کی قوت برداشت اب ختم ہو گئی تھی۔ یہ زخم مہلک ثابت ہوا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ جنرل ہارس اس کی لاش دیکھ کر فرط مسرت سے چیخ اٹھا۔ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔''

آزاد ریاست میسور محکوم بن گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ٹیپو سلطان کے علاوہ اتنی طویل جنگیں کسی اور نے نہ لڑیں۔ انگریزوں نے میسور پر قبضہ کرنے کے بعد عوام کا دل جیتنے کے لیے ایک حیرت انگیز اعلان کرا دیا۔ انہیں خبر تھی کہ عوام ٹیپو سلطان کو حاکم نہیں ولی اللہ مانتی تھی۔ کہیں عوام بھپر نہ اٹھے اسی لیے اگلے روز پانچ مئی 1799ء کو جنرل ہارس نے اسلامی رسومات کے مطابق ٹیپو سلطان کی تجہیز و تکفین کی اجازت دے دی۔ اس کی لاش دیدار عام کے لیے محل میں کھلی جگہ پر رکھی گئی۔ آخری دیدار کے لیے بلاتفریق مذہب

و ملت عوام وہاں امڈ آ رہے تھے۔ ظہر سے پہلے غسل کے بعد مکہ کے بنے ہوئے خصوصی کپڑوں کا کفن پہنایا گیا۔ زوال آفتاب کے بعد جنازہ محل سے روانہ ہوا۔ محل، گلیاں اور بازار سنسان تھے۔ جنازہ میں سب سے آگے قاضی شہر بہ آواز بلند قرآنی آیات پڑھ رہے تھے۔ عقب میں شرکاء یہ آیات دہراتے رہے۔ راستہ میں ہر مذہب و ملت کے لوگ اس جنازہ کا حصہ بنتے رہے۔ ہندو عورتیں اپنے سروں پر مٹی ڈال کر ماتم کناں تھیں۔ مسلمان خواتین جنازہ دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتیں اور اپنے سروں کے بال نوچتی رہیں۔ ٹیپو سلطان کو 'لال باغ' میں حیدر علی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ تدفین کے بعد شہزادوں کی جانب سے مساکین میں پانچ ہزار روپے ایصال ثواب کے لیے تقسیم کیے گئے اور یوں ہندوستان میں برطانوی دخل اندازی کے خلاف مزاحمت کا آخری در بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

☆☆☆

الناصر صلاح الدین بن یوسف بن ایوب نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کے مشہور ترین فاتحین میں سے ایک ہیں۔ ان کی پیدائش 1138ء میں موجودہ عراق کے شہر تکریت میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت کے لیے اس دور کے بہترین علماء کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اوائل عمری ہی سے ان کی فطرت میں پاکبازی، تقویٰ، طہارت، جرأت اور حوصلہ کا بیج بو دیا گیا اور اسے یہ باور کروایا گیا کہ دنیائے اسلام اس وقت ایک تیرہ و تار دور سے گزر رہی ہے۔ عیسائیت اسلام کا چراغ گل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

ذہنی تربیت سے پروان چڑھتے صلاح الدین کا بچپن قرآن کی تعلیم میں صرف ہوا تو شباب حدیث، فقہ، تفسیر اور دوسرے مذہبی علوم کی تکمیل کرتے گزرا۔ وہ دیگر امراء کی اولاد کی طرح اسراف، شکار یا دوسری امیرانہ تفریحات میں نہیں الجھتا تھا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ ایک کامیاب سپہ سالار ثابت ہوا۔

صلاح الدین ایوبی کے بارے میں ہر کس و ناکس یہ بات جانتا ہے کہ وہ ایوبی سلطنت کا بانی تھا۔ اس کی زیر قیادت ایوبی سلطنت نے مصر، شام، یمن، عراق، حجاز اور دیار بکر پر حکومت کی۔ اس کے علاوہ صلاح الدین نے اٹھاسی برس بعد بیت المقدس پر دوبارہ قبضہ کرکے تمام فلسطین سے مسیحی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ صلیبی جنگوں میں

عیسائیوں کو ناکوں چنے چبوائے اور ایک بہترین اسلامی حکومت کی بنیاد بھی رکھی۔ تاہم ان کی سیرت اور کردار کے بہترین اوصاف سے کم ہی افراد واقف ہوں گے۔

صلاح الدین کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا شوق جہاد تھا۔ انہیں بادشاہت، اس کے لوازمات اور شان و شوکت کی قطعی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے مصر، حلب، دمشق، موصل، جزیرہ، فلسطین اور تمام دوسرے علاقے بھی اس لیے فتح نہیں کیے تھے کہ انہیں وسعت سلطنت اور مال و دولت حاصل ہو۔ ان کے پیش نظر عالم میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام کی سربلندی اور اسلامی نظام کا نفاذ تھا۔ اس نے محلات میں زندگی گزارنے کی بجائے خیمہ کی زندگی کو ترجیح دی۔ خوبصورت کنیزوں کے جھرمٹ پر چمکتی ہوئی تلواروں کو فوقیت دی۔ انہیں اچھی خوراک، لباس اور رہائش کی بالکل طمع نہ تھی۔ انہوں نے عمر بھر جہاد کے لیے اور اس کی تیاری و اہتمام کے سوا کسی ذاتی کام پر ایک پائی صرف نہ کی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے کردار کا ایک اور نمایاں وصف ان کا حوصلہ، رعب، شجاعت و جرأت تھی۔ انہوں نے کبھی کسی مصیبت سے گھبرانا سیکھا ہی نہیں تھا۔ سخت سردی، تند و تیز ہوا میں بھی میدان جنگ میں ہی کھڑے رہتے۔ قلیل جماعت کے ساتھ کثیر فوج سے ٹکرانے میں انہیں کبھی کوئی عار محسوس نہ ہوا۔ ان کا ایمان تھا کہ تھوڑے سے ایماندار بہت سے بے ایمانوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ انہوں نے یورپی اقوام کے خلاف حطان کی جنگ میں بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ چھ لاکھ دشمن کی فوج کا مقابلہ کیا۔ ایک

معرکہ میں وہ اس قدر بیمار تھے کہ سارا جسم خرابی خون کے باعث پھنسیوں اور پھوڑوں سے بھر چکا تھا۔ پھوڑوں کی تکلیف سے وہ بستر پر بیٹھنے تک سے قاصر تھے لیکن اس کے باوجود جنگی ضروریات انہیں ہمہ وقت گھوڑے پر سوار رکھتیں۔ فوج کے سرداران کی علالت کے پیش نظر انہیں بستر میں آرام کرنے کا مشورہ دیتے تو وہ ہنستے ہوئے نہایت باوقار انداز میں جواب دیتے۔

''مجاہد کے لیے گھوڑے کی پیٹھ سے زیادہ آرام دہ بستر اور کیا ہوسکتا ہے بھلا؟ میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھتا ہوں تو اپنی ساری تکلیف بھول جاتا ہوں۔ میں میدان جنگ میں پیدا ہوا تھا اور یہیں مرنا چاہتا ہوں۔''

صلاح الدین نے عمر بھر کبھی کسی غیر مسلم سے زیادتی نہیں کی۔ جنگ حطان میں عیسائیوں کو شکست دینے کے بعد بے شمار قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ ان میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے جنہیں فوری طور پر رہا کر دیا گیا اور بقیہ ماندہ قیدیوں کو نہایت تکریم کے ساتھ دمشق بھیج دیا گیا۔ بیت المقدس فتح کرنے کے بعد بھی انہوں نے شہر والوں کے امان طلب کرنے پر سب کو معاف کر دیا۔ زر مخلصی دس دینار طے پایا۔ جن کے پاس رقم نہ تھی انہیں خود اپنی طرف سے آزاد کر دیا۔ ان کی یہ مذہبی رواداری تیسری صلیبی جنگ کی طوالت کا باعث بھی بنی تھی تاہم انہیں کبھی اپنی اس فیاضی پر افسوس نہ ہوا۔ انہوں نے ہر مقام پر عیسائیوں کو اس بات کی پوری اجازت دی کہ اگر وہ چاہیں تو ذمیوں کی حیثیت سے مفتوحہ شہروں میں رہ سکتے ہیں اور چاہیں تو عیسائی علاقوں میں جاسکتے ہیں۔

صلاح الدین اپنے ماتحتوں اور نجی ملازموں کے ساتھ انتہائی شفقت و مہربانی سے پیش آتے۔ انہوں نے کبھی کسی خطا پر کسی بھی ملازم کو سزا نہ دی۔ وہ اکثر اپنے عمال کے بڑے جرائم بھی معاف کر دیا کرتا تھا۔ خیانت جیسے قبیح فعل سے بھی کئی بار چشم پوشی برتی۔ قدرت کی کرنی ایسی ہوتی کہ انہوں نے جس کسی کا بھی جرم معاف کیا اس نے عمر بھر کے لیے توبہ کرلی۔

صلاح الدین کے اردگرد ہمیشہ ضرورت مندوں کا ایک حلقہ سا بندھا رہتا۔ ان کی فیاضی و سخاوت اس قدر شدید تھی کہ بسا اوقات اپنی معمولی ضروریات کی چیزیں بھی دوسروں سے مانگنی پڑتیں۔ اس کے باوجود وہ کسی بھی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ کسی سائل کے سوال کو رد کیا ہو۔ صلاح الدین تنگی و فراخی دونوں حالات میں نہایت سخی تھے۔ خزانچی بھی اس عادت سے واقف تھے اس لیے وہ شدید ضرورت کے وقت خرچ کے لیے کچھ نہ کچھ بچا کر ضرور رکھتے۔ صلاح الدین کو جب بھی ان کی اس حرکت کا علم ہوتا تو وہ اپنی سخاوت کی رفتار تیز تر کر دیتے۔ اس کا کہنا تھا۔

''دنیا میں ایک ایسا بھی آدمی ہونا چاہیے جو دولت کو کوئی اہمیت نہ دے۔ یہ دولت میری جاگیر بالکل نہیں ہے۔ یہ تو غریبوں اور حاجت مندوں کا حق ہے۔ میں تو صرف خزانچی ہوں۔ میرے پاس جو رقم آتی ہے وہ غریبوں اور محتاجوں کے لیے آتی ہے۔ محتاج اور مفلس میرے پاس مانگنے آتے ہیں تو وہ مجھ سے اپنا حق مانگتے ہیں۔ خزانچی کی بھلا کیا مجال کہ وہ ان کے جائز حقوق ادا نہ کرے۔''

صلاح الدین کی فیاضی صرف مال و زر کی تقسیم تک محدود نہ تھی۔ وہ بڑے بڑے شہر بھی خیرات کر دیا کرتے تھے۔ اس 'عزاز' شہر اور دیگر علاقے بہت وقت قبل فتح کیے تھے۔ کچھ عرصے بعد نورالدین زنگی کی بیٹی دربار میں چلی آئی۔ صلاح الدین نے بہت متانت' خلوص اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور شفقت سے دریافت کیا۔ ''بیٹی! کیا مانگتی ہو؟''

''عزاز مانگتی ہوں جہاں پناہ!''

اس جواب پر صلاح الدین مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ جانتے تھے سلطان نورالدین زنگی کی اس یتیم بیٹی کو اس کے بھائی الملک الصالح کے حاشیہ نشینوں نے یہ سب سکھا پڑھا کر بھیجا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے محسن کی بیٹی کو ٹال نہ سکے اور اسی وقت کہہ دیا۔ ''بیٹی! ہم نے عزاز تمہیں بخشا۔''

صلاح الدین کی فیاضی کی یہ عادت رفتہ رفتہ راسخ ہوتی جارہی تھی۔ وفات سے قبل انہوں نے شاہی خزانہ تقسیم کر دیا۔ بعدازاں خزانہ میں صرف ایک دینار اور سینتالیس درہم باقی بچے تھے۔ ان کی کوئی ذاتی جاگیر بھی نہ تھی۔

سلطان کی یہ فیاضی صرف وقتی ضروریات کی تکمیل تک محدود نہ تھی۔ اس نے اپنی دولت سے رفاہ عامہ کے بھی بہت سے کام کیے تھے۔ ان کے حکم سے مصر اور شام کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں مدارس قائم کیے گئے۔ ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے تمام اخراجات شاہی خزانہ سے ادا کیے جاتے۔

مدارس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی قلم رو کے ہر حصہ

میں شاندار سرائیں اور شفاخانے بھی بنوائے۔ ان کے تمام اخراجات بھی شاہی خزانہ سے ہی ادا کیے جاتے۔ صلاح الدین کی مصر آمد کے وقت یہاں مدارس کا کوئی بہتر انتظام نہ تھا۔ انہوں نے حضرت شافعیؒ کے مزار کے پاس ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کروایا اور اس دور کے مشہور و معروف ماہرین تعلیم کو تعلیم دینے کے لیے مقرر کیا۔ تمام ماہرین تعلیم طلباء کی رہائش' کھانے اور دوسری ضروریات کا خرچ شاہی خزانہ سے ادا کیا جاتا۔ اس کے بعد 'مدرسہ شافعیہ' کے نام سے بھی ایک درس گاہ تعمیر کروائی۔ یہ سلسلہ یہیں تک محدود نہ رہا۔ بعدازاں وقتاً فوقتاً مالکیہ' قمحیہ' زین التجار' شریفیہ' سوقیہ نامی مشہور مدارس کی تعمیر بھی صلاح الدین کی ہی مرہون منت تھی۔ ان مدارس میں اس دور کے اہم اور نامور علماء علامہ ابن خلدون' علامہ نجم الدین' حافظ ابن حجر اور علامہ جلال الدین سیوطی بھی درس دیا کرتے تھے۔

سلطان نے مصر میں کئی سرائیں' خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ دمشق میں بھی بے شمار مدارس اور سرائیں بنوائیں۔ انہوں نے ان سبھی تعمیرات کو اپنے نام سے بھی منسوب نہ کیا بلکہ دوسرے بزرگوں کے ناموں سے شہرت دیے۔ وجہ بہرحال صرف یہی تھی کہ ان کے نام کی شہرت ثواب آخرت کو کم کرنے کا موجب نہ بن جائے۔ مصر میں ہی قائم کردہ قاہرہ کا شفاخانہ اپنی انتظامی سہولیات کی بناء پر بے مثل تھا۔

صلاح الدین کو تلاوت قرآن پاک سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اکثر فرصت کے لمحات میں خود بھی نہایت شوق سے قرآن کی تلاوت کرتے اور دوسروں سے بھی سنتے۔ عموماً ہر رات وہ تین تین سیپارے پڑھوا کر سنتا تھا۔ اس کے علاوہ دن کے اوقات میں بھی اکثر قرآن سنا کرتا۔ بہت سے مشہور اور فاضل قاری اسی غرض سے پرکشش تنخواہوں پر ملازم رکھے گئے تھے۔ ایک روز اس کا گذر کسی ایسی جگہ سے ہوا جہاں کوئی خوش الحان بچہ قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ صلاح الدین کو اس کی تلاوت اتنی پسند آئی کہ لڑکے کو اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ اس کے ہمراہ بیٹھ کر کھایا پیا اور اس کے والد کو انعام میں ایک گاؤں بخش دیا۔ تلاوت کے وقت اس کے دل کا گداز اس قدر بڑھ جاتا کہ وہ زار و قطار رونے لگتا۔

قرآن پاک کی طرح اسے احادیث مبارکہ سے بھی بہت محبت تھی۔ وہ حدیث کی کتابیں خود بھی نہایت شوق سے پڑھتا اور اساتذہ حدیث سے بھی سنتا۔ خشیت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ جنگ سے ایک رات قبل شب بھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتا۔ اسے مکہ معظمہ اور وہاں کے باشندوں سے بھی شدید محبت تھی۔ اس نے اکثر اشراف مکہ اور دیگر حاجت مندوں کے سالانہ وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ علم اور اہل علم سے اس قدر لگاؤ تھا کہ صرف علماء کو تین لاکھ سالانہ کے مستقل وظائف ملتے رہتے۔ ان وظائف کے علاوہ بھی وہ لاکھوں روپے علماء میں تقسیم کیا کرتا۔ اس نے کبھی کسی عالم کو محتاج نہ رہنے دیا۔ علم ریاضی اور حکمت کے مشہور عالم' حکیم مہذب الدین ابوالحسن علی بن عیسیٰ' کا انتقال ہوا تو صلاح الدین کو اس خبر سے اتنا رنج پہنچا

''اجی چھوڑیے او پندرناتھ اشک کی بات ...
آپ بھی کس دوزخی کا ذکر لے بیٹھے، بے جد ...
بنیا۔ بیٹے! خوب یاد آیا۔'' اور اس تمہید کے بعد ...
نے کہنا شروع کیا۔

''کم بخت نے ایک بلی پال رکھی ہے، جی ہاں بلی! صبح سویرے ہی اسے اڑوس پڑوس کے گھروں میں بھیج دیتے ہیں، اور وہ شطونگڑی بھی کہیں نہ کہیں سے آنکھ بچا کر دودھ پی کر جب واپس آتی ہے تو اشک صاحب اسے الٹا لٹکا کر اس کے پیٹ سے سب دودھ باہر نکال لیتے ہیں اور پھر اسی دودھ سے چائے بنا کر پیتے ہیں، جی ہاں! بالکل سچ کہہ رہا ہوں، رتی بھر مبالغہ نہیں، نہیں صاحب! سنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی بات ہے میں خود ان کے ہاں اس دودھ کی چائے پی چکا ہوں۔''

☆☆☆

ایک مشاعرے میں ایک بزرگ شاعر شعر سنانے تشریف لائے تو ان کے کلام سے زیادہ ان کے مضحکہ خیز حلیے نے حاضرین کو متاثر کیا۔ چھوٹی سی سفید چمک دار داڑھی، سر پر کھدر کی ڈھلی ہوئی ٹوپی اور جسم پر گہرے سبز رنگ کا لمبا سا جبہ کسی شخص نے پنڈت ہری چند اختر سے پوچھا۔ ''یہ بزرگ کون ہیں، پنڈت جی!''

اختر صاحب پہلے تو آنکھوں پر چشمہ لگا کر ان حضرت کو غور سے دیکھتے رہے، پھر ایک دم چہک کر بولے۔ ''شکل و صورت سے تو مولانا تیل کنٹھ دکھائی دیتے ہیں۔''

کہ وہ کئی روز تک کوئی کام نہ کرسکا۔
عدل وانصاف کے تقاضوں کی تکمیل بھی گویا صلاح الدین پر ختم تھی۔ اس کا معمول تھا کہ ہفتہ میں دو روز 'دوشنبہ' اور 'پنج شنبہ' کو دربار عام منعقد کیا کرتا جہاں ہر شخص کو اپنا مقدمہ یا شکایت پیش کرنے کی کھلی اجازت ہوتی۔ رعایا کو بھی اجازت تھی کہ وہ عمال حکومت خود سلطان کی ذات کے خلاف مقدمہ دائر کرسکتا تھا۔ سلطان اگر ملزم ہوتا تو قاضی کی عدالت میں معمولی فریق کی حیثیت سے حاضری دیتا۔ قاضی شریعت کی رو سے جو فیصلہ کرتا وہ اس پر سر تسلیم خم کردیتا۔ ان دو ایام کے علاوہ بھی وہ سفر و حضر میں ہر جگہ مقدمات کی سماعت کیا کرتا۔ راہ چلتے بھی اگر کوئی دامن تھام لیتا تو اس کی شکایت کا ازالہ کیے بغیر آگے نہ بڑھتا تھا۔ وہ قوت کے زور پر نہیں بلکہ محبت کے زور پر حکومت کرنے کے گر سے واقف تھا۔ اس نے محبت کی آنچ سے ایسے سرکشوں کے دل بھی موم کردیے جو بادشاہوں کی اطاعت کو طوق سمجھ کر کبھی بھی سرنگوں نہیں ہوتے تھے۔

صلاح الدین ایوبی کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ بے تحاشا فتوحات اور کامیابیاں سمیٹنے کے بعد اس کی زندگی میں واحد کسک حج بیت اللہ کی زیارت تھی۔ سن وفات میں تو اس نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ وہ رواں برس حج کا فریضہ ضرور ادا کرے گا۔ کاروبار سلطنت نے یہ مہلت نہ دی اور حج کا زمانہ گذر گیا۔ صلاح الدین اس محرومی پر زار و قطار رویا۔ حج کا قافلہ دمشق واپس آیا تو وہ اس کے استقبال کے لیے دور تک گیا۔ ہر ایک حاجی سے بغلگیر ہوتے ہوئے اس نے اپنی محرومی پر بے پناہ اشک بہائے۔ اس گریہ زاری اور سرد موسم کی شدت کے اثرات سے وہ واپسی پر بخار میں مبتلا ہوگیا۔ دوسرے روز سے بخار کی شدت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ حجاج کے اعزاز میں دی گئی شاہی دعوت میں بھی شریک نہ ہوسکا۔ اس کی عدم موجودگی حاضرین کے لیے بے پناہ افسردگی کا باعث بنی رہی۔

اس علالت میں سلطان کی جانب سے کی جانے والی وصیت نے بھی سب کے دل گداز کردیے۔ اس نے حاضرین سے یہ آخری الفاظ کہے۔

"حطین کی لڑائی میں، میں نے جو کفن پہنا تھا اور جسے پہن کر میں بیت المقدس میں داخل ہوا تھا اسی خون آلود کفن میں میری تدفین کی جائے۔ میری تلوار قبر میں رکھ دی جائے۔ جنازے کے ساتھ کوئی بین نہ کرے۔ کوئی خطیب تقریر اور کوئی شاعر مرثیہ نہ پڑھے۔ قبر نیچی اور کچی بنائی جائے۔"

اس روز کے بعد سلطان کی حالت ہر گذرتے لمحہ کے ساتھ خراب ہوتی رہی۔ چوتھے روز حکماء نے اس کی فصد کھولی تو حالت مزید ابتر ہوگئی۔ ہر رات علامہ بہاؤالدین اور علامہ الفاضل اس کی مزاج پرسی کے لیے محل میں حاضر ہوتے اور اشک زن ہوکر واپس جاتے۔ محل کا دروازہ ہر وقت ہزاروں شہریوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ وہ اپنے اس محبوب بادشاہ کی مزاج پرسی کے لیے مضطرب رہتے۔ سہ شنبہ کی رات اس کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ بہاؤالدین اور الفاضل اس رات اسی کے سرہانے بیٹھے رہے۔

ان دونوں کے علاوہ ایک حافظ قرآن بھی اس کے سرہانے قرآن حکیم کی تلاوت کرتا رہا۔ صلاح الدین پر گویا مدہوشی طاری ہوچکی تھی۔ صبح تک یہی کیفیت برقرار رہی۔ تلاوت کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ اس کی سماعت میں جب یہ آیت پڑی۔

"عَلَیۡهِ تَوَکَّلۡتُ وَ اِلَیۡهِ اُنِیۡبُ"

تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھلی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ آنکھیں پل بھر کے لیے کھلیں ہونٹوں نے جنبش کی اور روح نے اجل کا ہاتھ تھام لیا۔

صلاح الدین کی وفات نے عوام و خواص کو بے پناہ رنج میں مبتلا کیا۔ اہل دمشق کے علاوہ بیرونی علاقوں کے باشندوں میں سے شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے یہ خبر سن کر آنسو نہ بہائے ہوں۔ عوام دمشق کے بازاروں میں صف بہ صف کھڑے زار و قطار روتے دکھائی دیے۔ اس کی وفات کے کچھ ہی دیر بعد عوام کا ایک جم غفیر قیام گاہ کے باہر جمع ہوگیا۔ رقت کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی اس کے آخری دیدار کی ہمت ہی مجتمع نہیں کرپا رہا تھا۔ اس گریہ زاری اور آہ و فغاں میں اس مرد مجاہد کو اس کی تلوار سمیت خاک نشین کردیا گیا۔

☆☆☆

جولیس سیزر تیرہ جولائی 100 قبل از مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ کا نام 'اوریلیا کوٹا' تھا۔ وہ مشہور رومن جرنیل 'گیوس ماریس' کا بھتیجا تھا۔ 85 قبل از مسیح میں والد کی وفات کے بعد سیزر سولہ برس کی عمر میں اپنے کنبے کا سربراہ بن گیا۔ اسی برس اپنے چچا ماریس اور رومی حکمران لوسیوس کارنیلیس کے درمیان خانہ جنگی کے دوران اس نے چچا کے حلیف کی بیٹی کورنیلیا سے شادی کرلی۔

خانہ جنگی میں فتح کے بعد چچا نے چند اختلافات کی بنا پر اسے وراثت سے بے دخل کردیا۔ ردعمل کے طور پر جولیس نے فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس کے بعد جولیس نے کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اس نے بہت جلد روم کی سیاست میں اہم مقام حاصل کرلیا۔ 67 قبل از مسیح میں اس کی اہلیہ کارنیلیا کا انتقال ہوگیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے پومپیا نامی خاتون سے شادی کرلی۔ اس سے اختلافات کے نتیجے میں علیحدگی ہوئی تو کلپورنیا سے ازدواجی رشتہ قائم کرلیا۔

نجی زندگی میں تلاطم کے باوجود جولیس سیزر کی جانب سے کامیاب فوجی مہمات اور سیاسی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ 68 قبل از مسیح میں وہ سینیٹ کا رکن بنا اور 63ق م میں اسے ایک مذہبی عہدہ دے دیا گیا۔ اس زمانے میں رومی سلطنت وسعت اختیار کررہی تھی لیکن اقتدار فرد واحد کی بجائے سینیٹ کے پاس تھا جس کا سربراہ سلطنت کا قانونی سربراہ سمجھا جاتا تھا۔

60ق م میں روم کے قانونی سربراہ پومپی نے اسے گال کا گورنر بنادیا۔ گال شمالی اٹلی 'موجودہ یوگوسلاویہ اور فرانس کی جنوبی بندرگاہ پر مشتمل علاقہ تھا۔ سیزر نے گال کا بقیہ علاقہ فتح کیا اور روم کی عملداری میں موجو فرانس' بیلجیم' ہالینڈ' جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے کچھ حصوں تک پھیلادی۔ اسی نے ایک فوجی مہم برطانیہ بھی روانہ کی جو مستقل فتوحات حاصل نہ کرسکی۔ گال کی فتح نے سیزر کو رومیوں کا ہیرو بنادیا۔ یہ وہ دور تھا جب روم کی سیاسی صورتِ حال تیزی سے غیر مستحکم ہورہی تھی۔ وسیع سلطنت کی دارالحکومت میں خلفشار تھا۔ جمہوریت مؤثر ثابت نہیں ہورہی تھی۔ جولیس کے دل میں خواہش مچلنے لگی کہ روم میں مطلق العنانیت قائم کی جائے۔ اس عمل نے اس کے مخالفین میں اضافہ کردیا ان افراد نے پومپی کو بھی اس کا مخالف کردیا۔ جولیس نے فوجی اقدامات کے ذریعے معاملات نمٹانے کا فیصلہ کیا۔ پومپی شکست کے بعد فرار ہوگیا۔ سیزر فاتح کی حیثیت سے روم میں داخل ہوا اور سینیٹ نے اسے سربراہ مقرر کردیا۔

جرنیل پومپی اور اس کے ساتھی ایک بار پھر متحد ہو گئے۔ اگلے پانچ برس سیزر انہیں کچلنے میں مصروف رہا۔ بالآخر فارسالیا کے مقام پر پومپی کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور وہ مصر فرار ہوگیا تاہم وہاں جلد ہی قتل کردیا گیا۔ سیزر بھی اس کے تعاقب میں مصر پہنچ گیا جہاں ایک ساحرہ 'قلوپطرہ' سے شناسائی اس کی منتظر تھی۔

قلوپطرہ سے رومانوی تعلقات کے نتیجے میں جولیس نے مصر کا اقتدار حاصل کرنے میں اس کی بھرپور مدد کی۔ سیزر نے پیلوشیم کا قلعہ فتح کرکے مصری فوج کے اس جتھے کو شکست دے دی جو دریائے نیل کے دہانے پر مزاحمت کے لیے موجود تھی۔ شہزادہ بطلیموس بھی اپنا کثیر لشکر لیے مکمل قوت اور دیوانگی سے آگے بڑھنے لگا۔ اسے اپنا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا تھا، وہ بھرپور عسکری طاقت سے حملہ کرکے سیزر کو قصر شاہی سے باہر نکال دینا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ جولیس سیزر کی شخصیت اور جہاندیدگی سے بہت خائف تھا۔ سیزر نے بطلیموس کے روانہ ہوتے ہی اپنی ساری فوج جہازوں پر سوار کردی۔ محل کی حفاظت کے لیے البتہ چند سپاہی چھوڑ دیے گئے تھے۔ اس کی جنگی حکمت عملیوں کی گرد پانا شہزادہ بطلیموس کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ سیزر نے اپنے جہاز کا رخ مشرقی سمت رکھا۔ وہ شاہی بیڑے کو اپنی پیلوشیم روانگی کا تاثر دینا چاہتا تھا تاہم تاریکی غالب آتے ہی اس نے اپنا رخ مغربی جانب موڑ لیا۔ اس کے بعد جنوبی سمت چند میل کی مسافت طے کرکے وہ قاہرہ کے نزدیک شاہی فوج تک پہنچ گیا۔ طے شدہ حکمت عملی کے مطابق اب اسے مصری سپاہ کا سامنا کرنا تھا جو دریائے نیل کے مغربی کنارے پر ایک بلند مقام پر خیمہ زن تھی۔

ستائیس مارچ 47 قبل مسیح کے اس روز چشم فلک نے شدید خون ریزی دیکھی۔ رومنوں نے مصریوں پر حملہ کرکے انہیں دریا کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد قتل و غارت کا تاریخی بازار گرم ہوا۔ شہزادہ بطلیموس اپنی سپاہ کو گاجر مولی کی

طرح کٹتے دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔ اپنی جان بچانے کی جبلی خواہش میں وہ ایک کشتی پر سوار ہوگیا جو اسی مقصد کے لیے دریائے نیل میں رکھی گئی تھی۔ شہزادہ بطلیموس اگر تنہا اس کشتی پر سوار رہتا تو اس کی جان یقینی طور پر بچ جاتی لیکن بدقسمتی بھی اس کے ہم رکاب تھی۔ رومی سپاہیوں سے خائف کئی مقامی لشکریوں نے بھی اس کے ساتھ ہی کشتی میں چھلانگ لگادی۔ وہ کشتی اس قدر بوجھ نہ سہار سکی اور اپنے سواروں سمیت آبی چادر اوڑھ لی۔ شہزادہ بطلیموس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کی سنہری زرہ بکتر کا بوجھ ہی اس قدر تھا کہ اسے تیراکی میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔ نتیجتاً وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

جولیس سیزر اب "فاتح مصر" تھا۔ وہ مخصوص عسکری روایات کے مطابق اپنے رسالوں کے ہمراہ اسکندریہ میں داخل ہوا۔ اہل اسکندریہ کے لیے شہر کے دروازے کھولے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے سیاہ ماتمی لباس زیب تن کرکے معززین کا ایک وفد سیزر کے پاس بھیج دیا۔ وفد نے اپنے دیوتاؤں کے بت سیزر کی خدمت میں پیش کردیے۔ یہ عمل اس بات کی علامت تھی کہ وہ جولیس سیزر کے مکمل تابعدار رہیں گے۔

سیزر نے اپنی منشا کے مطابق مصری حکومت تشکیل دی۔ متوفی بادشاہ کی وصیت کے مطابق قلوپطرہ کے اقتدار میں اس کے چھوٹے بھائی کو شریک بنادیا جو اپنی کم سنی کے باعث حکومت کا کسی بھی طور اہل نہ تھا۔ تمام تر اختیارات در پردہ قلوپطرہ ہی کی ملکیت تھے۔ اس نے اپنی عسکری اور سیاسی بصیرت کے تحت سابقہ عزائم کے برعکس مصر کو روم سے ملحق کرنے سے گریز ہی کیا۔

یہ بھی درحقیقت اس کی ایک سیاسی چال تھی۔ مصر بزور شمشیر زیر ہوا تھا۔ اس سرزمین کے تمام تر وسائل اب روم ہی کی ملکیت تھے۔ مقامی انتظام و انصرام سنبھالنے کے لیے ایک گورنر کی تقرری بھی کی جاسکتی تھی لیکن اس عمل میں ایک خطرہ بہرحال یہ بھی پنہاں تھا کہ نیل کی سرسبز و شاداب وادی اور وسائل اس گورنر کی نیت میں فتور پیدا کرسکتے تھے۔ اس لالچ کے تحت وہ روم کے لیے تجارت کی عارضی بندش بھی پیدا کرسکتا تھا۔ یہ تمام تر ممکنہ اقدامات مستقبل میں سیزر کے لیے ہی دردسر اور آزار ثابت ہوتے۔

دوسری جانب قلوپطرہ سے ایک ایسا تعلق استوار ہو گیا تھا کہ وہ مکمل وفاداری سے اس کا دم بھرتی۔ وہ بغاوت یا سازش کرنے کی ہمت نہ کرسکتی تھی کیونکہ اپنے اقتدار کی بقاء کے لیے سیزر کی فوج ناگزیر تھی۔ اس نے قلوپطرہ کو مزید اخلاقی دباؤ میں لینے کے لیے شہزادے اور اس کی حفاظت کی خاطر خصوصی دستہ تعینات کیا۔ اس کے علاوہ روفیو کو بھی نئے اختیارات دیے گئے تاکہ روم کے مفادات کی ہر ممکن حفاظت ہوسکے۔ محبت، اقتدار اور طاقت کے نشے میں ہنڈولتی قلوپطرہ ہر گذرتے لمحے جولیس سیزر کی مزید اسیر ہوتی جارہی تھی۔

کچھ ہی عرصہ بعد قلوپطرہ نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اہل مصر کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ ان کے عقائد کے مطابق نومولود ان کی ملکہ اور مشتری دیوتا کے اوتار سیزر کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔ بچے کا نام "سیزارین" (چھوٹا سیزر) اور درباری نام بطلیموس شانزدہم رکھا گیا۔ سیزر بے حد خوش اور سرشار تھا۔ اسی دوران روفیو کو چند تشویش ناک اطلاعات موصول ہوئیں کہ روم میں سیزر کی غیر موجودگی سے اہم عہدیداران معترض ہونے لگے ہیں۔ ان کا گمان تھا کہ جولیس سیزر اپنے حکومتی معاملات نظرانداز کرکے عیش و عشرت اور ذاتی مفادات کی تکمیل میں مگن ہے۔ سیزر ان اطلاعات پر طیش زدہ ہوگیا، اس نے فوری طور پر روم جا کر اپنے مخالفین سے مناظرہ کا فیصلہ کرلیا۔

مصر سے واپسی کے بعد سیزر اگلے ایک برس تک مختلف مہمات میں مشغول رہا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے مخالفین کی زبان بندی چاہتا تھا۔ ان مہمات میں فتح سمیٹ کر وہ پچیس جولائی کو روم واپس آیا اور اگلے ماہ ہونے والے "جشن فتوحات" کی تیاریوں کا آغاز کردیا۔ اس نے قلوپطرہ کو بھی تقریب میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔

جولیس سیزر کے مصر میں قیام سے روم کی سینیٹ کے کئی ارکان مضطرب تھے تو سیزر کی واپسی اور قلوپطرہ کی وہاں آمد نے یہ اضطراب سوا تر کردیا تھا۔ اس کی حرکات، فیصلے اور سفاکیت ان کے غم و غصے میں اضافہ کررہی تھی۔ اس کا اثر و رسوخ ہر گذرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ سینیٹ کلی طور پر اس کے دباؤ میں آنے لگی تھی۔ اس کے اصرار پر سینیٹ نے اسے "کمانڈر انچیف" اور "آزادی دہندہ" کے خطابات سے نوازدیا۔ یہ عنایات لمحہ فکریہ تھیں کیونکہ کمانڈر انچیف کسی بھی فاتح جرنیل کو نہیں پکارا جاسکتا تھا۔ مؤقف یہ تھا کہ یہ خطاب اس کی اگلی نسل تک منتقل ہو

جاتا جس کا عسکری شعبہ سے منسلک ہونا یا نہ ہونا بھی غیر یقینی ہی تھا۔ اس عمل کا براہ راست مطلب یہی تھا کہ یہ خطاب مصری ملکہ کے بیٹے سیزارین کو منتقل ہوجاتا۔

اہل روم کو یہ بات کسی بھی طور گوارا نہ تھی۔ وہ شہنشاہیت اپنے لیے کسی گالی سے کم تصور نہ کرتے تھے۔ گذشتہ تین سالہ خانہ جنگی میں بہت سے شہری جاں بحق ہوچکے تھے۔ عوام کی شدید خواہش تھی کہ سیزر کو ان کے بدلے اس کی طلب کردہ ہر شے فراہم کردی جائے۔ اس کے اختیارات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ عوامی پذیرائی حاصل نہ کرنے والے سینیٹرز کو بھی سبک دوش کرسکتا تھا۔ سینٹ چیمبر میں دونوں قونصلرز کے سامنے بیٹھنے، ہر معاملہ میں پہلے تقریر کرنے، یہاں تک کہ اپنے من پسند شخص کو مجسٹریٹ مقرر کردینے تک کا مجاز تھا۔ سینیٹ نے سیزر کو خوش کرنے کے لیے سینیٹ چیمبر میں طلائی کرسی بنوائی۔ اس کے اعزاز میں آزادی کی دیوی کا مندر، ذاتی رہائش کے لیے پہاڑی علاقہ پر نجی محل تعمیر تک کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے یوم پیدائش پر عام تعطیل کا اعلان ہوا۔ رومن روایات کے برعکس روم کی چہار دیواری میں دفن کرنے کی اجازت کے علاوہ "فادر آف کنٹری" کا خطاب، آیندہ دس سال کے لیے قونصلر اور تاحیات آمر تسلیم کرلیا گیا۔ اس نے روم کے نچلے اور متوسط طبقے کو فائدہ پہنچانے کے لیے کئی ایک اصلاحات کا نفاذ بھی کیا۔

☆ اناج کی تقسیم کو باقاعدہ کرنا۔

☆ زیادہ لوگوں کی نمائندگی کرنے کے لیے سینیٹ کے حجم میں اضافہ کرنا۔

☆ حکومت کا قرض ختم کرنا۔

☆ روم کے لوگوں کو دور دراز علاقوں میں رومن شہریت دینا۔

☆ رومن ٹیکس میں اصلاح کرنا۔

اس کی اصلاحات کے باوجود چند ایک غیر روایتی اقدامات نے سینیٹ کے اراکین کیشیس، بروٹس، ڈیسمس اور گائیس کو اس قدر برافروختہ کیا کہ وہ اس کے قتل کا منصوبہ تشکیل دینے لگے۔ ان عہد و پیمان اور حکمت عملی کے بعد ان چاروں نے اگلے دو ہفتوں میں تقریباً "اسی" مزید افراد کو اپنا ہم نوا بنالیا اور اس کے مزید دو ہفتوں بعد سیزر کو قتل کر دینے کا منصوبہ مکمل کرلیا گیا۔ یہ عجلت اس لیے بھی ضروری تھی کہ اٹھارہ مارچ کو سیزر پارتھین مہم پر روانہ ہوجاتا اور اسے روم کی حدود سے باہر مسلح افواج کے گھیرے میں قتل کرنا ممکن ہی نہ رہتا۔ یہ قتل عوامی جگہ پر کیے جانا ہی بہتر تھا تاکہ عوام کو یہی تاثر دیا جاسکے کہ یہ سب جمہوریت کی بقاء و دوام کے لیے کیا گیا ہے۔ اس سازش میں تقریباً ساٹھ افراد نے شریک ہونا تھا۔

انہی سرگرمیوں میں پندرہ مارچ کی صبح طلوع ہوگئی۔ سیزر کا مزاج بے حد خوشگوار تھا۔ اسے قلوپطرہ سے ملاقات کے لیے وقت بھی نکالنا تھا۔ قلوپطرہ نے اسکندریہ روانگی اسی دن کے انتظار میں مؤخر کررکھی تھی کہ سیزر کو بادشاہ بنتے دیکھ کر ملکہ روم کی حیثیت سے مصر لوٹ سکے۔ ان خوابوں سے بوجھل آنکھیں اور ذہن آنے والے خطرات کو بھانپنے سے مکمل قاصر تھیں۔

"آج ایوان میں جانا ضروری ہے کیا؟" کلپورنیا نے اپنے ہرجائی اور بھنور صفت شوہر کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل! ضروری تو ہے۔" وہ مختصراً بولا۔

"میری التجا ہے کہ آج کہیں مت جاؤ! میں نے گذشتہ رات بہت بھیانک خواب دیکھا ہے۔" وہ خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"غالباً تم نے اس نجومی کی بات کو اپنے ذہن پر سوار کرلیا ہے جس نے میرے قتل کی پیش گوئی کی تھی۔ اس معاملہ کو زیادہ سنجیدہ نہ لو۔ اہل روم مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ مجھے کبھی کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔" سیزر پر اعتماد تھا۔

"اس بات سے میں بھی متفق ہوں لیکن پھر بھی دل کو خدشات لاحق ہیں۔ آج اپنی روانگی مؤخر کردو۔ اس کے بعد میں بالکل نہ روکوں گی۔"

کلپورنیا نے کچھ اس انداز میں التجا کی کہ سیزر کا دل پسیج گیا۔ اس نے اہلیہ کی بات تسلیم کرلی۔ سیزر کی آمد میں تاخیر نے مبینہ قاتلوں کو اضطراب میں مبتلا کردیا۔ انہیں اس بات کا بھی خدشہ لاحق تھا کہ کہیں سازش طشت ازبام نہ ہوگئی ہو۔ ان چاروں نے متفقہ صلاح مشورے سے ڈیسمس کو سیزر کے پاس روانہ کیا جس نے نہایت اعتماد سے سیزر کو گھیرنے کا آغاز کردیا۔

"ایوان میں آپ کی آمد بے حد ضروری ہے محترم! آج ارکان حکومت نے متفقہ طور پر آپ کو شاہی تاج پیش کرنے کا فیصلہ کررکھا ہے۔"

’’آج یہ روانگی مؤخر رہے گی۔ جولیس سیزر ایوان میں کل آجائیں گے۔‘‘ کلپورنیا نے متانت سے کہا۔

’’محترم! میں آپ کی نجی زندگی میں مخل تو نہیں ہونا چاہتا البتہ اتنا ہی کہوں گا امرا یہ شکایت بھی کر سکتے ہیں کہ آپ نے ایک خاتون کی بات مان کر اہم اجلاس میں شرکت نہ کی۔ امرا اسے اپنی توہین گردانیں گے۔‘‘

ڈیسمس کی اس بات پر سیزر سوچ میں پڑ گیا۔ شاہی تاج کا تصور دل میں گدگداہٹ پیدا کر رہا تھا۔ اس نے تمام ترخدشات بالائے طاق رکھے اور ڈیسمس کے ساتھ روانگی کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی آمد تک قاتل شدید اضطراب میں ایوان کے برآمدے میں ٹہلتے رہے۔ جائے قتل کے لیے ایوان کا وہ برآمدہ منتخب کیا گیا تھا جس کے عقب میں پومپی کا مجسمہ نصب تھا۔

سیزر کے ایوان میں داخل ہوتے ہی اراکین تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ اس موقع پر طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک اہلکار ’’ٹریبی نس‘‘ انطونی کو الجھائے رکھنے کے لیے مامور تھا۔ سازشی ٹولہ خواہش کے باوجود سیزر کے دست راست کو قتل کی جسارت نہ کر پائے تھے۔ وہ پہلے جولیس سیزر سے خلاصی چاہتے تھے۔ سیزر سینیٹ کی کارروائی جلد از جلد ختم کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی دیکھتے کئی افراد اردگرد جمع ہوگئے۔

سیزر کے مسند پر بیٹھتے ہی ڈیسمس نے کہا۔

’’میٹلس سمبر کہاں رہ گیا؟ اسے اپنی عرضداشت عزت مآب سیزر کی خدمت میں پیش کرنی تھی۔‘‘

’’میں سمبر کے بھائی کی جلاوطنی کا حکم واپس نہیں لوں گا۔‘‘ اس نے دوٹوک جواب دیا۔

میٹلس سمبر نے منصوبے کے مطابق آگے بڑھ کر سیزر کا چغہ پکڑ کر کھینچ لیا۔ یہ ایک عندیہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور شخص ’’کسیکا‘‘ آگے بڑھا۔ کسیکا کو سیزر نے حال ہی میں ترقی عطا کی تھی۔ اس نے سیزر کے کندھے پر خنجر کا وار کر دیا۔ سیزر نے اس کا بازو پکڑا اور چلا کر بولا۔ ’’یہ کیا حرکت ہے بدمعاش؟‘‘

اس کے الفاظ ابھی مکمل بھی نہ ہوئے تھے کہ کسیکا کے بھائی نے پہلو پر وار کردیا۔ کیشیس نے چہرے کو نشانہ بنایا۔ بکولینس نے پشت میں خنجر گھونپا اور ڈیسی مس نے ران میں تلوار پیوست کردی۔ سیزر کا بدن لہو اگلنے لگا۔ اس نے ہمت مجتمع رکھتے ہوئے اپنا خنجر نکالا اور ان قاتلوں پر دیوانہ وار حملے کرنے لگا۔ اس کی حالت کسی زخمی شیر کی سی تھی جو موت کا دائرہ توڑ کر فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کی یہ کوشش کامیاب بھی ٹھہری۔ وہ کیسکا سے الجھتا اس مقام تک آپہنچا جہاں پومپی کا مجسمہ نصب تھا۔ یہاں بروٹس شرربار نظروں سے تلوار سونتے اس کا منتظر تھا۔ اس اثنا میں سیزر اپنے بدن پر بیس عدد ضربات سہہ چکا تھا۔ بروٹس کے وار اور آنکھوں سے جھلکتی نفرت نے اسے نڈھال کردیا۔ اس کے آخری الفاظ تھے۔

’’آہ میرے بیٹے! تو بھی ان شیطانوں میں شامل ہو گیا؟‘‘ وہ دکھ سے بولا۔ بروٹس سے اس کا تعلق کسی حد تک پدرانہ ہی رہا تھا۔

زخموں سے اگلتے لہو نے اسے نیم جان کردیا۔ وہ ڈگمگا کر زمین بوس ہوا تو دیگر قاتلوں نے اس کے نیم جان بدن پر تلوارزنی کی بوچھاڑ کردی۔ کچھ ہی لمحوں میں جولیس سیزر کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور آنکھیں سکندراعظم کی طرح دنیا فتح کرنے کے ادھورے خواب سجائے بےنور ہوگئیں۔

☆☆☆

قلوپطرہ کے بارے میں شاذ ہی کوئی ناواقف ہوگا کہ وہ مصر کی شہرۂ آفاق ملکہ تھی جس کے ہوش ربا حسن اور قیامت خیز شباب نے رومی سلطنت کے نامور جرنیلوں کو خاک وخون میں رنگ کر عظیم الشان سلطنتوں کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ قدرت نے اسے دلکش حسن اور جادوئی شخصیت سے نواز رکھا تھا۔

قلوپطرہ کا تعلق اسکندریہ کے حکمران یونانی خاندان بطلیموس سے تھا۔ وہ بطلیموس سیزدہم کے ہاں 69 قبل از مسیح میں پیدا ہوئی۔ اس کے والد کو اقتدار سے محرومی کے بعد روم کی مشروط حمایت سے تخت دوبارہ ملا تھا جس کے باعث مصر روم کا غلام شمار ہونے لگا۔ بادشاہ اہل روم کا مقروض تھا۔ اس نے روم کی مجلس امرا (سینیٹ) سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کی وفات کے بعد مصر روم کے زیرنگین ہی رہے گا۔ 51 ق م میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی اولاد میں سے قلوپطرہ ہی سب سے بڑی تھی۔ دوسری بیٹی آرصیو اور اس کے بعد دو بیٹے تھے۔

شاہ مصر کی وصیت کے مطابق اب بڑے لڑکے اور بڑی لڑکی نے مشترکہ طور پر تاج وتخت سنبھال کر حکومت کرنی تھی۔ اس موقع پر قصر شاہی دو گروہوں میں منقسم دکھائی

دینے لگا۔ قلوپطرہ کا حامی گروہ کمزور نکلا۔ نتیجتاً اسے جلاوطن ہوکر شام کا رخ کرنا پڑا۔

یہ وہ دور تھا جب جولیس سیزر اور جنرل پومپی میں اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی۔ پومپی اپنے حریف سے شکست کی ہزیمت سے بچاؤ اور پناہ کی تلاش میں مصر آیا تھا۔ اجل نے اسے ساحل پر ہی دبوچ لیا اور وہ اپنے منحرف درباریوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ جولیس سیزر بھی پومپی کے تعاقب میں مصر پہنچ چکا تھا۔ قلوپطرہ نے بہت ہوشیاری سے خود کو ایک قالین میں لپیٹ لیا۔ اس کے غلام نے ہدایات کے مؤجب وہ قالین جولیس تک پہنچادیا۔ قالین کھول کر دیکھا گیا تو قلوپطرہ کی برآمدگی جولیس کے لیے ہوش ربا ثابت ہوئی۔ بہت جلد وہ اس کے حسن کا بےطرح اسیر ہوکر رہ گیا۔ قلوپطرہ بھی جولیس کی شجاعت، وجاہت اور سب سے بڑھ کر سیاسی وعسکری اہمیت کے باعث اس کی گرویدہ ہو گئی۔ اس نے جولیس کی مدد سے اپنے حریفوں شہزادی آرصیو اور بطلیموس چہاردہم کا خاتمہ کروایا اور مصر کی مطلق العنان حکمران بن گئی۔

دوسری جانب روم میں مجلس امرا جولیس سیزر کی حکمرانی کی توثیق کرچکی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں ایک قابل اعتماد نائب مارک انطونی روم کے معاملات کی نگرانی کرنے لگا۔ اسی دوران قلوپطرہ نے جولیس کے بیٹے سیزارین کو جنم دیا۔ جولیس بیٹے کی پیدائش پر بہت خوش تھا تاہم اسے مجلس امرا میں ہونے والی چند تخریبی سرگرمیوں کے باعث روم واپس آنا پڑا۔

مصر سے واپسی پر سیزر کچھ عرصہ تو فوجی مہمات میں مصروف رہا البتہ قلوپطرہ کو جشن فتوحات کے موقع پر مدعو کرنا نہ بھولا۔ رومی سلطنت کی شان وشوکت دیکھ کر قلوپطرہ کے دل میں ایک بار پھر دیرینہ تمنا سر اٹھانے لگی۔ وہ روم کی ملکہ بن کر سیزارین کو جولیس کا جانشین بنانا چاہتی تھی لیکن رومی قانون کے مطابق ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ قانون کی رو سے جولیس کا جانشین اس کا بھانجا آکٹیوین ہوتا۔ قلوپطرہ کے ایڑی چوٹی کا زور لگادینے کے باوجود جولیس اس قانون سے انحراف پر تیار نہ ہوا۔ اس دوران روم میں پومپی کے حامیوں نے ایک بار پھر سر اٹھایا اور جولیس سیزر کو قتل کردیا گیا۔

قلوپطرہ اپنے خواب سے دستبردار ہونے کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ اس نے سیزر کے معتمد اور نائب جنرل

مارک انطونی کو اپنے دام حسن کا اسیر کرلیا۔ انطونی جولیس کی زندگی میں ہی اس ساحرہ سے بےطرح متاثر ہوچکا تھا۔ اس نے قلوپطرہ کو اسکندریہ لوٹنے اور مناسب موقع کا انتظار کرنے کے لیے قائل کرلیا۔ بعدازاں انطونی خود بھی اس کے پاس ہی مصر چلا آیا۔ قلوپطرہ نے اس کے جڑواں بچوں کو جنم دیا تاہم جولیس کی طرح وہ انطونی کے دل سے بھی روم کی محبت میں کمی نہ کرسکی۔

روم میں اس دوران آکٹیوین غالب آچکا تھا۔ انطونی نے شام اور مصر میں مہم جوئی کی لیکن ناکامی کے بعد دلبرداشتگی سے واپس چلا آیا۔ قلوپطرہ نے غم وغصے میں ایک غلام کے توسط انطونی تک اپنی موت کی جھوٹی خبر پہنچادی۔ وہ انطونی کے غصے وجنون کا رخ آکٹیوین کی طرف موڑنا چاہتی تھی تاکہ وہ روم میں سیزارین کی تخت نشینی کی راہ صاف کرسکے۔ قلوپطرہ کے اندازوں کے برعکس اس خبر نے انطونی کی اعصابی شکستگی میں مزید اضافہ کردیا۔ اس کے اعصاب یہ نیا بوجھ برداشت ہی نہ کرسکے اور اس نے بلاتامل وتاخیر اپنے بدن میں خنجر گھونپ لیا۔ بوقت آخر قلوپطرہ سے ملاقات میں اس کی آنکھوں میں محبت کی ہی جھلک تھی۔ جنگجو انطونی کا بدن خاک اور خون میں لتھڑ چکا تھا۔ قلوپطرہ اس کی حالت اور اپنے جھوٹ پر گہرے تاسف ورنج میں مبتلا تھی۔ انطونی اس کی کیفیات دیکھ کر کہنے لگا۔

’’تمہارے لیے میری موت باعث فخر ہونی چاہیے قلوپطرہ! آکٹیوین میرا بال بھی بیکا نہ کرسکا۔ اگر ممکن ہو تو اپنی شرائط پر اس سے باعزت سمجھوتا کرلینا۔‘‘ اس کے لیے

بات کی تکمیل دشوار ہورہی تھی پھر بھی وہ آخری الفاظ بول گیا۔

''میں اس پر بھروسا کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔'' وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ''اس کے ہاتھ کبھی زندہ نہ آؤں گی۔ خنجر، زہر، سانپ ہر طرح کی موت کا بندوبست کیے رکھا ہے۔ آکٹیوین فتح یاب ہو کر بھی شکست سے ہی دوچار ہو گا۔''

انطونی کی موت نے قلوپطرہ کے وجود پر خاموشی مجسم کر دی۔ اسے اپنا مستقبل واضح دکھائی دینے لگا تھا۔ آکٹیوین اپنی دیرینہ عداوت کا بدلہ یقینی طور پر بہت بھرپور انداز میں لے چکا تھا۔ وہ سب سے پہلے اسے اطاعت قبول کرنے کا چارا ڈالتا۔ اس کے بعد عداوت کی تسکین کے لیے گرفتاری کا حکم بھی دیا جاسکتا تھا۔ قلوپطرہ اس ذلت کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ آرصینو کی طرح جشن فتح میں تشہیر کا تصور ہی ہولناک تھا۔ گرفتاری کی صورت میں وہ خود کو سپرد آتش کر دینے کے لیے بھی تیار تھی۔

آکٹیوین نے مصر پر بہ آسانی قبضہ کرلیا۔ قلوپطرہ ان نامساعد حالات کے باوجود ذہنی جمع تفریق میں اُلجھی کسی بہتر راہ کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ انطونی کی لاش اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچا دی گئی۔ شدید ذہنی دباؤ اور دلی صدمہ نے اسے تیز بخار میں مبتلا کر دیا۔ مستقبل میں کسی جشن فتح کا حصہ بننے کا منظر بار بار پردہ بصارت پر طلوع ہو کر موت کی تمنا میں اضافہ کر دیتا۔

ان کٹھن شب و روز میں ماہِ اگست اپنے اٹھائیسویں پڑاؤ تک آ پہنچا۔ قلوپطرہ غم و یاس کی تصویر بنی دریچے سے دکھائی دیتے سمندر کی لامتناہی حدود پر نظریں جمائے گھنٹوں صرف کر دیتی۔ اسے اپنی زندگی بے مصرف محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک روز وہ اسی مشغلے میں مصروف اپنی سوچوں میں الجھی تھی کہ ایراس اور شارمیان اس کے پاس چلی آئیں۔ وہ پُرجوش دکھائی دے رہی تھیں۔ قلوپطرہ نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

''آکٹیوین آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔''

قلوپطرہ کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے برس ہا برس سے آزار میں مبتلا رکھنے اور اس کے خوابوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہونے والا شخص آج بالآخر اس کے سامنے موجود ہوتا لیکن قلوپطرہ نے ایسے حالات اور صورتِ حال کا کبھی تصور نہ کیا تھا۔ اس نے ہمیشہ خود کو فاتح اور آکٹیوین کو مفتوح کے روپ میں ہونے کا خواب دیکھا تھا۔

آکٹیوین کمرے میں کروفر اور بھرپور اعتماد سے داخل ہوا۔

''تو آج ہماری پھر ملاقات ہوگئی ملکہ قلوپطرہ!'' وہ طنزاً مسکرایا۔

''ہاں! جولیس سیزر کے بھانجے سے آج پھر ملاقات کا دن ہے۔'' اس نے بھی وہی انداز اختیار کیا۔ ''وہ جولیس سیزر جس نے خود مصر کا تاج و تخت میرے حوالے کیا تھا اور میری وجہ سے لاولد ہونے کے آزار سے محفوظ رہا۔''

''وہی جولیس سیزر جو ایک عورت کی طلب میں اپنی اقدار اور روایات سے متصادم تھا۔'' آکٹیوین نے تاسف سے کہا۔

''نہیں! وہ آخری لمحہ تک روم ہی کا وفادار رہا۔ محبت تو اس کے لیے ایک ثانوی شے تھی۔'' قلوپطرہ تلخی سے بولی۔

''روم ایک عظیم سلطنت ہے۔ اس کے باشندے وقتی طور پر بھٹک تو سکتے ہیں لیکن اپنی اقدار سے دائمی طور پر منہ نہیں موڑ سکتے۔ اگر کوئی ایسا کرنے کی جسارت کرے تو ان کا انجام جولیس سیزر اور مارک انطونی جیسا ہوتا ہے۔'' اس نے کروفر سے کہا۔

''انہیں بھی روم کی محبت نے ہی اس انجام تک پہنچایا تھا۔'' قلوپطرہ کی تلخی برقرار تھی۔

''رومتہ الکبریٰ کی عظمت اور شان تم کبھی نہیں جان سکو گی۔ جولیس سیزر سے تعلق کی بناء پر میں تمہاری آخری خواہش ضرور جاننا چاہوں گا۔'' آکٹیوین نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

''میں اپنے خاندان کی سلامتی اور انہیں مقتدر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''تو پھر اس کے عوض تمہیں میری اطاعت قبول کرنے کا اعلان کر کے اپنا خزانہ بھی میرے حوالے کرنا ہو گا۔'' آکٹیوین نے اپنی شرط بیان کی۔

قلوپطرہ نے یہ شرط تسلیم کرلی۔ آکٹیوین کے جاتے ہی وہ اپنی مخصوص قیام گاہ میں چلی آئی جہاں کئی روز سے مقید تھی۔ کچھ ہی دیر گذری تھی کہ ایک وفادار غلام نے اسے اطلاع دی کہ آکٹیوین نے کچھ دن بعد روم واپسی کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ قلوپطرہ اور اس کے خاندان کی جشن فتوحات میں تشہیر کرنا چاہتا تھا۔

''یہ جشن فتح کیا ہے ملکہ معظمہ؟'' اس کی کنیز ایراس نے سہم کر پوچھا۔

''اپنی فتوحات کا ایک نمائشی بازار جہاں ہمیں زنجیروں میں جکڑ کر روم کے بازاروں میں پھرایا جائے گا۔ روم کے غلیظ ترین افراد کو بھی ہماری دید اور ہم پر غیر اخلاقی آوازیں کسنے کا اختیار حاصل ہوگا۔'' اسے ایک بار پھر آرصینو یاد آئی۔

''دیوتا ایسا وقت کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔'' شارمیان نے جھرجھری لی۔

''صرف یہی نہیں وہ اپنی مقامی روایات کے مطابق ہمارے سوانگ بھی بھریں گے۔ ایک عدد نقلی انطونی بنایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ایک نقلی قلوپطرہ بھی یقینی ہوگی۔ عین ممکن ہے ہمارے بچوں کا سوانگ بھی بھرا جائے۔ وہ ذومعنی غیر مناسب 'تذلیل سے لتھڑے مکالمے ادا کریں گے اور ہم وہ سب سننے' دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔'' قلوپطرہ نے اپنے دورہ روم کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا۔

ایراس اور شارمیان کی رنگت فق ہوگئی۔ وہ بھی اس ممکنہ تذلیل پر شل تھیں۔ قلوپطرہ کچھ لمحے خاموش رہی... پھر شارمیان سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ''میرے لیے غسل کا انتظام کرو۔ بہترین لباس نکالو۔ عطر کا بندوبست کرو۔ مجھے ایک خصوصی سفر پر روانہ ہونا ہے۔''

شارمیان نے سر جھکاتے ہوئے تعظیم کا اظہار کیا اور تعمیل کے لیے چل دی۔ اس کے جاتے ہی قلوپطرہ ایراس کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''میرے خصوصی کمرے سے انجیر کی ٹوکری بڑی احتیاط سے اٹھا کر یہاں لاؤ۔''

ایراس نے بھی حکم کی تعمیل کی۔ دونوں نے شاہانہ انداز میں قلوپطرہ کو تیار کر دیا۔ اس کا لباس مہین اور خوبصورت تھا۔ سنہری مخصوص تاج کی دھات نے کانوں کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے شارمیان کی لائی گئی انجیر کی ٹوکری تھامی اور آہستگی سے کھول دی۔ خوش رنگ پھل تلے ایک سیاہ عفریت پوشیدہ تھی۔ قلوپطرہ اس کے سیاہ چمک دار بدن کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگی۔ اس زہریلے افعی نے اپنا پھن پھیلایا اور اپنا زہر قلوپطرہ کے بدن میں اتار دیا۔ اس کے لبوں سے ایک سسکاری برآمد ہوئی۔ بدن میں یکدم ہی حدت نے پنجے گاڑے تھے۔ اس جان لیوا حدت اور ناقابل برداشت خمار سے قلوپطرہ کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک جاندار مسکراہٹ تھی۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ اگست 2022ء

بھیگے بھیگے موسم کی
رنگیلی سریلی یاریاں
جاسوسی کے شمارے
کی تیکھی نشیلی کہانیاں

باڈی گارڈ

بیٹھے بٹھائے مصیبت میں گرفتار ایک چلبلی لڑکی کی شعلہ فشانیاں...... **امجد رئیس** کے قلم سے رابرٹ کریس کے ناول کی سنسنی خیز تلخیص

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات...... **روبینہ رشید** کے قلم کی جادوگری

دبر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ آسمان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو...... ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی... زندگی اس کے لیے خالی کشکول کے مانند تھی...... **حسام بٹ** کے قلم سے نئی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

ایسا آسیب جس کی قاتل گرفت نے ہر ایک کو مجروح کر دیا تھا۔ **زویا صفوان** کا سنسنی خیز سرورق

دوسرا رنگ

محبت اور جنگ دو محاذوں پر تنہا کھڑی راجکماری کا فیصلہ کن دن۔ **یعقوب بھٹی** کی تیکھی تحریر

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

جولیس سیزر، مارک انطونی اور اپنے خوابوں کا تاوان ادا کرتے وقت مرگ اسے ایک ہی بات کا اطمینان تھا تبھی تو وہ بولی تھی کہ ''میں نے آکٹیوین کے خوابوں کا چین بھی خزاں برد کردیا ہے۔''

☆☆☆

تاریخ میں القاب اعظم، قتال اعظم، قہر الٰہی، بے مثل فاتح، یکتائے روزگار جنگ جو اور چنگیز خان کے خطابات سے مشہور اس جنگ جو کے نام اور کارناموں سے بھلا کون واقف نہیں؟ اس نے بنی نوع انسان پر اپنی جرأت، بربریت، خونخواری اور عظمت و جبروت کی ایسی دھاک بٹھائی کہ صدیوں بعد بھی اس کا اثر جوں کا توں برقرار ہے۔

اپریل 1162 (بارہ جانوروں کی جنتری کے مطابق خنزیر کا سال) میں پیدا ہونے والا یہ شخص بظاہر اپنے آباؤ اجداد ہی کی طرح چپٹے نقوش، مندی آنکھوں اور کڑے تیوروں کا حامل تھا لیکن اس کی پیدائش کے وقت ایک غیر معمولی واقعہ نے سب ہی کو چونکا دیا تھا۔ شکم مادر سے دنیائے فانی میں قدم رکھتے ہی اس کی ہتھیلی خون سے بھری نظر آئی۔ سنسنی، حیرت، تجسس اور گھبراہٹ کی لہروں نے ہر کسی کو گھیر لیا۔ تکلیف سے نڈھال والدہ کے پاس موجود ہر عورت کی آنکھیں پھٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ والد 'یسوکائی' اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے ایک دشمن کو دھول چٹانے گیا ہوا تھا۔ اس حملہ میں اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ دشمن قید کر لیا گیا اور واپسی پر اسی قیدی دشمن کے نام پر بچے کا نام بھی 'تموچن' رکھ دیا۔ جس کا مطلب تھا 'فولاد جیسا مضبوط'۔

تموچن کی پرورش مخصوص علاقائی روایات کے مطابق ہوئی جن کی رو سے ہر بچے کو سخت ترین حالات میں پروان چڑھایا جاتا تھا۔ وہ اپنی خوراک کا بندوبست بھی خود ہی کرتے۔ تموچن ان حالات کو بغور دیکھتا انہی روایتی طریقوں سے پروان چڑھ رہا تھا۔ وہاں بچپن سے ہی بچوں کو گروہی شکل میں شکار کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ تموچن بھی کلہاڑوں اور کند تیروں سے چوہے اور کتے مارنے کی کوشش کرتا۔ اس کے بعد وہ بھیڑوں پر سواری کی مشق بھی کرتا۔ سہارے کے لیے بھیڑوں کی پشم حتی الامکان مضبوطی سے تھام لی جاتی۔ وہ سردار کا بیٹا تھا اس لیے شکار میں کامل و منفرد ہونے کی توقعات بھی کہیں زیادہ تھیں۔

تموچن ذہنی و جسمانی طور پر بے حد طاقتور تھا۔ اس کا ذہن دوررس تھا۔ کسی بھی معاملہ میں تجویز سازی اس کے لیے بہت آسان تھی۔ وہ کسی بھی قسم کے مشکل حالات میں خود کو کامیابی سے ڈھال لیتا۔ اس کی ان خوبیوں نے اسے بہت جلد کشتی لڑنے والوں کا سردار بنا دیا لیکن اس طاقت سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے تیور، جارحانہ پن اور خونخوار انداز مقابل کو خوا مخواہ مرعوب کرنے لگتے۔ تموچن کے علاوہ اس کے کئی ہم عمر افراد اس سے بھی زیادہ تنومند تھے مگر اس کی جملہ خوبیاں سب سے سوا تھیں۔ تیر اندازی کے فن میں بھی وہ بہت جلد کامل ہو گیا۔

تموچن کی ایک سوتیلے بھائی سے خاصی چپقلش رہتی تھی۔ طاقت میں وہ بھی کسی سے کم نہ تھا۔ دونوں فریقین میں محاذ آرائی پیدا ہو گئی۔ تموچن اپنے کسی بھی دشمن کو مہلت دینے کا قائل ہی کہاں تھا۔ سوتیلے بھائی کے ستارے بھی گردش میں تھے۔ اس نے ایک روز تموچن کی شکار شدہ مچھلی چرالی۔ موقع کی تاک میں بیٹھے تموچن نے اسے بلا تامل قتل کر دیا۔ قتل و غارت، بہتا ہوا لہو اور دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی خواہش تو اس کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتی تھی۔ یہ قبیلے کی روایات بھی تھیں اور ذاتی تمنا بھی۔ ان نوعمر خانہ بدوشوں کی گھٹی میں رحم و تحمل کی بجائے انتقام کا درس دیا جاتا تھا۔ اس قتل کے بعد تموچن کے جسم و جان میں ایک عجیب سی سرشاری، دلیری اور حدت پنپنے لگی۔ نوعمری کے تقاضوں جیسی کوئی بات اس میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی۔ وہ ذہنی طور پر بہت پختہ ہو چکا تھا۔ اسے اپنے ہم عمر بچوں کے چھوٹے موٹے جھگڑوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے 'بورتائی' نامی کم سن لڑکی کو شادی کے لیے پسند کر لیا۔

کچھ عرصہ بعد تموچن کو اپنی زندگی میں تلاطم خیز کیفیات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے والد یسوکائی کو دشمن نے دھوکے سے زہریلا مشروب پلا کر موت سے ہمکنار کر دیا۔ یہی دکھ کم نہ تھا کہ قبیلے کی اکثریت نے اس کی کم عمری کے باعث سرداری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تموچن نے بھی ہار مان کے نہ دی اور سرداری کا خاردار تاج اپنے سر سجا کر معاملات کی بہتری میں جت گیا۔

گذرتے وقت کے ساتھ تموچن ذہنی طور پر کافی پختہ ہونے لگا۔ خانہ بدوش نسل کی تمام خوبیاں اور خامیاں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسے قبیلہ میں کمزور افراد گوارا ہی نہ تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے قبیلے کے کسی بھی فرد پر یقین

نہ کرنا۔ چالاکی کے ذریعہ دشمنوں کی دغابازی کو مات دینے کا ہنر بھی آ گیا تھا۔ وعدہ کی پابندی ضرب المثل بن کر قبیلہ میں مشہور ہونے لگی۔ سترہ سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے اس کے قبیلے کی افرادی قوت کافی بڑھ گئی تھی۔ گوبی میں سرداری کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ دشمنوں سے بچاؤ اور چراگاہوں کو اپنے قبضہ میں رکھا جائے۔ اگر کوئی سردار لڑائیوں میں اپنے قبیلہ کی حفاظت نہ کر سکے تو اسے اس منصب پر فائز رہنے کا بھی کوئی حق نہ رہتا۔ تموچن کی چالاکی، فراست، جسمانی قوت اور دلیری نے اسے ہر مخالف پر غالب ہی رکھا۔ قبیلہ کے معاملات متوازن ہوتے ہی اس نے گذشتہ چار برس سے مؤخر شدہ ایک ادھورے وعدہ کی تکمیل کا ارادہ کر لیا۔ بورتائی سے شادی کرنے کا اس سے بہترین وقت کوئی نہ تھا۔

خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتا یہ وقت دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ گوبی میں جنگ کے شعلے ایک بار پھر بھڑک اٹھے تھے۔ شمالی میدانوں میں رہائش پذیر 'کمریت افراد' (بعض مقامات پر مرکیت بھی درج ہے۔) نے تموچن کے قبیلہ پر دھاوا بول دیا۔ یہ کھرے وحشی اور نٹھرا کے علاقوں کے قدیم باشندے درحقیقت اس جنگجو کے لواحقین تھے جس سے اولون کو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ وہ اٹھارہ سال بعد بھی انتقام کی آگ سینوں میں دہکائے ہوئے تھے۔ رات کو تموچن کے اردو میں بھڑکتی ہوئی مشعلیں پھینکنے کے بعد وہ بورتائی کو اٹھا کر واپس لوٹ گئے۔ تموچن نے ان جنگجوؤں کا ڈٹ کر مقابلہ تو کیا لیکن اپنی محبوب اہلیہ کو ان کے تصرف میں جانے سے نہ بچا سکا۔ وحشت، غضب اور انتقام نے اسے دیوانگی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس نے ایک طویل جدوجہد کے بعد بورتائی کو دشمن کی قید سے آزاد کروا لیا اور اس کے وجود میں نمو پاتی زندگی کے بارے میں بھی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے اپنی ہی اولاد قرار دیا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی افرادی قوت میں اضافہ کرتا رہا۔ اس کے بھی جنگجو غیر معمولی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان جنگ جوؤں کے ہمراہ تموچن نے پہلے قریبی قبائل کو اپنا مطیع بنایا۔ پھر تبدیل شدہ نئی حکمت عملی کے بعد ان نئے علاقوں کی طرف کوچ کا ارادہ کر لیا جہاں وسط ایشیا کے شہر آباد تھے۔ ان علاقوں کے قافلے دیکھنے کے بعد وہ کافی متجسس ہو چکا تھا۔ قافلوں پر حملہ کے بعد ملنے والے جو خوش پوش افراد قیدی بنائے گئے وہ سپاہی نہیں تھے۔ علماء، فضلاء،

ہیئت و نجوم کے ماہر، جڑی بوٹیوں کا استعمال جاننے والے، امراض نسواں کے ماہر طبیب اس کے لیے بہت انوکھے لوگ تھے۔

کچھ عرصہ بعد اس نے قروتائی طلب کی۔ اس بار ایشیائے بلند کی تمام تر قوموں پر حکومت کرنے کے لیے ایک شہنشاہ کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔ گذشتہ تین سال کی فتوحات کے بعد تموچن ہی کا انتخاب ہونا تھا۔ اس انتخاب کے بعد تاریخ ساز قروتائی کے ارکان تموچن کو اس کی شخصیت اور کامیابیوں کے شان شایان خطاب دینے کے خواہشمند تھے۔ بہت ساری تجاویز سامنے آئیں۔ اسی مجلس میں ایک بیش گوئی کرنے والے نے تموچن کے لیے 'چنگیز خان' (سرداروں کا سردار، سارے عالم کا شہنشاہ) نام تجویز کر دیا۔

چنگیز خان بنتے ہی تموچن نے ایک اور تاریخی قدم اٹھایا۔ اس کی فراست بھانپ چکی تھی کہ محض قبائلی رسموں کی پابندی کسی بھی اوج کے لیے ناکافی ہے۔ رسوم اور انسانی مزاج میں اختلافات مسلمہ ہوا کرتے ہیں۔ اس نے اپنے زیر نگین سبھی قبائل کو متحد کرنے کے لیے ایک نیا مجموعہ قوانین 'یاسا' متعارف کروایا۔ اس کے بعد چین کی جانب پیش قدمی کی اور اسے مکمل طور پر روند ڈالا۔

اقوام واپس آ کر چنگیز نے تبت سے سرقند تک کے وسیع کہستانی سلسلوں میں پھیلی کوشلوک سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد شمالی ایشیاء میں امن قائم ہو گیا۔ بغاوت ختم ہو چکی تھی۔ حالات کا یہ عالم تھا کہ خانہ بدوشوں کی اس سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی دلکش

حسینہ اپنے ساتھ ڈھیروں سونا لیے تنہا بھی سفر کرتی تو اسے کسی قسم کا خطرہ یا مزاحمت درپیش نہ ہوتا۔ اس انتظامی بہتری سے چنگیز خان کی طبیعت اوبنے لگی۔ اسے سرمائی شکار میں بھی لطف نہ آتا۔ دل میں برسوں پرانی تمنا ایک بار پھر شدت سے مچلنے لگی۔ وہ اپنے دشمنوں کو کچل کر قدموں میں گرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ خواہش بھی بہت جلد پوری ہوگئی۔ مسلم حکمران خوارزم شاہ کے ماموں کی ناعاقبت اندیشی کے باعث اس کے بھیجے گئے اہلکار قتل کردیے گئے۔ چنگیز خان سراپا انتقام بن گیا۔ اس نے لشکر تیار کیا اور بوقت رخصت ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''تم سب میرے ساتھ اپنی زور آزمائی سے اس شخص کو نیچا دکھانے جارہے ہو جس نے ہماری توہین کی ہے۔ اس کا گھمنڈ توڑنے کی فتح میں تم سب میرے ساتھ شریک ہو گے۔ فتح ہمیشہ نظم و ضبط اور اطاعت سے ملتی ہے۔ سردار خواہ دس سپاہیوں کا ہو یا دس ہزار کا۔ اس کی اطاعت سے غفلت کرنے والا اسی وقت موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اس کی عورتیں اور بچے بھی سسک سسک کر مریں گے۔''

وقت گذرتا رہا۔ منگولوں اور خوارزم شاہ کا ٹکراؤ مختلف مقامات پر جاری رہا۔ اسی دوران چنگیز خان کو خوارزم شاہ کے 'بخارا' میں ہونے کی اطلاع ملی۔ وہ ناقابل یقین رفتار سے تعاقب میں لپکا لیکن وہاں پہنچ کر علم ہوا کہ خوارزم شاہ فرار ہوچکا ہے۔ منگول سوار کسی سیلابی ریلے کی طرح شہر کی سڑکوں پر امنڈ آئے تھے۔ غلے کے گودام اور ذخیرے لوٹ لیے گئے۔ کتب خانے گھوڑوں کے اصطبل بنالیے گئے۔ قرآن پاک کے صفحات گھوڑوں کے سموں تلے روندتے دیکھ کر مسلمان بے بسی محسوس کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کرسکے۔ چنگیز خان.... اپنا گھوڑا لیے جامع مسجد میں داخل ہوگیا۔ بخارا میں بھیانک تباہی کی داستان رقم کی گئی۔ خوارزم شاہ کا تعاقب شہر بہ شہر جاری رہا لیکن وہ گرفتار یا ہلاک ہونے کی بجائے طبعی موت سے ہی ہمکنار ہوا۔ اس کے بعد چنگیز خان کو جلال الدین سے بھی کئی معرکے درپیش رہے۔

جنگ کے علاوہ چنگیز خان کا دماغ اصلاحی اقدامات میں بھی الجھا رہا۔ اس نے کئی بے مثال اور مفید انتظامی اقدامات کیے۔ ڈاک کا نظام استوار کیا۔ جابجا سرائے تعمیر کروائے۔ مردم شماری کے لیے بھی خصوصی کتابچے بنائے گئے۔ چنگیز کی اوّلین ترجیح فوج کی تنظیم اور نئی سڑکوں کی تعمیر ہی رہی۔ جنگ و جدل میں مصروف چنگیز خان اب بڑھاپے کی جانب گامزن تھا۔ اس کے مزاج میں اب کئی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔ وہ ایشیائے بعید لوٹنا چاہتا تھا جہاں اہل ختا پر مامور مقولی بہادر اب زندہ نہ تھا۔ گوبی کے خان جمت اور تکرار میں پھنس چکے تھے۔ ہیا کی سلطنت میں بھی بغاوت کی چنگاریاں شعلوں کا روپ دھارتی نظر آرہی تھیں۔ اس نے پشاور کو تاراج کرتے ہوئے سمرقند کا رخ کرلیا۔ واپسی کے اس سفر میں جنگی قیدیوں کا قتل عام کردیا گیا۔ مسلم بادشاہوں کی حرم سراؤں سے مغوی خواتین اور بیگمات بھی منگولوں کے قبضہ میں تھیں۔ ان پر محض اتنا رحم کھایا گیا تھا کہ سڑک کے کنارے اپنے والی کو آخری بار دیکھ کر رونے دھونے کی اجازت دے دی گئی۔

کچھ عرصہ بعد اسے یورپی چراگاہوں میں سرگرداں جوجی کی موت کی خبر ملی۔ لاکھوں افراد کا قتل عام کروانے، دشمن کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کروانے اور ان کھوپڑیوں میں شراب سے لطف اندوز ہونے والا وہ سردار بیٹے کی موت پر شدید صدمہ میں مبتلا تھا۔ وہ کسی کے سامنے اپنے رنج و الم کے اظہار کی بجائے خیمہ میں گوشہ نشین ہو کر خاموشی سے ماتم کرتا رہا۔ جوجی کی موت کا صدمہ ایک ناقابل مندمل زخم سہی، لیکن معمولاتِ زندگی نبھاتے رہنا بھی ضروری تھا۔ چنگیز خان ایک بار پھر میدان عمل میں کود پڑا تاہم اب سابقہ ہمت اور آہنی عزائم لرزیدہ ہوتے محسوس ہورہے تھے۔ کچھ عرصہ سے لاحق مختلف امراض کے اثرات اب مزید مسائل پیدا کرنے لگے۔ اسی دوران وہ حادثاتی طور پر گھوڑے سے گر کر زخمی ہوگیا۔ طویل عرصہ سے دشمنوں سے برسرِپیکار چنگیز خان نے بستر مرض پر بھی اس بات کا مکمل بندوبست کردیا تھا کہ بچے کھچے دشمنوں کو نیست و نابود کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ اس کا واضح حکم تھا کہ ہیا کے بادشاہ کی مکمل تباہی سے پہلے اس کی موت ہر قیمت پر پوشیدہ رکھی جائے۔

اپنی زندگی کے آخری روز اٹھارہ اگست 1227 کو اس نے تمام ارخونوں، ترخانوں اور دیگر سرداروں کو اپنے خیمہ میں بلوایا۔ وہ سب دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور توجہ سے سننے لگے۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ اس کا بیٹا تولی مشرقی علاقوں کا حکمران ہوگا۔ دوسرا بیٹا چغتائی مغربی علاقوں کا وارث ہوگا جبکہ اوغدائی اس کا جانشین مقرر ہوگا۔

مجلس ختم ہونے کے بعد وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ دشمنوں کے لیے قہر ثابت ہوتے اور لاشوں کی ڈھیر لگاتے ہوئے بالآخر وہ لمحہ بھی چلا آیا جب گوبی کی دہشت نے آخری سانس لی۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اس کی موت کے بعد ایک نیزہ یورت کے باہر گاڑ دیا گیا۔ یہ یورت خیمہ گاہ سے قدرے فاصلہ پر موجود تھا۔ رواج کے مطابق نیزہ کی انی زمین میں دھنسی ہوئی تھی جو اس بات کا اعلان تھی کہ سردار سخت علیل ہے۔ نجومی، دانشوروں اور مشیروں میں سے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ ملتی۔ انہوں نے نہایت کامیابی سے چنگیز خان کی موت پوشیدہ رکھی ہوئی تھی۔ چنگیز کی خواہش کے مطابق ہیا کے بادشاہ اور اس کی فوج کو مغل اردو میں ضیافت میں مدعو کر کے اعزازی خلعت پہنائے گئے۔ اسے اردو کے سرداروں کے درمیان بٹھا کر عزت بخشی گئی اور پھر ان سب کا قتل عام کردیا گیا۔ یہی سلوک جنازے سے واپسی پر عوام کے ساتھ کیا گیا۔ جنازے کا رتھ لے جاتے ہوئے راہ میں نظر آنے والا ہر شخص موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تاکہ دشمنوں تک چنگیز خان کی موت کی خبر نہ پہنچ سکے۔ ریگستان پہنچ کر اردو کے پرانے سپاہی جنازے کے ساتھ بآواز بلند ماتم کرنے لگے۔

''اے ہمارے بہادر آقا! تو ہمیں اس طرح چھوڑ کے کیوں چلا گیا؟

تیرا پیدائشی ملک اور اس کی رواں ندیاں آج بھی تیری منتظر ہیں۔

تیرے خوش نصیب آبائی وطن میں سنہرا مکان بہادر سورماؤں کے نرغہ میں ہے۔

وہ سورما آج بھی تیرے منتظر ہیں۔

تو ہمیں اس گرم سرزمین پر کیوں چھوڑ گیا ہے جہاں دشمنوں کی لاشیں ڈھیر کی صورت میں پڑی ہیں۔''

ریگستان کی سطح عبور کرتے اردوؤں نے بھی ماتم جاری رکھا۔ ان کی زبانوں سے ادا ہونے والا ہر ایک لفظ دلی عقیدت اور دائمی جدائی کے گہرے زخم سے چور تھا۔

''وقت کی چالیں کون سمجھ سکتا ہے بھلا؟

یہ انسان کو زندگی میں متضاد موسم دکھاتا ہے۔

کبھی تو شہباز کی مانند جھپٹا کرتا تھا لیکن اب ایک لڑکھڑاتی ہوئی گاڑی تیرا بے جان وجود لیے رواں دواں ہے۔

''اے ہمارے عظیم خان!

ہم کیسے یقین کرلیں کہ تو اپنے اہل و عیال، قوم اور قرولتائی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اے ہمارے خان!

تو ہمارا سردار تھا۔ ہم تیری سرپرستی میں ایک عظیم قوت بن کر پنپ رہے تھے۔

تو فخر و غرور سے عقاب کی مانند چکر لگایا کرتا تھا لیکن اب موت نے تجھے اپنے قبضہ میں کر کے نقل و حرکت سے بھی عاجز کردیا ہے۔

اے ہمارے خان!

یہ ہم پر کیسا ستم ٹوٹا ہے...... یہ تجھ پر کیسا وقت آن پڑا ہے؟''

چنگیز خان کی لاش قراقرم کی بجائے ان وادیوں میں لے جائی گئی جہاں اس کا جدوجہد اور مشکلات سے لبریز لڑکپن بسر ہوا تھا۔ اردو کے ہرکارے مختلف ارخانوں، شہزادوں اور دور دراز سپہ سالاروں تک خبر پہنچانے کے لیے لاش کو اس آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا جس کا انتخاب وہ پہلے ہی کرچکا تھا۔ تدفین سے قبل چنگیز خان کے اس گھوڑے کو بھی مار دیا گیا جس پر وہ اپنے آخری ایام میں سواری کرتا رہا تھا۔ اس گھوڑے کی ہڈیاں علیحدہ کر کے انہیں جلا کر خشک اور صاف کرلیا گیا۔ قبر کے اندر چھوٹا خیمہ نصب کر کے پکا ہوا گوشت، اناج، ایک کمان، تلوار اور گھوڑے کی ہڈیاں رکھ کر چنگیز خان کو دائمی رہائش گاہ تک پہنچا دیا۔ چالیس عورتیں، چالیس خوبصورت مشکی گھوڑے ذبح کر کے قبر پر چڑھائے گئے۔ تدفین کے بعد ایک قبیلے کو فوجی خدمت معاف کر کے اس مقام کی نگرانی سونپ دی گئی۔ قبر پر تقریباً ایک ہزار گھوڑے دوڑائے گئے تاکہ زمین ہموار ہوجائے اور قبر کا نشان باقی نہ رہ پائے۔ درختوں کے جھنڈ میں خوشبو جلانے کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد قرب و جوار کا جنگل اس قدر گھنا ہوگیا کہ چنگیز خان کی قبر والے صنوبر کے درخت کا نشان حقیقتاً کھوگیا۔

ماخذات:

مشاہیر کے آخری لمحات...... طاہر منصور فاروقی

وکی پیڈیا

ہدایت کار

اعجاز احمد نواب

پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ فلمی دنیا سے جڑے افراد نے لکھا ہے۔ سرگزشت میں پاکستانی فلمی صحافت کا ایک بڑا نام علی سفیان آفاقی نے مکمل فلمی تاریخ لکھی ہے۔ انور فرہاد جیسے کہنہ مشق صحافی نے روداد قلم بند کی ہے اور اب اسی سلسلے کو اعجاز احمد نواب آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہر قلمکار کا اپنا انداز بیان ہوتا ہے جن نکتوں کو اٹھایا گیا ہے اس کی گہرائی ملاحظہ کریں۔

فلمی صنعت سے وابستہ کہی ان کہی یادیں

تقسیم کے بعد لاہور میں فلمیں بننا شروع ہوتو گئیں، لیکن فلم میکرز پھونک پھونک کر قدم دھر رہے تھے، فلم ریلیز کرنے سے قبل خاص طور پر تسلی کرتے کہ کہیں اس جمعہ کو کسی بڑے بھارتی پروڈیوسر کی فلم تو نہیں آرہی، اگر ایسا ہونے کا شک بھی ہوتا تو اپنی فلم کی ریلیز کو روک لیتے، لیکن پھر جلد ہی جلد... یہ خوف اتر گیا کیونکہ ابتدائی سالوں میں ہی پاکستان کی لاہور میں تیار ہونے والی فلمیں پے درپے کامیاب ہونے لگیں، پہلے ہی عشرے میں جن ہدایت کاروں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر اپنے نام کی دھاک بٹھائی، اور اپنے وقت میں جن کا سکہ رائج تھا، ان میں ایک نام ہدایت کار مسعود پرویز ہے! ہدایت کار مسعود پرویز کا نام سامنے آتے ہی دماغ میں فلم ہیر رانجھا اتر آتی ہے، لیکن مسعود پرویز تو فلم ہیر رانجھا سے 28 سال قبل بھی فلمی لائن میں موجود تھے اور ان کے کریڈٹ پر بے شمار اور لازوال کام موجود ہے لیکن ہیر رانجھا کی آفاقی اور دوامی شہرت نے ان کے شاندار ماضی کو پردے کی اوٹ میں کردیا۔ شائقین اور مؤرخین نے ان کی باقی تمام فلموں اور بقیہ سارے کارناموں کو پس پشت ڈال دیا، اور اس کی وجہ بھی تھی، مسعود پرویز کی ہیر رانجھا لولی ووڈ کا فخر ہے، اس کی اوّلین ریلیز کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ بیت چکا ہے، لیکن اس طویل گزرے وقت کے ماہ وسال بھی اس پر گرد کی تہہ جما نہ سکے، ہیر رانجھا وہ موضع ہے جو برصغیر میں فلم سازی کی ابتدا سے لے کر مسعود پرویز کی ہیر رانجھا تک دوسرے تمام موضوعات سے زیادہ یا کسی ایک ہی کہانی جس کو سب سے زیادہ مرتبہ پکچرائز کیا گیا، وہ وارث شاہ کی ہیر ہی ہے، برصغیر پاک و ہند میں ہیر رانجھا سے زیادہ کوئی عشقیہ کہانی مشہور نہیں ہوئی! خاموش فلموں سے لے کر بولتی فلموں تک رنگین فلموں سے لے کر سینما اسکوپ فلموں تک اور اس کے بعد ڈیجیٹل کمپیوٹرائز دور تک ہیر رانجھا کی تو اسٹوری ہمیشہ سے فلم میکرز کے لیے فیورٹ رہی ہے، متحدہ ہندوستان سے لولی ووڈ بالی ووڈ تک وارث شاہ کی ہیر کو کم وبیش 25 مرتبہ پکچرائز کیا گیا، لیکن آخر کار یہ سلسلہ تب تھما جب مسعود پرویز نے اس کہانی پر اعجاز درانی اور فردوس کو لے کر ہیر رانجھا تخلیق کی، اس کے بعد پاک وہند میں ہیر رانجھا کو فلمانے کا سلسلہ ترک کردیا گیا۔ ہاں، کبھی کبھار اس کہانی کو جدید پیرائے میں ڈھال کر ماڈرن انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو بری طرح تجربہ ناکام رہتا ہے کیونکہ سب کو یقین آگیا ہے کہ ہدایت کار مسعود پرویز کی ہیر رانجھا جس طرح بن چکی ہے، اس سے بہتر انداز میں اب ہیر رانجھا پکچرائز نہیں ہوسکتی، فردوس سے موزوں ہیر نہیں مل سکتی، اعجاز سے اچھا رانجھا نہیں ڈھونڈا جا سکتا، اجمل سے بہتر کیدو کا کردار اب کوئی اور ادا نہیں کرسکتا، زمرد سے اعلیٰ سہتی کوئی نہیں بن سکتی۔ کھیڑے کا رول منور ظریف کے بعد کوئی ادا کر سکے گا یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا، وارث لدھیانوی جیسے مکالمے کیا کوئی اب لکھ پائے گا؟ خورشید انور جیسا میٹھا مدھر میوزک کون ترتیب دے گا؟ گانوں کے لیے نور جہاں کہاں سے آئے گی؟ یہی باتیں سوچ کر اب کوئی فلم ساز ہدایت کار چاہے لاہور کا ہو کراچی کا ہو یا ممبئی کا، جرأت نہیں کر پایا نہ آیندہ کر پائے گا۔ لولی ووڈ کی ہیر رانجھا کے بعد یہ موضوع اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لولی ووڈ اور بولی ووڈ دونوں میں بند ہوگیا ہے، رنگیلا کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں گے جو غیر اہم اور چھوٹے سے کردار کو بھی ایسے مخصوص انداز سے ادا کر گیا ہے کہ فلم بین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے تھے۔ بلاشبہ ہیر رانجھا پنجابی فلموں میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک سرتاج فلم ہے، اس شہرۂ آفاق فلم کے ہدایت کار مسعود پرویز تھے، جبکہ اس کے پروڈیوسر اعجاز درانی تھے، جو کہ ملکۂ ترنم کے تب خاوند ہوا کرتے تھے!

اعجاز درانی 1935ء میں پنجاب کے ضلع گجرات کے علاقہ جلال پور جٹاں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم جلال پور جٹاں سے حاصل کرنے کے بعد جہلم سے بیچلر آف آرٹس کی ڈگری حاصل کی، اس دوران وہ فلمیریا میں مبتلا ہو چکے تھے۔ فلموں کے اسیر ہو چکے تھے، فلمی اداکاروں کو قریب سے دیکھنے کا شوق اور فلموں میں کام کرنے کی خواہش انہیں لاہور کھینچ لائی، اس وقت ان کی عمر صرف بیس برس اور یہ 1955ء کا سنہ تھا۔ کافی جدوجہد کے بعد انہیں ایک فلم حمیدہ میں چھوٹا سا کردار ملا اس فلم کے پروڈیوسر منشی دل اور ہدایت کار داؤد چاند تھے۔ یہی وہ داؤد چاند تھے جنہوں نے پاکستان کی پہلی فلم تیری یاد بنائی تھی، حمیدہ 1956ء میں ریلیز ہوئی، ان کی دوسری فلم مرزا صاحباں بھی اسی برس سینماؤں کی زینت بنی۔ اس فلم میں بھی یہ سپورٹنگ رول میں تھے، تاہم تیسری فلم بڑا آدمی میں ان کی فنکارانہ صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے انہیں بطور ہیرو کاسٹ کیا گیا، اسی دوران یہ ملکۂ ترنم نور جہاں کی نظروں میں سما گئے، اور وہ انہیں دل دے بیٹھیں، یوں اعجاز اور نور جہاں 1959ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے، یہیں سے اداکار اعجاز درانی کی دولت اور شہرت کا دور شروع ہوا، ملکۂ ترنم کے اثر ورسوخ کی وجہ سے وہ دھڑا دھڑ فلموں میں کاسٹ ہونے لگے، تاہم اعجاز نے بھی پروڈیوسرز اور اپنے فلم ڈائریکٹرز کو مایوس نہ کیا، اور اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کی فلمیں یکے بعد دیگرے سپر ہٹ ہونے لگیں، شہید (اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو/ جیبی ہیا ہیا، نقاب جب اٹھایا شباب رنگ لایا/ نثار تیری گلیوں پہ اے وطن کے جہاں/ میری نظریں ہیں تلوار کس کا دل ہے روکے وار) لاکھوں میں ایک (حالات بدل نہیں سکتے ان راہوں پہ جیون بھر ہم ساتھ چل نہیں سکتے/ ہو سن ساجنا، دکھی من کی پکار ہوا و بیری سنسار/ پیار نہ ہو جب دل میں تو جینا ہے ادھورا مانے یا نہ مانے غفورا/ بڑی مشکل سے ہوا تیرا میرا ساتھ پیا/ دل دیا درد لیا آنکھ میں آنسو آئے ہو/ ساتھی کہاں ہو/ چلو اچھا ہوا تم بھول گئے) بہن بھائی (اے بے کسوں کے والی دے دے ہمیں سہارا، مشکل میں ہم نے تیری رحمت کو ہے پکارا) زرقا (رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے/ میں پھول بیچنے آئی) دیا اور طوفان (گا میرے منوا گاتا جارے جانا ہے ہم کا دور) دوستی (بس گیا تو سوتنیا کے دوار سجنا کہاں ہے تیرا پیار سجنا/ چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے/ روٹھے سیاں کو میں تو اپنے خود ہی منانے چلی آئی) انورا (لاج محبتاں دی رکھ وے میرے پنڈ دیا چھورا/ میرا پیار نہ دلوں بھلاویں میرے سوہنیا سجنا/ سن وے بلوری اکھ والیا) آسو بلا خان، چاچا سلطان، دور نگیلے، ضدی، بنارسی ٹھگ۔

اعجاز کا شمار لولی وو ڈ کے مشہور و معروف اداکاروں میں ہونے لگا تھا، وہ فلم ساز بھی تھے۔ ہیر رانجھا سے قبل وہ مرزا جٹ جیسی کامیاب فلم بنا چکے تھے، اسی فلم کے دوران شوٹنگ ان کا دل فردوس پر آ گیا تھا دونوں کے درمیان چلنے والے عشق کی مشک ملکۂ ترنم تک آ پہنچی تھی، جس کی وجہ سے اعجاز اور نور جہاں کے درمیان واضح دراڑ پڑ گئی تھی۔ دونوں جانب کے شیشہ دل میں بال آ چکا تھا، اسی بناء پر ہدایت کار مسعود پرویز کو شبہ تھا کہ کہیں نور جہاں ہیر رانجھا کے لیے اپنی آواز دینے سے انکار نہ کر دیں، کیونکہ فلم کے گیتوں کی دھنیں، موسیقار نے نور جہاں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی ترتیب دی تھیں، اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ نور جہاں نے ہیر رانجھا کے گیت گانے سے انکار کر دیا، یہ بات ہدایت کار فلم ساز سمیت ہیر رانجھا سے وابستہ تمام افراد کے لیے دھچکا تھی۔ آج کے قارئین اور فلم بینوں کی معلومات کے لیے یہاں بتانا ضروری ہے کہ ملکۂ ترنم نور جہاں کوئی عام فنکارہ نہ تھیں، بھارت میں لتا منگیشکر کی بھی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی ملکۂ ترنم کی لولی وڈ میں تھی۔ کسی بھی فلم میں نور جہاں کے گیت فلم کی کامیابی کی ضمانت رکھتے تھے، فلم کے لیے نور جہاں کی آواز آکسیجن کی سی اہمیت کی حامل تھی، جس سے نور جہاں ناراض ہو جاتیں اس کے لیے فلمی کیریئر بچانا مشکل ہو جاتا، نور جہاں کے انکار کے بعد ہیر رانجھا کیمپ میں سکتہ طاری ہو گیا، اعجاز درانی کی گزشتہ فلم مرزا جٹ کے موسیقار رشید عطرے تھے جو اب وفات پا کر جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے لہٰذا ہیر رانجھا کی موسیقی کے لیے عظیم موسیقار خواجہ خورشید انور سے رجوع کیا گیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہیر رانجھا سے قبل خواجہ خورشید انور نے کبھی کسی پنجابی فلم کی موسیقی ترتیب نہ دی تھی، البتہ اردو فلموں کی موسیقی کے وہ بے تاج بادشاہ قرار پا چکے تھے۔ انتظار، گھونگھٹ، ایاز، کوئل، جھومر اور شہید جیسی فلمیں تھیں جو سرحد پار سے بھی داد سمیٹ سمیٹ کر لا رہی تھیں، او جانے والے رے ٹھہرو ذرا رک جاؤ لوٹ آؤ...... چاند ہنسے دنیا بسے روئے میرا پیار...... چھن چھن ناچوں گی، گن گن گاؤں گی...... غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا...... جس دن سے پیا دل لے گئے دکھ دے گئے...... چلی رے چلی رے چلی رے میں تو دیس پیا کے چلی رے...... کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو...... دل کا دیا جلایا میں نے دل کا دیا جلایا...... دل جلا نہ دل والے آنکھ ملا لے...... مہکی فضائیں گاتی ہوائیں بہکے نظارے سارے کے سارے تیرے لیے ہیں...... تیرے بنا سونی سونی لاگے رے...... رم جھم رم جھم پڑے پھوار تیرا میرا نت کا پیار...... او بے وفا، میں نے تجھ سے پیار کیوں کیا، اور ان جیسے مزید درجنوں گیت جو آج بھی کہیں بجتے ہوئے گوش بشری تک رسائی حاصل کر لیں تو کان بے اعتنائی نہیں برت سکتے! لازوال نغمیں جو آج ساٹھ سال بعد بھی مقبولیت کے اوجِ ثریا پر براجمان ہیں" سنو عرض میری کملی والے، کوئی کیا سمجھے کوئی کیا جانے میں تو اجڑ گئی کملی والے! جو نہ ہوتا تیرا جمال ہی تو جہاں تھا خواب و خیال ہے لیکن خواجہ خورشید انور نے کبھی پورے کیریئر میں پنجابی فلم کی موسیقی ترتیب نہ دی تھی، یہ نہیں کہ انہیں کبھی پنجابی فلم کی پیشکش نہ ہوئی تھی بلکہ بے شمار بار انہیں پنجابی فلموں کی موسیقی مرتب کرنے کے بارے میں راغب کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ہر بار وہ کوئی نہ کوئی عذر تراش دیتے، لیکن جب مسعود پرویز اور اعجاز درانی نے ہیر رانجھا کی پیشکش کی تو خواجہ خورشید انور کی جہاندیدہ نظروں نے بھانپ لیا کہ یہ کوئی عام فلم نہ ہوگی۔ یہ ٹیم پہلے مرزا جٹ بنا کر کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ چکی تھی جس کے میوزک ڈائریکٹر رشید عطرے تھے جس کے گیت ابھی تک وطن عزیز کے گلی کوچوں، بسوں، ہوٹلوں اور ریڈیو پر گونج رہے تھے (نکے ہوندیاں دا پیار ویکھیں دیویں نہ وسار...... تجھے دل والے بو ہے اجے میں نیوں ڈھوئے...... میاروتی میرے ہانو دیو، نہ عشق نوں لیکاں لاویں ہاڑ اوے ڈھولن نہ جاویں) لیکن اب رشید عطرے انتقال کر چکے تھے، موسیقی کا سنہری باب بند ہو چکا تھا خواجہ خورشید انور نے یہ ہامی بھر لی کیونکہ ویسے بھی اب ان پر کچھ ایسی آوازیں اٹھنے لگی تھیں کہ پنجابی میوزک شاید خواجہ صاحب کے بس میں ہی نہیں، حالانکہ خواجہ خورشید انور خود پنجابی تھے، ہیر رانجھا کی کہانی وارث شاہ کے منظوم پنجابی کلام سے اخذ کی گئی تھی۔ اس کا اسکرپٹ وارث لدھیانوی نے تحریر کیا جب کہ گانے احمد راہی نے لکھے تھے۔ ایک دو گیت وارث لدھیانوی کے بھی تھے، یہ ہر لحاظ سے مضبوط ترین ٹیم تھی لیکن اس وقت سب کچھ ڈھ گیا جب ملکۂ ترنم نے گیت گانے سے انکار کر دیا، فلم ساز نے تو کہہ دیا کہ گیت مالا بیگم اور رونا لیلیٰ سے گوا لیے جائیں، لیکن خواجہ خورشید انور اڑ گئے کہ اگر نور جہاں نہیں گائے گی تو میں ہیر رانجھا کی موسیقی سے الگ ہو جاؤں گا۔

بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اعجاز فردوس کے تعلقات پر تو نور جہاں نے فلم کے لیے اپنی آواز دینے سے انکار کر ہی دیا تھا، لیکن جب ہدایت کار مسعود پرویز اور خواجہ خورشید انور دونوں مل کر ملکۂ ترنم کے پاس گئے تو ان محترم شخصیات کے احترام میں نور جہاں انکار نہ کر پائیں اور دکھی دل کے ساتھ اپنی آواز فردوس کی لپ سنگنگ کے لیے دینے کا اعلان کر دیا، یہ اتنا مشکل کام تھا کہ دنیا کی دوسری کوئی عورت شاید نہیں کر سکتی، آج کی کسی بھی گلوکارہ سے پوچھیں کہ کیا آپ اس اداکارہ پر پکچرائز کرنے کے لیے رومینٹک گانا گائیں گی جس کے بارے آپ کو علم ہو کہ وہ اور آپ کا خاوند آپس میں عشق کرتے ہیں، اور عنقریب شادی بھی کر سکتے ہیں اور آپ کو طلاق بھی ہو سکتی ہے، پوری دنیا میں شاید ایک بھی گلوکارہ ایسی نہیں ملے گی اور پھر نور جہاں نے کچھ ایسے رچاؤ سے ہیر رانجھا کے نغمات ریکارڈ کروائے کہ آج پچاس سال بعد بھی ان کی چاشنی اور مٹھاس قائم ہے۔ ہیر رانجھا میں دس گیت تھے جس میں سے سات نور جہاں کے تھے اور یہ اتنے مقبول ہوئے کہ اس کے بعد شاید ہی کسی فلم کے گانے اتنے شہرت یافتہ کہلائے (ونجھلی والڑیا، توں تے موہ لئی او مٹیار جنہیں سی کدی نہ منی ہار تینوں کر بیٹھی او پیار ونجھلی والڑیا اے گل بھلی ناں سن ونجھلی دی مٹھڑی تان وے میں تاں ہو ہو گئی قربان دے جند ماہیا تیری راہ پئی تکنی آں زلفاں دی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں ڈھولنا) اور پھر وہی ہوا جس کا ملکۂ ترنم سمیت سب کو شک تھا ہیر رانجھا کی تکمیل کے دوران ہی فردوس اور اعجاز جو فلم ہیر رانجھا کے ہیرو ہونے کے ساتھ ساتھ فلم ساز بھی تھے نے شادی کر لی، اس بات سے دل برداشتہ ہو کر ملکۂ ترنم نے اعجاز سے طلاق لے لی، اور ہر اس فلم کے لیے گیت گانے سے انکار کر دیا جس میں فردوس ہوتی تھی چونکہ اس وقت فردوس اپنے کیریئر کے جوبن پر تھی لہٰذا فوری طور پر تو فردوس کو کچھ فرق نہ پڑا لیکن پھر جلد پروڈیوسرز نے فردوس کو ہیروئن کاسٹ کرنا چھوڑ دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اگلے چار پانچ سالوں کے اندر فردوس فلموں سے باہر ہو گئی۔

فردوس 4 اگست 1947ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں 1963ء میں بطور کلاسیکل رقاصہ فلموں کی جانب آئیں، ان کی ابتدائی فلمیں فانوس، میخانہ، خاندان وغیرہ بری طرح فلاپ ثابت ہوئیں لیکن پھر 1967ء میں ریلیز ہونے والی پنجابی فلم ملنگی انتہائی کامیاب ٹھہری جس کی بنیاد پر فردوس بھی ہٹ ہو گئیں، گو ملنگی میں ہیروئن فردوس نہ تھیں بلکہ اداکارہ

شیریں ہیروئن تھیں، جب کہ فردوس دوسرے ہیر میں اداکار یوسف خان کے مقابل تھیں، تاہم فلم کا سب سے مشہور ہونے والا نغمہ فردوس پر پکچرائز ہوا تھا، پاڈش نگیر پاکستان کے معروف ترین میوزک ڈائریکٹر اور طبلہ نواز استاد طافو نے اپنا فلمی کیریئر بھی ملنگی سے ہی شروع کیا تھا اور اس گیت کی ڈھولک طافو کی انگلیوں کا ہی کمال ہے۔ "ماہی وے سانوں بھل نہ جاویں اللہ داناں ایں دیر نہ لاویں ہانڑ دے آ تجڑاں لمیاں اڈیکاں دن پیار دے۔"

ملنگی لولی ووڈ سینما کی یادگار ترین گولڈن جوبلی فلم ہے، اس فلم کا ایک مکالمہ بہت زیادہ مشہور ہوا تھا اور بچے بچے کی زبان پر ہوتا تھا۔ "دن نوں راج فرنگی داتے رات نوں راج ملنگی دا۔"

فلم کی شوٹنگ کے دوران اکمل اور فردوس کی قربتیں بڑھیں اور دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے، تاہم زندگی نے مہلت نہ دی۔ اکمل شہرت اور جوانی کی بلندیوں پر ہی تھے کہ فرشتہ اجل آن پہنچا، 11 جون 1967ء کو انتقال کر گئے، اداکار اکمل کا اصلی نام محمد آصف خان تھا، 1930ء میں پیدا ہوئے یہ، اداکار اجمل کے چھوٹے بھائی تھے، یہ اجمل ہی تھے جنہوں نے فلم ہیر رانجھا میں کیدو کا کردار ادا کیا، اعجاز درانی سے فردوس کی دوسری شادی تھی۔ ادھر اعجاز درانی کی بھی یہ دوسری ہی شادی تھی۔ پہلی شادی 1961ء میں نور جہاں سے ہوئی تھی، اداکارہ فردوس نے مجموعی طور پر 160 فلموں میں اداکاری کی جس میں 130 پنجابی فلمیں تھیں!

1979ء میں پھر ایک واقعہ پیش آیا، اچانک ہی اخبارات کے ذریعے پاکستان خبر پہنچی کہ ہیتھرو ائیرپورٹ برطانیہ میں اداکار اعجاز درانی چرس کی اسمگلنگ کرنے کی کوشش میں گرفتار ہوگئے۔ یہ خبر پاکستان فلم انڈسٹری پر بجلی بن کر گری، اس وقت فردوس اور نور جہاں دونوں سابقہ بیویاں تھیں، لیکن پھر دنیا نے حیرت انگیز منظر دیکھا کہ نور جہاں سابقہ بیوی ہوتے ہوئے بھی سابقہ خاوند کی محبت میں بے قرار ہوگئیں، متحرک ہوگئیں۔ اس کیس میں اعجاز درانی سزا سے تو نہ بچ سکے لیکن ملکۂ ترنم نے پورے کیس کی پیروی کی اور اپنی بین الاقوامی شخصیت اور تعلقات کے باعث برطانوی اخبارات میں خبروں کی زینت بنتی رہیں، اعجاز درانی کو پانچ سال قید کی سزا ہوئی۔ دوران قید بھی نور جہاں انہیں جیل میں ملنے جاتی رہیں، لیکن فردوس نہ گئی حالانکہ دونوں ہی اعجاز کی مطلقہ بیویاں تھیں تاہم تاریخ کے حوالے سب یہی بتاتے ہیں کہ فردوس نے منہ موڑ لیا اور فلمساز شیخ نذیر حسین سے شادی کرلی، جبکہ ملکۂ ترنم اپنے سابقہ خاوند کی رہائی اور پاکستان واپسی تک اعجاز کو مسلسل ملنے جاتی رہیں اور انہ سے جرم کی مدد بھی پہنچائی، قید کاٹ کر اعجاز درانی واپس آئے تو ایک بار پھر فلم پروڈکشن کی جانب مائل ہوگئے۔ اس سے قبل وہ مرزا جٹ ہیر رانجھا اور دوستی جیسی ڈائمنڈ جوبلی فلمیں بنا چکے تھے لیکن اب جب وہ لوٹے تو رومینٹک فلموں کا دور لد چکا تھا، لولی ووڈ پہ چہار سو سلطان راہی کا گنڈاسہ چل رہا تھا، بہتی گنگا میں انہوں نے بھی ہاتھ دھونے کے لیے کمر کس لی، اور سکہ رائج الوقت غیر تعلیم یافتہ ہدایت کار یونس ملک سے تعلیم کی ترویج کے موضوع پر بلاک بسٹر ڈائمنڈ جوبلی فلم شعلے بنوا ڈالی۔ سلطان راہی، انجمن اور مصطفیٰ قریشی کی ٹرائیکا ان دنوں لولی ووڈ پر راج کررہی تھی، فلم کے موسیقار وجاہت عطرے اور گلوکارہ ملکۂ ترنم نور جہاں تھیں فلم کی بقیہ کاسٹ بھی روایتی تھی۔ الیاس کاشمیری، بہار انور خان، الطاف خان، جگی ملک اور افضال احمد! فلم کے سب ہی گانے مقبولیت کے آسمان پر جا پہنچے۔

جھانجھر دی پاواں جھنکار، نیناں چوں ڈھلدا اخمار
جے میں ہوندی ڈھولنا وے ڈھولنا، سونے دی تعویتری

☆☆☆

کچھ شخصیات قدرتی طور پر سحر انگیز یا جادوئی صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں اور کچھ پیدا ہی دوسروں کو لیڈ کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ ہر موضوع ہر شعبہ میں دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن جاتے ہیں اردو پنجابی فلموں کے ہدایت کار مسعود پرویز بھی ایک ایسی ہی ہستی تھے فلمی صنعت میں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، مسعود پرویز اپنے وقت میں منجھے ہوئے قابلِ اعتماد، قابلِ اعتبار قابلِ داد اور قابلِ احترام ہدایت کار تھے، معیاری فلمیں تخلیق کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ لکھاری کے تخیل کو فلم کے فیتے پر مہارت سے منتقل کرنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ فلم کے ہر فریم پر گہری نظر اور مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ مسعود پرویز کی بنائی ہوئی ہر ہر فلم، فلم میکرز کے لیے روپے بنانے کی مشین بن جاتی، ممتاز اور منفرد ہدایت کار کہلاتے تھے۔ آپ کی بنائی ہوئی فلموں کو پاک و ہند میں مؤرخ نقاد اور شائقینِ فلم چاہیں بھی تو فراموش نہیں کر پائیں گے، آپ پرفیکٹ فلم ڈائریکٹر مانے جاتے تھے فلم ساز ان کی خداداد صلاحیتوں پر اندھا دھند بھروسا رکھتے اور کرتے تھے۔

آپ نے 1918ء میں جمہوریہ طافوی ہندوستان کے شہر امرتسر میں آنکھ کھولی۔ آپ کا گھرانہ علم و ادب سے آراستہ تھا، اردو کے سب سے بڑے ادیب سعادت حسن منٹو ان کے رشتہ دار تھے۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، سائنس میں ماسٹر ڈگری ہولڈر تھے جو اس دور کے مقصد وہ بھی مسلمانوں کے لیے ایک خواب کا سا درجہ رکھتا تھا۔ فلم انڈسٹری ان کی خوش جمود جھوک کی گواہ ہے۔ چڑھتی جوانی کے ہاتھوں میں ہی فلم کا روگ پالے امرتسر سے بمبئی موجودہ (ممبئی) جا پہنچے منٹو کے حوالے سے اپنا تعارف کروایا، خوبصورت اسمارٹ جوان، تعلیم یافتہ، لباس پہننے کا سلیقہ، شستہ گفتگو کی وجہ سے مسعود پرویز کو بطور ہیرو ایک فلم منگنی میں لے لیا گیا، اس فلم میں ان کی ہیروئن ممتاز شانتی تھیں، بعد ازاں ممتاز شانتی وقت پر راج کرنے والی ہیروئن بنی، اس کی پہلی فلم سوہنی کمہارن تھی، اس فلم میں بھی وہ ہیروئن تھی حالانکہ اس وقت اس کی عمر صرف چودہ برس کی تھی، خوبصورت وجود کی مالک جس کے انگ انگ میں بجلی بھری تھی بعد میں کئی فلموں میں دلیپ کمار کی ہیروئن بھی آئیں، مسعود پرویز کی طرح اس سوہنی کمہارن کا تعلق بھی پنجاب کے شہر گجرات سے ہی تھا، فرق صرف یہ تھا کہ مسعود پرویز گجرات کے علاقے جلال پور جٹاں سے تعلق رکھتے تھے جبکہ ممتاز شانتی کا تعلق بھی گجرات کا علاقہ ڈنگہ تھی۔ ان کی شادی معروف فلمساز ولی صاحب سے ہوئی تھی۔ شانتی اور ولی صاحب 1947ء میں تقسیم کے بعد پاکستان آگئے۔ پاکستان کے معروف فلمی شاعر [illegible] ان کے بھائی تھے جن کا اصل نام [illegible] تھا۔ ممتاز شانتی 19 اکتوبر 1989ء میں وفات پاگئیں۔ لاہور ہی ان کا مدفن ہے۔ 1942ء میں [illegible] کے بینر تلے بننے والی فلم منگنی ریلیز ہوئی تو ہر جانب شہرت کا ڈنکا بج گیا فلم توقعات سے زیادہ کامیاب ہونے میں کامیاب ہوئی۔ جب فلم منگنی برصغیر کی پہلی گولڈن جوبلی پنجابی فلم ہوئی بلکہ لاہور کے ایک سینما میں ایک سال تک چلنے والی فلم کا اعزاز اپنے نام کرلیا۔ منگنی کی کاسٹ میں اداکارہ [illegible] بھی شامل تھیں، جو کہ اداکارہ گلوکارہ سلمیٰ آغا کی خالہ تھیں، منگنی کی کامیابی نے ممتاز شانتی اور مسعود پرویز دونوں پر فلمی دنیا کے دروازے کھٹاک سے کھل گئے، منگنی کے بعد [illegible] نے مسعود پرویز کو اپنی فلم غلامی میں کاسٹ کرلیا، یہ 1945ء کا سن تھا، یہ بھی کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ مسعود پرویز کی تیسری

اگست 2022ء کے شمارے کی ایک جھلک

کاروباری چال
بدنما کے حصار میں قید ایک منچلے نوجوان کی آزمائشوں کی دلچسپ اور انوکھی داستان — طاہر جاوید مغل کے قلم کا ایک اور شاہکار

عقاب آب
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات زویا صفوان کا شاہکار

شہ زور
عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

جنگ باز
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کی جادوگری

اس کے علاوہ
ناہید سلطانہ اختر، محمد عباس ثاقب، عائشہ نصیر، فاطمہ حسام، عیوق بخاری و دیگر کی خوب صورت تحریریں

فلم کا نام میرا بائی تھا جو کہ 1947ء میں پردۂ اسکرین پر پیش کی گئی، اس فلم کے پروڈیوسر بھی ڈبلیوز یڈ احمد ہی تھے، اس کے بعد برصغیر میں انتخابات اور تقسیم کے ہنگامے پھوٹ پڑے۔

پاکستان بننے کے بعد مسعود پرویز اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے لاہور آ گئے، یہاں آ کر انہوں نے ایک بار پھر حواس مجتمع کر کے نئے سرے سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا۔ لیکن اب انہوں نے ہیرو آنے یا فلموں میں کام کرنے کے برعکس اپنے لیے ہدایت کاری کا میدان چنا، ناساز گار فلمی حالات کی بناء پر اس فلم پر سرمایہ کاری بھی انہیں خود ہی کرنا پڑی، فلم کا نام بیلی رکھا گیا۔ بیلی کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر مسعود پرویز خود ہی تھے، یہ ایک ریکارڈ ساز فلم تھی، اس فلم کے توسط سے کئی بڑے بڑے ناموں نے اپنے فلمی سفر کی شروعات کیں، اور آگے چل کر بہت نام کمایا، ان میں پہلے نمبر پر تو فلم کی ہیروئن صبیحہ خانم تھیں آگے چل کر صبیحہ خانم کو فرسٹ لیڈی آف اسکرین یعنی پاکستانی سینما کی خاتون اوّل خطاب دیا گیا، سنتوش کمار کا اصل نام موسیٰ رضا تھا بعد ازاں 1958ء میں ان کی شادی اسی فلم کی ہیروئن صبیحہ خانم سے ہوگئی جو ماضی کی معروف جوڑی ماہیا اور بالی جٹی کی بیٹی تھیں جو میلوں ٹھیلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے، ماہیا کا اصل نام محمد علی اور بالی جٹی کا اصل نام اقبال بیگم تھا۔ سنتوش کمار نے مجموعی طور پر 100 کے قریب فلموں میں کام کیا اور 8 نومبر 1982ء کو فوت ہوگئے۔ صبیحہ خانم کا اصلی نام مختار بیگم تھا۔ آپ نے دو سو سے زیادہ فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے، ان کی آخری فلم مرد جینے نہیں دیتے تھے۔ صبیحہ خانم جون 2020ء میں انتقال کر گئیں، سنتوش کمار کے چھوٹے بھائی درپن بھی پاکستانی فلموں کے نامور ہیرو تھے جنہیں لیڈی کلر کا خطاب بھی ملا تھا، درپن کا اصلی نام سید عشرت حسین تھا، آپ 1928ء میں برطانوی راج میں اتر پردیش میں پیدا ہوئے، ان کی شادی اداکارہ نیر سلطانہ سے ہوئی جنہیں ملکہ جذبات کہا جاتا تھا درپن 28 نومبر 1980ء کو فوت ہوئے اور لاہور کے مسلم ٹاؤن قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔ ان بیگم نیر سلطانہ کا اصلی نام طیبہ بانو تھا 1937ء میں علی گڑھ ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی، ان کی رشتہ داری انور کمال پاشا کی بیوی اداکارہ شمیم بانو کے خاندان سے تھی۔ نیر سلطانہ کینسر کے موذی مرض کے ہاتھوں شکست کھا کر 2 اکتوبر 1992ء جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔ سنتوش کمار اور درپن کے تیسرے بھائی ہدایت کار ایس سلیمان تھے۔ بولی ووڈ سینما کی مشہور و معروف شخصیت جنہیں سلو بھائی کے نام سے دنیا جانتی ہے ایس سلیمان 29 دسمبر 1938ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دو پنجابی سمیت کل 48 فلموں کی ہدایت کاری کی اور انتہائی کامیاب فلمیں ڈائریکٹ کیں جن میں شبنم شاہد کی ڈائمنڈ جوبلی فلم گھرانا (تیرا سایہ جہاں بھی ہو سجنا پلکیں بچھا دوں) اف یہ بیویاں (ہنس کے سہہ لیں گے اگر تم میں برائی ہوگی پر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی) انتظار (پیار کی اک نئی راہ پر ہم کو تقدیر لے آئی ہے) الزام (ہم پہ الزام تو ایسے بھی ہے ایسے بھی سہی) کے علاوہ باجی، محبت، اناڑی اور میرے حضور، ابھی تو میں جوان ہوں، جیسی فلمیں تخلیق کیں۔ ایس سلیمان کی شادی اداکارہ رقاصہ زریں پنا سے ہوئی ایس سلیمان نے 83 سال کی عمر پائی اور بالآخر 20 اپریل 2021ء بروز بدھ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

بات ہو رہی ہے ہدایت کار مسعود پرویز کی پہلی فلم بیلی کی جو 1950ء میں ریلیز ہوئی، اسی فلم سے عظیم موسیقار رشید عطرے نے بھی اپنے فنی سفر کی شروعات کیں، نامور موسیقار وجاہت عطرے ان کے صاحبزادے تھے۔ دونوں فوت ہو چکے ہیں۔ فلم بیلی کے مصنف اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو تھے جبکہ فلم کے گیتوں میں سے کچھ گانے امریتا پریتم نے لکھے یعنی امریتا پریتم نے بھی اپنا فلمی، قلمی و شعری سفر مسعود پرویز کی فلم بیلی سے ہی شروع کیا تھا۔ امریتا پریتم اردو ہندی کی عظیم مصنفہ اور شاعرہ ہیں آپ 31 اگست 1919ء کو گوجرانوالہ پنجاب میں پیدا ہوئیں، تقسیم کے کچھ عرصہ بعد بھارت چلی گئیں اور وہیں 31 اکتوبر 2005ء کو چھیاسی سال کی عمر میں فوت ہو گئیں۔ آپ نے سو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں، بھارتی ایوانِ بالا کی رکن بھی رہیں، اعلیٰ ادبی اور تعلیمی خدمات پر ہندوستان میں انہیں سب سے بڑا سویلین ایوارڈ پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا، آپ کی سب سے مشہور نظم اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بولا کر روئی سی دھی پنجاب دی تو لکھ لکھ مارے وین آج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن" یہ نظم سب سے پہلے فلم بیلی کے لیے لکھی گئی کیونکہ فلم بیلی تقسیم کے موضوع پر ہی تھی، اسی فلم سے امریتا پریتم نے اپنا فلمی سفر شروع کیا تھا۔

مسعود پرویز کی ہدایات میں بننے والی دوسری فلم انتظار تھی۔ شاید پاکستان کی نوزائیدہ فلم انڈسٹری کو کسی غیبی مدد کا

انتظار تھا، اور وہ مدد ملکۂ ترنم نور جہاں کی شکل میں ملی۔ بمبئی (بولی ووڈ) سے پاکستان سیکڑوں فلمی شخصیات نے ہجرت کی تھی، لیکن بات بن نہ رہی تھی لولی ووڈ ہنوز سسک رہی تھی، اور پھر جب بولی ووڈ کی پہلی سپر اسٹار ہیروئن گلوکارہ ملکۂ ترنم نور جہاں نے اپنے خاوند فلم ساز شوکت حسین رضوی کے ہمراہ لاہور قدم رنجہ فرمایا تو لولی ووڈ کے تنِ مردہ میں جیسے جان پڑ گئی۔ مسعود پرویز کی اگلی فلم انتظار تھی اس کے ہیروئن اور گلوکارہ کے طور پر نظرِ انتخاب نور جہاں پر ٹھہری، اس کے فلم ساز سلطان جیلانی اور خورشید انور تھے موسیقار بھی خواجہ خورشید انور تھے۔ عکاسی کے لیے نبی احمد کو چنا گیا۔ ہیرو کے لیے اس وقت تک سنتوش کمار سے بہتر انتخاب کوئی نہ تھا۔ نور جہاں ہیروئن تھیں۔ انتظار 12 مئی 1956ء کو عید الفطر کے مبارک موقع پر شائقین فلم کو بطور سوغات پیش کی گئی اور پھر پہلے ہی دن سپر ہٹ کا نعرۂ مستانہ بلند ہو گیا۔ اس فلم نے کامیابی کی نئی تاریخ مرتب کر دی، پاکستان ہندوستان دونوں ممالک میں اس کی نمائش ہوئی اور برصغیر بھر میں انتظار نے تہلکہ مچا دیا، خواجہ خورشید انور کی مدھر دھنوں اور نور جہاں کی مست گائیکی نے فلم شائقین کو پاگل کر دیا...... او جانے والے رے، ٹھہرو ذرا رک جاؤ لوٹ آؤ...... دوسرا گیت ملاحظہ فرمائیں "چاند ہنسے دنیا بسے روئے میرا پیار۔" تیسرا گیت یہ تھا۔ "چھن چھن ناچوں گی گن گن گاؤں گی سیاں مورے آئیں گے۔" اس گانے کو کون بھول پائے گا۔ "او بے وفا میں نے تجھ سے پیار کیوں کیا۔" ایک سے بڑھ کر ایک سریلی دھن...... ساون کی گھنگھور گھٹاؤ...... اور ملکۂ ترنم کا یہ گانا آج بھی دلوں کی دھڑکن تیز کر دیتا ہے۔ "جس دن سے پیا دل لے گئے دکھ دے گئے اس دن سے کھڑی ہوں ہائے چین نہیں آئے۔" اور اگر اس نغمے کو دیکھیں۔ "آ گئے...... بلم پردیسی۔ سجن پردیسی آ گئے گھر آ گئے!"

انتظار میں گیتوں کی تعداد 10 تھی اور ہر گیت اپنی مثال آپ تھا۔ اگر بات عکس بندی کی کی جائے تو انتظار اب تک بننے والی تمام فلموں میں بہتر تھی۔

پہلی پاکستان کی فلم تھی جسے حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا اور انتظار کو قومی ایوارڈ کا حقدار قرار دیا گیا۔

ہدایت کار مسعود پرویز کی اگلی پیشکش 1958ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی جس کا نام تھا زہر عشق۔ یہ پکچر بھی اپنی مثال آپ نکلی، اس میں بھی گانوں کی تعداد دس ہی تھی لیکن اگر کسی بھی گانے کا ذکر نہ کیا جائے اور صرف اس فلم کی ایک نعت کی بات کر لی جائے تو وہ سب پر بھاری تھی۔ زبیدہ خانم کی آواز میں "سنو عرض میری کملی والے، کوئی کیا سمجھے کوئی کیا جانے میں تو اجڑ گئی کملی والے، سنو عرض میری کملی والے۔"

اس فلم کے شاعر قتیل شفائی تھے، فلم کے مرکزی ستارے تھے مسرت نذیر، حبیب، نیلو، شاہین۔ گو کہ یہ فلم کاروباری لحاظ سے زیادہ نفع نہ دے پائی! تاہم فلم کا فریم ورک شاندار تھا۔ اب ہدایت کار مسعود پرویز پاکستان فلم انڈسٹری میں پوری طرح قدم جما چکے تھے، اور ان کی اگلی پیشکش فلم جھومر تھی جو 1959ء میں ناظرین کی نذر کی گئی۔ یہ بھی یادگار اور شاہکار فلم کہلائی۔ جی ہاں جھومر...... چلی رے چلی رے چلی رے، بڑی آس لگا کے چلی رے، میں تو دیس پیا کے چلی رے، اس کے بعد ایک بار پھر مسعود پرویز کی ایک ایسی فلم آئی کہ ناقدین چکرا کر رہ گئے وہ فلم جس نے ہر جانب کامیابیوں کے وہ جھنڈے گاڑے کہ بمبئی اور کلکتہ میں فلمیں بنانے والے بھی بغلیں جھانکنے لگے، اور پاکستانی فلم انڈسٹری کو باقاعدہ تسلیم کرنے اور سراہنے لگے۔ جی ہاں کوئل۔ ایک قطعی مختلف کہانی، ایک انتہائی شاندار پیشکش جس کا فریم ورک بہت پاورفل تھا، ایک گائیک کی داستان حیات، انسانی سماجی رویوں کی عکاسی کرتی بہترین ڈرامائی تصویر۔ لالچ حرص اور طمع سے آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے، باپ بیٹی کی محبت بیوی کے ایثار اور وفاؤں کی داستان بچپن کی محبت کیا رنگ لاتی ہے (رم جھم رم جھم پڑے پھوار، تیرا میرا نت کا پیار) اسلم پرویز ہیرو تھے اور کیا خوب ہیرو تھے، اور نور جہاں کے ساتھ جچے بھی خوب۔ یہ نور جہاں اور اسلم پرویز کی سب سے بہترین فلم تھی۔ نور جہاں اور اسلم پرویز پر مندرجہ بالا گیت منیر نیازی اور نور جہاں کی آوازوں میں ہے جبکہ فلم کے شروع میں یہی گیت ناہید نیازی اور نجمہ نیازی کی آوازوں میں بچوں پر پکچرائز کیا گیا ہے۔ (مہکی فضائیں گاتی ہوائیں بہکے نظارے سارے کے سارے تیرے لیے ہیں) کوئل کے سارے گانے سدابہار تھے۔ (دل کا دیا جلایا میں نے دل کا دیا جلایا) ہر گیت مسحور کن ہر دھن لاجواب۔ (او بے وفا میں نے تجھ سے پیار کیوں کیا او۔ بے وفا) تنویر نقوی کی شاعری میں ہر نغمہ ناقابلِ فراموش تھا۔ زبیدہ خانم کا یہ گیت تو ذرا دیکھیں (دل جلا نہ دل والے آنکھیں اٹھا کے نظریں ملا لے، تیرے بنا سونی سونی لاگے رے چاندنی رات ساگر روئے لہریں شور مچائیں یاد پیا کی آئے نیناں بھر آئے) الغرضیکہ کوئل ہر لحاظ سے مکمل اور یادگار

اردو بلیک اینڈ وائٹ فلم تھی جس کا ہر فریم شاندار تھا لیکن ایک خامی اس فلم یعنی کوئل میں میں نے ذاتی طور پر دیکھی، اور حیرت انگیز طور پر آج تک فلم کی اس خامی بلکہ بلنڈر کی طرف کسی کی توجہ نہ گئی، وہ یہ کہ فلم میں ایک جگہ اداکار نذر بندے خاں کے گھر سے حکومت کی جانب سے ملنے والا چیک اس وقت چراتا ہے جب بندے خاں کی بیوی سوئی ہوئی ہوتی ہے، پاس ہی لالٹین جل رہی ہے۔ رات کا منظر بتایا جاتا ہے، نذر وہ چیک لے کر سیدھا بینک جاتا ہے جہاں کیشیئر یہ اعتراض لگا کر چیک واپس کر دیتا ہے کہ اس کی ایکسپائری تاریخ گزر چکی ہے تو نذر خاموشی سے گھر واپس آ کر چیک اسی طاقچے میں واپس رکھ دیتا ہے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ کون سا بینک تھا جو رات کے وقت کھلا ہوا تھا، جہاں شبینہ بینکاری ہوتی تھی۔ بہر حال اس ایک مس ٹیک کے سوا باقی پوری فلم کوئل ایک ماسٹر پیس تھی۔ اس فلم کی کہانی شمس لکھنوی نے لکھی اور عکاسی نبی احمد نے کی۔ یہ فلم ملکہ اسٹوڈیوز لاہور میں تیار ہوئی جو گائیکہ ملکہ پکھراج کی ملکیت تھا وہی ملکہ پکھراج جو گلوکارہ طاہرہ سید کی والدہ تھیں۔ طاہرہ سید حیات ہیں اور نعیم بخاری کی مطلقہ ہیں۔ وہی نعیم بخاری جو ایک کیس میں سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف کے خلاف استغاثہ کی طرف سے پیش ہوئے تھے جس میں میاں نواز شریف کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے تاحیات نااہل قرار دیا ہے۔

ہدایت کار مسعود پرویز کی اگلی منزل 30 دسمبر 1960ء کو پیش ہونے والی فلم منزل تھی جس کی کاسٹ میں اسلم پرویز، نیلو، لیلیٰ اور اداکار نذر شامل تھے۔ پروڈیوسر جمال بٹ کی یہ فلم بری طرح فلاپ ثابت ہوئی، حالانکہ اس کی کہانی خود مسعود پرویز نے لکھی جبکہ اس کے مکالمات حزیں قادری نے تحریر کیے تھے۔ موسیقی فیروز نظامی کی تھی۔ کیمرا مین رضا میر جو کہ ٹی وی اداکار آصف رضا میر کے والد تھے۔ شاعری تنویر نقوی کی تھی جبکہ گلوکاری آئرن پروین اور نور جہاں کی ہونے کے باوجود یہ فلم بری طرح فلاپ ثابت ہوئی، اور بمشکل 9/8 ہفتے ہی کاروبار کر پائی!

1962ء میں مسعود پرویز کی فلم سکھ کا سپنا ریلیز ہوئی اور یہ بھی فقط دو تین ہفتے چلنے کے بعد ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈبوں میں بند ہو کر رہ گئی۔ سکھ کا سپنا کے اداکاروں میں یوسف خان، لیلیٰ، یاسمین اور آغا طالش تھے۔ فلم کے گیت فیض احمد فیض نے لکھے جبکہ موسیقار منظور اشرف تھے جنہیں چاہنے والے بعد میں ایم اشرف کے نام سے جانتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے 2 فلموں کا فلاپ ہونا کسی بھی ہدایت کار کے لیے انتہائی سنگین بات ہوتی ہے۔ ساکھ خطرے میں پڑ جاتی ہے یہی کچھ محترم مسعود پرویز کے ساتھ بھی ہوا۔ کام میں تھوڑا وقفہ آ گیا اور پھر اگلے چار سال تک ان کی کوئی فلم منظر عام پر نہ آ سکی آخر کار 1962ء میں ان کی پکچر سرحد ریلیز ہوئی۔ سابقہ تمام فلموں کی طرح یہ بھی بلیک اینڈ وائٹ تھی، سرحد کے ستاروں میں اعجاز، سلونی، آغا طالش، حسنہ، نجم الحسن اور علاؤالدین شامل تھے۔ مرکزی کردار علاؤالدین نے ادا کیا جو اس وقت مشہور و معروف ترین اداکاروں میں شمار ہوتے تھے سلطان راہی بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے لیکن اس وقت تک ان کے جوہر کھل کر سامنے نہ آ سکے تھے اور وہ چھوٹے موٹے کرداروں کے لیے ایکسٹرا اداکار سمجھے جاتے تھے۔ یہ فلم فلاپ تو نہ رہی البتہ اوسط درجے کا بزنس حاصل کرنے والی فلموں میں شامل رہی۔ فلم میں کل آٹھ گیت تھے لیکن ان میں سے دو گیت بے حد مقبول ہوئے۔ ایک مالا بیگم کا اردو گیت پشتو دھن پر تھا "تجھ پہ قربان شیر دل خان، تو میرا میں تیری جاناں ناں اوئے" اور دوسرا نور جہاں، مہدی حسن کی مشترکہ کاوش تھا "چاند تو جب بھی مسکراتا ہے، دل میرا ڈوب ڈوب جاتا ہے" ہدایت کار مسعود پرویز کی فلم سرحد کی کہانی پشتون ثقافت کے تناظر میں لکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں سرحد پاکستان کے ایک صوبے کا نام تھا جسے آج کل صوبہ خیبر پختونخوا KPK کہا جاتا ہے۔ فلم کی کہانی منظر نامہ اور ڈائیلاگ ضیاء سرحدی کے قلم کا شہکار تھے۔ ضیاء سرحدی تقسیم کے قبل سے ہندوستانی فلم نگری کا حصہ تھے۔ وہ 1914ء میں پیدا ہوئے بطور مصنف اور بطور ہدایت کار کچھ فلمیں بنائیں، ان کے بیٹے خیام سرحدی اپنی اچھوتی دل آویز اور منفرد ایکٹنگ کی بدولت پاکستانی فلموں اور پاکستان ٹیلی ویژن کے ممتاز اداکاروں میں گنے جاتے تھے، انہوں نے فلموں کی سابقہ ہیروئن خوبصورت اداکارہ صائقہ سے شادی کی تھی۔ صائقہ منور ظریف اور رنگیلا کی جوڑی دار ہیروئن تھیں۔ 24 نومبر 1967ء کو ایک تاریخ ساز فلم سینماؤں میں پیش کی گئی جس سے لولی ووڈ میں ایک نئی تاریخ رقم ہوئی، اس فلم کا نام ہے مرزا جٹ، کہا جاتا ہے کہ اگر مسعود پرویز کی مرزا جٹ نہ بنتی تو ہیر رانجھا بھی نہ بنتی، مرزا جٹ ایک پرفیکٹ مووی تھی جس کے ہیرو اعجاز اور فردوس تھے اس کے فلم ساز شیخ نذیر حسین تھے اور فردوس کی ایک شادی فلم ساز شیخ نذیر حسین سے بھی ہوئی تھی۔

اس سے قبل فردوس اداکار اور خوبرو ہیرو اکمل (بجانے بوہے اگے چک تا نزلی) کی بیوی رہ چکی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد فردوس کی شادی فلم ساز شیخ نذیر حسین سے ہوئی تھی۔ مرزا جٹ فلم نے شاندار گولڈن جوبلی منائی، اس کی کاسٹ فردوس، اعجاز، عالیہ، منور ظریف، آصف جاہ، مظہر شاہ، مینا شوری، آشا پوسلے اور رنگیلا پر مشتمل تھی۔ اس فلم میں کل نو گیت تھے جن میں سے اکثر زبانِ زدِ عام ہوئے "نہ عشق نوں لیکاں لاویں ہاڑا وے ڈھولن نہ جاویں سجے دل والے بوہے اجے میں نیویں ڈھوئے۔ تینوں واسطہ ای آ جا چناں تاریاں دی لوئے...... تسی حال میرے توں ڈرنا ائی اڑیو پیار نہ کرنا ئی اور ایک اور ناقابلِ فراموش گیت "تکے ہونڈیاں دا پیار ویکھیں دیویں نہ وسار میٹھوں جندڑی بے سمیں دیواں تیرے اتوں وار۔" آخر الذکر گیت اپنے وقت میں اس قدر مشہور ہوا کہ اگلے برس اسی نام سے فلم بن کر بھی آ گئی یعنی فلم کا نام ہی تکے ہونڈیاں دا پیار تھا۔ فلم مرزا جٹ راوی فلمز کے بینر سے تیار ہوئی اور گلوکاروں میں آئرن پروین، مسعود رانا، نسیم بیگم، نذیر بیگم اور ملکہ ترنم کے علاوہ عالم لوہار بھی تھے جن کی گائیکی کے بھی چرچے ہوئے "جھگڑ چلنو نصیب دے تے سے سو سو جانز" فلم کے رقاص حمید چوہدری تھے ان کی بھی دھوم مچ گئی۔ فلم کے موسیقار رشید عطرے تھے ان کے اسسٹنٹ اس فلم میں ان کے صاحبزادے وجاہت عطرے تھے۔ رشید عطرے اور نور جہاں کی یہ آخری مشترکہ فلم تھی۔ ان دونوں کی کیمسٹری سے درجنوں لازوال گیتوں نے جنم لیا اور شہرت کے آسمان تک پہنچے۔ رشید عطرے اور نور جہاں پہلی بار فلم انارکلی میں اکٹھے ہوئے "صدا ہوں اپنے پیار کی جہاں سے بے نیاز ہوں، کسی پہ جو نہ کھل سکے میں ایسا ایک راز ہوں" جلتے ہیں ارمان میرا دل روتا ہے قسمت کا دستور نرالا ہوتا ہے ان دونوں لیجنڈز کی دوسری مشترکہ فلم نیند تھی۔

(تیرے در پر صنم چلے آئے تو نہ آیا تو ہم چلے آئے...... چھن چھن چھن میری پائل کی دھن گائے تیرا ہی ترانہ کبھی آ کے سن) تیسری بار دونوں فلم سلمیٰ میں اکٹھے ہوئے۔ (زندگی ہے یا کسی کا انتظار) اس کے بعد فلم قیدی کی موسیقی دیکھیے (مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ) فیض کا لازوال کلام جسے ایک بار کسی مشاعرے میں پڑھنے کی فیض صاحب کو فرمائش کی گئی تو انہوں نے تاریخی جملہ ادا کیا کہ پہلے یہ میری نظم تھی لیکن اب نور جہاں کی ہے، اب انہی سے سنی جائے۔ رشید عطرے نے جب اپنی ذاتی فلم "موسیقار" پروڈیوس کی تو ایک بار پھر رشید عطرے کی موسیقی اور نور جہاں کی آوازوں کا سنگم ہوا اور سریلے سُر بکھرے (تم جگ جگ جیو مہاراج رے ہم تیری نگریا میں آئے...... رسیلے مورے رسیا نجریا ملا...... گائے کی دنیا گیت میرے سریلے رنگ میں نرالے انگ میں) یہ گانا صبیحہ خانم پر پکچرائز ہوا، سنا ہے کہ یہی نور جہاں کا وہ پہلا گیت تھا جو نور جہاں کے علاوہ کسی اور اداکارہ پر پہلی بار فلمایا گیا یعنی نور جہاں کا وہ پہلا گانا جس پر نور جہاں کے علاوہ کسی اور (صبیحہ خانم) نے لپ سنکنگ کی تھی۔ نور جہاں اور رشید عطرے کی مشترکہ محنتوں کا ثمر اور بھی کئی معروف گیت ہیں (ستارو میری راتوں کے سہارو، جیا را ترسے دیکھن کو...... ارے او بے مروت ارے او بے وفا...... لٹ الجھی سلجھا جا رے بالم میں نہ لگاؤں گی ہاتھ رے)

1968ء میں رشید عطرے کا انتقال ہو گیا۔ مرزا جٹ فلم کا گیت تکے ہونڈیاں دا پیار اس قدر مقبول ہوا کہ ریڈیو پر بسوں میں ہوٹلوں میں ہر جگہ بجنے لگا، اس گیت کی شہرت کو مزید کیش کرنے کے لیے مرزا جٹ کے ہی فلم ساز ایس ایم علی نے گانے کے بولوں پر نئی فلم کا نام رکھ دیا اور یوں فلم تکے ہونڈیاں دا پیار شروع کر دی گئی، لیکن فلم ساز اعجاز درانی کی مراد بلوچ تیار ہو چکی تھی لہٰذا مرزا جٹ کے بعد ہدایت کار مسعود پرویز کی جو فلم ریلیز ہوئی اس کا نام مراد بلوچ تھا۔ مراد بلوچ کے مرکزی کردار اعجاز فردوس نے ادا کیے۔ اعجاز مراد بلوچ جبکہ فردوس نے ستی کا کردار ادا کیا۔ ستی ہیر کی نند ہے نند یعنی ہیر کے کردار میں ناہید (کہندے نے نیناں تیرے کول بہنداں نیم) کو لیا رانجھا اقبال حسن بنے یہ فلم بھی بس ٹھیک ہی گئی لیکن سپر ہٹ نہ قرار پائی دیگر اداکاروں میں الیاس کشمیری، رنگیلا، مینا شوری (لارا لپا گرل) مظہر شاہ تھے۔ اس کے گیت زیادہ مشہور نہ ہوئے لیکن نور جہاں کی گائیکی میں ایک گانا تھا جس نے مقبولیت کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ڈھول بلوچا موڑ مہاراں، موڑ مہاراں تے آ گھر بھاراں مسعود پرویز کے اگلی ریلیز ہونے والی فلم تکے ہونڈیاں دا پیار تھی جس میں نغمہ اور اعجاز نے مرکزی کردار ادا کیے، یہ کامیاب فلم رہی جس کے گیتوں کی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی نی او ہدے کولوں کنڈھ کڑھنا جہدے کولوں کیس شرما نڑا دل دے کے تے نیے تاں بے رو کے وخا وینداں فیر کیے تال بیے تاں اس بلیک اینڈ وائٹ فلم میں اداکارہ نغمہ کو انتہائی خوبصورت انداز میں عکس بند کیا گیا اور ان کے حسن کے چرچے ہونے لگے۔ آیا تیرے لئی ریشمی رومال تے اتے تیرا

ناں کنڈھیاوے میں بڑیاای چاواں نال کے نوں وکھان لئی، چڑھایا چوڑا کچ دا...... عظیم موسیقار رشید عطرے کے انتقال کے باعث اس فلم نکے ہوندیاں دا پیار میں موسیقی ترتیب دینے کے فرائض وجاہت عطرے کے کم سن کاندھے پر رکھے گئے جنہیں وجاہت عطرے نے کچھ ایسی ذمہ داری سے بہ احسن و خوبی نبھایا کہ پھر آنے والے وقتوں میں وجاہت عطرے نے ہی راج کیا۔ اس فلم کی دیگر کاسٹ عالیہ، اقبال حسن، آصف جاہ، نجم الحسن، سلمیٰ ممتاز اور ظریف مرحوم پر مشتمل تھی۔

اب تک ہدایت کار مسعود پرویز کی کل 11 فلمیں ریلیز ہو چکی تھیں اور انہیں فلم انڈسٹری میں سولہ سترہ برس ہو چکے تھے۔ فلم ساز ان پر آنکھیں بند کر کے اندھا دھند اعتبار کرنے لگے تھے۔ جون 1970ء میں ہیر رانجھا ریلیز ہوئی اور اسی برس ان کی دوسری فلم بھی 11 ستمبر کو ریلیز ہو گئی یہ بھی ایک مضبوط اور کامیاب فلم تھی اس کا نام تھا نجمہ اپنے وقت کی سب سے مشہور فلمی جوڑی علی زیب (محمد علی اور زیبا) ہیرو ہیروئن تھے۔ اس فلم کی موسیقی ماسٹر عنایت حسین کی تھی۔ رسیلی اور سریلی موسیقی سے مزین اردو فلم نجمہ اوسط درجہ کا بزنس حاصل کر پائی یعنی نیم کامیاب رہی، حالانکہ اسے تیار کرنے والی ٹیم اچھی خاصی مضبوط تھی۔ نجمہ کی کاسٹ میں علی زیب سے ہٹ کر رنگیلا ساقی مصطفیٰ قریشی روزینہ قوی عطیہ شرف اور تمنا بیگم شامل تھیں۔ اس کے مصنف انور کمال پاشا اور مکالمے احمد راہی کے صریر خامہ سے تخلیق ہوئے تھے۔ شاعر تھے قتیل شفائی اور سب سے بڑھ کر نجمہ فلم کے پروڈیوسر آغا جی اے گل تھے جو ایورنیو سٹوڈیوز کے مالک تھے جن کے ہر شہر میں شبستان کے نام سے سینماز بھی تھے محمد علی زیبا کی مشترکہ فلموں میں یہ پہلی رنگین فلم تھی اس فلم میں 8 گانے ہیں جس میں سے ذیل کے گیت تو ریڈیو لسنرز سے اچھے خاصی پذیرائی اور توجہ سمیٹنے میں سرخ رو ہوئے...... چلے ٹھنڈی ہوا چھم چھم لے لے سیاں مجھ سے پیار نبھانے کی قسم...... آوازیں احمد رشدی اور مالا بیگم کی تھیں، جبکہ دوسرا نغمہ جو گلی گلی محلے محلے گنگنایا گیا وہ تھا۔ گلوکارہ نور جہاں کا بھول کر عہدِ وفا مجھ کو رلانے والے تم نے تو پیار نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ 1970ء میں ہی ہدایت کار مسعود پرویز کی تیسری فلم یار تے پیار بھی سینماؤں تک پہنچی مگر فقط پہنچی ہی فلم دیکھنے والوں کی توجہ اور داد دونوں سے محروم رہی، اعجاز فردوس عالیہ اقبال حسن اور مظہر شاہ جیسے بڑے فلمی ستاروں کی کشش بھی فلم کو کامیاب اور کیش نہ کروا پائی جو کہ اچنبھے کی بات تھی۔ مرزا جٹ، مراد بلوچ، ہیر رانجھا کے بعد شاید فلم ساز اعجاز درانی نے اس مشن کے لیے کمر کس لی تھی کہ تمام کلاسیکل عشاقوں کی کہانیوں کو پردہ سیمیں کے لیے قلم بند کر کے ہی دم لیں گے تا کہ تاریخ کے صفحات پر یہ بات ہمیشہ کے لیے رقم ہو جائے کہ ہر تاریخی عاشق کا کردار ادا کرنے میں اعجاز درانی کا کوئی جوڑ نہیں اسی لیے اب انہوں نے مسعود پرویز کی معاونت سے عاشقی سیریز کی چوتھی فلم سسی پنوں کے مثالی رومینس پر ایک بار پھر رومینٹک فلم بنانا شروع کر دی۔ اس پنجابی فلم کا نام پنوں دی سسی رکھا گیا۔ یہ ہدایت کار مسعود پرویز کی ہیر رانجھا، نجمہ کے بعد تیسری رنگین فلم تھی، اس فلم کے لیے ہیروئن کے طور پر سنگیتا کو سائن کیا گیا جنہیں فلم دیکھنے والوں نے پسندیدگی کی سند عطا نہ کی لیکن سب سے بڑی بات جو پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ فردوس اور اعجاز کی شادی کے بعد ملکہ ترنم اعجاز اور فردوس سے بری طرح ناراض تھیں، اور وہ کسی ایسی فلم کے لیے گیت ریکارڈ کروانے پر کسی صورت رضا مند نہ تھیں جس میں فردوس یا اعجاز دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک بھی ہو، اسی لیے پنوں دی سسی کے گیتوں کے لیے مسعود رانا اور رونا لیلیٰ پر ذمہ داری ڈالی گئی، دونوں نے پوری محنت کی اس فلم کے دو گیت اچھے خاصے مقبول بھی ہوئے ایک تو مسعود رانا کی آواز میں نی سسی اے بیقدرے تیرا لٹیا اے شہر بھنبھور نی کا اور دوسرا رونا لیلیٰ اور مسعود رانا کا مشترکہ گانا تیرے ملنے دی آس لے کے میں ٹرپی پنوں پنوں میں تے ازلاں توں جب دی رئی یہ فلم بری طرح ناکامی سے ہمکنار ہوئی اس کی وجہ فلم میں نور جہاں کے گانوں کا نہ ہونا بھی تھا۔ نور جہاں کے فلمی کیریئر کی شہرت و مقبولیت کا سورج اس وقت پورے نصف النہار پر دمک رہا تھا۔ فلم شائقین ایسی کسی فلم کو دیکھنے کے روادار ہی نہ ہوتے تھے جس میں ملکہ کی آواز نہ ہوتی حالانکہ پنوں دی سسی کی اشتہاری مہم پر زر کثیر خرچ کیا گیا تھا جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، پی ٹی وی پر بھی روزانہ رات خبرنامے سے قبل اس فلم کا ٹریلر دکھایا جاتا، لیکن فلم بری طرح فلاپ ثابت ہوئی!

اکیس مارچ 1975ء کو مسعود پرویز صاحب کی ایک اور پنجابی رنگین فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی جس کے ہیرو ہیروئن بالترتیب نیلو اور شاہد تھے، اور سیکنڈ پیئر میں شہنشاہ ظرافت منور ظریف اور ایک بالکل نئی غیر معروف اداکارہ بابرہ شریف تھی یہ فلم بھی بہت زیادہ کامیاب نہ ہوئی، فلم کا نام ''میراناں پاٹے خان'' تھا، درحقیقت یہ فلم 1955ء کی فلم پاٹے خان کا ری میک تھی۔ پاٹے خان کا کردار اردو فلموں

کے پہلے کامیڈین ظریف مرحوم نے ادا کیا تھا، لیکن میراناں پاٹے خان میں منور ظریف نے اپنے بڑے بھائی ظریف مرحوم کا پاٹے خان والا کردار ان سے کہیں بہتر ادا کیا تھا۔ اس فلم کے پروڈیوسر ایس ایم علی اور مصنف حزیں قادری، جبکہ کے میوزیشن بخشی وزیر تھے۔ عکاسی کے فرائض مسعود الرحمٰن نے ادا کیے جو اداکار فیصل الرحمٰن کے والد تھے، اس فلم کے حوالے سے خاص اور یادگار واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں منور ظریف نمبر ون کامیڈین اور ہیرو تھے ان کی کامیابیوں کا طوطی بول رہا تھا، اور بابرہ شریف کی انٹری فلم انڈسٹری میں نئی نئی تھی، انہیں آگے بڑھنے کے لیے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور اس وقت منور ظریف سے مضبوط اور کون ہوسکتا تھا، لہٰذا بابرہ شریف نے منور ظریف کے ساتھ دوستی کر لی اور منور فلمسازوں سے اس کی سفارش کرنے لگے کہ اسے فلموں میں کاسٹ کریں۔ منور کا کہنا ٹالنا فلم سازوں کے بس میں نہیں تھا میراناں پاٹے خاں فلم بھی اسی سلسلے یا اسی کوشش کی ایک کڑی تھی اس فلم کی بدولت بابرہ فلمسازوں کی نظروں میں آ گئی اور سما گئی، پہلی بار اسی فلم سے بابرہ شریف کے حسن کا جادو سر چڑھ کر بولا اس سے قبل منور ظریف بابرہ شریف کے ساتھ ایس سلیمان کی فلم بھول میں آچکے تھے۔ اس کے علاوہ شباب پکچرز کی کامیاب تصویر نوکر میں بھی منور بابرہ کی جوڑی موجود تھی اور پسند بھی کی گئی تھی۔ ایک اور فلم انجام میں بھی نوخیز خوبصورت بابرہ منور ظریف کے ساتھ کام کر چکی تھی، دونوں اسٹوڈیوز میں ایک ساتھ پائے جاتے، یوں لگتا تھا جیسے عنقریب شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے، منور ظریف بھی شاید بابرہ سے محبت کرنے لگے تھے اور بابرہ بھی شاید منور ظریف پر فریفتہ تھی اس وقت تک بابرہ شریف لولی ووڈ میں نئی نئی تھی، اور فلموں میں غیر اہم کرداروں یا زیادہ سے زیادہ سیکنڈ پیئر میں کاسٹ کی جاتی تھیں لیکن پھر اچانک ایک بڑے ہدایت کار شباب کیرانوی نے غلام محی الدین اور بابرہ شریف جیسی نئی کاسٹ کو لے کر ہلکی پھلکی رومانوی فلم میرا نام ہے محبت قلیل وقت میں بنا ڈالی، قدرت کا کرنا کیا ہوا کہ یہ فلم غیر متوقع طور پر غیر متوقع کامیابی سے ہمکنار ہو گئی اور بابرہ شریف ایک ہی جست میں اردو فلموں کی ٹاپ کلاس ہیروئن بن گئی، اور اسے پروڈیوسرز دھڑا دھڑ صف اوّل ہیرو کے ساتھ صف اوّل کی ہیروئن کے طور پر بھاری معاوضے پر کاسٹ کرنے لگے اور اس نے بلا تاخیر منور ظریف سے آنکھیں پھیر لیں اور اسے نظر انداز کرنے لگی، عشق کی یہ چوٹ سادہ لوح منور ظریف برداشت نہ کر پائے اور بلانوشی کا سہارا لینے لگے۔ انہیں دل کا عارضہ لاحق ہو گیا، اور آخر کار ہارٹ اٹیک سے جانبر نہ ہو پائے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یوں عشق نے ایک بہت بڑے فنکار کی جان لے لی (اس کی تفصیلات میں بھی کبھی جائیں گے، بڑی دلچسپ لیکن انتہائی دکھ بھری کہانی ہے، اس کی کڑیاں اس کے تانے بانے بڑی دور تک جاتے ہیں)

1977ء کی آخری سہ ماہی میں مسعود پرویز صاحب کی دو فلمیں شائقینِ فلم کی عدالت میں پیش کیں لیکن دونوں ہی، ناظرین کی نظرِ التفات سے محروم رہ گئیں ان میں سے ایک اکتوبر کی 21 تاریخ کو ریلیز ہونے والی فلم انسان تھی جس میں بابرہ شریف، شاہد اور بدر منیر، نمی کی دو جوڑیوں کو لے کر ہلکی پھلکی رومینٹک فارمولا فلم ترتیب دی گئی، اس فلم کی ایک انتہائی اہم اور خاص بات یہ تھی بلکہ یہ ایک ریکارڈ ہے جسے آج تک کوئی دوسری فلم یا دوسرا ہدایت کار توڑ نہیں سکے یا برابر بھی نہیں کر پائے، وہ یہ کہ اس فلم میں ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ مسعود پرویز کی اس فلم کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے بیک وقت سات میوزیشنز کی خدمات حاصل کی گئیں، یعنی سات موسیقاروں نے بیک گراؤنڈ میوزک مل جل کر تیار کیا۔ فلم میں سات گانے تھے اور ہر گیت کی موسیقی دینے کے لیے الگ الگ میوزک ڈائریکٹر سے کام لیا گیا، خواجہ خورشید انور، اے حمید، نذیر علی، کمال احمد، ماسٹر عنایت حسین، ناشاد، صفدر حسین۔ اس فلم کی واحد گلوکارہ مہناز بیگم تھیں لیکن شومئی قسمت حیرت انگیز طور پر کوئی موسیقار کامیاب نہیں ہو سکا، اور مہناز بھی رنگ جمانے میں بری طرح ناکامی سے ہمکنار ہوئیں۔ نہ تو موسیقی نے کوئی چمتکار دکھایا اور نہ ہی مہناز بیگم کا کوئی بھی گیت مشہور ہوا، اس فلم سے پہلے اور اس فلم کے بعد آج تک کسی نے یہ تجربہ دہرانے کی غلطی نہیں کی۔ اسی سال 77 کے 4 نومبر کو مسعود پرویز کی دوسری فلم نیا سورج بھی مقابلے کے لیے میدان میں اتاری گئی، جس کی کاسٹ میں وقت کے دو لیجنڈ محمد علی اور شبنم تھے، ان کی مدد کے لیے فلم میں منور ظریف اور مصطفیٰ قریشی جیسے بڑے نام بھی موجود تھے۔ نثار بزمی جیسے سکہ بند موسیقار بھی تھے لیکن ضیاء سرحدی کی تحریر کردہ یہ فلم بھی بری طرح فلاپ ہوئی، 1978ء میں لیجنڈ ہدایت کار مسعود پرویز کی ایک تاریخ ساز تاریخی فلم حیدر علی بنی یہ اچھی خاصی معیاری اردو رنگین فلم تھی، اور اچھی خاصی پسندیدگی کی نگاہوں سے بھی دیکھی گئی۔ گولڈن جوبلی تو خیر نہ کر پائی تاہم حیدر علی

کاروباری طور پر نفع کا سودا ثابت ہوئی، راولپنڈی میں یہ فلم شبستان سینما مری روڈ پر لگی تھی۔ حیدر علی کا مرکزی کردار محمد علی نے انتہائی خوبصورت انداز میں نبھایا، اس سے قبل ایک فلم ٹیپو سلطان کے نام سے بھی بنی تھی۔ اس میں ٹیپو سلطان کا کردار بھی محمد علی نے ہی ادا کیا تھا۔ فلم حیدر علی کے آٹھ میں سے چند نغمات بے حد مشہور ہوئے اور خاص طور پر اس زمانے میں ریڈیو پر بار بار بجائے جاتے تھے۔ ''جا جا ری کوکیا جا جا مت گا ری کوکیا مت گا۔ اے سب جگ کے رکھوالے میرا ساجن تیرے حوالے، کیوں روئے شہنائی دل تو میرا نو نا چوٹ تو میں نے کھائی۔'' ممتاز، محمد علی، نیر سلطانہ، ادیب جگی ملک طالش علاؤالدین اور شجاعت ہاشمی فلم کے نمایاں اسٹارز تھے۔ 5 دسمبر 78ء کو فلم ریلیز ہوئی۔ ہدایت کار مسعود پرویز کی اس فلم کے موسیقار تھے خواجہ خورشید انور اور انہوں نے اس کے تمام گانے گلوکارہ مہناز سے گوائے، جو دھیمی سروں کی گائیکہ تھیں، اگر فلم میں مزید گلوکاراؤں کی آواز شامل کی جاتی، تو ممکنہ طور پر فلم کی کامیابی بہت بہتر ہو سکتی تھی، اس دور میں اخبارات فلموں اور فلمی خبریں سے متعلق اچھا خاصہ مواد چھاپتے تھے ان میں انٹرویو کے علاوہ فلموں پر تبصرے بھی ہوتے تھے ایسے ہی کسی اخبار کے کسی تبصرے میں؛ میں نے ان دنوں پڑھا تھا کہ حیدر علی فلم کے کسی فائٹ سین کے دوران پس منظر میں بجلی کی تاریں اور بجلی کے کھمبے نظر آ رہے تھے، میری عمر اس وقت بہت کم تھی لیکن یہ بات کہیں پڑھی تھی میں نے، اگر ایسا تھا تو یہ ایک فاش غلطی تھی۔ نیف ڈیک ایک سرکاری ادارہ ہے، آج سے پچاس سال قبل اس ادارے کے تحت پہلے ایک دستاویزی فلم جاگو ہوا سویرا بنائی گئی جس کے اسکرپٹ رائٹر فیض احمد فیض تھے اس کے بعد 1947ء کی ہجرت کے دلخراش واقعات کو فلم بند کرنے اور اس دوران مسلم لیگ کی خدمات کو اجاگر کرنے کی ٹھانی گئی تو جیوری کی توجہ اردو کے معروف تاریخ نویس ناول نگار نسیم حجازی کے ناول خاک وخون پر مبذول کروائی گئی، یوں نسیم حجازی کے ناول خاک وخون پر فلم بنانے کا ارادہ باندھا گیا لیکن جب فلم کے ڈائریکٹر کے چناؤ کا وقت آیا تو اسی ڈائریکٹر کا انتخاب کیا گیا جس کو حکومت پاکستان کی جانب سے بیسٹ فلم ڈائریکٹر کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا، جی ہاں پاکستان کے لیجنڈری فلم ڈائریکٹر مسعود پرویز جن کو 1956ء میں فلم انتظار پر بہترین فلمی ہدایت کار کا ایوارڈ صدر پاکستان کی جانب سے عطا کیا گیا تھا۔ خاک وخون پکچرائز کرنے کے حساب سے ایک وقت طلب فلم تھی ہجرت کے واقعات کی فلم بندی کوئی آسان کام نہ تھی، لیکن یہ مشکل ترین کام بھی مسعود پرویز نے کر دکھایا اور آخر کار نسیم حجازی کے ناول پر مبنی فلم مکمل ہو کر نمائش کے لیے سینما گھروں تک آ پہنچی۔ اس کی کاسٹ میں محمد علی شمیم آراء شجاعت ہاشمی نوین تاجک کے علاوہ مشہور ٹیلی ویژن آرٹسٹ محبوب عالم اور عابد علی شامل تھے۔ مکالمے اور منظر نامہ احمد راہی کا لکھا ہوا تھا اور موسیقار تھے نثار بزمی۔ گلوکاروں میں مہدی حسن، نور جہاں، رجب علی اور اخلاق احمد تھے۔ مذکورہ فلم 23 فروری 1979ء بروز جمعۃ المبارک کو ریلیز ہوئی۔ ابتدائی ہفتے میں فلم نے رش پکڑا لیکن دوسرے ہی ہفتے فلم زمین پر گئی ایک کے سوا کوئی گانا ہٹ نہ ہو پایا۔ نور جہاں اور رجب علی کی کیمسٹری سے دوگانا امر ہو گیا ''زندگی اپنی گزر جائے گی آرام کے ساتھ اب تیرا نام بھی آئے گا میرے نام کے ساتھ، خاک وخون خاطر خواہ بزنس حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

یوں 1982ء کا سنہ ہدایت کار مسعود پرویز کے لیے لولی ووڈ فلم انڈسٹری اور پاکستان کی سینما نگری میں آخری برس ثابت ہوا ان کی آخری فلم ریلیز ہوئی اس فلم کا نام بھی مرزا جٹ تھا، جبکہ اس نام سے آپ نے ہی ایک فلم پندرہ برس قبل 1967ء میں بنائی تھی لیکن پہلی فلم کے فلم ساز اعجاز درانی تھے جبکہ نئی مرزا جٹ کے فلم ساز محمد سرور بھٹی تھے۔ سرور بھٹی کی پہلی فلم مولا جٹ 1979ء میں ریلیز ہو کر انہیں سونے چاندی میں تول چکی تھی، لیکن اب کچھ الگ اور منفرد کر دکھانے کے شوق میں سرور بھٹی نے ایک بار پھر لولی ووڈ کی کریم اور تکنیکی طور پر سب سے بڑی ٹیم اکٹھی کی اور مرزا جٹ بنا ڈالی۔ موسیقی کے لیے خواجہ خورشید انور کا انتخاب کیا گیا جب کہ کہانی احمد راہی سے لکھوائی گئی۔ کیمرا مین مسعود الرحمٰن تھے لیکن کچھ الگ کر دکھانے کے چکر میں ہیروئن کے لیے اداکارہ خانم کو منتخب کیا گیا جو اس وقت بھٹی پکچرز کی چند فلموں میں لیڈنگ رول ادا کرنے کی بناء پر قدرے مشہور تھیں لیکن پروڈیوسر اور ڈائریکٹر یہ سمجھ نہ پائے کہ وہ اتنی مہنگے بجٹ کی فلم کا بوجھ نہ اٹھا پائے گی دیگر کاسٹ۔ مناسب تھی شاہد اقبال حسن ساون دردانہ رحمٰن اور الطاف خان، لیکن فلم اپنا رنگ نہ جما پائی اور فلاپ ہو گئی فلم ساز کو بہت زیادہ نقصان ہوا اور اس فلم کے ساتھ ہی ہدایت کار مسعود پرویز اور موسیقار خواجہ خورشید انور کی فلمی زندگی تمام ہو گئی مرزا جٹ ان دونوں لیجنڈز کی آخری فلم ثابت ہوئی، بطور ہدایت کار مسعود پرویز نے 13 اردو اور 8 پنجابی فلموں کی ڈائریکشن دی۔

++

نمک حرام

ذوالفقار علی بخاری

جرائم کے نت نئے طریقہ کار آزمائے جاتے ہیں انہوں نے بھی جرم کے لیے انوکھے طریقے آزمائے تھے۔

جرم وسزا کی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے سوغات

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے سچ بولنے پر نمک حرام قرار دے دیا گیا ہے اور کامیابی سے دور رکھنے کے لیے سب میدان میں اتر آئے تھے۔

فیری کی موت نے ڈیوڈ کو نڈھال کر دیا تھا۔

سب کے لیے یہ بہت حیران کن بات تھی کہ فیری نے خودکشی کر لی ہے اور اس کے گھر والوں نے پوسٹ مارٹم کرانے سے انکار کر دیا ہے۔

انہوں نے یہ بات پھیلانے سے گریز کی تھی کہ وہ موت سے قبل نفسیاتی طور پر مجروح کی گئی تھی۔ ڈیوڈ کو جب علم ہوا کہ فیری دنیا سے چلی گئی ہے تو اس کے پیروں تلے سے

زمین نکل گئی تھی۔ وہ اس تلاش میں لگ گیا تھا کہ ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے فیری نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔

مسلسل تگ ودو کے بعد اسے علم ہوگیا کہ فیری نے ایسا کیوں کیا تھا۔

اس کی نجی گفتگو اور چند تصاویر کو سوشل میڈیا پر یوں پیش کیا گیا تھا جیسے اس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے۔ اس نے انجانے میں اپنی سہیلی پر اعتبار کر کے اپنی اور ڈیوڈ کی محبت آمیز باتوں کا ذکر کیا تھا اور اس سہیلی نے میسیجز کا اسکرین شارٹ لے کر سوشل میڈیا پر وائرل کر دیا تھا۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فیری کا اصل روپ یہ ہے، اس نے بہروپ بھرا ہوا ہے، درحقیقت وہ سہیلی پس پردہ کاف کا کے ساتھ مل گئی تھی اسی کے کہنے پر یہ سب کیا تھا۔

ڈیوڈ کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ فیری ایسا کرے گی لیکن وہ یہ بات بخوبی جان گیا تھا کہ فیری بہت حساس دل کی مالک تھی۔ اسی حساسیت نے اسے مجبور کیا۔ فیری نے اپنی توہین محسوس ہوتے ہی دنیا سے رخصتی کو بہتر سمجھا۔

اپنے مفادات کے حصول کی خاطر انہوں نے فیری کو رسوا کرنا ضروری سمجھا تھا اس لیے جان بوجھ کر اس کی کردارکشی کی گئی تھی اسے بغاوت کے جرم کی سزا دی گئی تھی۔

ڈیوڈ کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ اس کے کہنے پر ہی فیری نے بغاوت کا علم بلند کیا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اتنی بڑی سزا ملے گی۔

کاف کا پہلے اسے نمک حرام قرار دے چکا تھا اور اب فیری کی موت کا جرم بھی اس کے سر تھوپ رہا تھا۔

ڈیوڈ کو ماضی کی بہت ساری باتیں یاد آرہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے پردۂ سیمیں تھا جس پر مناظر رقصاں تھے۔

☆☆☆

''میں ایسا نہیں کرسکتی ہوں۔'' فیری نے ڈیوڈ کی بات سنتے ہی کہا۔

''دیکھو! ایسا تو کرنا ہی پڑے گا بصورت دیگر معاملات بے حد خراب ہوجائیں گے۔'' ڈیوڈ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''وہ بڑا نام رکھتے ہیں، اثر و رسوخ رکھتے ہیں اگر ہم نے اپنی بات کہی تو پھر کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور ہماری ساکھ خراب تو ہوگی ہی ہم پر تھوکا بھی جاسکتا ہے کہ ہم نے اپنے محسنوں کے خلاف ایسی بات کہی ہے۔'' فیری نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو ڈیوڈ ہنس دیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، سب ان کے اصلی چہروں سے بے خبر ہیں۔ اگر کوئی ہماری بات پر یقین نہیں کرتا ہے تو پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو ہماری بات میں موجود سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے ساتھ دیں گے۔'' ڈیوڈ نے سنجیدگی سے فیری کو کہا۔

''میں ان کو اپنا محسن سمجھتی تھی ان کے بارے میں ہمیشہ اچھا ہی سوچا تھا۔'' فیری کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے۔

''میں ابھی مرا نہیں ہوں، تم کیوں رو رہی ہو۔ ان لوگوں کو اپنی اوقات تک لانا پڑے گا جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کمزوری دکھا رہے ہیں اور ہم کچھ نہیں کرسکتے ہیں۔ وہ اگر نام رکھتے ہیں اور مقبولیت رکھتے ہیں تو اس وجہ سے ہم ان کو سراہتے ہیں اور ان کے لیے کام کرتے ہیں جس سے وہ ناموری حاصل کر رہے ہیں۔ اگر وہ گھٹیاپن، بازاری الفاظ اور منفی سوچ سے ہمارے جگر چھلنی کریں گے تو پھر وہ کسی رعائیت کے مستحق نہیں ہیں۔''

''وہ لوگ ہماری وجہ سے آج ارب پتی ہیں لیکن پھر بھی حرص کم نہیں ہو رہا ہے۔ وہ مزید دولت ہمارے ذریعے سے کمانے کے خواہش مند ہیں۔'' فیری نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''یہ دولت ہے ہی منحوس شے مگر یہ نہ ہو تو پھر ہم بہت کچھ حاصل بھی نہیں کرسکتے ہیں اور ہو تو سکھ کی نیند بھی نہیں سو پاتے ہیں لیکن اس کے بغیر گزارہ بھی تو نہیں ہے لیکن تم فکر نہ کرو، لالچ کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔''

ڈیوڈ نے نرم لہجے میں اپنی عادت کے مطابق بات کہی تو فیری کو حوصلہ ہوچکا تھا کہ اب معاملات جو بھی رخ اختیار کریں اسے سامنا کرنا ہوگا۔

''ٹھیک ہے میں موقع دیکھ کر انکار کرنے کی کوشش کروں گی اور کچھ ایسے رویے بھی رکھوں گی کہ وہ لوگ سمجھ جائیں کہ میں بھی راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' فیری نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈ اسے پہلے دن سے ہی باغی محسوس ہوا تھا اس نے ہمیشہ وہی کیا تھا جو اس کے دل میں آتا تھا لیکن ہمیشہ کامیابی اس کے نصیب میں آتی تھی کہ وہ صاف نیت کا حامل تھا۔ فیری نے بغاوت کے حوالے سے ڈیوڈ کو تمام اختیارات دے دیے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب جیت کے لیے لڑائی لڑنا بہت ضروری ہوچکا ہے۔

☆☆☆

فیری ابھرتی ہوئی لکھاری تھی۔ ایک گاؤں میں رہنے والی لڑکی جس کی اوّلین خواہش تھی کہ وہ اتنے پیسے کمائے کہ گھر

والوں کی خواہشات کو پورا کرسکے لیکن اسے کوئی ایسا موقع نہیں مل رہا تھا کہ وہ کچھ کر دکھائے کہ دولت اس کے قدموں تلے بچھ جائے۔ اسے بچپن سے شوق تھا کہ وہ ان لکھاریوں کی مانند کہانیاں لکھے جن کو وہ برسوں سے پڑھتی چلی آرہی تھی۔ اسے گاؤں سے شہر آنے کا موقع تب ملا تھا جب اس کے بھائی نے ضد کی تھی کہ اسے شہر کے کالج میں داخلہ لینا تھا۔ وہ اکیلا کیسے رہتا اس لیے فیری کو بھی آنا پڑا تھا۔ جب وہ اپنی پڑھائی میں مگن ہوگیا تو پھر فیری نے بھی اپنی زندگی کے خواب کو پورا کرنے کی ٹھان لی تھی۔

ایک صحافتی تربیتی کورس میں ڈیوڈ سے حسن اتفاق سے بات کرنے کا موقع ملا جس نے اس کے اندر چھپی صلاحیت کو بھانپ لیا اور اسے ایک تشہیری مقابلے میں شرکت کرنے کا کہا۔

ڈیوڈ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتا تھا جہاں نت نئے انداز میں تشہیری مہم چلا کر کلائنٹ کے کاروبار کامیابی سے ہمکنار کرائے جاتے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر وہ عام لکھنے والوں کی مانند اخبارات یا رسائل میں لکھے گا تو اتنا معاوضہ نہیں ملے گا جتنا اسے تشہیری مواد لکھنے پر مل سکتا ہے۔ یوں بھی اسے پتا تھا کہ وہ صحافت کے لیے ناموزوں ہے کیونکہ اس میں جو شرافت بھری ہے وہ اسے کبھی کامیابی تک نہیں لے جائے گی۔ فیری کی صلاحیتوں کو ایک ہی نظر میں ڈیوڈ نے بھانپ لیا تھا کہ یہ تشہیری دنیا میں آگئی تو چھا جائے گی۔ پہلی ملاقات میں فیری کے حسن کو دیکھ کر اس نے گھر بسانے کا بھی سوچا تھا لیکن پھر اپنی اماں کی خواہش پر خالہ زاد سے شادی کرکے یک طرفہ محبت کو دل ہی میں رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ڈیوڈ کے کہنے پر فیری نے تشہیری مقابلے میں حصہ لیا اور اپنی توقعات کے مطابق وہ اس مقابلے میں ناکام رہی لیکن قلم کو تھامنے کا نشہ اب سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ اپنی سوچ کو قلم کے ذریعے خوب صورت لفظوں سے یوں اجاگر کیا کہ ہر طرف اس کی قابلیت کی دھوم مچ گئی تھی۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے ڈیوڈ نے عمدہ تشہیری مہم سے کاروباری حلقوں میں اپنا ایک نام بنالیا تھا۔ فیری نے نت نئے خیالات پیش کرکے جج حضرات کے دل تو نہیں جیتے تھے لیکن وہ کاروباری حلقوں میں متعارف ہوچکی تھی۔

ڈیوڈ تشہیر کی دنیا کا مقبول ترین فرد تھا جس کے بنائے گئے اشتہارات لاکھوں دلوں کو جیت لیتے تھے اور وہ اسی بنا پر سب سے زیادہ معاوضہ بھی وصول کرتا تھا۔ اسی چیز کو دیکھتے ہوئے معروف کاروباری شخصیات الفرڈ اور کاف کا نے فیری اور ڈیوڈ کو ایک اہم پروجیکٹ کے لیے منتخب کرلیا تھا۔

یہ ساحلی علاقے میں رہائشی منصوبہ تھا جس کے لیے بھرپور انداز میں تشہیر کرنی تھی۔ فیری کو بھاری رقم کی ادائیگی کا چیک مل چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈیوڈ نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خطیر معاوضے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ الفرڈ جانتا تھا کہ یہ دونوں مل کر بہت کچھ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس لیے ان کو جتنی بھی رقم دی جائے گی وہ اس فائدے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوگی جو ملنے والا تھا۔

اس تشہیری کاروباری منصوبے سے پہلے ڈیوڈ ایک ایسے پروجیکٹ کو جو ماضی میں معمولی کامیابی حاصل کرچکا تھا اس کی یوں دھواں دار تشہیر کی تھی کہ پوری دنیا میں شہرت ہوگئی تھی۔ ایک مشہور ترین مشروب ''پی یو'' کے مقابلے میں نئے مشروب ''می یو'' کی تشہیر نے ملک بھر میں دھوم مچا دی تھی۔ بچے بچے کی زبان پر نئے مشروب کا اشتہار زبان زد عام ہوچکا تھا۔ ڈیوڈ کی مانند فیری کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کو سونے کی مرغی سمجھا جاچکا تھا اسی وجہ سے اسے بھی خوب کام حاصل ہو رہا تھا۔ فیری اور ڈیوڈ کی بھرپور تشہیری مہم کی بدولت تمام رہائشی مکانات محض دو ہفتوں میں بک چکے تھے۔

بیرون ممالک میں رہنے والے شہریوں کی ان مکانات کو خریدنے کی خواہشات کو پورا کرنا ناممکن ہوچکا تھا کہ تمام رہائشی مکانات پیشگی ادائیگی پر فروخت ہوچکے تھے۔ الفرڈ اور کاف کا زمین کی خرید و فروخت کے حوالے سے محدود پیمانے پر اپنی شناخت رکھتے تھے وہ اب پوری دنیا میں مشہور ہوچکے تھے۔ انہی دنوں میں ڈیوڈ نے اپنی منفرد شناخت کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے کا سوچا۔

ڈیوڈ نے اندر ہی اندر اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کام کرنا شروع کردیا تھا جس کی بھنک تک اس نے الفرڈ اور کاف کا کو نہیں ہونے دی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ برسوں سے ایک مخصوص سوچ کے ساتھ کام کرتے چلے آرہے ہیں اور اپنی اسی حکمت عملی کی بدولت کاروباری دنیا کی نامور شخصیات سے اپنے تعلقات خراب کرچکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تشہیر کی دنیا میں نئے نوجوانوں کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا جائے جو فیری اور ڈیوڈ سرانجام دے رہے ہیں۔

ڈیوڈ جان چکا تھا کہ اس کی آزادی کو سلب کیا جارہا ہے اور اسے ایک طرف کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ ڈیوڈ کو علم تھا کہ اس نے جب بھی یہ بات عیاں کی تو الفرڈ جو بظاہر اسے

آزادی سے کام کرنے کا کہتا ہے لیکن خواہش رکھتا ہے کہ وہ کسی اور کے لیے خاص کر جن سے اس کی کاروباری رقابت ہے ان کے لیے کام نہ کرے۔ لیکن ڈیوڈ نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر کام کرنا ہے تو اپنی مرضی اور دلیری سے کرنا ہے کیوں کہ اسے علم تھا کہ اگر اس نے مخصوص احباب کے ساتھ مستقبل میں بھی یونہی کام کرنے کو ترجیح دی تو اسے آگے بڑھنے سے روک دیا جائے گا کہ کم وقت میں بین الاقوامی سطح تک پہچان اور ساکھ بنا کر وہ ویسے ہی سب کو ششدر کر چکا تھا۔

ڈیوڈ نے بین الاقوامی تشہیری اداروں کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا اسی دوران الفرڈ اور کاف کا کے مخالف ایلی کے ادارے کے لیے کام کرنا ڈیوڈ کے لیے زہر قاتل ثابت ہو چکا تھا۔

اسے خاموشی سے اس بات کے طعنے دیے جا رہے تھے کہ اس نے کاروباری مخالفت جانتے ہوئے بھی ایلی کے ساتھ کام کرنا گوارا کیا ہے۔ ڈیوڈ کی خواہش تھی کہ وہ اپنی پہچان اور نام کی خاطر کسی کے ساتھ بھی کام کرے تاکہ مخصوص گروہ کے ساتھ کام کرنے کی چھاپ اتار سکے لیکن وہ دونوں اس طرف سوچنے کو تیار نہیں تھے۔ ڈیوڈ کی سوچ یہ تھی کہ آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزادی سے ہر اچھے ادارے کے لیے کام کرے لیکن اس کی سوچ کے برعکس ایک کے بعد ایک نئے منصوبے اس کے سپرد کیے جا رہے تھے اسے خطیر رقم کی آفر کر کے کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ چڑ رہا تھا کہ اسے آزادی سے کام کیوں نہیں کرنے دیا جا رہا ہے۔ مالکان ڈیوڈ کو بہت حد تک برداشت کرنے کے باوجود ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور کرتے ہوئے جس پروجیکٹ پر ڈیوڈ کام کر رہا تھا اسے فارغ کر کے اکیلے فیری کو کام کرنے کا کہا جا رہا تھا۔ فیری نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دے گی۔

اسی حوالے سے فیری اور ڈیوڈ کی اس روز گفتگو ہوئی تھی جس نے دونوں کا ذہنی سکون برباد کر دیا تھا کہ کاف کا اور الفرڈ ذہنی طور پر ان کو ہراساں کر رہے ہیں تاکہ ان کے مفادات کو زک پہنچانے کی سزا دے سکیں۔

فیری نے الفرڈ اور کاف کا سے ڈیوڈ کے حوالے سے بات کی اور دونوں کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ ڈیوڈ کو آزادی سے کام کرنے کا موقع دیں تاکہ معاملات درست رہیں۔ الفرڈ رضامند ہوگیا تھا مگر کاف کا نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔ جب ڈیوڈ تک یہ بات پہنچی تو اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔

ڈیوڈ نے تشہیری دنیا میں کام کرنے سے توبہ کرلی۔ اس نے الفرڈ اور کاف کا کو یہ بات باور کروادی تھی کہ اب اسے تشہیری کام میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی ہے اس لیے وہ اپنے کاروبار کی تشہیر کے لیے کسی اور کو منتخب کرلیں۔ الفرڈ کو دلی دکھ ہو رہا تھا کہ ڈیوڈ کا ساتھ چھوٹ رہا ہے لیکن کاف کا نے ڈیوڈ کی بات سنتے ہی خاموشی اختیار کرلی۔ کاف کا جانتا تھا کہ جب تک فیری ساتھ ہے وہ اپنی کاروباری ساکھ کو قائم رکھیں گے۔

ڈیوڈ نے بطور ڈراما رائٹر اپنی شناخت بنانے کے لیے کام شروع کر دیا تھا اور اس حوالے سے اس نے اپنا پہلا ڈراما اپنی ہی زندگی پر لکھ ڈالا۔ اس نے کاف کا کے مخالف ایلی اور دونوں دوستوں کی زندگی پر ڈراما پیش کر کے جنگ کا طبل بجادیا تھا۔ جب کاف کا نے ڈراما دیکھا تو اسے اچھی طرح سے علم ہو گیا کہ ڈیوڈ باغی ہو چکا ہے اور اسے راہ راست پر لانا ضروری تھا۔ ایلی سے کاف کا بہت خار کھاتا تھا اسی وجہ سے جب اس نے یہ محسوس کرلیا کہ ڈیوڈ نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے تو اس کے دل میں مزید نفرت پیدا ہوگئی تھی کہ پہلے ہی ڈیوڈ بطور نمک حرام قرار دیا جا چکا تھا جس کا فیری کو بھی بہت رنج تھا۔

☆☆☆

بیس برس قبل ایلی، کاف کا اور الفرڈ گہرے دوست تھے اور ایک ساتھ انہوں نے کاروبار شروع کیا تھا۔ کاف کا اپنے دیگر دو دوستوں سے زیادہ ذہانت رکھتا تھا اسی وجہ سے ہر معاملے میں اس کی بات تسلیم کی جاتی تھی۔

ان دنوں تینوں دوستوں نے گھریلو سامان فروخت کرنے کے حوالے سے یہ طے کیا تھا کہ ادھار پر سامان نہیں بیچا جائے گا۔ شومئی قسمت کے ایلی کے بھائی کو شادی پر سامان کی ضرورت ہوئی تو اس نے ادھار پر سامان دینے کی بات کہی تو الفرڈ فوری طور پر رضامند ہوگیا تھا لیکن کاف کا نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ پہلے طے کیے گئے معاہدے میں نہیں تھا۔ اگرچہ بات اتنی سنگین نہیں تھی لیکن چوں کہ الفرڈ اور کاف کا ان دنوں ایلی کو کاروبار سے الگ کرنے کے لیے سوچ چکے تھے اسی وجہ سے انہوں نے چھوٹی سی بات کو اتنا طول دیا تھا کہ ایلی نے کاروبار سے الگ ہو کر ان کے ہی مقابلے میں سستا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایلی نے اس پر ہی بس نہیں کیا تھا اس نے انہی کے سامنے دکان کھول کر جو مقابلے کی فضا قائم کی تھی۔ کاف کا اور

الفرڈ کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ ڈیوڈ نے جب ایلی کے کاروبار کی تشہیری مہم کو اپنے ذمے لیا تھا اس نے بھی پرانے دوستوں کے مفادات کو زک دینا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے اب وہ یہی چاہ رہے تھے کہ ڈیوڈ بس ان کے لیے کام کرے مگر اس حوالے سے فیری نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ان کے بے جا طعنوں سے تنگ آچکی تھی جو وہ ڈیوڈ کے بارے میں سنتی رہتی تھی۔

فیری نے کبھی اپنی الفت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن وہ ڈیوڈ کو ایک محسن کے طور پر عزت دیتی تھی کیوں کہ اسی کی وجہ سے اس نے اس شعبے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے قلم کاری کا شوق تھا اسی وجہ سے اس نے صحافت میں آنے کے لیے ایک تربیتی کورس کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پھر ڈیوڈ سے ملاقات کے بعد تو اس کی زندگی بدل گئی تھی کہ اس نے تشہیری دنیا میں خود کو منوانے اور نام پیدا کرنے کا سوچ لیا تھا کہ اس کے بعد اسے ہزاروں روپے محض چند یوم میں مل جانے تھے۔ فیری اس سے پہلے تیس دنوں میں جتنی محنت سے کام کر کے چند ہزار کماتی تھی وہ ان پیسوں کی اہمیت کو خوب سمجھنے لگی تھی جو تشہیری کام سے حاصل ہو رہے تھے کہ اسی کی بدولت اس نے اپنے چھوٹے بھائی کی شادی بھی کرادی تھی۔ اب گھر میں پیسے آنے لگے تھے اور حالات کچھ بہتر ہوئے تھے کہ یہ معاملہ سامنے آگیا تھا۔ فیری اب الفرڈ اور کاف کا کی وجہ سے ذہنی طور پر پریشان رہنے لگی تھی۔ وہ کام چھوڑنا چاہتی تھی لیکن وہ بضد تھے کہ وہ ان کے لیے کام کرنا نہ چھوڑے۔

☆☆☆

کافی دیر سے فون کی گھنٹی بج رہی تھی پھر تنگ آکر فیری نے فون اٹھالیا۔

''ہاں بھئی کیا ہو رہا ہے، کوئی نئی خبر۔'' کاف کا نے کہا۔

''کچھ نہیں سب پرانا ہے......بس امی بیمار ہیں تو ان کی تیمارداری میں مگن ہوں۔'' فیری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تم نے بھی وہی فیصلہ کرلیا ہے جو ڈیوڈ کر چکا ہے یعنی ایک نہ شد دو نمک حرام شد۔'' کاف کا نے طنزیہ لہجے میں بات کہی۔

''ایسا بالکل نہیں ہے۔ ڈیوڈ ایسا بالکل نہیں ہے۔'' فیری نے طرف داری کرتے ہوئے ڈیوڈ کی جان بخشی کرانے کی کوشش کی۔

''ہوں......ہم جانتے ہیں بھئی برسوں ہم نے بھی خاک چھانی ہے اسی صحرا میں۔'' کاف کا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''مجھے ڈیوڈ کے بقایاجات درکار ہیں۔'' فیری نے ڈیوڈ کے چند ماہ کی تنخواہ کے متعلق بات کہی تو کاف کا ایک دم چونک گیا۔

''کون سے......ارے اچھا وہ......ٹھیک ہے بھجوا دیتے ہیں۔'' کاف کا نے اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں اب مزید کام نہیں کرسکتی ہوں۔''

جونہی فیری نے بات کہی کاف کا ایک دم غصے میں آگیا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ ہمارے ساتھ زیادتی ہے ہم نے اتنی محنت سے تمہاری ساکھ بنوائی اور اب تم کام کیسے نہیں کرتی ہو......دیکھ لوں گا۔''

''میں نے سوچ لیا ہے کہ اس دنیا سے دور چلی جاؤں جہاں بس دکھاوا ہے۔'' اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے فیری نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ تم ایسا کیسے کرتی ہو۔'' کاف کا نے یہ کہتے ہوئے کال کاٹ دی اور الفرڈ کو کال کرنے لگا۔ اسے یہ بتانا ضروری تھا کہ اب ایک اور نمک حرام بھی پیدا ہو چکا ہے اس کی گردن میں بھی پھندا ڈالنا ضروری ہو چکا ہے۔

☆☆☆

''ہمارا نمک کھا کر لوگ مرجاتے ہیں نمک حرامی نہیں کرتے ہیں۔'' کاف کا نے الفرڈ کی حمایت حاصل ہوتے دیکھ کر سامنے بیٹھے ڈیوڈ سے کہا۔

''ہمارا قصور کیا تھا جو آپ نے ہمیں اپنا دشمن بنالیا۔'' ڈیوڈ نے اپنی ناک کو یوں دو انگلیوں سے دبایا کہ وہ سرخ ہوگئی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ اضطراب کے عالم میں کیا کر رہا ہے۔ اس نے اپنی بات کہہ کر خاموشی اختیار کرلی تھی۔

''ہمارے دیے گئے راستے پر چلتے رہتے تو ہم نہ تو تمہارا راستہ روکتے اور نہ فیری جان سے جاتی۔ یہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

کاف کا کی بات نے ڈیوڈ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔

''ہم نے فیری سے کہا تھا کہ ہم نے بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیا ہے تمہیں بھی اپنی جگہ پر لے آئیں گے اب

دیکھو تم خود چل کر ہمارے پاس آئے ہو۔'' الفرڈ نے مسکراتے ہوئے بات کہی۔

ایک معروف ہوٹل کی بالائی چھت پر بنے ریولنگ ریسٹورنٹ میں کھانے کی دعوت پر آئے ہوئے الفرڈ، کاف کا اور ڈیوڈ کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی باتیں سن سکتا اس لیے وہ بنا خوف وخطر بات کر رہے تھے۔

اچانک الفرڈ بولا۔ ''کھانے میں نمک تیز ہے۔''

''کھانے میں نمک نہیں وہ زہر ہے جو تمہیں جہنم رسید کردے گا۔'' ڈیوڈ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

''ارے ارے..... یہ کاف کا کو کیا ہوا ہے۔''

اچانک الفرڈ نے اپنے دوست کاف کا کے کندھے کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''وہی ہوا ہے جو آپ جیسے انسانوں کا مقدر ہوتا ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''کیا مطلب۔'' الفرڈ نے کھانستے ہوئے کہا۔

''اس کھانے میں زہر ملا ہوا تھا جسے کھا کر تمہارا دوست تو جان سے جا چکا ہے اب تمہاری باری ہے۔''

ڈیوڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر خاموش ہوا اور وہ اٹھ کر الفرڈ کے پاس آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا اور میری کا جرم اتنا تھا کہ ہم نے آزادی سے کام کرنے کا سوچا، اپنی الگ پہچان بنانے کا سوچا۔ آپ نے کوئی تصدیق کیے بنا ہم پر غلط الزامات لگائے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ہمارے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تاکہ ہم کہیں کے نہ رہیں، خود آپ نے میری اچھی بھلی نوکریاں بھی ختم کرادیں تاکہ میں لوٹ کر آپ کے پاس آجاؤں اور جب فیری نے کام کرنے سے انکار کیا تو آپ نے اسے بھی خودکشی کی جانب مائل کردیا۔''

ڈیوڈ کی آنکھیں شدت غم سے لال ہو چکی تھیں اس نے سب کہہ دیا تھا جو آج کے دن وہ کہنے کے لیے الفرڈ اور کاف کا سے ملنے آیا تھا۔

کاف کا کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

الفرڈ نے اپنی پوری قوت استعمال کر کے بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''مجھے معاف کردو، ہم سے غلطی ہوگئی تھی ہم پر ناجائز الزامات اور مستقبل خراب کرنے کی کوشش کی تھی، مجھے اور میرے بھائی کو بچالو۔''

الفرڈ کی بات کو کاٹتے ہوئے ڈیوڈ نے کہا۔ ''برسوں سے اتنا کچھ کر رہے تھے کسی نے تو اٹھنا تھا اب بھگتو، کیوں کہ تم نے تو مجھے نمک حرام کہا تھا اب میں نمک حلال کیوں بنوں؟''

''یہ بتاؤ نا میرے دوست کو نیند کیوں آئی ہے۔''

الفرڈ کی ساری توجہ ابھی تک کاف کا پر تھی جس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور وہ کرسی پر یوں پڑا تھا جیسے بے جان مورتی ہو۔

''تمہارے دوست کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔ میں جو بوفے سے کھانا لے کر آیا تھا اس میں لاتے لاتے زہر ملایا تھا۔ یہاں لے کر آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ کھانا مجھے خود سرو کرنا تھا تب ہی چھت پر کھانے کے لیے خاص طور پر بلوایا ہے۔''

ڈیوڈ نے ایسی بات کہی جو الفرڈ سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ یہ بات بھول چکا تھا کہ ڈیوڈ نے پہلے بھی کھانے میں زہر ملانے کی بات کی تھی۔

الفرڈ مسلسل کھانس رہا تھا کہ گلے میں پھندا آچکا تھا۔ یہ نادیدہ پھندا عام رسی کا نہیں تھا بلکہ یہ فیری کا ہی نادیدہ اسکارف تھا جو اس کی موت کا سبب بن رہا تھا۔

ڈیوڈ نے سوچ لیا تھا کہ ان کو زندہ نہیں چھوڑنا ہے اس لیے وہ ان کو عبرت کا نشان بنانا چاہ رہا تھا تاکہ کل کو پھر کوئی کسی معصوم کے ساتھ زیادتی نہ کرسکے۔

فیری کی موت کے بعد ڈیوڈ کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے موت تک لے جانے والوں کو بھی یہی سزا دے گا اور پھر خود بھی فیری تک پہنچ جائے گا۔ اس کے لیے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونا مزید ذلت کا سبب ہوسکتا تھا اور پھانسی کا تختہ دار بھی رسوائی بنتا اس لیے اپنی سزا اس نے خود سوچ لی تھی۔

ڈیوڈ اٹھے قدموں چلتا ہوا چھت کے کنارے کے پاس پہنچ گیا اور پھر اس نے وہاں سے چھلانگ لگادی۔

اخبارات میں شائع ہونے والی خبر کے ساتھ تصویر نے قاتل کو سنگدل قرار دیا تھا لیکن درحقیقت قاتل کسی کی نظر میں نمک حرام تھا جس نے اپنا نمک حلال کردیا تھا اس نے فیری کے ساتھ عہد کو پورا کردیا تھا کہ اس نے وفاداری نبھا دی تھی۔ دوسری طرف اخبار میں شائع تصویر میں الفرڈ کا منہ کھلا تھا اور ہاتھ جوڑے ہوئے تھے جو گناہ گار کے آخری وقت میں معافی کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔

++

ترقی پسند

زین مہدی

یہ رودادِ زندگی اس قلم کار کی ہے جس نے ایک امیر گھرانے میں جنم لیا، ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر امیرانہ زندگی کو لات مار کر سڑکوں پر آگیا، خود کو حقیقتاً ترقی پسند ادیب ثابت کیا. زندگی بھر اپنے نظریے کے لیے جدوجہد کرتا رہا. ایسی کتابیں لکھیں جس نے ہلچل مچا دی. آج بھی وہ کتابیں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں.

ایک معروف قلم کار کا مختصر سا زندگی نامہ

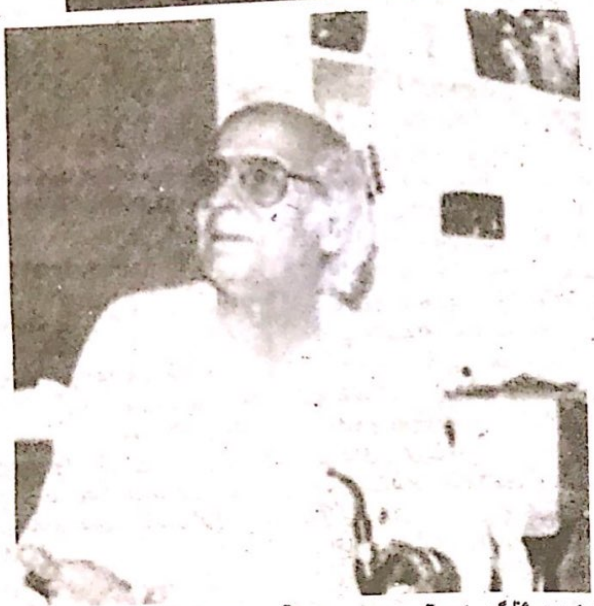

امباری کا شمار اعظم گڑھ کے ان قصبوں میں ہوتا ہے جہاں سادات کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ اسی قصبے کے کشاہا نامی گاؤں میں اس نے جنم لیا۔ 31 جولائی 1916ء کو ..... اس نے جس گھرانے میں جنم لیا تھا وہ علاقے کے بڑے زمینداروں کا گھرانا تھا۔ ان کی زمینیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ زمینیں انہیں انگریزوں کی جانب سے ملی تھیں۔

برسوں قبل جب پورے برصغیر میں آزادی کا پہلا بگل بجا اور مجاہدین سر سے کفن باندھ کر انگریزوں سے مقابلہ کرنے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ اس وقت ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے وطن کی آزادی پر غلامی کو ترجیح دی تھی۔ جنہوں

نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ان کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ایسے لوگوں کو انگریزوں نے خوب نوازا تھا۔اعظم گڑھ میں جن خاندانوں کو نوازا گیا ان میں ایک خاندان اس کا بھی تھا۔اس کے خاندان کے پاس پہلے سے بھی زمینیں تھیں اس لیے وہ علاقے میں اہمیت کے حامل خاندان تھے،اس پر انگریزوں نے مزید زمینیں عطا کر دیں۔گویا کہ یہ خاندان علاقے کا سب سے خوشحال خاندان تھا۔ایسے خاندان میں پیدا ہونے والا بچہ بھی خوش حالی کا مزہ خوب لوٹتا ہے۔وہ بھی اسی راہ پر چل رہا تھا۔لاڈ و پیار میں پل کر بڑا ہو رہا تھا۔ابتدا میں تو اسے گھر میں ہی حرف شناسی سکھائی گئی مگر بعد میں اسے مقامی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔پڑھنے میں وہ کافی تیز تھا اس لیے اس نے جلد ہی اساتذہ کی توجہ حاصل کر لی۔سبق تو اُسے ہمہ وقت ازبر رہتا۔ایک کے بعد ایک جماعت وہ اچھے نمبروں سے پاس کرتا چلا جا رہا تھا لیکن ایک عجیب بات تھی کہ وہ اس کمسنی میں بھی اپنے ہم جماعت کا خیال رکھتا۔خاص کر وہ طالب علم جو معاشی طور پر ٹوٹے ہوئے گھرانوں کے تھے۔اسکول آتے وقت اسے دن کا کھانا بھی ساتھ دیا جاتا مگر وہ اس کھانے میں اپنے ہم جماعتوں کو شامل کر لیتا تھا۔گھر تک بات پہنچی تو سرزنش بھی ہوئی کہ یہ غریب غربا کے بچے ہیں ان سے زور رہو ورنہ یہ سر پر چڑھ جائیں گے،مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا کہ دل مانتا ہی نہیں تھا۔اسے غریبوں کے بچوں سے خاص انسیت تھی۔یہ انسیت کا جذبہ اسے ہمدردی کا پیکر بنائے ہوئے تھا۔

ان دنوں وہ ساتویں جماعت میں تھا جب اس نے پہلی بار ایک ایسی کتاب پڑھی جس نے اس کے اندر ایک انقلاب سا پیدا کر دیا۔وہ کتاب در اصل نیاز فتح پوری کا ماہنامہ نگار تھا۔اس میں شامل تحریریں اس کے ذہن پر خاص اثر چھوڑ گئی تھیں۔اس کمسنی میں جو سوچتا تھا وہی کچھ اس ماہنامہ میں تھا۔اب وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ پرچہ پڑھا کرتا۔کب کا ہے،کتنا پرانا ہے اس سے اسے کوئی مطلب نہیں تھا۔جیسے جیسے وہ اس پرچے کی تحریر پڑھتا جاتا ویسے ویسے اس کے دل و دماغ پر اثر طاری ہوتا جاتا۔

اسی دوران اس نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے اس کے اندر بغاوت کا بیج بو دیا۔اسے قدرت کے نظارے سے عشق تھا۔لہلہاتے کھیت،بہتا دریا،ڈوبتا سورج،صبح کاذب کی سفیدی اسے پسند تھی۔اس نے ایسے ہی نظاروں کے درمیان ہوش سنبھالا تھا۔وہ یہی کچھ دیکھتا ہوا بڑا ہوا تھا۔عمر کے ساتھ ایسے نظاروں میں دلچسپی بڑھتی گئی۔وہ لکھنو میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مقیم تھا لیکن اس کا دل اسے کھیتوں کھلیانوں کی جانب کھنچتا ہوا محسوس ہوتا۔لکھنو میں رینگتے ہوئے گومتی کے کنارے شام گزرتی لیکن جیسے ہی تعطیل آتی وہ گاؤں کی جانب بھاگ اٹھتا۔اس بار اس نے اپنے ایک رشتے دار کے ہاں وقت گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔اس کے گاؤں میں ایک ہفتہ ٹھہرنے کا سوچ لیا تھا۔وہ اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے ان کے گاؤں پہنچ گیا۔

وہ گھرانا بھی اس کے خاندان کی ٹکر کا تھا۔ان لوگوں کی زمینیں بھی بہت تھیں۔کئی گاؤں کے مالک تھے۔حویلی بھی شاندار تھی۔وہاں پہنچ کر وہ بہت خوش تھا۔شام جب تک رات کا چولہ نہ پہن لیتی وہ چوبارے سے ہٹتا نہیں تھا۔غروب آفتاب کا منظر اپنی آنکھوں میں سموتا رہتا۔اسی طرح وہ نماز فجر کے بعد کھیتوں میں نکل جاتا۔گو کہ وہ نماز کا پابند نہیں تھا لیکن خاندان کا ہر فرد اسلام ازم کو خود پر طاری کیے ہوئے تھا اس لیے وہ بھی ان کی خوشی کی خاطر کسی بات سے انکار نہیں کرتا تھا لیکن مغرب کی نماز سے بچنے کے لیے وہ اکثر کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔اس شام جب وہ ہوا خوری سے واپس آیا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

ہر ایک کو اس بات کی خبر تھی کہ اس کمسن بچے کے اندر ایک باغی روح ہے۔گھر والوں کے ہزار منع کرنے کے باوجود وہ غریبوں کا ہمدرد بنا ہوا ہے۔ہر غریب کو دکھ تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اسی لیے اس کے سامنے بہت سی باتوں سے گریز کیا جاتا تھا مگر ہونی کو کون روکے اسی لیے وہ منظر اس نے دیکھ لیا۔

وہ سیر سے لوٹا تو حویلی کے باہر ایک شخص کو نیم کے پیڑ سے الٹا لٹکا ہوا پایا۔اس کے چچا اور کزنز بھی وہاں موجود تھے۔وہ سب اس پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ابھی وہ دور تھا پھر بھی اس نے دیکھ لیا کہ اس کے چچا اس لٹکے ہوئے شخص کا انگوٹھا کسی کاغذ پر لگوا رہے ہیں۔یہ منظر دیکھ وہ غصے سے ابل پڑا۔اس کی اس بے ادبی پر چچا کا پارا چڑھ گیا مگر اس غریب کی جان بخشی ہو گئی۔وہ غریب مسکین موقع پاتے ہی بھاگتا چلا گیا۔

اس واقعہ نے اس پر بہت اثر ڈالا اور وہ اسی دن وہاں سے اپنے گھر چلا آیا اور پھر اسی لکھنو کے لیے نکل پڑا۔گھر میں رکتا تو رشتے داروں کا اور غصیلے چچا کا پیغام آنا ضروری تھا پھر اس کی خاطر داری کیسے ہوتی اس کا علم اسے بخوبی تھا۔

☆☆☆

لکھنو سے اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ الہ آباد یونیورسٹی چلا آیا۔یہیں سے اس نے بی اے کی سند حاصل کی۔الہ آباد میں اسے دو اچھے دوست ملے۔فراق گورکھ پوری نے تو اس کی زندگی پر بڑا اثر ڈالا۔اپنے ساتھ ساتھ اسے لیے پھرتے۔اس کی ادبی شناخت کراتے۔دھیرے دھیرے وہ الہ آباد میں اپنا ادبی مقام بناتا گیا مگر اس کا اثر تعلیم پر مطلق نہ پڑتا۔بی اے کے بعد اس نے قانون پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایل ایل بی کرنے کے لیے علی گڑھ آ گیا۔یہیں اس نے ڈاکٹر کے ایم اشرف کی کتابوں سے فیض حاصل کیا اور وہ کمیونسٹ پارٹی کے قریب ہوتا چلا گیا۔یہیں اس نے خواجہ احمد عباس کے انقلاب کا مطالعہ کیا اور اس کتاب کے سحر میں پور پور ڈوبتا چلا گیا۔

اب حالت یہ تھی کہ وہ عیش،آرام،مال و دولت سبھی کچھ چھوڑ کر متلاشی بن چکا تھا۔اسے وہ راہیں تلاش کرنی تھیں زندگی کے حسن کی،صداقتوں کی،سچائیوں کی،انہی کی تلاش میں اس کی ملاقات سردار جعفری اور اسرار الحق مجاز سے ہوئی۔یہ دونوں ہی ترقی پسندی میں بہت آگے تھے۔انہوں نے بھی اس کے ذہن پر ایک اثر چھوڑا۔وہ ان کا گویا معتقد ہو گیا۔اسی درمیان اس نے قانون بھی پڑھ لیا۔

پڑھائی سے فرصت ملی تو اس نے ایک نیا پلان بنایا۔لکھنو سے ترقی پسند ادب کا پہلا مجلہ شائع کرنا شروع کر دیا۔اس جریدے نے دیکھتے ہی دیکھتے قارئین میں ایک خاص مقام بنا لیا۔یہ پرچہ پورے ہند میں زور شور سے اپنی جگہ بنا رہے تھے مگر ترقی پسندی کا مرکز اس وقت بمبئی تھا۔پارٹی میں اہم مقام رکھنے والے تمام لوگ بمبئی میں تھے۔انہوں نے مشورہ دیا کہ لکھنو کی بجائے بمبئی آ جاؤ اور پارٹی کا اپنا مجلہ جو ابھی تک اپنا مقام صحیح طور پر بنا نہیں پایا ہے اسے قوت دی جائے۔

وہ ایک نئے عزم کے ساتھ بمبئی کے لیے نکل پڑا۔شاید وہ 43-1942ء کا زمانہ تھا۔اس نے بمبئی پہنچتے ہی کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ میں شمولیت اختیار کر لی،ادارتی عملہ میں شامل ہو گیا۔وہیں سے اس اخبار کی نمائندگی کے لیے اقوام متحدہ میں متعین ہوا۔کیونکہ وہ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے کے لیے کولمبیا یونیورسٹی جانا چاہتا تھا۔یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا۔اور یہ وہ وقت تھا جب برصغیر میں آزادی کی تحریک پورے عروج پر تھی۔عوام دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ہندو ہندو بن کر اور مسلمان مسلمان بن کر ابھر چکے تھے۔کمیونسٹ پارٹی کی پکڑ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ایسے وقت میں اسے امریکا جا کر راہ بنانے کی ذمے داری سونپی گئی چنانچہ وہ امریکا روانہ ہو گیا۔امریکا میں اس نے مختلف ریاستوں میں ہند کی تحریک آزادی پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔اس کی یہ سرگرمی امریکی حکام کو ذرا بھی نہ بھائی اور اسے سامراج دشمن سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

اس کی گرفتاری کے خلاف اقوام متحدہ میں مشعین،دنیا بھر کے اخباری نمائندوں نے احتجاج کا راستہ منتخب کر لیا۔انہوں نے عالمی ادارے کی کارروائی کا ایک دن کے لیے بائیکاٹ کر دیا چنانچہ اس دن کی کارروائی کا اخباری ریکارڈ دنیا بھر میں کہیں موجود نہیں ہے۔

اس احتجاج سے امریکی حکومت پر دباؤ بڑھا اور اسے رہا کر کے واپس جانے کا حکم دے دیا گیا۔

امریکا سے واپس آیا تو ہر طرف ایک عجیب کھیل کھیلا جا رہا تھا۔انسانیت پوری طرح مر چکی تھی۔ہر طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی تھی۔ملک بھر میں ایسا کوئی بھی حصہ نہیں تھا جہاں تعصب کا ناگ پھن پھیلائے کھڑا نہ ہو گیا ہو۔ہر شہر ہر خطے سے قتل و خوں ریزی کی اطلاعات نہ آ رہی ہوں۔یہ کمیونزم کی ہار تھی۔اس وجہ سے پوری پارٹی میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔یہ آگ اس قدر تیز تھی کہ اسے بجھانے کی کوئی راہ بجھائی نہیں دے رہی تھی۔اسی درمیان قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا۔

اب برصغیر دو ملکوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔انڈین حصے میں کمیونسٹ ورکر بڑی تعداد میں تھے مگر پاکستانی حصے میں پارٹی کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لیے سرکردہ کمیونسٹ افراد کو جو مسلمان تھے انہیں پاکستان جا کر پارٹی کو منظم کرنے کا حکم نامہ جاری ہو گیا۔

حکم نامہ ملتے ہی وہ 1948ء میں لاہور آ گیا۔

لاہور اس زمانے میں ادب کا مرکز تھا۔قیام پاکستان سے قبل بھی یہاں اردو کتب کی اشاعت کو عروج حاصل تھا اور بعد میں بھی ایک اہم مقام بنانے میں کوشاں رہا۔ہجرت کا کرب جھیل کر آنے والے فنکاروں نے بھی کراچی جو اس وقت دارالحکومت تھا اس پر لاہور کو ترجیح دی۔وہ بھی اسی وجہ سے وہاں قیام کرنے پر آمادہ تھا۔وہاں اس کے اور بھی دوست پہلے سے موجود تھے یا پھر آتے جا رہے تھے۔

وہ فرضی نام پر لاہور آیا تھا کیونکہ پنجاب پولیس کے پاس اس کی گرفتاری کے وارنٹ پہلے سے موجود تھے۔وہ اپنے ایک دوست کو بڑی شدومد سے تلاش کر رہا تھا۔وہ تھا حمید

اختر۔ مگر وہ بھی اسے مل کر نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ بھی تو مہاجر بن کر لاہور آیا تھا، اسے کہاں سر چھپانے کی جگہ ملی ہے اس سے کوئی بھی باخبر نہیں تھا کہ ایک دن وہ دوست خود ملنے پہنچ گیا۔

وہ کراچی سے لاہور آیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر اس کے شاندار لباس اور امیرانہ وضع قطع دیکھ کر ایک ایجنٹ اسے فلیٹیز ہوٹل لے آیا تھا۔ دو روز بعد اس دوست یعنی حمید اختر سے ملاقات ہوئی تو پہلی بات یہی کہی کہ ''بہت برے ہوٹل میں پھنس گیا ہوں۔ ہر طرف اندھیرا ہے، کمرے گندے ہیں اور بدبو سے دماغ پھٹا جاتا ہے، کسی بہتر جگہ پر رہائش کا انتظام کر دیجیے۔''

دوست نے کہا۔ ''حضرت یہ تو راجوں مہاراجوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ شہر میں اس سے بہتر تو کوئی جگہ موجود ہی نہیں ہے۔''

حقیقتاً 1948ء میں لاہور میں فلیٹیز سے بہتر کوئی ہوٹل موجود نہیں تھا مگر لکھنوی نفاست پسندی پر یہ ہوٹل پورا نہیں اترتا تھا۔ بہرحال اگلے روز کسی دوسری جگہ منتقل ہو گیا۔ غالباً کسی دوست کے گھر اور زیر زمین رہتے ہوئے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔

اس کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ اس دنیا کو بدلنے اور بہتر بنانے کا، استحصال، ظلم اور جبر کے خاتمے کا۔ جبکہ اسے ہر خوبصورت چیز سے پیار تھا۔ پھولوں سے، بچوں سے، حسین لوگوں سے، خوبصورت چہروں سے۔ اس کی جمال پرستی کے بہت سے قصے مشہور ہیں اور بہت سوں کے عینی گواہ بھی ہیں اور اسی پیمانے سے وہ اس دنیا کو سنوارنا چاہتا تھا۔

جو کام جماعتوں اور اداروں کے کرنے کا تھا، یعنی فکری لحاظ سے لوگوں کو اور معاشرے کو تبدیلی کے لیے تیار کرنے اور توہمات اور تعصبات سے بچانے کا وہ اس نے تن تنہا انجام دینے کی سعی شروع کر دی۔

لاہور پہنچ کر اسے بھی اپنی قدر و قیمت کا احساس ہونے لگا۔ لاہور جیسا اکھڑ مزاج کا شہر مگر اس کی اہمیت پہچان گیا تھا لوگ ادب سے ملتے۔ آپ جناب سے باتیں کرتے۔ حمید اختر تو باضابطہ انہیں استاد کا درجہ دینے لگے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''وہ میرے دوست ہی نہیں استاد بھی تھے۔ لاہور آنے کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ ''نیا زمانہ'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر چونکہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ تھے اس لیے وہ زیر زمین رہ کر پرچہ مرتب کرتے تھے۔ بظاہر میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ احمد راہی اور بشیر ظفر ایڈووکیٹ بھی اس اخبار میں رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے۔ حکومت نے نیا زمانہ کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا تو اپنا وطن، بحر اور دوسرے ناموں سے اس کے احباب یہ پرچہ شائع کرتے رہے۔ یہ ایک مکمل اخبار تھا۔ اس زمانے میں اس کی خوبیوں کی داد احمد راہی، بشیر ظفر اور حمید اختر سمیٹتے رہے اس لیے کہ بظاہر یہی لوگ یہ اخبار نکالتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ اس معیاری ہفت روزہ اخبار کی تدوین ترتیب' اصل میں کس کی ذمہ داری ہے۔ حمید اختر صحافتی دنیا میں نو وارد تھے۔ چند ادبی کہانیاں ضرور لکھ چکے تھے۔ انہوں نے اخبار نویسی ان ہی سے سیکھی۔ ہر ہفتے مختلف موضوعات پر لکھنے کے لیے مختلف دوستوں کی ڈیوٹی لگتی۔ حمید اختر کا کام ان تمام مسودات کو جمع کر کے ان تک پہنچانا اور پھر ان کی قطع و برید کے بعد کتابت کرا کے شائع کرانا تھا۔ ابتداء ہی میں حمید اختر کو کسی خاص موضوع پر لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی لیکن وہ جب بھی کچھ لکھ کر لاتے اسے آدھے سے زیادہ کاٹ کر پھینک دیا جاتا۔ حمید اختر چونکہ ادب کے طالب علم تھے اس لیے لفاظی اور زبان کی چاشنی پر زیادہ توجہ دیتے۔ اور وہ ایک بھی فالتو لفظ برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ بغیر دلیل کے کسی دعویٰ کو چھاپنے پر رضامند نہ ہوتے۔ اعداد و شمار کے بغیر کسی فیصلے کا اعلان کرنے کے حق میں نہ ہوتے۔

یہ سلوک حمید اختر کے مضامین ہی کے ساتھ نہیں تھا بلکہ کبھی لکھنے والوں کے صفحے کے صفحے قلم زد ہو جاتے۔ ان کے ایک دوست زور بیان میں کہیں کے کہیں نکل جانے کے عادی تھے۔ ان کا مضمون ہاتھ میں آتے ہی سبط کی زبان سے بے ساختہ نکلتا۔ ''معاذ اللہ، آپ لوگوں نے کیسے کیسے 'سلطان القلم' پال رکھے ہیں جو لکھنے پر آتے ہیں تو پلٹ کر دیکھتے ہی نہیں۔''

اکثر اوقات ایسے زود گو قلمکاروں کے دس صفحے کے مضمون کو وہ تین چار پیراگراف میں بدل دیتے اور اس طرح الجھی ہوئی تحریر کی وجہ سے جو بات قاری کی سمجھ میں شاید نہ آسکتی واضح اور دوٹوک شکل میں آتی۔ اس کانٹ چھانٹ کے نتیجے میں.... یہ اخبار موثر اور بامعنی ہوتا۔ سبط جس طرح زندگی بھر فالتو بات کرنے سے گریز کرتے رہے اس طرح انہوں نے کبھی کوئی غیر ضروری فقرہ لکھا بھی نہیں، بغیر دلیل اور منطق کے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ہر کام میں نفاست کو ترجیح دیتے تھے۔

حمید اختر لکھتے ہیں مجھے یاد ہے۔ غالباً 1974ء میں،

میں چند روز کے لیے کراچی میں ان کے گھر ٹھہرا تھا۔ ایک رات میں نے شکایت کی کہ آپ لوگوں سے ملتے نہیں۔ بہت سے لوگ شاکی ہیں کہ آپ بالکل گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ کہنے لگے۔ ''بھئی وقت بہت کم ہے اور کام بہت ہے، اس لیے میں ملاقاتیں کرنے کی بجائے کام کرتا ہوں۔''

اس بات پر ہمارے درمیان کافی دیر بحث رہی۔ میں نے کہا آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ وقت کم ہے۔ ٹھیک ہے کرنے کے بہت کام باقی ہیں مگر زندگی کے بارے میں یہ سوچ مریضانہ ہے۔ اگلے روز میں نے بیٹی نوشابہ سے کہا، اپنے ابو کے دماغ سے یہ بات نکالنے کی کوشش کرو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اسی دس بارہ برس میں انہوں نے موسیٰ سے مارکس تک، انقلاب ایران اور نوید فکر جیسی معرکۃ الآراء تصانیف مکمل کیں۔ اس سے قبل ماضی کے مزار اور شہرنگاراں شاید مکمل کر چکے تھے۔ باقی کتابیں جن میں ان کی آخری کتاب بھی شامل ہے اور جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

یہ گزشتہ بارہ برس کی تخلیقات ہیں۔ اس تمام عرصے میں وہ اپنی دھن میں کام کرتے رہے۔ اپنے مضامین، تصانیف اور لیکچروں کے ذریعے انہوں نے رواداری، روشن خیالی، سائنسی سوچ اور فکر کے نئے اور بلند مینار تعمیر کیے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کے دوران میں لندن (اگست 1985ء) اور کراچی (مارچ 1986ء) میں بار بار اس پریشانی کا اظہار کرتے تھے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ ملا، پیران حرم اور ان کے گماشتے حکمرانوں کے ساتھ مل کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ عام انسانوں کو ان کے روز مرہ کے مسائل کا ادراک نہیں کرنے دیتے اور انہیں توہمات اور تعصبات کے کنوئیں میں دھکیل رہے ہیں۔ جس سائنسی سوچ اور روشن خیالی کی بنیاد سرسید احمد خان نے ڈالی تھی آج ہم اس سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ ان کی آخری دنوں کی تصانیف اسی موضوع پر مشتمل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دور میں ثقافتی، ادبی، تہذیبی اور فکری میدان میں کام کرنے والے نوجوان بہت عرصے تک ان کی نگارشات سے راہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔''

حمید اختر ان کے بارے میں مزید لکھتے ہیں ''ذاتی زندگی میں وہ خوش پوش، نفاست پسند، مہذب اور انتہائی نرم گفتار تھے۔ معاشی طور پر بدترین حالات میں بھی ان کے لباس پر کسی نے کبھی شکن نہیں دیکھی۔ گرمیوں میں کرتہ شلوار پہن کر گھر سے نکلتے تو واپس آ کر دوبارہ باہر جانے کے لیے کبھی وہ جوڑا استعمال نہیں کرتے۔ شام کو دوبارہ دھوبی کا دھلا ہوا جوڑا پہن کر نکلتے تھے۔ ہم نے بہت دفعہ کہا۔ ''سید صاحب آپ کے وارڈ روب کا خرچا بہت ہے۔ اسے کم نہیں کیا جاسکتا؟''

جواب ہمیشہ یہی ہوتا۔ ''بھئی ایک دفعہ پہننا جذب ہونے کے بعد وہ کپڑا دوبارہ کیسے پہنا جاسکتا ہے۔''

حمید اختر ان کے بارے میں ایک اہم بات لکھ گئے۔ بقول ان کے ''سبط حسن خواتین میں ہمیشہ بہت مقبول رہے اور یہ بات ہمارے جیسے دوستوں کے لیے اکثر رشک و حسد کا باعث بنتی رہی۔ ایک دفعہ میں نے ایک خاتون سے جو اصل میں میری دوست تھی اور جس سے میری ہی وجہ سے سبط کا ربط تھا، پوچھا کہ ان کی خواتین میں مقبولیت کی وجہ کیا ہے' میں بھی تو کچھ پتا چلے۔

اس نے کہا۔ ''سبط جب اس سے بات کرتے ہیں تو اسے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے ادھر اُدھر آس پاس بلکہ پوری دنیا میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔ بس ہم ہی ہم ہیں۔''

اپنے سے جونیئر لوگوں بالخصوص اپنی بچی سے ہمیشہ کہتے تھے اپنے کسی فعل، کسی کام کے بارے میں کسی کے سامنے کوئی وضاحت نہ کرو۔ ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھو اور خود اپنے کو بتاؤ کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا، کسی دوسرے کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر میں ان کا کہنا تھا کہ کوئی بلند آواز سے نہ بولے۔ کیونکہ بک بک کرنا ہماری تہذیب میں معیوب ہے۔

روایات کی پاسداری کا یہ عالم تھا کہ 1950ء میں مزدوروں کے ایک جلسے میں نصیر انور مرحوم اور حمید اختر نے اسٹیج پر کلاسیکل موسیقی پیروڈی کی شکل میں پیش کی۔ سبط حسن بھی اس جلسے میں چھپے بیٹھے تھے۔ شام کو ملا تو میری بہت کھنچائی کی۔ کہنے لگے۔ ''جہالت کی اس سے بڑھ کر کوئی نمائش ہو سکتی ہے؟ کلاسیکی موسیقی ہماری تہذیب اور روایات کا حصہ ہے۔ آپ لوگوں کو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔''

رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ ہم دونوں کے درمیان کسی قسم کا تکلف نہیں تھا اور وہ ابتداء ہی سے پہچان گئے تھے کہ عام دنیاوی معاملات میں، میں خاصہ احمق ہوں ہر کسی پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ اپنے نفع نقصان کے بارے میں نہیں سوچتا۔ مگر جب کبھی میری کسی حماقت پر انہوں نے غصے سے کہا۔ ''بھائی آپ کی بے وقوفی کی کوئی حد بھی ہے۔''

میں نے خوشی سے نعرہ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کلمۂ حق کہنے کے لیے آپ نے چالیس برس انتظار کیا۔ چلیے سچ بات آپ کی زبان پر آئی تو......''

سبط حسن کی زندگی بہت منظم تھی۔ رہنے سہنے کا انہوں نے ایک معیار قائم کر رکھا تھا جو بدترین حالات میں بھی قائم رہا۔ صفائی کے بہت پابند تھے اور ان کے کمرے میں ہر چیز قرینے سے رکھی رہتی تھی۔ عام طور سے غیر ضروری باتوں سے احتراز کرتے، اسے مزید تفصیل سے سمجھانے کے لیے انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ 1954ء میں جب میں دوبارہ جیل گیا تو اتفاق سے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ ہم کچھ عرصہ اکٹھے جیل میں رہے۔ ہر صبح ان کا بستر دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی۔ ہم لوگوں کے بستر صبح اس حالت میں ہوتے کہ دری کہیں ہے، تکیہ کہیں ہے اور چادر کہیں الگ پڑی ہے۔ مگر سبط حسن کے ساتھ بالکل الگ معاملہ تھا۔ وہ رات بھر سو کر صبح اٹھتے تو ان کے بستر پر شکن تک نہیں ہوتی تھی۔ اس پر سب لوگ ان کا مذاق اڑاتے، بلکہ میں نے تو اعلان کر رکھا تھا کہ بستر کو صحیح حالت میں رکھنے کے لیے سبط اس پر نہیں سوتے بلکہ کرسی پر سوتے ہیں۔

''جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کبھی کبھی ہمارے وارڈ میں آتے اور کرسی پر براجمان ہو کر پند و نصائح کا دفتر کھول دیتے۔'' اس واقعہ کو وہ دلچسپ انداز میں بتاتے ہیں کہ جیسے ہی سپرنٹنڈنٹ صاحب کی آمد کا اعلان ہوتا، یا اندازہ ہوتا کہ وہ آرہے ہیں۔ ہم تمام سیاسی قیدی دیگر قیدیوں کی طرح الرٹ ہو جاتے مگر سبط حسن ایسے موقع پر ہمیشہ اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کا سب سے بڑا افسر ہوتا ہے، اس لیے ہمیں ان کی باتیں سننا پڑتیں۔ میں بھی تکلفاً سپرنٹنڈنٹ صاحب کی باتیں سنتا اور ہوں ہاں کرتا رہتا۔ ایک روز سبط حسن کہنے لگے۔ ''یہ حمید اختر کمال کا آدمی ہے۔ یہ ہر بور آدمی کے ساتھ گھنٹوں گفتگو کر سکتا ہے۔''

اس بات سے سمجھ لیں کہ ان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی غیر پسندیدہ شخص کے ساتھ بات بھی کر لیں۔ اپنی طبیعت اور ضمیر کے خلاف عمر بھر کوئی کام نہیں کیا۔

حمید اختر سبط حسن کے بارے میں مزید بتاتے ہیں کہ ''یہ غالباً 1953ء ستمبر کا ذکر ہے۔ سبط حسن کو جیل سے رہا ہو کر آئے کچھ ہی دن گزرے تھے اور وہ مال روڈ کے پیچھے تقی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ انہی دنوں دریائے راوی کا پانی لاہور کے رہائشی علاقوں میں داخل ہو گیا تھا۔ میں ان دنوں سنت نگر میں رہتا تھا۔ دن کے وقت میں دفتر امروز میں ڈیوٹی پر تھا کہ پتا چلا سنت نگر اور کرشن نگر کے محلے زیرِ آب ہیں اور تمام راستے بند ہیں۔ گھر میں میری بہن اور کم عمر بھتیجی تھی۔ بڑے بھائی لاہور سے باہر تھے۔ مجھے بہن اور بھتیجی کی فکر تھی۔ ادھر پانی یونیورسٹی کے باہر تک آگیا تھا۔ دیو سماج روڈ پر جو میرا راستہ تھا چھ سات فٹ پانی تھا۔ اسی سڑک پر مرحوم صوفی تبسم صاحب کا گھر تھا۔ پتا چلا وہ بھی رات سے چھت پر بیٹھے ہیں۔ سبط اور میں ساری شام اِدھر اُدھر کا چکر لگاتے رہے۔ مگر گھر تک جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ رات ایک بجے تک ہم لوگ ٹی ہاؤس میں بیٹھے اور وقفے وقفے سے زمزمہ توپ کے پاس جا کر پانی کا زور دیکھتے رہے۔ مگر پانی کم ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایک بجے کے بعد وہاں سے اٹھ کر تقی بلڈنگ میں سبط کے گھر آئے۔ مگر پریشانی کی وجہ سے سو نہ سکے۔ صبح پتا چلا کہ پانی کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا ہے۔ میری پریشانی دیکھتے ہوئے سبط نے اعلان کیا کہ وہ تیر کر میرے گھر جائیں گے اور بہن کی خیریت معلوم کر کے آئیں گے۔

میں نے انہیں بہت روکا، اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی خطرہ تھا وہ بہت اچھے تیراک تھے، مگر ان کی نفاست طبع کی وجہ سے مجھے معلوم تھا کہ اس گندے اور غلیظ پانی میں سے گزر کر جانا ان کے لیے کس قدر مشکل ہوگا۔ دریا کے پانی کے ساتھ ساتھ علاقے کی ساری غلاظت حشرات الارض سانپ بچھو وغیرہ بھی بکثرت موجود تھے مگر سبط اس پانی میں سے گزر کر نہ صرف میرے گھر گئے بلکہ وہاں کچھ دیر رکنے کے بعد اس سے آگے کرشن نگر میں عائشہ جمال (ہاجرہ مسرور کی بڑی بہن) کے ہاں بھی گئے اور دو گھنٹے بعد واپس آکر ہم لوگوں کو گھر والوں کی خیریت سے آگاہ کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے بعد وہ مسلسل کئی دن بار بار نہاتے اور پوڈر ملتے رہے۔ کہتے تھے ناک سے گندے پانی کی بدبو نہیں جاتی۔ اس شام میں گورنمنٹ کالج سے ہوتا ہوا گھوڑا اسپتال جا کر وہاں سے کشتی میں سوار ہو کر گھر پہنچا تھا۔ ہمارے گھر میں خیریت تھی، مکان کی دوسری منزل پانی سے محفوظ رہی تھی۔ نچلی منزل میں البتہ چھ سات فٹ پانی ہی پانی تھا۔

☆☆☆

حمید اختر لکھتے ہیں۔ ''9 جولائی سے ستمبر 54ء تک ہم بارہ چودہ آدمی لاہور سینٹرل جیل کے بم وارڈ میں تھے۔

ہمارے ساتھ مرحوم لال خان، مرحوم دادا منصور، مرحوم محمد افضل، قسیم اشرف ملک، مرزا ابراہیم، رؤف ملک، کامریڈ غلام محمد، سی آر اسلم اور بہت سے دوسرے ساتھی تھے۔ ہم لوگوں نے اپنے وارڈ میں والی بال کی ٹیم بنائی۔ روزانہ شام کو دو تین گھنٹے والی بال کھیلتے۔ یہاں بھی سبط حسن بے قاعدگی برداشت نہ کرتے، ساتھیوں سے ہمیشہ اس بات پر جھگڑا ہوتا کہ جو بال ان کی طرف آرہا تھا اسے دوسرے بھاگ کر کیوں اٹھاتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچنا شروع کر دیا۔ روزانہ اعلان ہوتا ''یہ میرا علاقہ ہے اگر یہاں کوئی آیا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

لاہور سینٹرل جیل کے یہ تین مہینے بہت اچھے گزرے۔ سبط حسن، سی آر اسلم اور افضل مرحوم دن بھر شطرنج کھیلتے، ہم لوگ تاش کی بازی لگاتے۔ اس کام کے لیے بم وارڈ میں جہاں ہم سب کی علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیاں تھیں وہاں ایک بڑا ہال بھی تھا۔ جہاں کھیل بھی ہوتا، سیاسی بحثیں بھی جاری رہتیں اور لطیفہ بازی کے دور بھی ہوتے۔ جیل پہنچتے ہی میری تجویز پر ہم سب لوگوں نے احتجاج کے طور پر سر کے بال منڈوا دیے تھے۔ پورے کے پورے چودہ آدمیوں نے حجام کو بلا کر استرے سے سر صاف کرائے تھے۔ تیسرے دن اس زمانے کے آئی جی جیل خانہ جات کرنل بشیر سید آئے تو اتنے سارے سیاسی قیدیوں کے چٹیل سر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے اور کافی دیر تک پوچھتے رہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔ سبط حسن کا اس دفعہ بھی کوئی ملاقاتی نہیں تھا۔ باقی سب نظر بندوں کے گھر والے ہر پندرہ روز کے بعد آتے تھے۔ کھانے پینے کا سامان، سگریٹ، مٹھائی، پھل غرض یہ کہ ہر ایک کے گھر سے ملاقات پر حسب توفیق سامان آتا۔ سبط حسن واحد نظر بند تھے۔ جن کا کوئی ملنے والا نہ تھا مگر انہوں نے اس پر بھی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ جیل میں انہوں نے حقے کا دیسی تمبا کو جسے وہ کھمبو کا نام دیتے تھے۔ صاف کر کے پائپ میں پینا شروع کر دیا تھا چنانچہ دو تین ماہ کے لیے آٹھ دس روپے کا تین چار سیر دیسی تمبا کو ان کی واحد ضرورت تھی۔ باقی یہ تین مہینے بڑے مزے میں گزرے۔ حتیٰ کہ ہم لوگوں کو علیحدہ علیحدہ گروپوں میں پنجاب کی مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ لال خان مرحوم، ڈاکٹر عبداللہ، مرزا محمد ابراہیم، کامریڈ غلام محمد اور میں میانوالی جیل بھیجے گئے۔ سبط حسن اور دوسرے ساتھی کیمبل پور اور کچھ دوسری جیلوں میں گئے۔ جانے سے پہلے ہم لوگوں نے اپنی نظر بندی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں رٹ درخواست دائر کر دی تھی چنانچہ جنوری 1995ء میں اس کی سماعت کے لیے ہم سب لوگوں کو واپس لاہور لایا گیا اور ہائی کورٹ کے حکم سے اسی ماہ یہیں سے رہا کیا گیا۔ یہ بہت بڑی خوشی کی بات تھی لیکن اس دن کوئی بھی خوش نہ تھا کیونکہ اسی روز اردو کے منفرد افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا انتقال ہوا تھا۔

☆☆☆

جیل کے نمبرداروں اور مشقتیوں کے لیے سبط حسن کا نام کچھ مشکل تھا چنانچہ اس تمام عرصے میں سید صاحب کو سیفٹی حسن کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی تھا۔ وہ سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند تھے جیل کے عملے نے انہیں سیفٹی حسن کا نام دے دیا۔ یہاں تک تو خیریت تھی۔ ایک روز سبط کے لیے ڈیوڑھی سے بلاوا آیا۔ جو نمبردار انہیں لینے وارڈ میں آیا۔ اس نے آتے ہی اعلان کیا۔ ''صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر سید سفل حسن کو یاد کر رہے ہیں۔''

یاروں نے اس پر قہقہہ لگایا تو سبط نے بڑی لجاحت سے کہا۔ ''بھائیو! اس کو یہیں تک رکھنا، باہر جا کے کسی کو نہ بتانا ورنہ بھائی لوگ اسی نام سے پکارنے لگیں گے۔''

حمید اختر آگے لکھتے ہیں۔ ''گرفتاری سے ڈیڑھ برس قبل میں امروز کے ادارتی عملہ میں شامل ہو چکا تھا۔ رہائی کے بعد واپس امروز میں کام شروع کر دیا۔ سبط حسن کچھ دنوں بےکار رہے... مگر ان کے مشاغل، رہن سہن، معیار زندگی، صفائی ستھرائی، نفاست اور نزاکت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس زمانے میں امروز اور پاکستان ٹائمز کے بانی مرحوم میاں افتخار الدین کو ایک ہفت روزہ نکالنے کا خیال آیا اور لیل و نہار کے نام سے ڈیکلریشن لے لیا گیا۔ تیاریاں شروع ہو گئیں اور ایڈیٹر کی تلاش ہونے لگی۔ ایک روز میاں صاحب امروز کے دفتر آئے اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر اس ہفت روزہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کافی دیر بعد اٹھ کر جانے لگے تو اچانک مجھ سے پوچھا۔ ''لیل و نہار کا ایڈیٹر کسے بنائیں؟''

میں نے فوراً کہا۔ ''سبط حسن کو۔''

''اس لیے کہ وہ تمہارا دوست ہے۔'' میاں صاحب نے کہا۔

میں نے انہیں بتایا کہ سبط میرے دوست ضرور ہیں مگر اس پیشے میں انہیں میں اپنا استاد مانتا ہوں اور یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس وقت پاکستان میں اردو انگریزی صحافت میں ان سے بڑا شاید ہی کوئی دوسرا نام موجود ہو۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میاں صاحب نے سبط حسن کو

میرے کہنے پر لیل ونہار کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے کے بعد بھی سبھی متعلقہ لوگوں سے بحث مباحثہ کرتے رہتے، دوسروں کی سنتے، اپنی رائے دیتے اور بالآخر اپنے فیصلے کو اجتماعی فیصلہ بنا کر لاگو کرتے، میری رائے اب بھی یہی ہے کہ انہوں نے سبط کو ایڈیٹر مقرر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ محض ہماری رائے معلوم کرنے اور اپنے فیصلے کو مزید پختہ کرنے کے لیے ہم سے مشورہ کر رہے تھے۔

بہرحال لیل ونہار سبط حسن کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے معیار اور محاسن کے بارے میں یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ یہ رسالہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اور اس ملک کا کوئی ہفت روزہ اس کے معیار کو چھو تک نہیں سکا۔ میں یہاں اس زمانے میں سبط حسن کی ذاتی زندگی کا ذکر کروں گا۔ لیل ونہار کی اشاعت کے دو تین برس میں سبط حسن کو پہلی بار سکون سے کام کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کے ذاتی اور قریبی دوستوں کے علاوہ دوسروں کو بھی پہلی بار ان کی صلاحیتوں کا پتا چلا۔

یہ دو تین برس ہم نے ایک ہی دفتر میں گزارے۔ دوپہر کا کھانا احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، ظہیر بابر اور میں قاسمی صاحب کے کمرے میں کھاتے اور کھانے کا یہ سیشن تبادلہ خیالات اور لطیفہ بازی کے لیے مخصوص ہوتا۔ فیض صاحب بھی انہی دنوں جیل سے رہا ہو کر آ گئے اور پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل ونہار کے چیف ایڈیٹر کے طور پر ان کا نام آنے لگا۔ مگر کچھ عرصے بعد بوجوہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں سبط حسن کی ذاتی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا۔

اس بابت بتانے کے لیے کچھ اور باتیں بتانا ضروری ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، سبط حسن برصغیر کی آزادی سے کئی برس قبل اپنا گاؤں بیوی، بچی، عزیز، رشتہ دار سبھی کچھ چھوڑ کر اپنی زندگی کے مشن کی تکمیل کے لیے لکھنو، حیدرآباد، بمبئی اور نیویارک میں رہے۔ ایک دفعہ گھر چھوڑا تو پھر اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا۔ نیویارک ہی سے لاہور آ گئے۔ یہاں انہوں نے اپنے قریب ترین دوستوں سے بھی اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔ 1955ء سے لے کر 1962ء تک میرا ان کا شب و روز کا ساتھ رہا۔ مگر میرے ساتھ بھی انہوں نے اپنے اہل خاندان کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس دور میں وہ ایک طرح سے ہمارے خاندان کا حصہ تھے۔ 1956ء میں میری شادی ہوئی۔ میں بوجوہ اس وقت شادی کے حق میں نہیں تھا۔ میرے بڑے بھائی مرحوم اور میری بہن نے سبط حسن کو درمیان میں ڈالا اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں بڑی بچیوں صبا اور ہما کی ولادت 1957ء اور 1960ء میں ہوئی۔ جب میرا اور سبط کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ وہ ان کے سامنے پلیں، بڑھیں اور ان کو گھر کے فرد ہی کی طرح جانتی تھیں۔ ان کی ذات اور ان کے خیالات کے سوا ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور سنا تھا کہ اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ان کی جاگیر میں تھا۔ جسے وہ بیوی اور بچی کے حوالے کر کے گھر سے نکل گئے تھے اور یہ اعلان کر گئے تھے کہ اب اس گھر یا جاگیر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ برس ہا برس تک کسی سے ملے ہی نہیں۔

"لیل ونہار" کی ادارت کے زمانے میں انہیں کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکا جانا تھا۔ روانگی کی تیاریوں کے وقت البتہ انہوں نے پہلی بار مجھ سے کہا کہ ان کی بیٹی ڈھاکا میں ہے وہاں وہ اس سے ملیں گے۔

سبط حسن جب نوشابہ کو چھوڑ کر گھر سے نکلے تھے۔ اس وقت وہ تین چار برس کی بچی تھی۔ اب وہ ڈھاکا پہنچے تو بیٹی بی اے میں پڑھتی تھی۔ ہم لوگ تاریخی ملاقات دیکھنے کے لیے وہاں موجود تو نہیں تھے، مگر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ یہ کیسی ملاقات ہو گی۔ ڈھاکا میں نوشابہ اپنے ایک خالو کے ہاں مقیم تھی جو ایک انتہائی مہذب، لائق اور اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ بظاہر ان ماں بیٹیوں کو وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن یہ بچی غالباً باپ کی غیر موجودگی کو بہت زیادہ محسوس کرتی تھی۔ ایسی سہیلیوں سے مل کر جن کے ہاں باپ ان کے ساتھ تھے، وہ اور بھی اداس اور دکھی ہو جاتی تھی چنانچہ سبط حسن ڈھاکا پہنچے تو بچی نے ان کو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں چھوڑا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر کالج گئی، پرنسپل اور پروفیسروں سے ملایا۔ اپنی تمام سہیلیوں اور ان کے اہل خاندان سے ملاقات کرائی۔ اور سائے کی طرح ان کے قیام ڈھاکا میں ان کے ساتھ چپکی رہی۔ خود سبط حسن بھی اس سے علیحدہ ہونے کو تیار نہیں تھے۔ سبط حسن اپنی واپسی کا پروگرام دو چار روز تک ٹالتے رہے لیکن جب بالآخر آنے لگے تو نوشابہ نے ان کے ساتھ لاہور جانے کا اعلان کر دیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ لیل ونہار کی ادارت کے زمانے میں انہوں نے نقی بلڈنگ کا فلیٹ چھوڑ دیا تھا اور سمن آباد منتقل ہو گئے تھے۔ ہم سب دوستوں بالخصوص میرے گھر والوں کے لیے سبط حسن

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

کے گھر پر ان کی بیٹی کی آمد ایک زبردست اور خوشگوار تبدیلی تھی۔

بچی کو کچھ روز بعد کیڈٹ ڈکالج میں داخل کرادیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خان کا مارشل لاء پورے زوروں پر تھا لیکن امروز، پاکستان ٹائمز اور لیل و نہار چلانے والی کمپنی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر ابھی ایوب حکومت نے قبضہ نہیں کیا تھا۔ فیض صاحب دو تین برس باہر گزار کر دوستوں کے منع کرنے کے باوجود وطن واپس آنے والے تھے اور ہم سب کو ان کا شدت سے انتظار تھا لیکن ان کی آمد سے قبل ہی سبط حسن اور احمد ندیم قاسمی کو ایک دفعہ پھر گرفتار کرلیا گیا۔ چند روز بعد فیض واپس آئے تو اگلے ہی دن انہیں پکڑ لیا گیا۔ سبط حسن کی گرفتاری کے بعد نوشابہ اکیلی رہ گئی۔ سبط حسن کے لیے جیل کے یہ دن بہت سخت تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بچی کی وجہ سے سخت پریشان ہیں ورنہ جیل ان کے لیے نئی بات نہ تھی۔ میں نے جیل میں ان سے چوری چھپے ملاقات کر کے بہت لعن طعن کی اور کہا کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو بچی کے بارے میں کیوں پریشانی ہے؟ بہرحال اس ملاقات کے بعد وہ مطمئن ہوگئے۔ بچی ہمارے ہاں آگئی اور وہاں سے اسے کیڈٹ کالج کے ہاسٹل میں بھجوادیا گیا۔

خوش قسمتی سے یہ سب لوگ دو ڈھائی ماہ بعد ہی رہا ہوگئے۔ اب مشکل یہ آن پڑی تھی کہ نوشابہ جو باپ کے ساتھ آگئی تھی۔ اپنی ماں کے لیے اداس رہنے لگی۔ سبط حسن کا بوجوہ اپنی بیگم کو لاہور لانے کا ارادہ نہیں تھا مگر بچی کی حالت دیکھ کر انہوں نے خط لکھ کر بیگم کو بھی بلالیا اور اس طرح تقریباً پندرہ برس کی جدائی کے بعد یہ خاندان ایک بار پھر سے یکجا ہوا۔

خاندان تو اکٹھا ہوگیا مگر سبط حسن کے امن و سکون کے یہ تین چار برس ختم ہوگئے۔ ایوب حکومت نے 59-1960ء میں پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار پر قبضہ کرلیا۔ جس حکم نامے کی رو سے ان اخبارات کو چلانے والے ادارے کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا تھا اس میں یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ اسٹاف میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا اور یہ کہ اس ادارے میں کام والے بھی صحافی بدستور کام کرتے رہیں گے۔ سبط حسن کو البتہ اسی روز فارغ کردیا گیا۔

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ میں سینکڑوں صحافی کام کررہے تھے حکومت کی کوشش اور خواہش یہی تھی کہ سب لوگ کام کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ جب مظہر علی اور احمد ندیم قاسمی نے پاکستان ٹائمز اور امروز کی ادارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تو کئی روز تک ان کو واپس لانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ البتہ سبط حسن کی برطرفی غالباً نئے مقرر ہونے والے ایڈمنسٹریٹر مرحوم سرفراز کا پہلا تحریر حکم نامہ تھا جو انہوں نے چارج لینے کے بعد جاری کیا۔

مرحوم سرفراز احمد پرانے صحافی اور منجھے ہوئے بیوروکریٹ تھے۔ انہوں نے برطرفی کا حکم نامہ دینے کے لیے سبط حسن کو اپنے کمرے میں بلایا اور یہ پیشکش کی کہ حکومت انہیں زمین، مکان اور کارخانہ تک الاٹ کرنے کو تیار ہے، کوئی دوسرا کام بھی جو ان کی معاش کے لیے موزوں ہو دیا جاسکتا ہے البتہ انہیں لکھنے، پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ملک کے اخبارات اور رسائل کے دروازے ان پر بند ہیں، اس کے سوا وہ جو مانگیں انہیں مل جائے گا۔ لیل و نہار کے دو تین برس کے شماروں کے علاوہ غالباً حکومت کے پاس ان کی زوردار تحریروں کے کچھ اور ثبوت بھی موجود تھے۔ مثلاً ''انقلاب چین زندہ باد'' انہوں نے لکھا تھا جس پر کسی کا نام نہ تھا اور جسے حکومت پنجاب نے ضبط کرلیا تھا اور اسی بنیاد کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں مہینوں مقدمہ چلتا رہا تھا۔ 1951ء میں گرفتاری سے قبل وہ تین چار برس ''زیر زمین'' رہے تھے اس لیے ان کی تحریروں پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا۔ راولپنڈی سازش کیس کے بعد سینکڑوں افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر پر لاہور کے شاہی قلعہ پر تشدد کیا گیا اور اس طرح دیگر معلومات کے علاوہ تلوار کی طرح کاٹ کرتی ہوئی ان تحریروں کے لکھنے والے کی بھی نشاندہی ہوگئی تھی چنانچہ حکومت کا فیصلہ..... تھا کہ اس آدمی کو لکھنے اور اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے حق سے محروم کردیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو کوئی اور کام کرنے اور حکومت کی طرف سے ہر سہولت مہیا کرنے کی پیشکش کی گئی اور کہا گیا کہ جس دشت کی سیاحی میں انہوں نے اپنی عمر گزاری ہے اس سے کنارہ کش ہوجائیں۔ سبط حسن سرفراز صاحب کا شکریہ ادا کرکے پی پی ایل کی سیڑھیوں سے اتر گئے۔ اس پیشکش کا تذکرہ انہوں نے میرے سوا غالباً کسی سے نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب میں نے یہ بات کی تو ان کے گھر والوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ سبط نے اس سارے زمانے میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

سبط حسن کے لکھنے پڑھنے پر پابندی کے بارے میں سب سے اچھا تبصرہ مادام نور جہاں کا تھا۔ انہوں نے اسی زمانے میں ایک روز مجھ سے سبط حسن کی خیریت پوچھی تو میں

نے بتایا کہ سرکار انہیں مال و دولت، زمین، مکان، کارخانہ سبھی کچھ دینے کو تیار ہے مگر انہیں لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مادام نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا مگر دو منٹ بعد بڑی بلند آواز سے بولیں۔ ''ہائے! یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی مجھ سے کہے تم گا نہیں سکتیں۔''

لیل و نہار سے برطرفی کے بعد سبط حسن کے لیے زندہ رہنے، مکان کا کرایہ اور کچن چلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کے دوست اور ہم سب کے محترم روشن علی بھیم جی نے انہیں کراچی آنے اور ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں اپنی مرضی کا کام کرنے کی پیشکش کی۔ مگر سبط کسی قسمت پر لاہور چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ لاہور میں تین برس دھکے کھانے کے بعد کو تیار نہیں کراچی جانا پڑا اور میں سمجھتا ہوں کہ سبط نے زندگی بالآخر انہیں دس بارہ سال میں جو تھوڑی علمی کام کیا ہے اس کا سہرا سبط کے آخری دس بارہ سال میں جو تھوڑی علمی کام کیا ہے اس کا سہرا سبط کے بعد بھیم جی اور مکتبہ دانیال کے ملک نورانی کے سر ہے۔ روشن علی بھیم جی نے انہیں جم کر کام کرنے کا موقع دیا اور ملک نورانی نے ان کی بظاہر خشک علمی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھال لی۔

کراچی وہ بالکل مجبور ہوکر گئے تھے۔ لیل و نہار سے برطرفی کے بعد انہوں نے لاہور میں تقریباً دو برس بہت برے حالات میں گزارے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں انہوں نے بہت سے کام اپنی طبیعت کے خلاف کیے۔ مثلاً ہمارے ایک دوست اے رحمٰن کی ایک فیکٹری میں وہ بطور لیبر ویلفیئر آفیسر کام کرتے رہے۔ یہ دوست امپریل الیکٹرک کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر اور سبط کے پرانے دوست تھے۔ انہوں نے سبط کو یہ پیشکش محض اس لیے کی تھی کہ وہ جانتے تھے سبط بغیر کام کیے کسی سے بھی کسی قسم کی مالی اعانت حاصل نہیں کریں گے۔ ان کی یہ فیکٹری ''ایمکو'' اس زمانے میں لاہور کے پاس تھی اور ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھی۔ سبط نے اس کے قیام میں بڑی محنت کی اور مزدوروں کے حقوق کے لیے اپنے اس دوست سے مسلسل دنگا فساد کرتے رہے۔ اس کے بعد کافی مدت تک انہوں نے فیروز سنز کے ساتھ کام کیا۔ یہ کام اگرچہ نسبتاً بہتر تھا مگر یہاں بھی وہ دوسروں کی مرضی کے تابع رہ کر کام کرنے کی وجہ سے خاصے پریشان رہے۔ پھر چند ماہ وہ ہمارے مشترکہ دوست نواب مظفر علی قزلباش کے بھتیجے اور ہونے والے داماد کے اتالیق رہے۔ یہ سب کام انہوں نے اپنی معاشی ضروریات کے لیے کیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے جہاں بھی اور جو کام بھی کیا اس میں بھرپور اور بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ہر کام محنت، نیک نیتی۔ اور دیانت داری سے کیا اور ہر جگہ سے خود ہی کام چھوڑ کر علیحدہ ہوئے۔ کہیں ان کا خیال تھا کہ وہ جتنا معاوضہ پا رہے ہیں، کام اس سے کم ہے۔ کہیں بور ہوکر تنگ آکر علیحدہ کرنے کا ہوئے۔ یہ سارے کام وہ اپنی حقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے نہیں بلکہ محض پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کرتے رہے مگر ذہنی طور پر پریشان رہے۔ اس پریشانی کا ذکر انہوں نے کبھی کسی دوست سے نہیں کیا۔ بظاہر خوش باش اور اپنے حال میں مست نظر آتے تھے لیکن آہستہ آہستہ لاہور میں جیسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ ان پر معاشی مشکلات کا بوجھ اتنا بڑھا دیا گیا کہ بالآخر انہیں کراچی جانا پڑا۔

کراچی میں ان کے ابتدائی دو تین برس ایسٹرن فیڈرل کمپنی کے محکمہ تعلقات کے سربراہ کی حیثیت سے، اس شعبے کو فعال اور موثر بنانے میں گزرے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہاں بھی انہوں نے متعدد کارنامے سرانجام دیے۔ تعلقات عامہ کے کام کو ایک نئی جہت عطا کی اور نئے نئے اور موثر سلوگن ایجاد کیے۔ جب یہ کام سیٹ ہوگیا تو تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی اور زندگی کے آخری دس بارہ برس میں متعدد معرکتہ الآرا تصانیف مکمل کیں۔

سبط حسن کے کراچی چلے جانے کے بعد ہمارا ان کا دوستانہ رابطہ ویسا نہ رہا جیسا کہ برسوں سے چلا آرہا تھا۔ کبھی وہ اپنے کام سے لاہور آتے تو ان کی آمد ہوا کے تازہ اور ٹھنڈے جھونکے کی مانند محسوس ہوتی۔ دوست احباب جمع ہوتے، محفلیں جمتیں اور سبط حسن ہمیشہ اس شہر کو چھوڑنے پر افسردہ ہوجاتے۔ ان کا کہنا تھا وہ لاہور آنے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں اور یہاں آنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس زمانے میں، میں بھی کئی بار کراچی گیا اور جب تک وہ سوسائٹی میں رہائش پذیر رہے، ہمیشہ انہی کے ہاں ٹھہرا۔ اتفاق سے ساٹھ کے عشرے میں فیض صاحب بھی کراچی ہی میں تھے چنانچہ ہم سب لوگ سرشام جمع ہوجاتے۔ مرحوم زیڈ اے بخاری، مرحوم مجید ملک اور بہت سے دوسرے احباب ان محفلوں میں علم و آگہی کے موتی بکھیرتے، شعر و نغمہ کی گفتگو ہوتی، ملکی حالات پر تبصرہ ہوتا اور سب سے زیادہ ذکر لاہور اور یہاں کے دوستوں کا رہتا۔

آخری پانچ برس کے دوران جب سبط حسن گلشن اقبال

میں اپنے مکان میں منتقل ہوگئے، ان کے ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملا اس لیے کہ یہ گھر شہر سے کافی دور تھا۔ مگر اس زمانے میں بھی کراچی پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ان کے دفتر قمر ہاؤس جانا ہوتا۔ ہم نے کراچی جانے کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا وہاں ابن انشاء اور سبط حسن سے ملیں گے۔ انشاجی بہت پہلے سدھار گئے۔ اب سبط بھی گئے۔ میرے لیے کراچی اب ویران شہر ہے۔ وہاں جاکر پرانی یادیں ستاتی ہیں اور زخم تازہ ہوجاتے ہیں۔ اتنے ساتھی، دوست، رفیق اور ہمدم چلے گئے ہیں کہ یہ دنیا اب سونی سونی نظر آتی ہے۔

1985ء میں سبط سے ملاقات کے نسبتاً زیادہ مواقع ملے۔ وہ لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہونے والی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں بہت سرگرم رہے۔ اس میں شرکت کے لیے لندن گئے اور کراچی اور لندن میں ان سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں... پھر وہ کراچی کانفرنس کی تقریبات کے سلسلے میں دوبارہ لاہور آئے، دوستوں کو جمع کیا اور نوجوانوں کو خاص طور سے آگے بڑھنے اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کی طرف متوجہ کیا۔ کراچی کانفرنس کے دوران کچھ نوجوان خاص طور سے سندھ اور بلوچستان سے آنے والے مندوبین نے جب اپنی تقریروں میں ہم سب پرانے لوگوں بالخصوص سبط حسن کو میانہ روی اور مصلحت کیشی کے طعنے دیئے اور میں نے ان کا جواب دینے کا ارادہ کیا تو سبط نے مجھے منع کیا۔ اور کہا کہ بھائی ان لوگوں کو دل کا غبار نکال لینے دو، انہوں نے اس زمانے میں بہت اذیتیں برداشت کی ہیں۔ بہت مار کھائی ہے اس لیے وہ جو کہتے ہیں کہنے دو۔

کراچی کانفرنس میں بعض نوجوانوں نے سبط کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی لیکن گزشتہ تین برس سے وہ ایک ہی بات کہتے تھے۔ ''ہم سب کا کام سائنسی فکر اور ترقی پسندانہ خیالات کو فروغ دینا ہے۔ کیونکہ رجعت پسندوں اور بنیاد پرستوں کی کوشش اس ملک کو دو چار سو سال پیچھے لے جانے کی ہے۔ یہ لوگوں کو روٹی روزگار کے مسائل سے الگ کر کے خیالی جنتوں کے تصور سے بہلا رہے ہیں۔ یہ موجودہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں ہیں اور اس استحصالی نظام کے پشتی بان ہیں۔ ہر محب وطن روشن خیال شخص کا فرض ہے کہ ان کا مقابلہ کرے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کو فکری اور ذہنی انقلاب کے لیے تیار کیا جائے۔'' خود انہوں نے زندگی کے آخری چند برسوں میں یہی کام کیا۔ وہ نہ کسی تحریک کے سربراہ تھے اور نہ نام نمود کی خواہش رکھتے تھے۔ البتہ اس مشن کی تکمیل کے لیے جو انہوں نے اوائل عمر میں اپنایا تھا، زندگی کی آخری سانس تک کام کرتے رہے۔

کراچی میں انہوں نے احباب کا ایک بہت وسیع حلقہ پیدا کرلیا تھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا اس لیے کہ ان سے ملنے والے ان کی سحر انگیز شخصیت کے گرویدہ ہوجاتے۔ وہ ذہنی اور جسمانی ہر لحاظ سے سرتاپا جمال ہی جمال تھے۔ ان کی خوبصورت سوچ اور دلآویز شخصیت کا طلسم ایسا نہ تھا کہ ملنے والوں کو متاثر نہ کرتا۔ وہ انتہائی اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اردو فارسی کے کلاسیکل ادب پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ وہ چاہتے تو دنیاوی مال و دولت کے ڈھیر لگا لیتے لیکن ان کی زندگی درویشانہ تھی کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا کبھی اپنی افتادِ طبع کے خلاف کوئی کام نہیں کیا اور مصلحت کیشی اور مفاد پرستی کو پاس نہیں بھٹکنے دیا۔ ان کے چاہنے والوں اور نیاز مندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آخر دو تین برس میں، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ تنہائی اور گوشہ نشینی ترک کررہے ہیں۔ جو نوجوان ان سے کچھ پوچھنے اور سمجھنے کے لیے آتے تھے ان سے وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ بہت مہذب، خلیق، نازک مزاج، نفاست پسند اور انتہائی خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔

اگر دیکھا جائے تو ان کی پوری زندگی کمزور طبقے کی حمایت میں قید و بند جھیلتے گزری۔ وقت آخر بھی وہ دہلی میں منعقد ایک کانفرنس جو انہی خطوط پر منعقد کی گئی تھی وہ شرکت کرنے گئے تھے کہ قضا نے واپسی کی مہلت نہ دی اور 20 اپریل 1986ء کو وہ راہی ملک عدم ہوگئے۔

ان کی رحلت نے ہم سے ہمارا بہت بڑا سرمایہ چھین لیا ہے۔ مگر اپنی تحریروں کی شکل میں جو سرمایہ وہ چھوڑ گئے ہیں وہ برسوں تک آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ وہ شخص جو زندگی بھر غریبوں کی خاطر، نظام کو بدلنے کی خاطر لڑتا رہا اسے اس کا صحیح مقام نہیں ملا۔ اگر وہ چاہتے تو انہیں بہت کچھ مل جاتا لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہ کیا جس کی پاداش میں وہ انعام و اکرام کے حقدار ٹھہرائے جاتے۔

(اس تحریر کی تیاری میں حمید اختر کی تصنیف آشنائیاں کیا کیا اور دیگر اخبار و رسائل کی مدد لی گئی ہے)

++

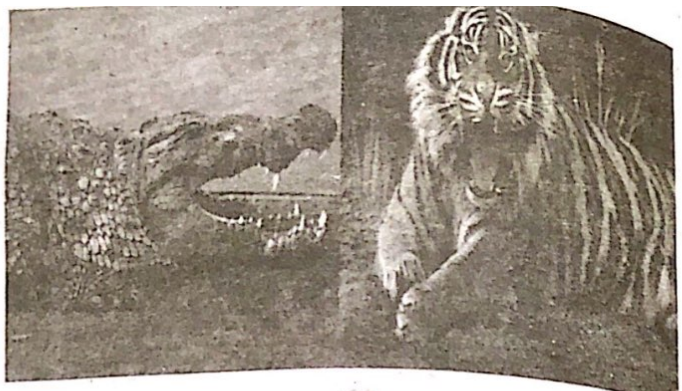

خونی مگرمچھ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

شیر اگر خشکی کا خطرناک درندہ ہے تو مگرمچھ آبی گزرگاہ کا خطرناک ترین درندہ کہلاتا ہے۔ بلکہ شیر کی پکڑ سے کئی گنا سخت پکڑ مگرمچھ کی ہوتی ہے۔ اس کے جبڑے میں پھنسنے کے بعد موٹی سے موٹی ہڈیاں تک چرچرا جاتی ہیں۔ ایسے خطرناک مگرمچھ کا شکار جو آدم خور بن گیا ہو، آسان نہیں ہے۔ اسی مگرمچھ کے ساتھ چیتے کے شکار کی داستان بھی ملاحظہ کریں۔

چیتے اور مگرمچھ کا شکار جسم میں سنسنی پیدا کرنے کا موجب ہے۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ خوف اکثر میرا ساتھی رہا ہے لیکن اصل بات خوف نہیں بلکہ اس نااہلیت کی ہوتی ہے جو خوف کا مقابلہ کرنے میں حائل ہو۔

یہی وہ چیز ہے جو زندگی کے بعض صبر آزما لمحات میں انسان کے لیے تباہ کن بن جاتی ہے۔ جنگِ عظیم کے دنوں میں، میں ایک گیم وارڈن کی حیثیت سے تعینات تھا اور اپنی مستقل مزاجی اور مسلسل مشق کی وجہ سے بہت اچھا نشانہ باز بن کر اپنے ایک بازو کا ازالہ کرچکا تھا۔

جی ہاں! اسی شوق میں میرا ایک بازو ضائع ہوا تھا، تاہم بہت اچھی نشانہ بازی سے اس کمی کی تلافی ہوچکی تھی

لیکن اس کا کیا علاج کہ اگر کسی کے ہزار بازو بھی ہوں تو بھی وہ اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا اور جب کچھ نظر ہی نہ آئے تو گولی چلانا بے کار ہوتا ہے۔

مشرقی یوگنڈا میں، کراموجہ کے قریب میں نے دریائے کپیٹا کے کنارے واقع ایک پہاڑی پر اپنے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت سے دو کیمن گاہیں بنائی تھیں۔

یہی بات تھی کہ خیموں کی نسبت مٹی گارے اور گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں زیادہ راحت اور آسائش ہوتی ہے۔ ویسے بھی اس علاقے کا موسم ایسا ہے جس میں خیمے، انسان کی قطعی ناکام ایجاد محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی چیز ہر لحظہ غائب ہوتی رہتی ہے۔ سفید چیونٹیاں خیموں کو مسلسل کھاتی رہتی ہیں اور بالآخر خیمہ ہی غائب ہو جاتا ہے۔

خیمہ ان چیونٹیوں کے لیے بہترین مسکن ہوتا ہے۔ بچھو بھی عموماً خیموں میں آرام کرنے چلے آتے ہیں۔ مکڑیوں کی فوج تو اکثر بارش کی طرح نازل ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ بہت سے حشرات الارض ان خیموں پر بلا بولتے رہتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مضبوطی سے بنی ہوئی جھونپڑیاں کہیں زیادہ آرام دہ ہوتی ہیں۔

جنگل میں اکٹھی دو جھونپڑیاں اچھے خاصے مکان کا کام دیتی ہیں اور اگر برآمدہ کے ذریعے ان دونوں کو ملا دیا جائے تو بلاشبہ بنگلے کا لطف آجاتا ہے، جو جھاڑیوں اور پودوں کے درمیان بڑا دل فریب منظر پیش کرتا ہے۔

یہی میں نے کیا تھا۔ دو جھونپڑیوں کی کیمن گاہوں کو ایک بنگلے کی شکل دے دی تھی۔ پہاڑی پر واقع ہونے کے باعث یہاں ہوا کے خوش گوار جھونکے رات کی حدت کو بڑی حد تک زائل کر دیتے تھے مگر بنگلا میں جو میرے لیے کسی محل سے کم نہ تھا عام قسم کے دروازے نہیں تھے۔ یہاں ایسے درخت ہی نہیں جن کے تختوں سے دروازے بنائے جاسکتے۔

کئی درختوں کے تنوں کو جوڑ کر ایک بھاری بھرکم سا دروازہ آمد و رفت کے لیے بنایا جاتا ہے۔ مجھے بھی یہی کرنا پڑا تھا۔ بعد ازاں کثرت استعمال سے یہ دروازہ بھی زمین بوس ہو گیا تھا۔ دوبارہ اسے تعمیر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب یہ ''محل'' بغیر دروازوں کے اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کر رہا تھا اسی لیے جھاڑیوں میں رہنے والے جانور اکثر میرے بنگلے میں داخل ہو کر میری آزادی میں مخل ہوتے اور خاصہ پریشان کرتے تھے۔

سب سے زیادہ خطرہ اس چیتے سے تھا جس کے تباہ کن حملوں کی داستانوں نے گرد و نواح میں خوف و ہراس پیدا کر رکھا تھا اور ان حالات میں جب کہ میری منگیتر ہلڈا میری اس پہاڑی رہائش گاہ کا جائزہ لینے اور کچھ عرصہ جنگلی فضاؤں سے لطف اندوز ہونے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ میرے لیے معاملات اور زیادہ تشویش ناک ہو گئے تھے۔

اس رات سخت ہواؤں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا ایک ایسے لیمپ کی روشنی میں مطالعہ سے لطف اندوز ہو رہا تھا جو اپنی ساخت کے لحاظ سے طوفانی ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ہلڈا نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ باہر مکمل تاریکی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں بہت اسرار بھری لگ رہی تھی۔ تیز جھونکوں سے تنگ آکر میں نے لیمپ بجھا دیا اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔

میرا خیال ہے کہ میں ایک گھنٹا سویا ہوں گا کہ اچانک میرے تیز حواس نے کسی خطرے کی بو سونگھ کر مجھے جگا دیا۔ کمرے میں سناٹا تھا۔ میں بے حس و حرکت بستر پر لیٹا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں کسی شے کے وجود کو تلاش کر رہا تھا۔ کسی چیز کی موجودگی کا مجھے بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا، جس کا وجود آہستہ آہستہ ابھر کر سامنے آرہا تھا۔

چند لمحوں کے اندر میں اس وجود کو پہچاننے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی چیتا تھا جس کی غارت گری کے افسانے مشہور تھے۔ وہ بالکل خاموش کھڑا تھا۔ ہلڈا اسی طرح مطمئن سو رہی تھی اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ اگر وہ یہ منظر دیکھتی تو چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی۔ اس کی چیخ اس وحشی درندے کی رہنمائی کے لیے کافی ہوتی اور وہ ایک جست میں بستروں پر لیٹے ہوئے دو ہنستے بستے انسانوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔

یوں خوف و دہشت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ خود سے زیادہ مجھے ہلڈا کا خیال تھا جو بے چاری یہاں تفریح کرنے آئی تھی، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے نہیں۔

بہرکیف...... میں پوری طرح بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ ذرا سی حرکت بھی اس وحشی درندے کو متوجہ کر سکتی تھی۔ پسینے سے شرابور سانس کو بے آواز کیے لیٹنا خاصہ مشکل تھا۔ اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ چیتا اگر مجھ پر حملہ کرنا چاہے تو اس

کے راستے میں کیا رکاوٹ ہے؟

جواب فوراً ہی میرے ذہن رسا میں آگیا۔ مچھر دانی۔ درندہ یقیناً اس معمولی سی مچھر دانی سے خوف زدہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری طرح وہ بھی پریشان ہے۔ اس قسم کے حالات میں جو حریف بھی اپنے خوف پر قابو پالے وہ بازی جیت سکتا ہے۔

چنانچہ میں نے اپنے عقل و تجربے کو بروئے کار لاکر اپنی دہشت پر قابو پایا۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو مجھے یاد آیا کہ میرے پلنگ کے نیچے نیزہ موجود ہے۔ خوف کے باعث میں اس نیزہ کو بھول گیا تھا۔ اب میرے حوصلے بڑھ گئے تھے۔

یہ نیزہ ایک مقامی قبیلہ کے سردار نے مجھے تحفتاً دیا تھا۔ اس کا تیز دھار پھل ایک فٹ لمبا اور چھ انچ چوڑا تھا۔ اگلی سمت تیز نوک تھی۔ میں اس نیزہ کو اٹھانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا کام چپ چاپ اور غیر آواز پیدا کیے ہونا چاہیے۔ بہرحال اسے اٹھانے کے لیے مجھے اپنی تمام مہارت صرف کرنا پڑی۔

اپنے اکلوتے بازو کو آہستہ آہستہ مچھر دانی سے نکال کر میں نے ہلکی سی کروٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ نیزے کی طرف بڑھایا۔ نیزہ ہاتھ تو آگیا لیکن اب اس ہاتھ کو مچھر دانی میں اس طرح بے آواز واپس لانا تھا۔ ذرا سی بے پروائی مجھے میری عزیز از جان ہلڈا کو موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔

بہت چوکنا اور محتاط ہو کر میں حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسی دوران ایک بہت معمولی سی آواز سنائی دی۔ یہ ایک بہت آہستہ اور خاموش سی حرکت تھی اور اگر میں انتہائی چوکنا نہ ہوتا تو شاید اسے نہ سن پاتا۔ اس آواز سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ قوت سماعت پوری طرح بیدار تھی۔ چیتا آہستہ آہستہ مچھر دانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

خوف اور دہشت نے ایک بار پھر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے اسی عالم میں گزرے پھر مجھے خیال آیا کہ چیتا اگر کوئی حرکت کر رہا ہے تو وہ میری حرکات و سکنات سے اتنا باخبر نہیں ہو سکتا جتنا خاموشی سے جائزہ لینے پر ہو سکتا ہے۔ اس سے مجھے کچھ سکون و اطمینان ہوا کیونکہ میں دشمن کی حرکات سے باخبر تھا اور وہ میری حرکات سے بے خبر......

مجھے آج بھی اچھی طرح یقین ہے کہ میں نے اپنی حرکات سے کوئی بھی آہٹ نہیں ہونے دی تھی۔ نیزے پر اب میری گرفت مضبوط تھی اور میں اپنا ہاتھ مچھر دانی کے اندر لا چکا تھا چنانچہ میں چیتے پر ایک دم حملہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

اس خوف ناک رات کے ان لمحات کو یاد کر کے میں آج بھی اکثر حیران ہوتا ہوں کہ مجھے کیسے چیتے کی حرکات کا علم ہو رہا تھا۔ شاید یہ میری چھٹی حس تھی جو مجھے باخبر رکھ رہی تھی یا پھر ہلڈا کی محبت، جس کے لیے میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار تھا۔

چیتا اب میری چارپائی کے پاؤں کی سمت آگیا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں ایک بھاری بھرکم درندے کی مدھم غراہٹ بڑی خوف ناک تھی۔ اسی دوران غسل خانہ میں کوئی بھاری چیز زوردار آواز کے ساتھ گری۔ ساتھ ہی واش بیسن کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

اس ہنگامہ ناگاہ، نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔ میں نے پاگلوں کی طرح مچھر دانی کو اپنے اوپر سے ہٹایا اور نیزہ تان کر حملے کے لیے تیار ہو گیا لیکن معلوم ہوا کہ چیتا کمرے سے باہر جا چکا ہے۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے میں نے لیمپ روشن کیا۔ کمرے میں اجالا پھیلا تو میں نے دیکھا کہ ہلڈا ابھی جاگ پڑی تھی۔ اس کی سہمی سہمی آنکھوں میں استفسار تھا کہ بات کیا ہے؟ اس نے مجھے دیکھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

اس بن بلائے اور ناپسندیدہ مہمان کے قدموں کے نشان زمین پر بہت واضح تھے۔ چاروں پنجوں کے نشان میری چارپائی کے عین ساتھ تھے، گویا میری حرکات کا اسے ذرا بھی علم ہو جاتا تو موت یقینی تھی۔

لیمپ کو دروازے میں رکھ کر میں نے اپنی رائفل بھری۔ ہلڈا کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی، کیونکہ وہ دوبارہ نیند کے مزے لے رہی تھی۔ چیتے کی دوبارہ آمد کا کوئی امکان نہ تھا۔

ایک تو یہ بات درندے کی فطرت کے خلاف ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود بھی بری طرح دہشت زدہ ہو کر بھاگا تھا، کم سے کم اس رات اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔

☆☆☆

صبح میں نے دو نوکروں اور دو ایسے کھوجیوں کو ساتھ لیا جنہیں چیتے کے شکار سے گہری دلچسپی تھی۔ یہ خانہ بدوش کھوجی اچھے شکاری بھی تھے۔ چیتے کے پنجوں کے نشانوں سے سراغ آسانی سے مل سکتا تھا۔

رات کے طوفان کے بعد جو بارش ہوئی تھی اس سے پیداشدہ کیچڑ میں چیتے کے پنجے آسانی سے نظر آرہے تھے اور ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ چیتا بھاری بھرکم ہے گویا دشمن طاقت ور تھا۔ میرے نوکر اور کھوجی مجھ سے مذاق کرتے رہے کہ میں دشمن کے علاقہ میں داخل ہو کر اس کی سلطنت میں مداخلت کر رہا ہوں۔

لگتا یہ تھا کہ وہ سالہا سال سے اس جنگل میں رہتا ہے۔ جس پہاڑی پر میرا بنگلا واقع تھا وہ ایک چھوٹے سے راستہ کے ذریعے ایک دوسری پہاڑی سے منسلک تھی اور اس دوسری پہاڑی میں کئی غار ایسے تھے جو چیتے کے لیے اچھی پناہ گاہیں ثابت ہو سکتے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد پنجوں کے نشانات ڈھلوان میں اتر کر دریا کی سمت چلے گئے تھے پھر دریا کے کنارے ایک چکر بناتے ہوئے یہ نشان چٹانوں میں غائب ہو گئے تھے۔

یہ چٹانیں خاصے بڑے علاقہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چیتے کو ان چٹانوں سے نکالنے کے لیے میں اپنے اسٹاف کے درجنوں نیزہ بازوں کو بلا سکتا تھا لیکن ڈر یہ تھا کہ ان کے جمع ہونے تک چیتا اس علاقہ سے فرار ہو سکتا ہے۔

ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ دن کے وقت چیتے کو شاذ و نادر ہی شکار کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال، اپنے ساتھیوں کے مشورہ پر میں قبائلی طرز کا ایک پھندا لگانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ مخصوص قسم کا پھندا اس علاقہ میں چیتے کے شکار کے لیے ایک کامیاب حربہ ہے۔ بستی سے کچھ لوگوں کو بلا کر پھندا لگانے کا کام انہیں سونپا گیا اور میں خود گھر واپس آ گیا۔ یہاں میں نے ہانڈا کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رات ہم کتنے بڑے خطرہ سے دوچار ہوئے تھے۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ میں معمول کے مطابق اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوں۔ شام تک پھندا تیار ہو گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا عجیب سا پھندا ہوتا ہے جس میں پھنس کر درندہ گڑھے میں گر جاتا ہے۔ اس گڑھے میں قید ہو کر وہ ہلنے جلنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس طرح بچ نکلنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔

ہمارا واسطہ چونکہ کسی عام چیتے سے نہیں تھا اسی لیے میں اس پھندے سے مطمئن نہیں تھا۔ میرے خیال میں اس بھاری بھرکم چیتے کے لیے اس پھندے کو توڑ کر نکل جانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ بہر کیف، اپنی جگہ یہ ایک آزمائش ضرور تھی اور دیکھنا یہ تھا کہ کیا چیتا اس پھندے کے قریب میں آتا ہے کہ نہیں؟

اس رات میں نے اپنی رائفل بھر کر اپنے بستر کے ساتھ رکھی اور دراز ہو گیا۔ صبح کے آخری پہر برتنوں کی کھنکھناہٹ نے مجھے نیند سے بیدار کر دیا۔ میں نے فوراً رائفل تھامی اور بستر سے کود پڑا۔ دروازہ کے قریب لیمپ جل رہا تھا اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔ بستر کے ساتھ رائفل کو سیدھا کیے میں برآمدے میں مبہم سے سائے کو دیکھ رہا تھا۔ برآمدہ کے دوسری سمت کمرے کو میرا ڈرائنگ روم کہہ لیجیے۔

وہاں مکمل طور پر اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ برآمدے کا راستہ تاریک تھا اور میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ چیتا میرے ڈرائنگ روم میں پہنچ چکا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان صرف برآمدہ حائل تھا۔ درندہ صرف دروازہ سے باہر نکل سکتا تھا اور کوئی راستہ نہیں تھا چنانچہ میں اپنے کمرے میں ٹھہر کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف چیتا شاید میری کسی بے خبری یا غلطی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھا۔

بہر کیف وقت کا گزرنا میرے حق میں اچھا تھا۔ جلد ہی پو پھٹنے والی تھی اور صبح کی روشنی میں اس کا بچ نکلنا محال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس طاقت ور دشمن نے پھندے کا رخ کرنے کی بجائے دوبارہ میرے بنگلے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے وہ پھر آن دھمکا تھا۔ میں پوری طرح مستعد ہو کر اس کی تاک میں رائفل سیدھی کیے بیٹھا تھا۔ تاہم یہ خیال بھی تھا کہ چیتا اگر جرأت کر کے ایک جست لگائے تو وہ برآمدہ کے پار جا سکتا ہے۔ چیتے کی تیز رفتاری ضرب المثال حیثیت رکھتی ہے پھر یہ کہ اس وقت تک جو اندھیرا تھا وہ بھی اس کا معاون ہوتا۔

آدھے گھنٹے آنکھیں پھاڑے انتظار کرنے کے باوجود چیتا باہر نہیں نکلا۔ شدید تناؤ کے باعث چند لمحوں کے لیے میری چوکس نظروں میں غنودگی سی نمودار ہوئی اور یہی وہ لمحات تھے جب چیتے کو فرار کا موقع مل گیا، کیونکہ جیسے ہی میں نے سر جھٹک کر آنکھیں کھولیں چیتا باہر جا رہا تھا۔ میں نے فائر کر دیا لیکن نشانہ خطا گیا۔ ایک لمحہ کی تاخیر اس کی زندگی کا باعث بن گئی۔

میں اگر کمرے کی بجائے برآمدے میں دروازہ کے پاس بیٹھتا تو شاید یہ صورت نہ ہوتی مگر اس صورت میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ چیتا مجھ ہی پر حملہ کر دیتا۔ میں اپنے اکلوتے

ہاتھ کے باعث زیادہ مزاحمت نہ کر پاتا اور وہ میری تکابوٹی کر دیتا۔ اس کے بعد ہانڈا کا یہی حشر ہوتا۔ اف، میں اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لیتا اور میری اس احتیاط کے سبب وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میرے ناکام فائر کی آواز سے نوکر اور قبائلی میری مدد کے لیے آ گئے۔ ہم اکٹھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، وہاں چینی اور شیشے کے برتن ٹوٹے پڑے تھے، چیتا جانے ان میں کیا تلاش کرتا رہا تھا۔ اس وقت چار بجے تھے۔ پچھلی دو راتوں سے مسلسل بیداری نے مجھے تھکا کر چور کر دیا تھا، چنانچہ کپڑے بدلے بغیر میں بستر پر ڈھیر ہو گیا اور پھر اس وقت جاگا جب سورج کی تمازت نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

ہانڈا چائے بنا کر میرے سرہانے رکھ چکی تھی مگر وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ہانڈا کو آواز دی اس کے ساتھ ہی مجھے باہر لوگوں کا اچھا خاصہ شور سنائی دیا۔ میں کود کر بستر سے نکلا۔

"صاحب! صاحب!" جوبانہ چیختا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "چیتا پھندے میں پھنس گیا ہے۔"

میں نے رائفل اٹھائی اور بھاگتا ہوا لوگوں کے ساتھ پھندے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہمارے وہاں تک پہنچنے تک اور بہت سے لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ وہ جوشیلے انداز میں اپنے نیزے ہلا رہے تھے۔ ان کے گھنگریالے بال سرخ پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے لیکن اس سے قبل کہ میں پھندے کے قریب پہنچ کر قیدی کا جائزہ لیتا لوگوں کے گروہ میں ایک دم کھلبلی سی مچی۔ خوف و دہشت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شور ایک دم بند ہو گیا جیسے کسی نے ریڈیو کا سوئچ ایک دم بند کر دیا ہو۔

چیتا پھندا توڑ کر لوگوں کے درمیان سے تیزی کے ساتھ نکل گیا۔ مجھے فائر کرنے کی بھی مہلت نہ ملی پھر یہ کہ کچھ قبائلی میرے اور چیتے کے درمیان آ گئے تھے اس لیے میں بھاگتے ہوئے بھی اس پر فائر نہ کر سکا تھا۔

قبائلی اپنے نیزے لہراتے ہوئے چیتے کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے لیکن وہ ان کی زد سے بہت دور نکل گیا تھا۔ میں نے واپس آ کر پھندے کا جائزہ لیا۔ دونوں کھوجی اپنے سر آہستہ آہستہ ہلا رہے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"چیتا بہت بڑا ہے اس میں شیطان کی طاقت موجود ہے۔"

تمام قبائلیوں نے کھوجیوں کے اس نظریے کی تائید کی۔ اب ان سب کی نظروں میں چیتے کی عظمت کا اعتراف موجود تھا۔ میں نے انہیں چیتے کا تعاقب کرنے کی دعوت دی تو تقریباً سبھی نے انکار کر دیا۔ صرف میرے دو نوکر اور ایک نوجوان نے رضامندی ظاہر کی۔

یہ نوجوان وہ تھا جس نے صرف ایک ماہ پہلے اکیلے ہی ایک شیر کا خاتمہ کیا تھا۔ مجھے قبائلیوں کے طرز عمل پر حیرت تھی لیکن اپنی جگہ شاید وہ بھی درست تھے کیونکہ چیتے کی بے پناہ طاقت اور اس کا بھاری بھرکم وجود سب کے سامنے آ چکا تھا اس لیے وہ خوف زدہ تھے۔ میں، نوجوان اور میرے دونوں نوکر تعاقب کی مہم پر نکلے۔

چٹانوں کی بھول بھلیوں میں اس خطرناک چیتے کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا، لیکن ہم نے اپنا کام جاری رکھا۔

دریا کے ساتھ واقع پہاڑیوں پر چاروں طرف خوب صورت جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ڈھلوان راستہ اوپر کی طرف جاتے ہوئے تین پہاڑی راستوں میں منقسم ہو جاتا تھا۔ پہلی پہاڑی کے قریب پہنچ کر ہم کچھ دیر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ میرے قبائلی نوکر اور نوجوان بری طرح تھک چکے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ پھندے کو توڑتے وقت چیتے کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی ہے۔" نوجوان قبائلی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "اب وہ ضرور کہیں آرام کرنے کے لیے بے قرار ہوگا۔ آثار بتا رہے ہیں کہ وہ ان پہاڑیوں میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔"

"تو پھر ہمارے لیے یہ سنہری موقع ہے کہ اسے آرام کا وقت نہ دیا جائے۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ یوں تھکے ماندے ہم پھر آگے چل پڑے۔ سورج اب پوری تب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس کی تیز شعاعیں خاصی تکلیف دہ تھیں۔ قسمت نے یاوری کی راستے کی گھنی جھاڑیوں میں ہمیں ایک ہرن خوف زدہ حالت میں بھاگتا ہوا ملا۔ وہ کبھی ایک طرف مڑتا اور کبھی دوسری طرف۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ چیتا کہیں قریب ہی موجود ہے، ورنہ ہرن یوں بدحواس ہو کر نہ بھاگتا۔ میرے ایک ملازم نے ایک درخت پر چڑھ کر جائزہ لیا اور پھر خوشی سے چلا کر کہا۔ "صاحب! وہ سامنے غار کے مقابل بیٹھا ہے۔"

ہم چاروں آگے بڑھے لیکن اس لمحے اس قبائلی

نوجوان نے مجھ سے کہا۔

میں نے حیرت سے اس قبائلی جوان کو دیکھا جو اپنی موت کو دعوت دے رہا تھا۔ اتنا بھاری بھرکم، طاقتور اور خطرناک چیتا اور اس کے مقابلہ میں صرف ایک نیزہ سے مسلح نوجوان۔

میں اس کی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کی اجازت کیسے دے دیتا لیکن اس نوجوان کے مسلسل اصرار نے مجھے مجبور کر دیا کہ آگے بڑھ کر حملہ کرنے دوں۔

چیتا ہمیں دیکھ چکا تھا۔ جوں ہی اس نے جست لگائی، نوجوان قبائلی نے اپنا نیزہ تاک کر پھینکا جو چیتے کے پیٹ میں اتر گیا۔ وہ دہاڑتا ہوا گرا اور تڑپنے لگا، اسی لمحے میرے فائر نے اس شیطان کا کام تمام کر دیا۔

میں دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بلما کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ چیتے کی کھال کا تحفہ پا کر خوشی سے پھولے نہیں سمائے گی۔

☆☆☆

اس بہادر قبائلی نوجوان کا نام موتانہ تھا۔ اس نے مجھ پر انکشاف کیا کہ چیتے کی مہم سے پہلے وہ دریائے کپلیا کے پار ایک ایسی ہی مہم پر روانہ ہونے والا تھا لیکن میری وجہ سے اس نے اپنی اس مہم کو موخر کر دیا تھا۔

وہاں کیا تھا؟ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس طرف ایک مکانہ نام کی بستی ہے، جہاں کچھ عرصے سے ایک خونی مگرمچھ نے دہشت مچا رکھی ہے۔ بستی کی عورتوں کا وہاں کپڑے دھونا اس موذی نے محال کر رکھا ہے اور اب اس کی بدمعاشی اس حد تک اتر آئی ہے کہ وہ دریا سے نکل کر خشکی پر بھی حملہ آور ہونے لگا ہے، ایک بچے اور ایک عورت کو وہ اپنا شکار بنا چکا ہے۔ نیز اطراف میں پھیلی ہوئی مچھیروں کی جھونپڑیوں میں بھی گھس جاتا ہے۔

میں نے اس کے ساتھ اگلے ہی دن جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

صبح تڑکے میں اور موتانہ ...... دریائے کپلیا کے دوسرے پار مکانہ بستی پہنچے۔ اپنے دونوں قبائلی نوکروں کو میں بلما کا خیال رکھنے کے لیے بنگلے میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ یعنی وہ اس مہم میں میرے ساتھ نہیں تھے۔ یہاں میرا پہلی بار آنا ہوا تھا۔ بلاشبہ یہ علاقہ بھی قدرت کی صناعی کا ایک شاہکار تھا۔ ایک طرف گھنے درختوں سے چھپی پہاڑیاں تھیں، دوسری جانب ڈھلوانوں پر چائے کے باغات، تیسری جانب گھنا جنگل، اس سے آگے دلدل، جس میں سے دھوپ پڑنے پر زرد رنگ کی بھاپ سی اڑتی دکھائی دیتی۔ اس سے ملی ہوئی کالامری نامی ندی تھی جس کے متعلق موتانہ نے مجھے بتایا تھا کہ یہیں وہ آدم خور جانے کہاں سے یہاں آ گیا تھا اور اب بستی کے لوگوں کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔

کالامری ندی آگے جا کر پہاڑی سرنگ میں سے گزرتی تھی اور تقریباً بیس میل دور جا کر گھنے جنگلوں کے عقب میں ایک دریائے کپلیا سے مل جاتی تھی۔

بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ مگرمچھ دریا سے یہاں آ گیا ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ بستی کے لوگوں میں سے کسی نے اس مگرمچھ کو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تھا ہی اتنا پھرتیلا اور چالاک۔

سب سے پہلے ایک چرواہے نے اپنے بچھڑے کو، جو پانی پینے ندی تک چلا گیا تھا، پانی میں غائب ہوتے دیکھا تھا لیکن قریب جا کر دیکھنے پر اسے پانی کی سطح پر بہتا ہوا کچھ خون اور بلبلے نظر آئے تھے اور بس۔

وہ چرواہا چائے کے باغات کے ڈھلوانوں سے پرے بستی میں رہتا تھا اور مدتوں سے اپنے جانوروں کو اس ندی پر پانی پلا رہا تھا مگر اس قسم کا واقعہ اس سے پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ اس نے بستی میں جا کر شور مچا دیا۔ لوگ ڈنڈے، کلہاڑیاں اور بلم لے کر آ گئے اور ندی کے کنارے کنارے بہت دور تک گئے مگر انہیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

پھر بستی کا ایک بچہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ غریب بچہ اپنی بیمار ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا باپ تین سال پہلے ندی کے اس طرف کی دلدل میں پھنس کر مر گیا تھا۔ بچہ مچھلیاں پکڑتا اور اس کی ماں انہیں نمک لگا کر ایک ڈور میں پرو کر جھونپڑی کے باہر گڑے ہوئے بانسوں سے لٹکا دیتی۔ دھوپ میں مچھلیاں سوکھ جاتیں تو وہ انہیں آئندہ کے لیے محفوظ کر لیتی تھی۔

ایک روز بچہ ندی پر مچھلیاں پکڑنے گیا تو پلٹ کر نہ آیا۔ اسے دور دور تک ڈھونڈا گیا مگر وہ نہ ملا۔ اس کی ماں اسے اب تک یاد کر کے روتی ہے۔

بستی کے پرانے لوگوں کا خیال تھا کہ گھنے جنگلوں کے پیچھے بہنے والے دریا سے، جہاں بہت سے خوف ناک مگرمچھ پائے جاتے ہیں، کوئی مگرمچھ ادھر آ گیا ہے اور یہ سب اسی کی حرکت ہے۔ ہمیں یہ معلومات بستی کے لوگوں نے دی تھی۔

بستی والوں نے ہماری رہائش کے لیے گھاس پھونس سے بنی ہوئی ایک بڑی سی جھونپڑی تیار کر رکھی تھی۔ ساری جھونپڑیاں ایک کھلی اور ہموار جگہ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ ان کے اردگرد اونچے اونچے درخت تھے۔ یہاں کے لوگ یا تو چائے کے باغات میں کام کرتے یا پھر مویشی پالتے تھے۔

دوپہر تک سستانے کے بعد ہم چاروں نے ندی پر جانے کا پروگرام بنایا۔ یوں ہم چاروں کچھ مقامی لوگوں کے ساتھ اس طرف چل پڑے، جہاں اس علاقے کی مشہور ندی کالامری ہے۔

جنگل سے نکلتے ہی ندی کا صاف ستھرا کنارہ نظر آتا تھا اور اگر کنارے کے ساتھ ساتھ سیدھے جنوبی سمت جاتے تو غلیظ دلدل تھی، یہاں ہر طرف ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جیسی گندھک کی ہوتی ہے۔ اس دلدل میں سے اکثر بڑے بڑے بلبلے اٹھتے نظر آتے تھے۔ ندی کا پانی بھی گدلا تھا اور اس میں جابجا جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

بستی والوں سے معلوم ہوا کہ پینے کا پانی وہ لوگ کنوئیں سے حاصل کرتے ہیں مگر مویشی ندی ہی کا پانی پیتے ہیں۔ ندی پر پیش آنے والے حادثات کے بعد وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے پھر بھی اکثر ان کے مویشی پانی پینے اس طرف آ جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ اتنے بہت سے جانوروں کو روزانہ کنوئیں سے پانی نکال کر پلانا ممکن نہ تھا۔

ہم لوگ کنارے کنارے چلتے ہوئے بہت دور تک گئے مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ دلدل کے قریب اچھی طرح گھوم پھر کر ہم لوگ واپس چلے آئے اور بستی کے لوگوں کے ساتھ مل کر شکار کا پروگرام طے کرنے لگے۔ ہمارا بھی خیال یہی تھا کہ کوئی مگرمچھ بڑے دریا سے یہاں آ گیا ہے مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ بچے کو ہڑپ کر جانے کے بعد وہ آدم خور ہو چکا تھا اور اس سے انسانی زندگیوں کو خطرہ تھا۔

بالآخر طے یہ ہوا کہ مختلف اوقات میں ندی پر جا کر مگرمچھ کو دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ تاہم ہم نے اب بستی والوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی تنہا ندی پر نہ جائے اور مویشیوں کو پانی پلانے والے چرواہے بھی بلم وغیرہ اپنے پاس ضرور رکھیں۔

کھانے اور پھر چائے سے فارغ ہو کر سہ پہر کو ایک بار پھر ندی کا چکر لگایا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، وہاں کسی طرح بھی مگرمچھ کی موجودگی ثابت نہیں ہوئی تھی۔

ٹاکوما برج جب بنا تو۔ اس پل کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ یہ پل کم از کم سو سال تو کھنچ ہی جائے گا لیکن اس پل کو بنانے میں اس کی ڈیزائننگ کی غلطی نے سارا کام خراب کر دیا۔

صرف دو سال کے بعد وہ پل بیٹھ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ تیز ہوا کی وجہ سے پل اس انجام کو پہنچا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت ہوا کی رفتار صرف چالیس میل فی گھنٹا تھی۔

مرسلہ: احمد خان، ہنگو

1981 میں کنساس سٹی کے حیات ریجنسی ہوٹل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس ہوٹل کی تعمیر 1979 میں مکمل ہوئی تھی۔

یہ ہوٹل اپنی بناوٹ، ڈیزائننگ اور پلاننگ کے لحاظ سے لاجواب تھا۔ بہت خوبصورت عمارت تھی اس کی لیکن اس کی ڈیزائننگ میں غلطی رہ گئی۔ اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ اگر کبھی مقررہ تعداد سے زیادہ لوگ آ گئے تو کیا ہوگا۔

اس وقت ہوٹل میں رقص کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ یہ مقابلہ ایک ہال میں ہو رہا تھا جس کے چاروں طرف بالکونیاں بنی ہوئی تھیں۔ سیکڑوں لوگ ان بالکونیوں سے اس مقابلے کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک بالکونیاں دھڑا دھڑ گرنے لگیں اور ایک کہرام مچ گیا۔

درجنوں افراد ہلاک ہو گئے تھے۔

مرسلہ: نصرت پروین، لاہور

9۔ لاس ویگاس کے ہوٹل میں ایک ایسا عجب حادثہ ہوا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ حادثہ ایک زبردست تکنیکی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔

ہوٹل کے پول سائڈ کو سولر سسٹم یعنی شمسی توانائی سے روشن رکھنے اور پانی کو گرم رکھنے کے لیے بڑے بڑے اس قسم کے شیشے لگائے گئے تھے جو شمسی توانائی کے حصول کے لیے لگائے جاتے ہیں۔

یہ بہت تاریخی موقع تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پول سائڈ پر بہت سے افراد موجود تھے۔ اوپر لگے ہوئے شیشوں کے پردوں کو آہستہ آہستہ ایک طرف ہٹایا گیا اور اس کے ساتھ ہی سورج کی کرنیں براہ راست کچھ اس انداز سے نیچے تک آئیں کہ ان کی حدت میں پچاس گنا اضافہ ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی شعاعوں نے وہاں موجود لوگوں کے بالوں اور کپڑوں میں آگ لگا دی۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی اور لوگوں نے تالاب میں کود کود کر جانیں بچائیں۔

مرسلہ: نثار بھٹو، لاڑکانہ

پہلے ہمارا خیال تھا کہ ممکن ہے مگرمچھ اس علاقے سے کہیں اور نکل گیا ہو مگر اس خیال کی بنیاد پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

قبائلی نوجوان موتانہ کا خیال تھا کہ رات کو ندی کے آس پاس گشت کیا جائے۔ شاید وہ خشکی پر وقت گزارنے رات کی تاریکی میں نکلتا ہو چنانچہ رات کا انتظار شروع ہوا۔

مٹی کے تیل کی لالٹینیں تیار کی گئیں۔ میرے پاس ایک طاقت ور ٹارچ تھی۔ یہ محکمے کی طرف سے مجھے ملی تھی۔ بستی کے چار لوگ جو ہمارے ساتھ تھے، انہوں نے خود کو بڑے بڑے خنجروں اور بلموں سے مسلح کیا اور تیز خوشبودار چائے کے دور چلائے گئے۔

گھنے جنگلوں اور پہاڑیوں کے باعث سورج جلد ہی غروب ہوجاتا تھا۔ پرندے اونچے اونچے درختوں پر واپس آچکے تھے اور اب گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔

کبھی کبھی کسی پرندے کے پھڑپھڑانے کی آواز یا کسی جانور کی چیخ اس سناٹے کو وقتی طور پر توڑتی اور ڈوب جاتی۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے کہ لیکن لگتا تھا جیسے آدھی رات بیت چلی ہو۔

پھر ہم سب تیار ہوکر نکل کھڑے ہوئے۔ میرے پاس تو رائفل تھی، جبکہ موتانہ کے پاس اپنا پسندیدہ نیزہ، باقی لوگ لالٹینیں اور خنجر وغیرہ تھامے ہوئے چلنے لگے۔

ندی قریب آگئی۔ اس وقت ندی کی طرف جاتی ان پگڈنڈیوں پر چلنا آسان نہیں تھا۔ گھنی جھاڑیوں میں ہم نے سرخ رنگ کے ایک خوب صورت سانپ کو کنڈلی مارے بیٹھا دیکھا جو ہمارے قریب آنے پر اسی جھاڑی میں غائب ہوگیا۔

ندی کے کنارے پہنچ کر جونہی ٹارچ اور لالٹینوں کی روشنیاں پڑیں، ایک تیز سی سرسراہٹ ابھری اور کوئی وزنی چیز جیسے ندی میں چھپاک کی آواز پیدا کر کے اتر گئی۔ سبھی اس طرف متوجہ ہوگئے۔ پانی کی سطح پر بلبلے اور پھر لہروں کے پھیلتے ہوئے دائرے نظر آتے رہے۔

جس جانب سے آواز ابھری تھی وہاں جاکر دیکھا گیا تو گیلی زمین پر کچھ نشانات نظر آئے۔ میں نے سب لوگوں کے چہروں پر خوشی کے آثار دیکھے گویا مگرمچھ کا سراغ مل گیا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹا ہم سب وہاں رہے۔ ٹارچ اور لالٹینوں کی روشنیوں کے دائرے، ندی کی سطح پر ادھر سے ادھر پڑتے رہے لیکن مگرمچھ کا پتا نہ چلا۔ تھک ہار کر ہم سب لوگ واپس آگئے۔

اب مگرمچھ کا شکار کرنے کے لیے کسی اچھی منصوبہ بندی کی ضرورت تھی جس کے بارے میں سب نے فیصلہ کیا کہ کل صبح کی ملاقات میں اس معاملے پر غور کیا جائے گا۔

رات کے کھانے میں مقامی لوگوں کی پکائی ہوئی مچھلیاں تھیں۔ مختلف اقسام اور مختلف ذائقوں کی، سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور باتوں میں مصروف ہوگئے۔

اگلی صبح مختلف تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بارش کا خطرہ شدید تھا۔ ناشتے کے دوران ہی طے پا گیا کہ ایک بکری کا بچہ ندی کے کنارے درخت سے باندھ دیا جائے اور مگرمچھ کے باہر نکلنے، بکری کے بچے پر حملہ آور ہونے کا انتظار کیا جائے۔

جب تک ہم وہاں پہنچے بکری کا بچہ باندھا جاچکا تھا۔ گویا طریقہ کار یہاں بھی شیر کے شکار جیسا ہی تھا۔ اردگرد کے درختوں کی شاخوں پر ہم چڑھ کر جاچھپے۔ موتانہ نے نیزہ تانے رکھا تھا۔ میں نے اپنی رائفل فل لوڈ کر رکھی تھی۔ دو مقامی آدمی بلم اور کلہاڑی لیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کو کلہاڑا ماری (کلہاڑا پھینک کر وار کرنا) میں خاصی مہارت تھی۔

اب ہم سب کی نظریں پانی پر تھیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ہماری مایوسی بڑھتی رہی۔ شکار کسی بھی جانور یا درندے کا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ ہم اس کے عادی تھے۔ دوپہر ہوچکی تھی۔

اچانک پانی کی سطح پر ایک زوردار چھپاکے کی آواز ابھری اور ہم میں جیسے جان پڑ گئی۔ ہم ایک دم چوکنا ہو گئے۔ ابھی میں نے کسی کو کچھ نہ کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ بکری کا بچہ منہ سے ممیاتی سی آوازیں نکالنے لگا۔ پانی کے شور نے اسے بھی نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا کر دیا تھا۔

دونوں مقامیوں نے کلہاڑا اور بلم سونت لیا تھا۔ موتانہ نیزہ پھینکنے کے لیے تیار تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ پانی میں جس جگہ شور ابھرا ہے وہ درخت سے دور ہے، لہٰذا میں نے اپنی رائفل ایک ہاتھ سے دوسری نسبتاً مضبوط ٹہنی سے ٹکادی۔

جیسے ہی مجھے مگرمچھ کی پشت اور بدہیت کھال والا جسم نظر آیا میں نے فائر کردیا۔ دھماکا ہوا۔ پرندے چیختے ہوئے اڑے، بکری کے بچے کے شور میں اضافہ ہوگیا، میری نظریں پانی کی سطح پر تھیں، وہاں خون سا پھیلا ہوا تھا، پھر ایک بھاری دم سطح آب پر ابھر کر ڈوب گئی۔

’’وہ مارا......‘‘ ایک مقامی فاتحانہ انداز میں چلّایا۔

موتانہ سنجیدہ تھا۔ بولا: ’’وہ زخمی ہوکر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔‘‘

’’میرا بھی یہی خیال ہے۔‘‘ میں نے کہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

ہم سب درخت سے نیچے اتر آئے، چند مقامی لوگ فائر کی آواز پر چلے آئے تھے، ان کے چہروں پہ خوف اور سراسیمگی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ شیر کے شکار سے مگرمچھ کا شکار یکسر مختلف تھا۔ اس کی اپنی دہشت تھی، جو مقامی لوگوں کے چہرے سے ہویدا ہوتی نظر آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اچانک ہم نے کوئی سیاہ چیز پانی کی سطح پر دوبارہ ابھرتی دیکھی۔ دونوں بلم بازوں نے میرے اشارے پر بلم اور کلہاڑے پھینکے، موتانہ نے بھی نیزہ اچھالا، خود میں نے رائفل سیدھی کرکے دو دھماکے کر ڈالے۔ پانی میں پھر جوار بھاٹا ابھرا۔ لمبا بدہیت تھوتھنا غوطہ لگاتا نظر آیا اور پھر اس کی موٹی کھردری دم لہرائی۔ پھر دونوں ہی غائب۔

پانی میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی تھی۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوسکا تھا کہ مگرمچھ کس حد تک زخمی ہوا تھا، کیونکہ بسا اوقات زخمی درندہ بھی چند دنوں بعد مرکھپ جاتا ہے، اسی لیے ہم اس کے زخمی ہونے کا اندازہ کرنا چاہتے تھے جو سردست نہیں ہوسکا تھا۔

ندی کا پانی ایک بار پھر پُرسکون ہو چکا تھا۔ ہم کافی دیر انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد لوٹ آئے۔ ابھی دن کے صرف تین بجے تھے۔

☆☆☆

اب پروگرام یوں بنا تھا کہ ہم مگرمچھ سے دوبدو لڑائی کریں گے۔ یعنی کشتی میں سوار ہوکے پانی میں جا اتریں گے، اس کے بغیر اس موذی کو ختم کرنا ممکن نظر نہیں آتا تھا، یہ خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا، مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس پر موتانہ نے میرا خیال کرتے ہوئے مودبانہ گزارش کرڈالی۔ ’’سر! آپ کنارے پر ہی رہیں، کشتی میں نہ آئیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے میرے ایک ہاتھ کی طرف دیکھا تھا۔

میں مسکرادیا اور بولا۔ ’’میری فکر مت کرو، مجھ میں دو ہاتھوں والے انسانوں جیسی ہی طاقت ہے۔‘‘

ہم کشتی کا بندوبست کر چکے تھے۔ کشتی ندی میں اتاری گئی۔ یہ چپوؤں سے چلنے والی ہاتھ سے بنی ہوئی ایک مضبوط

ہنری فورڈ کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ اس نے فورڈ گاڑیاں متعارف کروائیں۔ بلکہ اسے بابائے کارسازی کہنا چاہیے۔

فورڈ گاڑیاں بے پناہ کامیاب ہوئیں۔ ہر جگہ ان گاڑیوں کی دھوم مچ گئی۔ فورڈ کو اب یہ اعتماد ہوگیا کہ وہ جو پراڈکٹ بھی مارکیٹ میں لائے گا وہ اسی طرح کامیاب ہوگی۔

اس نے اب ایک دوسری گاڑی Eosol کی پلاننگ کی۔ اور اس گاڑی کی پروڈکشن شروع کردی۔

اس نے یہ گاڑیاں 1957 میں متعارف کروائی تھیں لیکن ہوا یہ کہ اس کے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

صرف دو سال بعد یعنی 1959 میں ایڈسول کی پروڈکشن بند کردی گئی۔ کیونکہ اس کی فروخت کی قیمت اس کی تیاری کی لاگت سے کم ہورہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک غلط گاڑی، غلط مارکیٹ کے لیے غلط وقت پر لائی گئی تھی۔ اس پروجیکٹ نے فورڈ کو کتنا نقصان پہنچایا۔ یہ فورڈ ہی بتاسکتا ہے۔

مرسلہ: عباس علی خان، شورکوٹ

1994ء میں تیل کے ایک Rig میں ہونے والا سانحہ بھی تاریخ کے بڑی غلطیوں میں سے ایک تسلیم کیا گیا ہے۔

(Rig وہ پلیٹ فارم ہے جو تیل کی تلاش اور سمندر سے تیل نکالنے کے لیے بنایا جاتا ہے) اس رگ میں بہت سے لوگ کام کررہے تھے۔ انجینئرز، مزدور، اور ماہرین وغیرہ۔ ہوا یہ تھا کہ چھٹی کے وقت ہر والو کو بہت احتیاط سے بند کردیا جاتا تھا۔ یہ ڈیوٹی سیکورٹی پر معمول اہلکاروں کی تھی۔ وہ ڈیوٹی سے واپس جانے سے پہلے ہر والو کو بند کرکے جاتے لیکن اس شام کسی ایک سے کوتاہی ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ سارے والو اس کے ساتھیوں نے چیک کرکے بند کردیے ہوں گے لیکن بدقسمتی سے ایک والو کھلا رہ گیا تھا۔ اور اسی کھلے ہوئے والو نے تباہی مچادی۔

پورے رگ میں گیس بھر گئی اور وہ دیو ہیکل پلیٹ فارم ایک زوردار دھماکے کے ساتھ تباہ ہوگیا۔

اس حادثے میں نہ صرف 3.4 بلین ڈالر کا نقصان ہوا تھا۔ بلکہ 167 افراد ہلاک بھی ہوگئے تھے۔ جبکہ زخمی اس کے علاوہ تھے۔

آپ اندازہ کرلیں کہ ذرا سی غلطی کتنے بڑے نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔

مرسلہ: نسرین عنایت اللہ، دینہ جہلم

کشتی تھی، جسے چلانے کے لیے ایک مقامی مچھیرے کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

ہم سب کشتی میں سوار ہو کے آگے بڑھ گئے اور بستی کے لوگ کنارے پر بیٹھے ہماری طرف تکتے رہے۔ میری نظریں مستقل پانی کی سطح پر تھیں اور کسی بھی قسم کی سرسراہٹ پر لگتا تھا جیسے مگرمچھ سرسراتا ہوا اپنی لمبی سی دم کو ہلاتا منہ کھولے میری طرف بڑھ رہا ہو۔

جنوبی سمت میں دور تک جا کر واپس آنے کے بعد ہم لوگ شمال کی طرف گئے۔ ایسے میں چاندی جیسی چمکتی مچھلی اچھلی اور پھر پانی میں ڈوب گئی۔ کشتی پھر واپس ہوئی اور جنوبی سمت جانے لگی۔ ہم سب دم بہ خود سے بیٹھے تھے۔ اس وقت جب ہماری کشتی دلدل کے قریب سے گزر رہی تھی، میں نے ایک آواز سنی اور کشتی کو یک دم اچھلتا محسوس کیا۔ مجھے جھٹکا لگا، میں نے فوراً دنبالے کا سہارا لیا۔ موتانہ نے نیزہ تان لیا، دونوں مقامی جوانوں نے اپنے کلہاڑے سونت لیے۔ پانی کی سطح پر ہلچل ابھری۔

پھر دفعتاً ہی ایک موٹی ستون جیسی دم کشتی کے دنبالے سے ٹکرائی اور اس کا بیلنس آؤٹ ہوتے ہی موتانہ اور ان دونوں کلہاڑہ بردار وں میں سے ایک نیچے پانی میں جا گرے۔ میرا چہرہ فق ہو گیا۔ پانی میں وہ خونی مگرمچھ موجود تھا۔ ہماری دو بدو لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

تب ہی میں نے مگرمچھ کے غار جیسے بدوضع لیکن خوف ناک تھوتھنے کو ابھرتے اور اس کی جانب بڑھتے دیکھا۔ موتانہ ... اور مقامی نوجوان کے اوسان خطا ہو چکے تھے اور ان پر ایسی دہشت طاری ہو چکی تھی کہ انہیں نیزہ اور کلہاڑا تک سنبھالے رکھنے کا یارا نہ رہا تھا۔ وہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پانی میں جا گرے تھے۔

میں نے مگرمچھ کی کمر پر فائر کر دیا۔ وہ تڑپا مگر اسے کوئی فرق نہ پڑا۔

''تم دونوں تیر کر کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرو، کشتی کی طرف مت آؤ۔ فائر کرنا مشکل ہو جائے گا میرے لیے۔'' میں نے چلا کر ان سے کہا۔ ان دونوں نے فوراً ہی میری ہدایت پر عمل کیا۔ مگرمچھ ان کی جانب پھر لپکا۔ میں نے مچھیرے کو اسی طرف ہی کشتی کھیتے رہنے کی ہدایت کی۔

ایک اور فائر میں نے مگرمچھ کے اچانک نظر آنے والے تھوتھنے پر داغا، اس پر مجھے اس کے تکلیف سے چلانے کی عجیب ڈراؤنی آواز آئی اور پھر وہ پانی میں ہی کہیں غائب ہو گیا۔ موتانہ اور مقامی نوجوان تیزی سے تیرتے ہوئے کنارے پر آ چکے تھے۔ میں ابھی کنارے پر جانے کے موڈ میں نہ تھا۔ میرا اس وقت رواں رواں جوش سے کانپ رہا تھا اور متلاشی نظریں تیزی سے گردش کر رہی تھیں کہ اچانک ہی میں نے مگرمچھ کو دلدلی کنارے کی جانب پانی سے ابھرتے دیکھا۔ اس کا اوپری حصہ خون سے رنگین تھا۔ میرا جوش سوا ہوا، میں نے مچھیرے کو اسی طرف کشتی کھینے کا کہا۔

میں بھی دلدلی کنارے میں اتر گیا اور اس موذی کا تعاقب کرنے لگا، میں نہیں جانتا تھا کہ مگرمچھ تہہ آب میں جانے کے بجائے زخمی ہو کر اس نے خشکی کا رخ کیوں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ادھڑے ہوئے زخموں پر ان گنت مچھلیاں چمٹنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اس موذی کو ختم کرنے کے لیے یہ موقع سنہری تھا۔ میں نے تہیہ کیا اور رائفل کسی نہ کسی طرح سنبھالے اس کے تعاقب میں رہا۔ وہ اور میں دلدلی کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے۔ زخمی ہو کر مگرمچھ مزید خطرناک ہو چکا تھا۔ میں نے نشانہ لے کر فائر داغا، مگرمچھ کو ایک جھٹکا لگا۔ گولی شاید اس کے منہ یا تالو میں کہیں لگی تھی۔ دشمن کو زیر ہوتے دیکھ کر میری ہمت اور جوش سوا ہوئے۔ مگرمچھ نے پلٹ کر مجھ پر حملہ کرنا چاہا، اس کی بے چین دم مسلسل حرکت کر رہی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے پرے ہو گیا۔ پھر میرا پاؤں پھسلا، میں گرا، رائفل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جس کا میں ابتدائی سطور میں ذکر کر چکا ہوں کہ ایک شکاری اپنے حواس اور خوف پر قابو پانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ میں نے بھی یہی کیا اور لپک کر اپنی کیچڑ میں لتھڑی رائفل اٹھالی، شکر تھا کہ یہ سلامت تھی۔

ادھر مگرمچھ کیچڑ میں کبھی غائب ہو رہا تھا اور کبھی ابھر رہا تھا، میں نے تاک کر ایک اور فائر کیا، اس کی ایک آنکھ سے خون ابلا۔ اس کا غار سا منہ کھلا اور میں نے اس کے حلق میں ایک اور گولی داغ کر اسے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سلا دیا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ غیر معمولی طور پر ایک جسیم مگرمچھ تھا۔

موتانہ سخت شرمندہ تھا۔ اس نے میرے ایک ہاتھ ہونے کا ذکر کیا تھا اور اسی ایک ہاتھ والے شکاری نے اس کی جان بچائی تھی اور نہ صرف یہ بلکہ ایک خطرناک موذی مگرمچھ کا خاتمہ بھی کیا تھا۔

++

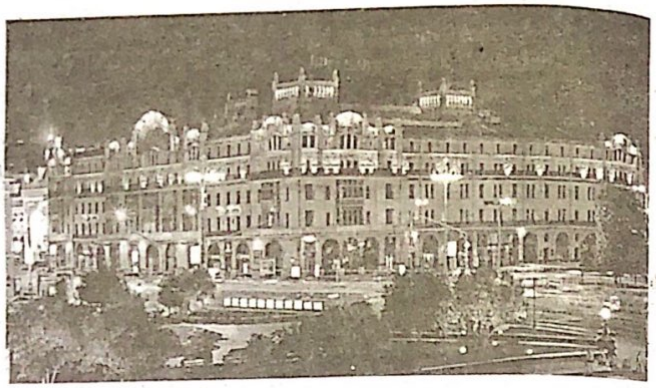

جادوگرنی

نائمہ راضیہ

ایک ایسی عورت کی داستان جو روس بھر میں جادوگرنی مشہور ہے۔ اس کے گھر کے باہر لوگ قطار میں کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟

ایک چونکا دینے والی روداد

یہ ایک عورت ہے جس کا نام جیوگینا داوسولی ہے۔

اس کی عمر صرف 32 سال ہے۔ عرفِ عام میں وہ دوشونا کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔

یہ روس کے ایک اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتی ہے جو کاسک قبائل پر مشتمل ہے۔ دشونا، جو اس عورت کا عرفِ عام ہے اس کے لفظی معنیٰ ''شیطانی عورت'' کے ہیں۔

راسپوٹن کی طرح یہ عورت بھی ہر قسم کی بیماریوں کا علاج کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔

جی، راسپوٹن..... کوروس کا ایک مشہور اور تاریخی راہب کہا جاتا ہے۔ روسی بادشاہ زار کے شاہی خاندان میں اسے بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا کیونکہ وہ نوجوان وارث تخت کی شدید بیماریوں کا کامیاب علاج کر چکا تھا۔

ولی عہد کی صحت یابی نے اسے پورے روس میں مشہور کر دیا اور آج بھی ایک روحانی معالج کی حیثیت سے وہ پوری

دنیا میں معروف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگ اسے محض ایک شیطان یا شیطان کا چیلا سمجھتے تھے۔

اس کی موت کو اب سالہا سال گزر چکے ہیں لیکن اب روس میں پھر ایک روحانی معالج کا ورود ہوا ہے یعنی جیوگینا دا وتسولی۔

بات ہو رہی تھی جیوگینا دا وتسولی یعنی وشونا کی۔ بیماری خواہ ہلکی ہو یا سخت وہ اس کا روحانی علاج کر سکتی ہے۔

اس عورت کی آنکھیں سیاہ ہیں مگر اتنی چمک دار کہ ان سے روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے مریضوں کی طرف دیکھتی ہے تو مریض اس عجیب و غریب روشنی سے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس زنانہ شیطان کے ہاتھ لمبے، پتلے اور مخروطی ہیں۔ ان ہاتھوں کے ذریعہ وہ بدترین بیماریوں کا علاج کرتی ہے۔ ان بیماریوں میں سرطان (کینسر) بھی شامل ہے جسے طبی ماہرین اب تک لاعلاج مرض سمجھتے ہیں۔

اس عورت کی تیز نگاہیں، حسیناؤں کی جادوگری کے قصے یاد دلاتی ہیں لیکن اپنے لمبے مخروطی ہاتھوں کے ذریعہ وہ روس کے حکمران لیونڈ برزنیف کا علاج کر چکی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ برزنیف اس وقت موت کے دروازے پر تھا جب اس عورت نے اس کا علاج شروع کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ برزنیف کو موت کے جبڑوں سے کھینچ کر زندگی کے حصار میں لے آئی۔

اس واقعہ کے بعد سے یہ خوب صورت عورت روس میں بے پناہ شہرت حاصل کر گئی اور اسے بڑا اثر و رسوخ بھی حاصل ہو گیا جیسا کہ سائبیریا کے راہب راسپوٹن کو ولی عہد کے علاج سے حاصل ہوا تھا۔ راسپوٹن کی موت کو اب 66 سال ہو گئے ہیں۔

ماسکو میں وشونا کے گھر روزانہ ہزاروں ایسے لوگ آتے ہیں جو اس کے ہاتھوں کے جادو سے اپنی بیماریوں کا علاج کرانے کے لیے خواہاں ہوتے ہیں لیکن وہ صرف چند گنے چنے مریضوں کا علاج کرتی ہے۔ ایسے مریض جو دیوانگی کی حد تک علاج کے خواہاں ہوں۔

ان مریضوں کو وہ صرف ہاتھوں سے چھو کر صحت یاب کر دیتی ہے۔ وشونا صرف سرطان کا ہی علاج نہیں کرتی معدہ کی بیماریاں بھی ٹھیک کرتی ہے۔ اس کے ہاتھوں سے گٹھیا کے مریض بھی صحت یاب ہوتے ہیں۔

معالج کی حیثیت سے اس نے اپنے کیریئر کا آغاز اس وقت کیا جب وہ ایک کمسن لڑکی تھی اور کیوبن نامی ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھی۔

ان دنوں ماسکو میں اس کے گھر کے سامنے جمع ہونے والے ہزاروں افراد تسلیم کرتے ہیں کہ وہ معجزانہ طور پر شفایاب کرانے والی عورت ہے۔ وشونا کے مداحوں میں ماسکو کے اعلیٰ حکام بھی شامل ہیں اور سائنس دان بھی۔

وہ انہیں بعض شدید بیماریوں سے نجات دلا چکی ہے اور وہ بھی صرف اپنے ہاتھوں کے لمس کے ذریعے سے۔

سوویت اکیڈمی آف سائنس کے ایک رکن جوائی کو مبارینو نے اپنے طریق سے اس جادوگر معالج کو معجزانہ طاقتوں کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔ ''وشونا کی صلاحیت کو صرف پُراسرار قوت قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ صرف ہاتھوں کے لمس سے، بغیر کسی سرجری کے بیماریوں کا علاج کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخ میں ایسے بہت سے معالجوں کا ذکر موجود ہے جو مریضوں کو صرف چھو کر انہیں صحت یاب کر دیتے تھے۔ وشونا اس قسم کے معالجوں کی ایک زندہ مثال ہے۔''

ایک اور روسی سائنس دان کا کہنا ہے کہ وشونا ایک مخصوص قوت کی حامل ہے۔ اس کی یہ صحت بخش قوت اتنی بے پناہ ہے کہ اس نے ایک ایسی الیکٹرانک ایجاد کو قریب قریب تباہ کر ڈالا ہے جو ذہنی مریضوں کے علاج کے لیے تیار کی گئی تھی۔ وشونا کے جسم میں ایک پُراسرار قوت موجود ہے جو حیرت انگیز حد تک توانا اور بھرپور ہے۔''

جن لوگوں نے سنجیدگی سے اس عورت کو علاج کرتے ہوئے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ کسی مریض کا علاج کرتے وقت وشونا کے ہاتھوں اور سر سے ایک عجیب سی روشنی خارج ہوتی ہے۔

دوسری طرف ایک اور عجیب امر یہ ہے کہ وشونا اپنے گھر میں قطعی عام اور سادہ زندگی گزارتی ہے۔ وہ صرف چند اوقات میں اپنی غیر معمولی قوتوں کو استعمال میں لاتی ہے۔

وہ صرف چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ نکلی تھی۔ طنعس جا پہنچی۔ روزی کمانے کے لیے اس نے فلموں میں بھی کام کیا۔ نرسنگ اسکول میں داخلہ سے پہلے وہ ایک ریسٹورنٹ میں ویٹرس کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔

وہ صرف دو سال کی تھی جب اس کے باپ کو اس کی پُراسرار قوتوں کا علم ہو گیا تھا۔ یہ ایسی پُراسرار اور عجیب طاقتیں تھیں جنہیں الفاظ میں واضح نہیں کیا جا سکتا۔

ان کا انکشاف اس وقت ہوا جب انہوں نے دو سالہ بچی کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھایا اس وقت ان کی کمر میں شدید درد تھا لیکن بچی کو ہاتھوں میں اُٹھاتے ہی اچانک وہ درد غائب ہو گیا یوں جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اس کے بعد گاؤں بھر کے لوگ اپنی مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے اس ننھی بچی کے گھر کا رخ کرنے لگے۔

معدہ کی بیماریوں، کمر کا درد، جوڑوں کا درد سب اس کے ہاتھوں شفایاب ہونے لگے۔ اس سلسلہ میں وشونا کا کہنا ہے۔

''ان لوگوں کو ہاتھ لگائے بغیر میں اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں ان کی تکلیف دیکھ لیا کرتی تھی اور پھر جب میں اپنے ہاتھ ان کے جسم سے چھوتی تو بیماری یا درد فوراً رفو چکر ہو جاتے۔ یہ بہت مختصر سا طریق کار تھا البتہ مکمل شفایابی کے لیے ان میں سے بعض کو دو تین دفعہ میرے پاس آنا پڑتا تھا۔ لوگوں کو صحت یاب کرنے کی اس مہارت نے اسے لوگوں میں جادوگرنی مشہور کر دیا لیکن خود اسے اس عطیہ خداوندی کا پورا احساس اس وقت ہوا جب میں نرسنگ اسکول میں داخل ہوئی جو طغلس میں واقع ہے۔ اس نے جب طغلس کے پولی کلینک میں کام شروع کیا تو لوگ بڑی تعداد میں اس سے علاج کرانے کے لیے آنے لگے۔

اسپتال کے مریضوں کو فوری طور پر پتا چل گیا کہ یہ لڑکی ہر قسم کی اعصابی بیماریوں، دردوں اور گٹھیا کا تیزی سے علاج کر سکتی ہے اور وہ بھی کسی سرجری کے ذریعے نہیں بلکہ صرف اپنے ہاتھوں سے مریضوں کے جسم کو چھو کر۔

اس کے بعد لوگوں نے زور دینا شروع کیا کہ وہ اسپتال کی نوکری چھوڑ کر براہِ راست صرف علاج پر توجہ دے۔ گھر پر پرائیویٹ پریکٹس کرے تاکہ لوگ آسانی سے اور براہِ راست اس سے رابطہ کر سکیں۔

اس کے مریضوں میں ماسکو کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔ ان کے ذریعہ اس کے سحر کی خبریں ماسکو تک پہنچیں بعد ازاں اخبارات نے ''جادوگر ہاتھوں والی عورت'' کی مختلف کہانیاں شائع کیں اور بہت سے لوگ اس سے رجوع کر کے شاداں و فرحاں واپس آ گئے۔

اس کے بعد اس کا تبادلہ ماسکو کے پولی کلینک میں ہوا لیکن یہاں جب اس سے علاج کرانے والے مریضوں کی تعداد انتہائی بڑھ گئی تو اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اس طرح اس نے گھر پر پریکٹس کا آغاز کیا جہاں وہ آج بھی اسی طریق سے مریضوں کا علاج کرتی ہے۔

صرف ہاتھوں کے لمس سے انہیں صحت یاب کرتی ہے۔ وہ جسم کے متاثرہ حصہ پر صرف ہاتھ رکھتی ہے۔ ماہرین اور ڈاکٹروں کی ٹیمیں۔ اس کے کام کا جائزہ لے چکی ہیں، وہ السر، ہائی بلڈ پریشر اور ورم کا علاج کرتی ہے۔

وہ بڑے شرمیلے انداز میں اعتراف کرتی ہے۔ ''یہ سچ ہے کہ جتنے لوگ میرے پاس آتے ہیں میں ان سب کا علاج نہیں کر سکتی۔ بعض حالات میں صرف سرجری ہی کامیاب ہوتی ہے اور اگر بہت ضروری ہو تو میں اپنے مریض کو صاف لفظوں میں بتا دیتی ہوں کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔''

1979ء میں روس کے وزیراعظم لیونڈ برزنیف نے اسے اپنے علاج کے لیے طلب کیا تھا۔

اس وقت برزنیف کے معالج مایوس ہو چکے تھے، لیکن وشونا کے ہاتھ برزنیف کو موت کے منہ سے کھینچ لائے اور وہ نازک حالت سے نکل کر دوبارہ کام کاج کے قابل ہو گیا۔

++

> ایک بہت ہی بھیانک اور عبرتناک غلطی علاؤالدین محمد خوارزم سے ہو گئی تھی۔ اس وقت اس کی سلطنت بہت طاقتور تھی، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی سلطنت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا ہے۔
>
> اس زمانے میں منگولوں کا طوفان چنگیز خان کی صورت میں آگے بڑھتا آ رہا تھا۔ چنگیز خان نے اپنے سفیر خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجے تھے۔
>
> خوارزم شاہ نے ایک ایسی غلطی کی جس کی سزا پوری قوم کو نسل در نسل برداشت کرنی پڑی۔
>
> اس نے منگولوں کو کسی قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اجڈ وحشی لوگ اس کی تربیت یافتہ فوج کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔
>
> اس نے نہ صرف چنگیز خان کی توہین کی بلکہ ان سفیروں کے سر کاٹ کر چنگیز خان کے پاس بھیج دیے۔ بس پھر کیا تھا۔ منگولوں کے طوفان، چنگیز خان نے اس کی پوری حکومت تاراج کر کے رکھ دی اور اتنے انسانوں کا خون بہایا کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔
>
> مرسلہ: ناصر چغتائی، کراچی

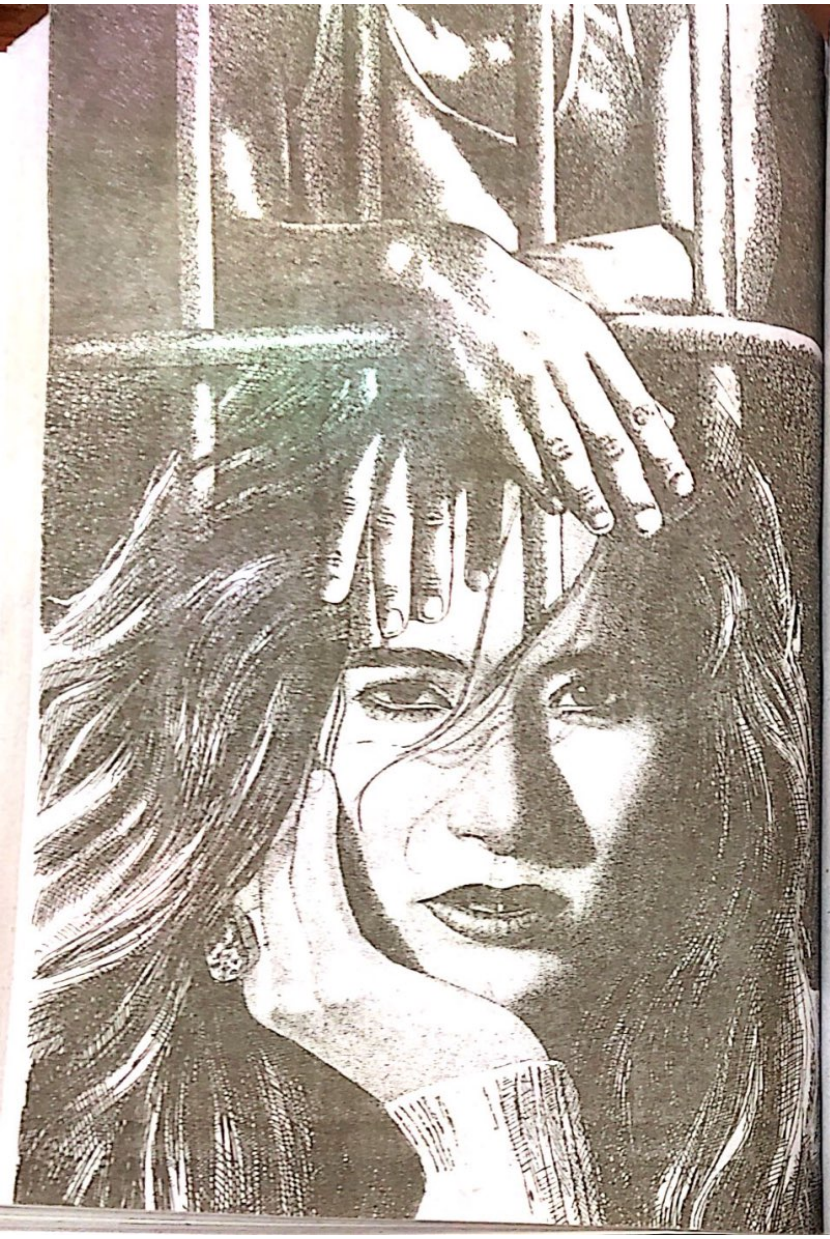

تیسواں حصہ

رو سیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آبپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

انوشکا علی سے ملنا چاہتی تھی لیکن اس نے بہانہ بنا دیا۔ انوشکا کے پیچھے ہی دیپک اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈان کلب میں آ گیا تھا۔ اس نے ہاروے کو دھمکی دی۔ ہاروے کے آدمی مارٹر نے علی کا حلیہ بدل دیا تھا۔ ہاروے کا ڈرائیور علی کو ایک کوٹھی میں چھوڑ گیا تھا اینڈرسن اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اینڈرسن کی بیٹی بہت باتونی تھی وہ علی کو انکل کہہ کر پکارتی تھی۔ انوشکا نے علی کو کال کی تھی لیکن پھر اچانک وہ گھبرا گئی تھی کہ کہیں اس کی کال کی ریکارڈنگ نہ ہو رہی ہو۔ ہاروے کے کہنے پر علی، اپنی لوکیشن بدلنے اور فون کو کہیں دور پھینکنے چلا گیا پھر کافی دور پہنچ کر اس نے انوشکا کو کال کی، کال اس کے باپ رتن کمار نے اٹینڈ کی اور دونوں کے درمیان خوب تلخ باتیں ہوئیں۔ پھر علی اینڈرسن کے ساتھ گھر چلا گیا۔ اینڈرسن مارکیٹ سے واپس گھر آیا تو کافی پریشان تھا۔ علی کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہاروے صاحب غائب ہو گئے ہیں۔ دو روز کے بعد منیجر موہن نے علی سے کہا کہ ہاروے صاحب ٹھیک ہیں اور اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ موہن نے علی کو ایڈریس دیا تو وہ فوری طور پر ہاروے سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب علی مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو رتن کمار کا آدمی سوم اسے ساتھ لے گیا۔ علی کو جب پتا چلا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے تو اس کی سوم کے ساتھ فائٹنگ ہوئی لیکن وہاں دو آدمیوں نے آ کر علی کو بے ہوش کر دیا۔ رتن کمار نے علی کو خاصہ مارا تھا۔ علی رتن کمار کے ٹھکانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا راستے میں اسے انوشکا دکھائی دی اس کے کہنے پر ٹیکسی ڈرائیور نے تعاقب کیا پھر علی ڈان کلب پہنچ گیا۔ ہاروے کے کہنے پر علی مضافات میں ایک عمارت میں چلا گیا جہاں جیک نامی آدمی موجود تھا۔ تیسرے روز ایک چینل کے ذریعے علی کو پتا چلا کہ ہاروے کے کلب کو آگ لگا دی گئی ہے۔ علی ہاروے سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

انتظار کی کوفت انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے۔ ایک ایک لمحہ گراں گزرتا ہے۔ میں بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ جب تک ہاروے سے بات نہیں ہو گی مجھے سکون نہیں ملنا تھا۔ جیک بھی ہاروے سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے مضطرب تھا۔ اس کے کہنے پر میں نے متعدد بار ہاروے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔

ہم مسلسل جاگ رہے تھے۔ نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سوا بارہ بجے کے قریب ہی فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن نقصان کا ابھی تک کوئی اندازہ نہیں تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی میں خود کو بھی قصوروار گردانتا ہوں کہ میری وجہ سے رتن کمار، ہاروے کا دشمن بن گیا تھا۔ میں نے قصد کر لیا تھا کہ میں رتن کمار سے ہاروے کے نقصان کا بدلا ضرور لوں گا۔ مجھے اس وقت کا شدت سے انتظار تھا جب رتن کمار ہماری گرفت میں ہو گا۔ میں اور جیک مسلسل ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ ہاروے کے کلب کے حوالے سے مسلسل خبریں چل رہی تھیں۔ دفعتاً جیک مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر مورس! چائے پیو گے؟ مجھے تو چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے، بنا لیں، میں بھی پی لوں گا۔'' میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواباً کہا تو وہ چائے بنانے چلا گیا اور میں ایک بار پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ معاً چینل پر بریکنگ نیوز کا لوگو چلا تو میں پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میل اینکر نے بولنا شروع کیا۔ ''ناظرین! ہم آپ کو بتاتے چلیں، ڈان کلب کے مالک ہاروے ہیوبے کا مؤقف سامنے آ گیا ہے۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ ان کے کلب کو رتن ہوٹل کے مالک اور سماجی شخصیت رتن کمار کے ایماء پر آگ لگوائی گئی ہے۔ رتن کمار کا مؤقف جاننے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔''

میل اینکر مسلسل یہی بولنے میں مصروف تھا۔ اس کا انداز سنسنی پھیلانے والا تھا۔ میں نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز میوٹ کی اور سیل فون اٹھا کر ہاروے سے رابطہ کیا۔ صد شکر کہ اس بار ان سے رابطہ ہو گیا۔ ''ہیلو ہاروے صاحب۔''

''ہیلو......آپ کون؟'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ میں نے سیل فون کو کان سے ہٹا کر اسکرین پر دیکھا تو ہاروے کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ میں نے سیل فون کو دوبارہ کان سے لگا لیا۔

''ہیلو......آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں......کون ہیں آپ؟'' میرے بولنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے

دریافت کیا گیا تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں نمبر غلط تو نہیں مل گیا لیکن جب دوسری طرف سے کہا گیا کہ میں ہاروے کی مسز بات کر رہی ہوں تو منہ سے ٹھنڈا سانس نکل گیا۔

''مسز ہاروے! میرا نام مورس ہے اور میں نے ہاروے صاحب سے بات کرنی ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''کیا ان سے بات ہو سکتی ہے؟''

''ہاں ہو سکتی ہے۔'' مسز ہاروے نے جواباً کہا۔ ''وہ واش روم میں ہیں، آتے ہیں تو میں ان کو تمہارے بارے میں کہہ دوں گی وہ تمہیں کال بیک کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے، شکریہ۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے رابطہ منقطع کر کے سیل فون ٹیبل پر رکھ دیا۔ ہاروے خیریت سے تھا اس لیے مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ دو منٹ ہی گزرے تھے کہ ہاروے کی کال آ گئی۔

''ہیلو ہاروے صاحب، کیسے ہیں؟'' میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' ہاروے کی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔ ''تم کیسے ہو، کوئی مسئلہ تو نہیں؟''

''نہیں ہاروے صاحب، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''ٹی وی دیکھ رہا ہوں، آپ کے حوالے سے خبر چل رہی ہے، کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے کلب کو رتن کمار نے ہی آگ لگوائی ہے؟''

''سو فیصد یقین ہے۔'' ہاروے نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''جب اس کا کوئی وار مجھ پر کارگر نہیں ہوا تو اس نے میرے کلب کو آگ لگوا دی۔''

''اب آپ کیا کریں گے؟'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے دریافت کیا۔

''رتن کمار کو سامنے لاؤں گا۔'' انہوں نے جواباً کہا۔

''وہ کیسے؟'' میں چونکا۔

''اس کو ایک ہی صورت میں سامنے لایا جا سکتا ہے جب اس کی بیٹی کو اغوا کیا جائے۔'' ہاروے نے کہا۔ ''میرے آدمی انوشکا پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہیں، وہ اس وقت اپنی دادی کے ساتھ گوپال کالونی کی ایک کوٹھی میں موجود ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر اتڈیلی، یکدم میرے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ انوشکا واقعی گوپال کالونی کی ایک کوٹھی میں موجود تھی، ڈرائیور نے مجھے اس کالونی کا یہی نام بتایا تھا۔

''جی ہاروے صاحب۔ میں جانتا ہوں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

دوسری طرف ہاروے شاید چونک پڑا تھا۔ ''کیا مطلب، کیا تم جانتے ہو؟''

''جی میں جانتا ہوں۔'' میں نے اعترافی لہجے میں کہا اور پھر انہیں انوشکا کو دیکھنے اور اس کی کار کا تعاقب کرتے ہوئے گوپال کالونی میں پہنچنے تک کے بارے میں بتا دیا۔

''مورس! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' ہاروے کی خفگی بھری آواز سنائی دی۔

''میں آپ کو بتانا چاہتا تھا لیکن موقع ہی نہیں ملا۔'' میں نے کہا۔ ''پھر میں آپ سے کافی دیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آپ کا فون بند جا رہا تھا۔''

''بہرکیف۔'' میری بات کے اختتام پر ہاروے نے کہا۔ ''رتن کمار کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن ہم انتہائی احتیاط سے چل رہے ہیں، اگر ہم نے جلدی میں اسے اغوا کر لیا تو سارا الزام مجھ پر عائد ہو جائے گا اسی لیے میرے آدمی اس کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں۔ انوشکا کے اغوا کا سن کر پھر دیکھنا وہ گدھ کیسے دوڑا چلا آئے گا۔''

ہاروے دور اندیشی سے کام لے رہے تھے۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر انہی دنوں انوشکا کو اغوا کر لیا گیا تو سارا الزام ہاروے صاحب پر ہی آئے گا۔ ان سے مزید چند باتیں ہوئیں اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا تو میں نے سیل فون میز پر رکھ دیا۔ عین اسی لمحے جیک کافی کے دو کپ اٹھائے آ گیا۔ اس نے ایک کپ میرے سامنے میز پر رکھا اور اپنا کپ لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''مسٹر ہاروے سے رابطہ ہوا؟'' اس نے کافی کی چسکی لینے کے بعد پوچھا۔

''ہاں۔ ابھی بات ہوئی ہے۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے اسے بتا دیا کہ ہاروے صاحب جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں۔ جیک کے چہرے پر سکون کے سائے لہرا گئے تھے۔ پھر ہم دونوں کافی پینے کے ساتھ ساتھ ٹی وی بھی دیکھتے رہے۔ رات کا ایک بجنے والا تھا تبھی میں نے جیک سے اجازت چاہی اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

☆......☆

رات میں پُرسکون نیند سویا تھا۔ صبح سات بجے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے شاور لینے سے پہلے معمول کی ایکسرسائز کی تھی۔

شاور لے کر جب میں ناشتا کرنے کے لیے ڈائننگ

ہال میں آیا تو جیک ٹیبل سجا چکا تھا۔ ٹیبل ناشتے کے لوازمات سے بھری پڑی تھی۔ جیک میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ رسماً حال احوال پوچھنے کے بعد ہم دونوں ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ یہاں کوئی عورت یا خانساماں نہیں تھا اس لیے سارے کام جیک خود ہی کرتا تھا، ناشتا، لنچ اور ڈنر وہی تیار کرتا تھا، گھر کی صفائی ستھرائی بھی اسی کے ذمے تھی۔

جیک کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کافی لذیز ہوتے تھے۔ میں بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ مسلسل چین کلر کھانے کی بدولت اب میرا جسمانی درد بھی جاتا رہا تھا اور میں خود کو کافی فٹ محسوس کر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر تازہ دم ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں میں نے بوڑھے والے گیٹ اپ سے بھی نجات حاصل کر لی تھی۔ جب جیک نے مجھے میری اصل شکل میں دیکھا تو پہلے پہل تو وہ مجھے پہچان نہ سکا تھا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ وہ میرا گیٹ اپ تھا تو وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ میں اس وقت بھی اپنی اصل شکل میں موجود تھا۔

''مورس صاحب!'' دفعتاً جیک چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا تو میں بھی اسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم ناشتا کر چکے تھے اور اب چائے پی رہے تھے۔

''کہیے جیک صاحب، کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' میں نے بھی چائے کا گھونٹ لیا اور کپ میز پر رکھنے کے بعد کہا۔

''تم نے اپنا تفصیلی تعارف نہیں کرایا۔'' جیک نے کہا۔ واقعی مجھے یہاں رہتے ہوئے کئی دن گزر گئے تھے لیکن ہمارے درمیان تفصیلی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ جیک اَن پڑھ تھا لیکن وہ کافی ہوشیار اور تیز طرار آدمی تھا۔ وہ ہاروے کا وفادار تھا اور اس کی خاطر جان بھی قربان کر سکتا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں زیرِلب مسکرایا۔

''ہاروے صاحب کو کیسے جانتے ہو؟'' وہ اب پوری طرح میری طرف متوجہ ہوا تھا۔

''ہاروے صاحب سے ایک ریفرنس کے تحت ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے ایک بار پھر چائے کا گھونٹ لینے کے بعد کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا گویا وہ سمجھ گیا ہو۔

ہمارے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ مستفسر ہوا۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

میں ہنسا۔ ''جیک صاحب، کیوں تکلف کر رہے ہیں، آپ ایک نہیں دو سوال پوچھیں۔'' بمبئی میں اینگلو انڈین لوگوں کی بہتات نظر آتی اب تک کا تجربہ بتا رہا ہے کہ یہ اینگلو انڈین خاصے معتبر ہوتے ہیں۔

جیک بھی زیرِلب مسکرا دیا۔ اس نے بھی چائے کا گھونٹ لینے کے بعد پوچھا۔ ''رتن کمار کا کیا چکر ہے؟''

کپ اس کے ہاتھ میں ہی تھا اور وہ میرا جواب سننے کا منتظر تھا پھر اس نے دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ہاروے صاحب کا رتن کمار سے کوئی جھگڑا نہیں ہے لیکن گزشتہ رات ان کے کلب کو آگ لگائی گئی جس کا الزام انہوں نے رتن کمار پر لگایا ہے۔ میں رتن کمار کو ذاتی طور پر تو نہیں جانتا لیکن اس کے بارے میں اخبارات میں پڑھتا رہتا ہوں۔ وہ ایک سماجی کارکن ہے اور اپنے مذہب کے پیروکاروں کی بہت مدد کرتا ہے، غریب لڑکیوں کی شادیاں بھی کراتا ہے، ہاروے صاحب کو انڈیا میں کام کرتے ہوئے برسوں بیت گئے ہیں انہوں نے کبھی کسی سے کاروباری رقابت نہیں رکھی، وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان ہیں۔''

اس کے خاموش ہونے پر میں نے سر ہلایا اور گویا ہوا۔ ''جانتا ہوں جیک صاحب کہ رتن کمار کیا چیز ہے، لیکن جس طرح ہاتھی کے کھانے کے دانت اور... دکھانے کے اور ہوتے ہیں بالکل اسی طرح رتن کمار بھی دوغلا انسان ہے۔ اس کا ظاہر اور باطن مختلف ہے، اس کے قول اور فعل میں تضاد ہے۔''

جیک بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے ہنکاری بھری۔ میں نے دو لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''رتن کمار کے چہرے کے پیچھے ایک مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہاروے صاحب کی رتن کمار سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن میری وجہ سے وہ ہاروے صاحب کا دشمن بن گیا ہے۔''

جیک کے چہرے پر حیرت کے سائے لہرائے، یقیناً وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گا کہ میری رتن کمار سے کیا دشمنی ہے، میں اس سے کیا چاہتا ہوں؟ بالآخر وہ اپنے دل میں موجود سوال کو زبان پر لایا۔ ''رتن کمار سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

میں نے اس بار طویل سانس لیا۔ اس لمحے میرے پردۂ تصور میں روزینہ کا معصوم عکس لہرا گیا تھا۔ اس لمحے میری آواز بھرّا گئی۔ ''رتن کمار کی وجہ سے میری بہن نے خودکشی کی

ہے۔''

''اوہو......'' جیک کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''رتن کمار اپنی عیاشی کے لیے امریکی پورنوگرافک کمپنی سے لڑکیاں خرید کر انڈیا لاتا ہے۔'' میں ٹرانس کی کیفیت میں بولتا چلا گیا۔ ''وہ بدبخت اسی کمپنی سے میری بہن کو بھی خرید کر انڈیا لایا تھا لیکن میری بہن نے اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے خودکشی کو ترجیح دی۔ اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ تو کر لیا لیکن اپنی عصمت لٹنے سے بچالی۔''

میری مختصر داستان سنتے ہوئے جیک سکتے کی حالت میں چلا گیا تھا۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے کرسی پر ایک بت ایستادہ ہو۔ چند لمحوں کے بعد جب اس کا سکتا ٹوٹا تو اس نے سرسراتی آواز میں دریافت کیا۔ ''تو تم اپنی بہن کے پیچھے انڈیا آئے ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے ہموار لہجے میں کہا۔ ''میری بہن نے رتن کمار کی وجہ سے اپنی جان دی ہے، میں جب تک رتن کمار کو جہنم واصل نہیں کروں گا، سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔''

''ایسے لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے مورس! جس پر بیتتی ہے وہی درد محسوس کر سکتا ہے۔'' جیک نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔''

''شکریہ جیک۔'' میں نے سر ہلایا۔

''رتن کمار کا بیان بھی اخبار میں چھپا ہے۔'' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جیک نے کہا۔

میں چونکا۔ ''کیا کہا ہے اس نے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ ڈان کلب میں لگنے والی آگ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، ہاروے صاحب نے اس پر یقیناً کاروباری رقابت کی بناء پر الزام لگایا ہے۔'' جیک نے بتایا تو میں استہزائیہ انداز میں مسکرا دیا۔

''ظاہر ہے جھوٹا انسان جھوٹ بولنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔'' میں نے تنفر سے کہا۔ جیک نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ہم نے چائے پی لی تھی اور تھوڑی دیر مزید رتن کمار کے حوالے سے گفتگو کرنے کے بعد میں اخبار اٹھائے لان میں سایہ دار جگہ پر پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ جیک برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

اخبار میں رتن کمار کا بیان چھپا تھا۔ بیان وہی تھا جو جیک نے بتایا تھا، اخبار میں ہاروے کے کلب کے حوالے سے بھی خبریں اور تصویریں تھیں۔ کلب کی بلڈنگ تباہ ہو گئی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔ رتن کمار اس حد تک جا سکتا ہے مجھے اس کا اندازہ تو تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ڈان کلب کو آگ لگوا دے گا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ اب وہ کھل کر ہاروے کے سامنے مقابلے کے لیے آ گیا تھا۔

کچھ دیر اخبارات میں دیگر خبروں پر سرسری نظریں ڈالنے کے بعد میں نے اخبار میز پر رکھا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان صاف تھا اور سورج اپنی منزل کی طرف محوِ سفر تھا۔ آسمان پر کچھ پرندے بھی اڑتے پھر رہے تھے۔ میں ان پرندوں کو دلچسپی اور پُرغور نظروں سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک جہاز بھی گزرا تھا جس کی آواز سے مضافات کا ماحول گونج اٹھا تھا۔ مجھے شدید بوریت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے یوں ہی سرسری انداز میں نظریں دوڑائیں تو میری نظریں پورچ میں کھڑی کار پر ٹک گئیں۔ میں کار کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایکا ایکی میرے دل میں ایک خیال آیا تو میں اٹھ کر کچن کی طرف چل دیا۔ جیک کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھا۔

''جیک۔'' میں نے کچن کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

''ہاں بولو مورس۔'' جیک نے کپ دھوتے ہوئے میری طرف دیکھ کر استفسار کیا۔ ''کیا کچھ چاہیے؟''

''ہاں۔'' میں نے گردن ہلائی۔

''کیا؟'' اس نے کپ ایک سائیڈ پر رکھ کر پوچھا۔

''مجھے کار کی چابی چاہیے۔'' میں نے جواباً زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا تو جیک بے اختیار چونک پڑا۔

''کیا...... کار کی چابی؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن...... تم کہاں جانا چاہتے ہو؟''

''میں گھومنا پھرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے صراحت سے کہا۔ ''دراصل میں یہاں رہتے ہوئے بور ہو گیا ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا سانس گھٹ رہا ہو۔ میں کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں پلیز، انکار مت کرنا۔''

''لیکن ہاروے صاحب......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ان کی فکر مت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم ان کو بتا بھی دو گے تو وہ برا نہیں مانیں گے۔''

''تم کہاں جاؤ گے؟'' جیک نے کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''بس یہیں کہیں گھوم پھر کر واپس آ جاؤں گا۔''

''کیا میں ساتھ چلوں؟'' اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ''میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ تمہیں راستوں کا علم نہیں ہے۔''

''تم......'' میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ چلو آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور گپ شپ بھی کر لیں گے۔''

میری بات پر وہ خوش ہوگیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہیں رکو، میں چابی لے آتا ہوں۔''

وہ چابی لینے چلا گیا اور میں پورچ میں کھڑی کار کے پاس کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے واپس آنے میں دو منٹ لگائے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ہم کار میں بیٹھے روانہ ہو چکے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جیک تھا جبکہ میں سائیڈ سیٹ پر بیٹھا باہر کے نظارے کرنے میں مصروف تھا۔

صبح کا وقت تھا اس لیے گاؤں کے لوگ جن میں عورتیں، جوان، بوڑھے اور بچے کھیتوں میں کام کرنے میں مصروف تھے۔ دور دور تک سرسبز اور لہلہاتے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان کھیتوں کے درمیان بجلی کے کھمبے بھی نصب تھے جن کے اوپر سے تاریں ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک جا رہی تھیں۔ اس روز موسم اچھا تھا۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی گرد آلود ہوائیں چل رہی تھیں۔

ہم ایک علاقے میں پہنچ گئے۔ اس کا نام جیک نے اندھیری بتایا تھا۔ وہ علاقہ کافی بڑا تھا۔ بازار میں خاصی رونق تھی۔ کھانے پینے کے ڈھابے نما ہوٹلوں پر لوگوں کا رش تھا۔ کچھ دور جانے پر ایک مندر بھی دکھائی دیا تھا جہاں سادھو قسم کے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے ویسے ہی لباس پہنے ہوئے تھے جیسے انڈین فلموں میں پنڈتوں اور سادھوؤں کو پہنے ہوئے دکھایا جاتا تھا۔ ہم تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے گاؤں کی سیر کرتے رہے۔ اس دوران ہم نے کولڈ ڈرنکس اور چپس کے پیکٹ بھی لیے تھے۔ وہاں کے لوگ خصوصاً بچے ہمیں حیرت سے دیکھتے تھے۔

پھر جیک نے میری مشاورت سے واپسی کا راستہ اختیار کیا اور کار کو نئی سڑک پر ڈال دیا۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس سے ہم آئے تھے۔ یہ کوئی اور راستہ تھا جس کے بارے میں جیک کو معلوم تھا۔ میرے پوچھنے پر جیک نے بتایا کہ اسے مضافاتی علاقے میں رہتے ہوئے دس سال کا عرصہ ہوگیا ہے اور وہ گرد و نواح کے چپے چپے سے واقف ہے۔ لوگوں سے بھی اس کی اچھی واقفیت ہے۔ جس راستے سے ہم جا رہے تھے اس کے دونوں اطراف میں کھیت کھلیان تھے۔ ایک بات نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھیت میں جگہ جگہ مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے نصب تھے۔ یہ گھوڑے کافی بڑے بڑے تھے۔

''کھیتوں میں مٹی کے گھوڑے کیوں رکھے گئے ہیں؟'' میں نے گھوڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے جیک سے پوچھا۔

میری بات سن کر جیک نے بھی سرسری نظر ان گھوڑوں پر ڈالی اور پھر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''اس علاقے میں کورو قبیلے کے لوگ بھی رہتے ہیں۔'' جیک نے جواباً کہا۔ اس کی نظریں سامنے تھیں۔ ''اس قبیلے کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان مٹی کے بنے ہوئے گھوڑوں پر دیوتا سوار ہوں گے اور اسی طرح وہ ان لوگوں سے خوش ہو کر ان کی فصلوں کی پیداوار میں اضافے کا باعث بنیں گے۔''

مجھے حیرت ہوئی تاہم میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ میں جب بچپن میں بچوں کے رسائل پڑھتا تھا تو معلوماتی مضامین میری توجہ کا مرکز ہوتے تھے۔ مجھے اپنی ذہنی صلاحیت بڑھانے کا بہت شوق ہوتا تھا۔ انڈیا میں بسنے والے مختلف لوگوں کے اپنے عقائد تھے۔ یہاں بڑی ذات کے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے سے کمتر اور کم حیثیت کے لوگوں کو اچھوت اور نیچ ذات کا سمجھتے تھے۔ ہمارے اسلام میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اللہ کی نظر میں سب مسلمان برابر ہیں چاہے کوئی کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو یا کوئی غریب کیوں نہ ہو۔ جیک نے مزید کہا۔ ''اس کے علاوہ ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ گھوڑے ان کی فصلوں کی حفاظت بھی کرتے ہیں اسی لیے کورو قبیلے کے لوگ اپنے کھیتوں میں مٹی کے گھوڑے نصب کرتے ہیں۔ تمہیں یہاں اور بھی ایسے قبیلے ملیں گے جن کے اپنے عقیدے ہیں۔''

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم واپس ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ اب اچھی خاصی گرمی ہوگئی تھی۔ ہم ائرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھے تھے اس لیے گرمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں آتے ہی میں صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ جیک نے ائرکنڈیشنڈ آن کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد ڈرائنگ

روم میں ٹھنڈک ہوگئی۔

جیک تو اپنے کام میں مصروف ہوگیا جبکہ میں سوچنے لگا کہ اب میں کیا کروں؟ میرے پاس فون بھی عام سا تھا جس پر واٹس ایپ نہیں چل سکتا تھا۔ دراصل میں مرینہ، انوشکا اور حیدر الماس صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی بہت یاد آ رہی تھی۔ نہیں جانتا تھا کہ ان مصائب سے میری جان کب چھوٹے گی۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا تھا۔

دوپہر کا کھانا جیک اور میں نے اکٹھے ہی کھایا تھا پھر میں تھوڑی دیر سونے کے لیے بیڈروم میں چلا گیا۔ شام سے ذرا پہلے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ میں بیڈروم سے باہر آگیا۔ جیک شاید گھر میں موجود نہیں تھا کیونکہ مجھے اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ تاہم اپنی تسلی کے لیے میں نے سارا گھر چھان مارا تھا۔ وہ واقعی گھر میں نہیں تھا۔ وہ شاید باہر پیدل گیا تھا کیونکہ کار پورچ میں موجود تھی پھر کافی دیر گزر گئی اور وہ واپس نہ آیا تو مجھے تشویش کے ساتھ ساتھ انجانے خیالات بھی ستانے لگے۔ مجھے وہاں رہتے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے جیک کبھی اتنی دیر باہر نہیں رہا تھا۔

مجھ پر اضطراری کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ سب سے پہلا خیال میرے دماغ میں یہی آیا کہ کہیں مجھے دیکھ تو نہیں لیا گیا تھا کیونکہ میں جب جیک کے ساتھ باہر گیا تھا تو اپنی اصلی شکل و صورت میں تھا لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ رتن کمار کے آدمی مضافات میں بھی موجود ہوں۔

پہلے میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ میں ہاروے سے بات کروں پھر میں نے یہ خیال جھٹک دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان سے بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے جیک کا انتظار کرنا چاہیے۔ میرے پاس اس کا نمبر نہیں تھا ورنہ میں خود ہی کال کر کے اس سے پوچھ لیتا۔ میں اس وقت لان میں کھڑا تھا جب مجھے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ لان سے گیٹ صاف دکھائی دیتا تھا اس لیے میں پوری طرح گیٹ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ ساتھ ہی میری چھٹی حس بھی بیدار ہوگئی تھی۔ قبل اس کے دروازہ کھلتا میں جلدی سے جھاڑیوں کی اوٹ میں ہوگیا تھا لیکن میری نظریں گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ ذیلی دروازہ کھلا اور سب سے پہلے جیک اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک پختہ العمر آدمی تھا جس نے شاید جیک کی کمر سے پستول کی نال لگا رکھی تھی۔

اس آدمی کی رنگت سیاہی مائل تھی، سر کے بال گھنگریالے تھے۔ مونچھ بھی کافی گھنی تھی۔ وہ جیک کو یرغمال بنائے پورچ میں پہنچا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔'' جیک کی جواباً سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میرے ساتھ نوٹنکی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ دبے دبے لہجے میں پھنکارا۔ ''سچ بتاؤ، کہاں ہے وہ؟''

''کہا تو ہے وہ کمرے میں سو رہا ہے۔'' جیک نے کہا۔ ''اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو چلو میں تمہیں اس کے کمرے میں لے چلتا ہوں، خود ہی دیکھ لینا۔''

جواباً اس آدمی نے جیک کے سر پر پستول کا دستہ اس قدر زور سے مارا کہ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ کافی دردناک تھی۔ وہ پورچ میں گر گیا تھا۔ چونکہ درمیان میں کار حائل تھی اس لیے جیک کس حالت میں تھا میں نہیں دیکھ سکا تھا لیکن ان دونوں کی باتوں سے میں سمجھ گیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان میرے بارے میں ہی سوال و جواب ہو رہے تھے۔ اس نے جھک کر شاید جیک کا جائزہ لیا تھا پھر وہ پورچ سے ہوتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی میں بھی جھاڑیوں سے باہر نکلا اور دبے قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اب میرا رخ اس راہداری کی طرف تھا جہاں کمروں کی قطار تھی، انہی کمروں میں سے میرا بیڈروم تھا۔ میں نے راہداری کی نکڑ پر پہنچ کر جھانکا تو وہی آدمی پستول تھامے ایک کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پھر اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ آدمی باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر کراٹے کا ہاتھ رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے اذیت ناک کراہ نکلی اس کے ساتھ پستول چھوٹ کر دور جا گرا.... وہ ابھی پوری طرح کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے کلائی کو پکڑے جھک گیا تھا کہ میرا گھونسا اس کی ناک پر پڑا۔ ایک بار پھر اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا ہوگا، کیونکہ خون دھار کی صورت میں اس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔

اس نے مجھے تین موٹی موٹی گندی گالیوں سے نوازا اور مجنونانہ انداز میں میری طرف بڑھا لیکن میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی پیچھے کی طرف ہوتے ہوئے اس کے منہ

پر لگ ماردی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا۔ اب وہ فرش پر چت پڑا چھت کی طرف دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ لمحہ بھر کے بعد شاید اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے کیونکہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

میں نے اس کا جائزہ لینا مناسب سمجھا کہ کہیں وہ بے ہوش ہونے کا مکر نہ کررہا ہو لیکن وہ حقیقتاً بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور تقریباً عجلت بھرے انداز میں دوڑتا ہوا پورچ میں پہنچا۔

جیک عالم بے ہوشی میں کار سے ایک فٹ کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن ناکامی کی صورت میں، میں نے اسے اٹھایا اور ڈرائنگ روم میں لاکر صوفے پر لٹا دیا پھر میں بھاگ کر کچن سے گلاس میں پانی بھر لایا۔ صوفے کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو کچھ دیر کے بعد وہ کسمساتے ہوئے ہوش میں آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی اس کے منہ سے اذیت ناک کراہ نکلی اور اس نے میری طرف دیکھا۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' میں نے پوچھا تو جواباً اس نے سر ہلا دیا۔ پھر میں نے اسے اٹھ کر بیٹھنے میں مدد دی۔ بیٹھتے ساتھ ہی اس نے اپنی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو ایک بار پھر اس کے منہ سے آہ نکلی۔ پستول کی نال لگنے سے کنپٹی پر زخم بن گیا تھا اور خون نکل کر جم چکا تھا۔

''وہ...... وہ کہاں ہے؟'' جیک نے اسی آدمی کے بارے میں پوچھا جسے میں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اسے بے ہوش کر دیا ہے تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

''کیا تم اسے جانتے ہو...... کون ہے وہ؟'' میں نے جیک سے دریافت کیا۔

''نہیں...... میں اسے نہیں جانتا۔'' جیک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں جیسے ہی گیٹ پر پہنچا تو اچانک اس نے کہیں سے نمودار ہو کر میری کمر سے پستول لگا دی اور تمہارے بارے میں پوچھا۔ میرے انکار پر اس نے اندر دھکیل کر گیٹ لگا دیا اور سر پر پستول کا دستہ مار کر بے ہوش کر دیا۔''

میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''کہیں یہ رتن کمار کا آدمی نہ ہو۔''

''لیکن اس نے تمہیں کیسے پہچان لیا؟ اور تمہاری تلاش میں یہاں تک پہنچ گیا۔'' جیک کی تشویش برقرار تھی۔

''یہی بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے میں تمہارے زخم کی مرہم پٹی کرلوں پھر میں اس سے پوچھتا ہوں۔'' کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میڈیکل باکس کہاں رکھا ہے؟''

''تم میری فکر مت کرو، میں خود مرہم پٹی کرلوں گا۔'' جیک نے بھی صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کی خبر لو، کہیں وہ ہوش میں آکر فرار ہی نہ ہو جائے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چل کر راہداری میں پہنچ گیا۔ وہ آدمی بہ دستور عالم بے ہوشی میں تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر ڈال کر اس کے ہاتھ اور پیر رسی سے کرسی کے ساتھ باندھ دیے۔ اس کے بعد میرے دل میں ایک خیال آیا تو میں نے عمارت سے باہر نکل کر قرب و جوار کے چکر لگائے۔ دراصل میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ آدمی اکیلا یہاں آیا تھا یا اس کے ساتھی بھی تھے۔ قرب و جوار میں مجھے ایسا کوئی بھی شخص دکھائی نہ دیا جس پر مجھے اس آدمی کے ساتھی ہونے کا شبہ ہوتا۔ میں واپس عمارت میں چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں جیک موجود تھا۔ اس نے مرہم پٹی کرلی تھی۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اسے بتایا کہ میں یہ .... دیکھنے گیا تھا کہ کوئی اور تو موجود نہیں ہے۔ ''تم باہر کیا کرنے گئے تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

جیک نے جواباً کہا۔ ''قریب میں ایک اسٹور ہے میں وہاں سے سگریٹ لینے گیا تھا۔'' پھر اس نے بے ہوش آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید یہ بھی وہیں تھا، اس لیے یہ میرے پیچھے آ گیا۔''

میں نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ بعد ازاں میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب میں جیک کے ساتھ باہر گیا تھا تو اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور ہمارا تعاقب کیا ہوگا۔ باقی ساری بات تو اب وہی بتا سکتا تھا۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تو اسے بے ہوش ہوئے آدھا گھنٹا ہونے والا تھا۔ اس کا پستول میری جیب میں تھا جسے میں اس آدمی سے سچ اگلوانے کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں انتظار کررہا تھا کہ یہ آدمی ہوش میں آئے تو میں اس سے پوچھ گچھ کروں۔ اس عمارت کی بیرونی دیواروں پر خفیہ کیمرے بھی نصب تھے۔ باہر ہونے والی کسی قسم کی حرکات و

سکنات بہ آسانی دیکھی جا سکتی تھی۔ سامنے کی دیوار پر ایل ای ڈی آویزاں تھی جس میں چھ مختلف جگہوں کے مناظر دکھائی دے رہے تھے لیکن ان مناظر میں کوئی بھی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا تھا جس پر شبہ کیا جا سکے کہ وہ بندھے ہوئے آدمی کا ساتھی ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو مورس۔'' دفعتاً جیک نے پوچھا تو میں سوچ کی دنیا سے باہر نکل آیا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواباً کہا تو وہ ہنکاری بھر کر رہ گیا۔ اسی طرح ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر جیسے ہی بندھا ہوا آدمی ہوش میں آنے لگا تو ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نظر جب مجھ پر پڑی تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ میں اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے پتلون کی جیب سے اس کا پستول نکالتے ہوئے دریافت کیا۔ پھر پستول کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ اس کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ''سچ بولنا ہی تمہاری زندگی کی ضمانت ہوگا۔ اگر مجھے لگا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو میں دماغ میں گولی اتار دوں گا۔''

''شش...... شنکر...... میرا نام شنکر ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا تم رتن کمار کے آدمی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں دیپک کے لیے کام کرتا ہوں۔''

''مجھے کیسے پہچانا؟'' میں نے پُرغور نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''دیپک کے پاس تمہاری تصویر ہے۔'' اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ''جس رات تم رامو کے ساتھ جارہے تھے تو اسی رات دیپک نے تمہاری تصویر دکھائی تھی اور میں کرشن کے ساتھ تمہیں پکڑنے کے لیے آیا تھا۔''

اب مجھے ساری بات سمجھ آ گئی تھی، جس رات کرشن اپنے ساتھیوں کے ساتھ مجھے پکڑنے آیا تھا تو یہ بھی انہی میں شامل تھا۔ میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس سے پوچھا۔ ''کیا تم نے دیپک کو میرے بارے میں اطلاع دے دی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پہلے میں تمہیں دیکھ کر تصدیق کرنا چاہتا تھا تاکہ میں کسی غلط آدمی پر ہاتھ نہ ڈال دوں اسی لیے میں اس آدمی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم باخبر ہو چکے ہو۔'' کہنے کے ساتھ اس نے جیک کی طرف اشارہ کیا تھا۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے جیک کو اشارہ کیا کہ وہ اکیلے میں میری بات سن لے۔ ہم دونوں ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ جیک نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے باہر کیوں لے آئے ہو۔ میں نے لمحہ بھر کو سوچا پھر پوچھا۔ ''مجھے مشورہ دو جیک کہ اس آدمی کا کیا کرنا چاہیے۔ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا تو یہ ہمارے بارے میں دیپک کو بتا دے گا اور وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں چڑھائی کر دے گا۔''

جیک نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بلا تامل کہا۔ ''گولی مار دو اسے۔ پہلے ہی ہاروے صاحب کا بہت نقصان ہو چکا ہے، اگر ہاروے صاحب کو پتا چل گیا کہ ہم نے اسے زندہ چھوڑ دیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔''

''لیکن......'' میں گڑبڑایا۔ دراصل میں خون خرابے کا قائل نہیں تھا لیکن جیک نے ایسے کہہ دیا تھا جیسے اس کی نظروں میں کسی انسان کی اہمیت ہی نہ ہو۔ اس کی بات بھی درست تھی۔ ہاروے صاحب مزید کوئی نقصان برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکیں گے اسی لیے میں نے سوچا کہ مجھے ان سے رابطہ کرکے بات کرنی چاہیے۔ میں نے سیل فون نکالا اور ہاروے صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا نمبر بند جارہا تھا۔

''ہاروے صاحب کا نمبر بند جارہا ہے۔'' میں نے سیل فون جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اگر تم اسے نہیں مار سکتے تو پستول مجھے دو۔'' جیک نے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ پستول کی طرف بڑھایا۔ ''میں اسے گولی مارتا ہوں۔ سوچو مت۔ پستول مجھے دو۔''

میں متذبذب تھا تبھی جیک نے میرے ہاتھ سے پستول جھپٹا اور روکنے کے باوجود ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ میں اسے روکتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا لیکن جیک نے میری ایک نہ سنی۔ اس نے جاتے ہی شنکر کی پیشانی پر پستول کی نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی آواز ابھری اور شنکر تڑپے بغیر ہی ساکت ہو گیا البتہ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات بدستور موجود تھے۔ مجھے جیک سے اس سفاکی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ جیک نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کی

ایک رمق بھی نہیں تھی۔

''اسے مارنا ضروری ہو گیا تھا مورس۔'' جیک نے صراحت سے کہا۔

''اس کی لاش کا کیا کرو گے؟''

''میں اسے بہت دور پھینک آؤں گا۔'' اس نے پستول اپنی پتلون کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم پریشان مت ہو۔ تم سے کام نہیں ہو سکا اس لیے میں نے کر دیا۔''

''کیا تمہیں افسوس نہیں ہے؟'' میں نے جیک کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''کس بات کا افسوس؟'' جیک کے چہرے پر حیرت لہرائی۔ ''یہ ان لوگوں کا ساتھی تھا جو تمہارے جانی دشمن ہیں۔ اگر ہم اسے زندہ چھوڑ دیتے تو پھر ہمارا زندہ بچنا مشکل تھا اس لیے افسوس کرنے کے بجائے شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں بچا لیا ہے۔''

میں نے اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لاش کو ٹھکانے لگانا اس کا مسئلہ تھا۔ وہ شنکر کی لاش کو کار کی ڈگی میں ڈال کر بہت دور ویران علاقے میں پھینکنے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ آتے وقت وہ باہر سے کھانا لیتا آیا تھا اس لیے ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ کافی بنا لایا اور ہم کافی پینے کے دوران باتیں بھی کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ وہ شنکر کی لاش پندرہ بیس میل دور ایک ویران علاقے میں گھنی جھاڑیوں میں پھینک آیا ہے، لاش پھینکنے سے پہلے اس نے اس کے پستول پر انگلیوں کے نشانات مٹا کر شنکر کی انگلیوں میں پھنسا دیا تھا، تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ میں اس کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ عجیب ہی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔

دن پر دن گزر رہے تھے لیکن ہاروے نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، اخبارات میں ہاروے اور رتن کمار دونوں کے بیانات متواتر شائع ہو رہے تھے۔ ہاروے نے رتن کے خلاف پولیس میں درخواست دے دی تھی اور پولیس معاملے کی انویسٹی گیشن کر رہی تھی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ رات میں کافی دیر تک رتن کمار کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہاروے ابھی رتن کمار کی بیٹی کو کیوں اغوا نہیں کرا رہا تھا کیونکہ ابھی دونوں کے درمیان سرد جنگ جاری تھی ایسی صورتِ حال میں اگر ہاروے، رتن کمار کی بیٹی کو اغوا کراتے ہی صورتِ حال ان کے خلاف ہو جائے گی اور رتن کمار کو ہاروے پر الزام لگانے کا موقع مل جائے گا۔ یہ حکمتِ عملی بہترین تھی لیکن میں پُرسکون نہیں تھا۔ میں جلد از جلد رتن کمار کی گردن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں جیسے جیسے سوچتا تھا الجھتا ہی جاتا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں آخر کروں تو کیا کروں؟

رتن کمار کے آدمی بھوکے کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ آج دیپک کے آدمی نے جس طرح ہمیں ٹریس کیا تھا وہ قابلِ داد تھا لیکن سب سے اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ اس نے ہمارے بارے میں دیپک کو نہیں بتایا تھا ورنہ مسئلہ ہو جانا تھا۔ جیک اور میری دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اگر میں باہر نکلوں گا تو بھیس بدل کر نکلوں گا تاکہ کسی خطرے میں نہ پڑوں۔ نہ جانے ہاروے کب رتن کمار پر ہاتھ ڈالے اس سے پہلے مجھے ہی کچھ کرنا چاہیے، میں نے سوچا اور پھر پروگرام بنانے کے بعد میں لمبی تان کر سو گیا۔

اگلی صبح اٹھنے کے بعد میں نے جیک سے ایک وگ، نقلی داڑھی اور مونچھیں منگوانے کا کہہ دیا۔ پہلے تو وہ حیران ہوا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میں ضروری کام سے شہر جانا چاہتا ہوں تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید وہ ہاروے سے بات کرنے کا سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ہاروے کو نہ بتائے، میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ جیک پس و پیش میں پڑ گیا، اس کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ بالآخر اس نے میری بات مان لی لیکن اس نے شرط عائد کر دی کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھے اس کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے میں نے ہامی بھر لی۔

وہ میرے لیے ایک وگ، نقلی داڑھی مونچھیں لے آیا۔ میں نے وگ اپنے سر پر ایڈجسٹ کی، نقلی داڑھی مونچھیں لگائیں، لباس بدلنے کے بعد جب میں نے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا تو میرا حلیہ کافی بدل گیا تھا۔ رتن کمار یا اس کے ساتھی اگر مجھے دیکھتے تو مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔ جیک نے جب مجھے اس نئے حلیے میں دیکھا تو وہ بھی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جیک تھا اور میں سائیڈ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہم شہر کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد

جیک نے پوچھا۔ ''مورس! کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''ایک ہوٹل میں چلتے ہیں۔'' میں نے جواباً کہا۔

''ہوٹل..... کون سے ہوٹل؟'' جیک نے چونک کر پوچھا۔

''رشی ہوٹل۔''

''وہاں کون ہے؟''

''رتن کمار کا رائٹ ہینڈ دیپک۔'' میں نے بتایا۔

''تمہارا پروگرام کیا ہے؟''

''میں دیپک کو قابو کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے مختصراً بتایا۔ ''پھر میں اسی کے ذریعے رتن کمار تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''یہ بہت رسکی کام ہے۔'' جیک نے خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں زیرِ لب مسکرا دیا۔

''رسک لینا تو میری عادت بن چکی ہے۔'' میں نے جیک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر مت کرو، میں احتیاط کروں گا۔''

''کیا تم دیپک کو اغوا کرو گے؟''

''صورتِ حال دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔'' میں نے اس بار سنجیدہ لہجے میں کہا۔ جیک نے ہنکاری بھری اور خاموشی سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کی شرط ماننا پڑی تھی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ میں باہر نکل کر کچھ کروں اسی لیے میں نے رشی کو قابو کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دیپک آسان شکار نہیں ہے، اس نے اپنے اردگرد بھی غنڈوں کی فوج رکھی ہوئی ہے۔ اس لیے مجھے انتہائی ہوشیاری سے کام کرنا تھا۔

ایک گھنٹا چالیس منٹ کے بعد ہم رشی ہوٹل پہنچ گئے۔ چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے اچھی خاصی گہما گہمی تھی۔ جیک نے کار پارک کی اور ہم دونوں ہوٹل کی لابی سے گزرتے ہوئے ہال میں پہنچ گئے۔ چند میزیں خالی تھیں، ہم دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ میں نے ہال میں طائرانہ نظریں دوڑائیں، ہال میں جتنے بھی افراد موجود تھے وہ سب اپنے لباس اور حلیوں سے امراء دکھائی دیتے تھے، پھر میں نے ریسپشن کی طرف دیکھا، وہاں شلپا تو موجود تھی لیکن دیپک کہیں دکھائی نہیں دیا البتہ اس کی جگہ ایک اور مرد موجود تھا۔ ویٹر انتہائی چابک دستی سے آرڈر سرو کرنے میں مصروف تھے۔ ہال میں بیٹھے لوگ نہایت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے آوازیں... مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔

''کیا یہی دیپک ہے؟'' جیک نے شلپا کے ساتھ کھڑے مرد کی طرف سرسری انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کا لہجہ مدھم ہی تھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شاید وہ ابھی تک نہیں آیا..... یا پھر وہ چھٹی پر ہو۔''

جواباً جیک سر ہلا کر رہ گیا تبھی ایک ویٹر ہماری میز پر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی۔ میں نے میز پر پڑا مینیو اٹھایا اور ویٹر کو آرڈر نوٹ کرا دیا۔

کھانا کھانے کے دوران ہم دونوں ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتے رہے۔ میں وقفے وقفے سے کاؤنٹر کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ دوپہر کے ڈھائی بج گئے لیکن دیپک کی آمد نہ ہوئی تو مجھے بے چینی ہونے لگی۔ میں جس مقصد کے لیے آیا تھا مجھے وہ ناکام ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے میز پر دونوں کہنیاں رکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ ''مجھے شلپا سے معلوم کرنا ہوگا۔''

''شلپا؟'' جیک چونکا۔ ''کون شلپا۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''ریسپشن پر کھڑی لڑکی کی۔'' میں نے جواباً کہا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں۔''

''کیسے؟'' جیک متجسس ہوا۔

''اسی نے مجھے دیپک سے بچایا تھا۔'' میں نے یہ کہنے کے ساتھ ہی مختصراً بتا دیا تو جیک نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو؟'' جیک نے کہا۔ ''جاؤ اور اس سے دیپک کے بارے میں پوچھ لو۔''

''نہیں، ایسے نہیں۔'' میں نے جیک کی تجویز رد کر دی۔ ''بالفرض اگر یہاں دیپک موجود ہوا تو میں اس کی نظروں میں آ جاؤں گا۔''

''اوہو..... اس بارے تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' جیک نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم واقعی دور کی سوچتے ہو۔''

میں نے اس کی داد دینے پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ میں شلپا کی طرف دیکھ رہا تھا جو اپنے کام میں مصروف تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ کہیں جائے تو میں اس کے پیچھے جاؤں اور اس سے بات کروں..... اور پھر میری دعا

قبول ہوگئی۔

شلپا اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کاؤنٹر کے دوسرے کونے پر بنے چھوٹے سے دروازے کو کھول کر باہر نکلی اور اس راہداری کی طرف بڑھ گئی جدھر غالباً کچن تھا۔

''تم یہیں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے جیک کو تلقین کرتے ہوئے کہا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' جیک نے تنبیہ کی۔ میں نے سر ہلایا اور پھر سرسری انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا راہداری کی طرف بڑھا۔ ہال میں بیٹھے افراد کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ مجھے کئی غیر ملکی افراد بھی دکھائی دیئے تھے۔

شلپا سست روی سے چلتی ہوئی جا رہی تھی کہ میں نے پیچھے سے اسے آواز دی۔ ''شلپا۔''

شلپا اپنا نام سن کر رکی اور مڑ کر مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر غیر شناسائی کے تاثرات ابھر آئے۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

''جی کہیے۔'' شلپا نے پُرغور نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شلپا! میں مورس ہوں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا تو وہ بے اختیار چونکی۔

''مورس! آپ...... لیکن......'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ وہ مجھے پہچان گئی تھی۔

''شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔''

''آپ کا حلیہ......''

''میں نے حلیہ بدلا ہوا ہے۔'' میں نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

''اوہ...... سمجھ گئی، آپ نے یقیناً دیپک کی وجہ سے حلیہ بدلا ہوا ہے۔'' وہ سمجھنے والے انداز میں بولی تو میں اس کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بالکل ہی درست اندازہ لگایا تھا۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔''

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''یہ بتاؤ دیپک کب آئے گا؟''

''دیپک؟'' اس نے زیرِ لب دہرایا۔ ''وہ ان دنوں چھٹیوں پر ہے اور کب ڈیوٹی پر آئے کچھ پتا نہیں ہے۔''

''کیا تم اس کے گھر کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟'' میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے اس کے گھر کا کچھ پتا نہیں ہے ورکر فائل میں پتا درج ہوتا ہے لیکن اس تک میری رسائی نہیں ہے۔ البتہ شمی جانتا ہوگا۔''

''تو اس سے پوچھ کر مجھے بتا سکتی ہو؟''

''شمی بھی آج چھٹی پر ہے۔ وہ کل ڈیوٹی پر آئے گا۔ پلیز آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں اگر دیپک کے کسی ساتھی نے آپ کو دیکھ لیا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ یہاں پر دیپک کے چاہنے والے ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے میرے سامنے سے ہٹ کر ہال کی طرف نظر دوڑائی۔ شاید وہ خوف زدہ ہو گئی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنا شروع ہو چکی تھیں۔

''او کے، میں یہاں سے جا رہا ہوں تم پریشان مت ہو۔'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''صرف یہ بتا دو کہ کیا یہاں اور کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو دیپک کے ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ میرا خیال ہے اور کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کے گھر کے بارے میں جانتا ہو کیونکہ وہ دوستی بنانے میں بھی ایک حد رکھتا تھا۔''

''اوہو...... پھر تو مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔'' میں نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

''آپ اس کے گھر کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' شلپا نے استفسارانہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''وہ بہت کھترناک (خطرناک) آدمی ہے۔ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا، لاسٹ ٹائم اس نے اپنے ساتھیوں کو بلا لیا تھا۔''

''سب یاد ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اصل میں میرا کچھ حساب اس کی طرف نکلتا ہے وہی چکتا کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے گہری سانس بھر کر کہا۔ ''خیر...... کیا تم میرے لیے کام کر سکتی ہو؟''

''کیا؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''اگر تم کسی طرح شمی سے مجھے دیپک کے ٹھکانے کے بارے میں معلوم کر دو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''بظاہر یہ بہت مشکل کام ہے۔'' شلپا نے جواباً سوچتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی۔''

''شکریہ۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ مجھے اس کے لہجے سے صاف محسوس ہوا تھا کہ وہ اپنی پوری کوشش کرے گی۔

''لیکن آپ سے رابطہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو۔'' میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ ''میں خود ہی تمہیں فون کرلوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' شلپا نے جواباً کہا اور پھر مجھے اپنا سیل نمبر بتایا تو میں نے کاغذ پر نوٹ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں راہداری سے نکل کر اپنی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ جیک میرا ہی منتظر تھا۔

''کیا کچھ پتا چلا؟'' جیک نے میری طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں دریافت کیا۔

جواباً میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ ان دنوں چھٹیوں پر ہے، کب ڈیوٹی پر واپس آئے گا شلپا کو کچھ پتا نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ شمی، دیپک کے ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہے لیکن وہ بھی آج چھٹی پر ہے۔''

''پھر اب کیا ارادہ ہے؟''

''میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے شلپا سے اس کا سیل نمبر لے لیا ہے، اس نے کہا ہے کہ وہ شمی سے دیپک کے ٹھکانے کے بارے میں معلوم کرنے کی پوری کوشش کرے گی، بہرکیف میں کل شام کو اس سے معلوم کرلوں گا۔ آؤ چلیں۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو بل لانے کا کہا تو وہ دو منٹ کے بعد بل لے آیا اور جیک نے ادائیگی کر دی۔ ہال سے نکلنے سے پہلے میں نے کاؤنٹر کی طرف نظر دوڑائی تھی، شلپا واپس اپنی جگہ پر پہنچ گئی تھی اور اس نے مجھے ہال سے باہر نکلتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہم واپس جا رہے تھے۔ ہمارا ہوٹل میں جانا فضول ثابت نہیں ہوا تھا۔ کم از کم شلپا کا نمبر مل گیا تھا اور مجھے اُمید تھی کہ وہ میرا کام کر دے گی لیکن یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ کہیں شمی اس کی طرف سے مشکوک نہ ہو جائے ورنہ اس لڑکی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ مجھے کسی طور گوارا نہیں تھا کہ میری وجہ سے وہ کسی مشکل کا شکار ہو۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' دفعتاً جیک کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔

''کچھ نہیں۔''

''لیکن تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے تم کسی کے بارے میں فکر مند ہو۔'' جیک نے بیک مرر میں ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاید وہ چہرہ شناس بھی تھا اس نے میرے چہرے کے تاثرات کے ذریعے میرے دل میں پیدا ہونے والے خیالات پڑھ لیے تھے۔ ''کہیں شلپا کے بارے میں......''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو وہ میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔

''اس بات کے سو فیصد امکانات ہیں۔ شمی، دیپک کو بتا سکتا ہے کہ شلپا اس کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ممکن ہے دیپک اس کی طرف سے مشکوک ہو جائے اور اس سے پوچھ گچھ کرے۔ وہ لڑکی ذات زیادہ دیر تشدد برداشت نہیں کر سکے گی اور تمہارے بارے میں بتا دے گی اس طرح وہ تمہارے لیے جال بھی بچھا سکتا ہے اور تم پکے ہوئے پھل کی طرح اس جال میں جا گرو گے۔''

جیک کے تجزیئے نے واقعی مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہرحال یہ امکان موجود تھا جسے رد کرنا بے وقوفی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ میں ہر پہلو پر سوچ رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ سڑک کنارے ٹھیلے والے بھی کھڑے تھے اور لوگ ان ٹھیلوں پر فروٹ وغیرہ خرید رہے تھے۔ دفعتاً میری نظر ایک ٹھیلے کے پاس کھڑے موٹی توند والے شخص پر پڑی تو میں ٹھٹک گیا۔ میں نے غور کیا۔ وہ بلاشبہ رامو تھا۔ وہی رامو جو کچھ عرصہ پہلے مجھے دھوکا دے کر اندھیری گلی میں بھاگ گیا تھا اور کچھ دیر کے بعد دیپک کے ساتھی مجھے پکڑنے کے لیے آ گئے تھے۔

میں نے کچھ سوچ کر جیک سے کہا۔ ''جیک! ذرا کار روکنا۔''

پہلے تو وہ چونکا پھر اس نے کار کی رفتار ہلکی کرتے ہوئے سڑک کنارے روک دی اور گردن موڑ کر استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کار کیوں رکوائی ہے۔

میں کوئی جواب دیئے بغیر کار سے اترا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اسی ٹھیلے کی طرف بڑھ گیا جہاں رامو کھڑا تھا۔ شاید وہ پھل خرید رہا تھا۔ میرا حلیہ بدلا ہوا تھا اس لیے مجھے پریشانی نہیں تھی کہ وہ مجھے پہچان لے گا۔

رامو پھل والا شاپر اٹھائے مڑنے ہی لگا تھا کہ میں اس

کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور میری سائیڈ سے نکلنا چاہا تو میں نے اسے روک لیا۔ اس کے ماتھے پر تشکا تھا۔

''رامو۔'' میں نے حتی الامکان آواز بدل کر اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ اپنا نام سن کر ٹھٹکا۔

''کون؟'' اس نے بہ غور میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔'' میں نے بدستور سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ''میری جیب میں پستول موجود ہے۔ اگر تم نے چوں چرا کی تو میں گولی چلادوں گا۔ سمجھے۔''

''لیکن.....'' وہ متذبذب ہوا پھر کچھ سوچ کر وہ میرے ساتھ چل دیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ میں اسے کار کی طرف لے جارہا تھا۔

''کون ہو تم.....'' وہ دوبارہ مستفسر ہوا۔ اس کے لہجے میں بدستور گھبراہٹ تھی۔ اس دوران ہم کار کے قریب پہنچ چکے تھے۔

میں نے کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال اندر بیٹھو۔''

پہلے وہ ہچکچایا مگر جب میں نے دوبارہ اسے گولی مارنے کی دھمکی دی تو وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے کار میں بیٹھ گیا۔ میں بھی اسی کے ساتھ بیٹھ گیا اور جیک سے کہا۔ ''چلو۔'' میں نے جیک کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔

جیک نے میری بات سنتے ہی کار آگے بڑھادی۔ رامو پُرغور نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ شاپر اس کے ہاتھ میں تھا۔ خوف کے مارے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں بھی چمک رہی تھیں۔

''کون ہو تم اور مجھے کہاں لے جارہے ہو؟'' اس نے دوبارہ مجھ سے استفسار کیا۔ میں نے بیک مرر میں جیک کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ بھی الجھا الجھا سا تھا۔

''خاموش بیٹھے رہو۔'' میں نے اس بار اسے ڈانٹا۔

''تم مجھے اغوا کر رہے ہو؟'' وہ خاموش ہونے کی بجائے پوچھنے لگا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو مجھے کہاں لے کر جارہے ہو؟''

''اپنے ساتھ.....''

''لیکن کیوں؟''

میں جانتا تھا جب تک رامو کو اس کے سوال کا جواب نہیں مل جائے گا وہ چپ نہیں بیٹھے گا اس لیے اسے خاموش کرنا ضروری تھا۔ میں نے جواب دینے کی بجائے برق رفتاری سے اس کی کنپٹی پر مکا رسید کردیا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی مگر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے ایک اور مکا اس کی کنپٹی پر مار دیا۔ اس بار اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ سیدھا ہو کر اپنی سائیڈ کے دروازے کی طرف لڑھک گیا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں اور شاپر بھی ہاتھ سے چھوٹ کر کار کے فرش پر گر چکا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' دفعتاً جیک نے پوچھا۔

''یہ دیپک کا ساتھی ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''اس سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ یہ یقیناً دیپک کے گھر کے بارے میں جانتا ہوگا۔''

جیک نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ہم ابھی شہر میں ہی موجود تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد جیک نے کار مضافات کی طرف جانے والی سڑک کی طرف موڑ دی اور اس کی رفتار میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ اس سڑک پر بھی اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ہوا چل رہی تھی جس سے کھیتوں میں فصلیں ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھیں۔ ان کھیتوں میں کچھ لوگ بھی کام کر رہے تھے۔

آدھے گھنٹے کے مزید سفر کے بعد ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ رامو چونکہ بھاری جسامت کا انسان تھا، اسے اکیلا اٹھا کر اندر لے جانا میرے بس کی بات نہیں تھی اس لیے ہم دونوں نے مل کر پہلے اسے کار سے باہر نکالا پھر اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹتے ہوئے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ کرسی پر ڈال کر میں نے اس کے ہاتھ پیر کرسی کے ساتھ باندھ دیئے۔ اس کی گردن دائیں طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔

اُس روز گرمی غضب کی پڑ رہی تھی۔ میرے جسم کے تمام مساموں سے پسینا ابل رہا تھا۔ حالانکہ جب ہم کار میں تھے تو اے سی چل رہا تھا لیکن جیسے ہی باہر نکلے تو یوں لگا جیسے ہم تپتے صحرا میں آگئے ہوں۔

میں نے پہلے کچن میں جا کر پانی سے اپنی پیاس بجھائی پھر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ جیک واش روم میں چلا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اے سی چل رہا تھا اس لیے کچھ ہی دیر کے بعد پسینا سوکھ گیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ رشی ہوٹل جانا میرے لیے سود مند ثابت ہوا تھا۔ اگر رشی ہوٹل نہ جاتا تو

شاید واپسی پر رامو مجھے دکھائی نہ دیتا۔ رامو کو دیکھ کر میرے اندر اہال تو پیدا ہوا تھا لیکن میں نے خود پر کنٹرول کیا تھا۔

کچھ منٹ کے بعد جیک واش روم سے آگیا۔ وہ نہا کر آیا تھا اور... کافی فریش لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے بھی نہانے کا کہا تو میں بھی واش روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر میں ڈرائنگ روم میں آیا تو جیک کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوگیا تھا۔ رامو بہ دستور عالم بے ہوشی میں تھا۔ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر میں نے رامو کو ہوش میں لانے کا فیصلہ کیا۔ پانی والا جگ اٹھا کر میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو چند لمحوں کے بعد وہ ہوش میں آگیا۔

میں چونکہ اس کے سامنے بیٹھا تھا اس لیے ہوش میں آتے ہی جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ حیرت سے گنگ رہ گیا۔ میں اس وقت اپنے اصل حلیے میں تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات نمایاں ہوگئے تھے اور وہ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔

''تت..... تت..... تم۔'' اس کے منہ سے سرسراتی آواز میں یہ الفاظ نکلے۔

''تمہاری حیرت دیدنی ہے۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے دھوکا دے کر دیپک کے بھیجے ہوئے کتوں کے حوالے کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن تم کامیاب نہیں ہوسکے رامو۔''

جواباً وہ تھوک نگلنے پر مجبور ہوگیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ بس خوف بھری نظروں سے مجھے تکتا رہا اور میں دل ہی دل میں اس کے خوف سے حظ اٹھا رہا تھا۔

''تم..... مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس کے لہجے میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

''کیا تمہاری پتنی اور بچے ہیں؟'' میں نے مدعے پر آنے سے پہلے رامو کے خاندان کے حوالے سے پوچھنا بہتر سمجھا۔ میری بات سن کر رامو چونکا۔

''ہاں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''میری پتنی ہے اور میرے تین بچے ہیں۔''

''ہم۔'' میں نے سنجیدہ انداز میں ہنکاری بھری پھر ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی۔ ''غور سے میری بات سنو رامو، اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے اناتھ نہ ہوں اور تمہاری پتنی ودھوا نہ ہو تو میں جو کچھ پوچھوں، تمہیں مجھے اس کا صحیح جواب دینا ہوگا۔ کیا کہتے ہو؟''

میری بات سن کر رامو کا چہرہ خوف سے فق ہوگیا۔ اس کے وجود پر کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ..... یہ انیائے مت کرنا۔ تم..... تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''مجھے دیپک کے ٹھکانے کا بتا دو۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''بس مجھے اور کچھ معلوم نہیں کرنا۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں اس کی آنکھوں میں پُرغور نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے یا سچ بتاتا ہے۔

''میں..... میں بتا دوں گا۔'' کہنے کے ساتھ ہی شاید اس نے اپنے خشک حلق کو بھی تر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''میں تمہاری بنتی کرتا ہوں، میرے پریوار کو کچھ مت کہنا۔ لیکن میں یہ تمہیں بتا دوں کہ رتن کمار اور دیپک کے آدمی تمہیں پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ تم زیادہ دیر ان سے نہیں بچ سکو گے۔ وہ تمہارا کھون (خون) پینے کے لیے بے چین ہیں۔''

رامو نے بندھا ہونے کے باوجود مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ میں مسکرا دیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے عقب میں آگیا۔ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کی چنتا مت کرو رامو۔ وقت آنے پر میں تمہارے گرو گھنتال رتن کمار سے دو دو ہاتھ کروں گا۔ چلو اب دیپک کے گھر کا ایڈریس بتا دو۔''

''ہاں..... بتاتا ہوں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا پھر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ''پہلے مجھے وچن دو کہ تم میرے پریوار کے ساتھ کچھ نہیں کرو گے۔ دو وچن۔''

میں اس کے عقب سے گھوم کر اس کے سامنے آگیا تو وہ بھی اپنی گردن گھماتا گیا۔ وہ نفسیاتی طور پر میرے رعب میں آگیا تھا اور اسے خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اگر میں نے دیپک کے گھر کا ایڈریس نہ بتایا تو یہ میرے پریوار کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں وچن دیتا ہوں کہ تمہارے پریوار کو کچھ نہیں کہوں گا۔ چلو اب دیر مت کرو، دیپک کے گھر کا ایڈریس بتا دو۔''

''دیپک کی بھیم کالونی میں کوٹھی نمبر ایک سو تین ہے۔'' رامو نے کہا۔

''ان دنوں وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میری

اطلاع کے مطابق وہ جس ہوٹل میں جاب کرتا ہے وہاں سے اس نے چھٹیاں لی ہوئی ہیں اور تم یقیناً جانتے ہو گے کہ وہ ان دنوں کہاں موجود ہے۔ ہیں نا؟''

میرے انکشاف پر رامو کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں دیپک کے بارے میں اتنی جانکاری رکھتا ہوں۔

''مجھے نہیں معلوم دیپک کہاں گیا ہوا ہے۔'' رامو نے شاید اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس نے تھوک نگلی تھی۔

''پھر کس کو معلوم ہوگا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''شاید اس کی دیدی کو پتا ہوگا۔'' رامو نے جواب دیا۔

''تمہاری دیپک سے آخری ملاقات یا بات چیت کب ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس کی دیدی کہاں رہتی ہے اور اس کا نام کیا ہے؟''

''دیپک کی دیدی کا نام رادھا ہے۔'' رامو نے بتایا۔ ''وہ بھی دیپک کے گھر میں رہتی ہے۔ وہ ودھوا (بیوہ) ہے۔ دیپک سے میری آخری بار بات دو ہفتے پہلے ہوئی تھی اس کے بعد نہیں ہوئی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جب تک میں دیپک تک نہیں پہنچ جاتا تم ہمارے مہمان رہو گے۔''

رامو نے واویلا مچانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ وہ اوغ اوغ جیسی آوازیں نکالنے لگا ساتھ ہی منہ سے رومال بھی نکالنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اسی لمحے جیک بھی شاید رامو کے واویلا مچانے کی آواز سن کر آگیا۔ اس نے جب رامو کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا دیکھا تو وہ ساری بات سمجھ گیا۔

''جیک! میں اسے کچھ دن یہاں مہمان کے طور پر رکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے جیک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا ایسا ممکن ہوسکتا ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔'' جیک نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ ''وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اسے کسی کمرے میں پہنچا دو ورنہ یہ عجیب و غریب آوازیں نکال کر ہمارا دماغ چاٹتا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' جیک نے کہا۔ ''میں کچھ کرتا ہوں۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ ایک کمرے میں چلا گیا، رامو میری طرف التجائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اوغ اوغ کرتا رہا جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میرے دماغ میں جو منصوبہ تھا میں نے اس پر عمل کرنا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جیک آگیا۔

''اسے لے چلو۔'' جیک نے کہا۔ ''میں نے تہ خانے کا دروازہ کھول دیا ہے۔''

مجھ پر آج پہلی بار انکشاف ہوا تھا کہ اس عمارت میں تہ خانہ بھی تھا حالانکہ مجھے وہاں رہتے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ میں نے رامو کے منہ سے پہلے کپڑا نکالا پھر اس کی رسیاں کھولنے لگا۔ رامو یوں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا جیسے موت سے بچ کر نکلا ہو۔ رسیاں کھولنے کے بعد میں نے اسے کالر سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ منت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

''میں تمہاری بنتی کرتا ہوں، مجھے چھوڑ دو، میں نے دیپک کے گھر کا پتا بتا تو دیا ہے۔''

''چھوڑ دوں گا رامو، پریشان مت ہو۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا اور اسے آگے کی طرف دھکیلا۔ وہ صوفے سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا تھا۔

''ابھی چھوڑ دو نا۔'' رامو ایک بار پھر منت سماجت پر اتر آیا۔ ''میں وچن دیتا ہوں، میں دیپک سے تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔''

''تم خاموشی سے چلتے ہو یا ہم زبردستی کریں؟'' میں نے ترش روئی سے کہا۔

''میں......'' رامو نے دوبارہ کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کے منہ پر ایک گھونسا جما دیا۔ میرا گھونسا اس کے ہونٹ پر لگا تھا جس سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ خون کی ایک دھار سی نکل کر اس کے لباس پر پڑی تھی۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے کراہ بھی نکلی تھی۔

''اب اگر بولے تو میں تمہارا حلیہ بگاڑ دوں گا۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''چل۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے اسے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا گیا لیکن فرش پر گرا نہیں تھا۔

اسی لمحے جیک نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا اور اسٹور روم کی طرف لے گیا۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ اسٹور روم میں کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دیوار کا کچھ حصہ گھوم کر باہر کو نکلا ہوا تھا اور دوسری طرف مرکزی بلب کی روشنی میں سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ رامو تہ خانے میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن ہم دونوں ہی اسے

گھسیٹتے ہوئے تہ خانے میں پہنچا آئے۔

تہ خانہ کافی وسیع تھا۔ ایک کونے میں چوڑا سا پلنگ پڑا تھا۔ پلنگ کے ساتھ ہی لکڑی کی ایک میز پڑی تھی جس پر کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ کمرے کے دوسرے کونے کی طرف باتھ روم کا دروازہ تھا۔ تہ خانے میں ایک مرکزی بلب جل رہا تھا۔ رامو نے دوبارہ واویلا مچانے اور چھوڑنے کی بات کی تھی لیکن پیٹ میں پڑنے والی میری لات نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ ہم اسے اسی حالت میں چھوڑ کر تہ خانے سے باہر آگئے تھے۔ سیڑھیوں کے شروع میں لوہے کا ایک دروازہ تھا جسے جیک نے بند کر دیا۔ کونے میں ایک جگہ چھوٹا سا ابھار تھا جس پر جیک نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دیوار برابر ہو گئی۔ بہت ہی جدید اور خفیہ انداز میں یہ تہ خانہ بنایا گیا تھا۔ دیوار کے برابر ہونے کے بعد محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی دوسری طرف کوئی تہ خانہ بھی ہوسکتا ہے۔

جیک میری حیرت کو بھانپ چکا تھا اس لیے وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ تہ خانہ ہاروے صاحب نے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ انہوں نے مستری اور مزدور آگرے سے منگوائے تھے اس لیے اگر یہاں دشمن بھی پہنچ جائیں تو وہ تہ خانے تک نہیں پہنچ سکتے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے جیک نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا رامو نے دیپک کے ٹھکانے کے بارے میں کچھ بتایا؟''

جواباً میں نے اسے مختصر طور پر بتا دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پھر پوچھا۔ ''کیا تم دیپک بابو کے گھر جاؤ گے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''دراصل میں رتن کمار کی گردن ناپنے کے لیے بہت بے چین ہوں اس لیے جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

اسی طرح ہم باتیں کرتے رہے اور پھر شام ہو گئی، رات کا کھانا کھانے سے پہلے میں رامو کو کھانا دینے کے لیے تہ خانے میں آگیا۔ جیک نے مجھے تہ خانے کا دروازہ کھولنے کا میکنزیم بتا دیا تھا۔ میں نے انتہائی احتیاط سے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ گیا۔ رامو بستر پر سو رہا تھا۔ میں نے ٹرے میز پر رکھی اور رامو کو جگایا۔

رامو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا ہونٹ سوجا ہوا تھا اور خون بھی جم چکا تھا۔ ''اوہو......کیا ہو گیا ہے؟''

''کھانا کھا لو۔'' میں نے کہتے ساتھ ہی میز پر پڑی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ بتاؤ، میں کہاں موجود ہوں؟'' رامو نے ایک نظر ٹرے پر ڈالی اور پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔

''تم کس لیے پوچھ رہے ہو؟'' میں نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا اور پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

''وہ...... ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' وہ گڑبڑایا۔ پھر اس نے استفسار کیا۔ ''مورکھ، مجھے یہاں سے کب جانے دو گے؟ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''اتنی بھی کیا جلدی ہے رامو۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک میرا مقصد پورا نہیں ہو جاتا تم یہیں رہو گے۔''

اس نے اور کوئی بات نہ کی اور میں اٹھ کر واپس اوپر آگیا۔ میں نے تہ خانے کا دروازہ اچھی طرح بند کیا تھا تاکہ رامو گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ پھر میں نے اور جیک نے مل کر کھانا کھایا اور آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔ میرا ارادہ آج رات ہی دیپک کے گھر جانے کا تھا لیکن جیک چاہتا تھا کہ آج نہیں کل چلے جانا اور اس بارے میں ہاروے صاحب کو بھی مطلع کر دو۔

میں ہاروے صاحب کو مطلع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب انہیں پتا چلے گا تو وہ مجھے دیپک کے گھر جانے سے منع کر دیں گے اس لیے میں نے جیک سے درخواست کی کہ وہ اس بارے میں ہاروے صاحب کو کچھ نہ بتائے۔ جیک تذبذب کا شکار ہوا تھا کہ اگر میری غیر موجودگی میں ہاروے صاحب کا فون آگیا یا وہ خود یہاں آگئے تو میں انہیں کیا جواب دوں گا؟

ہاروے صاحب اپنے ہوٹل کے حوالے سے الجھے ہوئے تھے اس لیے ان کا یہاں آنا ممکن نہیں تھا لیکن یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ میں جیسا سوچ رہا ہوں ویسا ہی ہو۔ بہرکیف، میں نے آج رات دیپک کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے سوچا۔

پھر رات کے تقریباً گیارہ بجے میں اور جیک ہم دونوں کار میں سوار ہو کر شہر کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا حلیہ نہیں بدلا تھا میں اپنے اصل حلیے میں تھا۔ جیک اسی شہر کا تھا اس لیے وہ چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک بار بھیم کالونی جا چکا ہے اس لیے اسے راستوں کا علم

تھا۔ رات کا وقت تھا ٹریفک اگرچہ کم تھا لیکن سڑک کے دونوں طرف سے جاری تھا۔ جگہ جگہ لگے مرکری بلب اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ کئی جگہوں پر کھانے پینے کے چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور کولڈ ڈرنک کارنر بھی کھلے ہوئے تھے۔

تقریباً سوا گھنٹے کے بعد ہم بھیم کالونی میں پہنچ گئے۔ کوٹھی نمبر ایک سو تین ہمیں تلاش کرنے میں دقت پیش نہ آئی۔ میں نے جیک کو کار میں بیٹھے رہنے کا کہا اور خود اتر کر دیپک کے مکان کی طرف بڑھا۔ کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ دیپک کا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوٹھی میں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ میں الجھن کا شکار ہوا۔ یہ قول رامو کے دیپک کے گھر اس کی ودھوا بہن رادھا رہتی تھی۔

دیپک کا مکان شاندار تھا۔ اس کا لوہے کا بڑا سا گیٹ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اتنے شاندار مکان کا مالک ہونے کے باوجود وہ ہوٹل میں کاؤنٹر مین کی جاب کیوں کر رہا ہے؟ پھر میں نے اپنے سوال کا جواب خود ہی اخذ کر لیا کہ وہ رتن کمار کا آدمی ہے اس کے دشمنوں پر نظر رکھنے کے لیے وہ کام کر رہا ہوگا۔ یہ بات بھی سوچ طلب تھی کہ دیپک کسی اور ہوٹل میں جاب کرنے کی بجائے رتن کمار کے ہوٹل میں کام کیوں نہیں کر رہا؟ میں نے سوچا کہ جب دیپک میرے ہتھے چڑھے گا تو میں اس سے یہ سوال ضرور پوچھوں گا۔

وہاں جتنے بھی مکانات تھے تین تین مکانوں کے بعد دس دس گز کا فاصلہ تھا۔ دیپک کی کوٹھی بھی آخر میں تھی اور اس کے بائیں طرف دس گز کی گلی تھی۔ میں اس گلی والی دیوار کود کر دیپک کے گھر میں کود سکتا تھا۔ قبل اس کے کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا، دفعتاً دور سے آتی ایک کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی عین اسی درخت پر پڑی جس کی اوٹ میں، میں موجود تھا۔ اگلے ہی لمحے میں بری سرعت کے ساتھ مکمل طور پر درخت کی اوٹ میں ہو گیا کہ کار میں بیٹھے کسی فرد کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔

میں اس کار کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک ٹیکسی تھی اور میرے سامنے سے گزرنے کی بجائے دیپک کی کوٹھی کے عین سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ٹیکسی کی اندرونی لائٹ آن تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور بیٹھا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لمحہ بھر کے بعد ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک عورت برآمد ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس عورت کی عمر تیس بتیس سال ہوگی۔ اس نے جینز کی پینٹ اور فل شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں ہائی ہیل تھی۔ اس نے ہینڈ بیگ سے پیسے نکال کر ڈرائیور کو دیئے اور گیٹ کی طرف بڑھی۔ لمحہ بھر کے بعد ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھائی اور وہاں سے چلا گیا۔

میں اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رامو نے بتایا تھا کہ دیپک کے گھر اس کی ودھوا بہن رادھا بھی رہتی ہے پھر یہ لڑکی کون تھی؟ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی آہنی دروازے کو کھولا گیا ہو۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس لڑکی نے اپنے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا تھا۔

پھر مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور تین منٹ کے بعد ہی لائٹس آف ہو گئیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ رادھا تھی تو بہت ہی ماڈرن لڑکی تھی۔ ہندو بیوہ عورتیں نہ تو زیور پہنتی ہیں اور نہ ہی رنگین کپڑے۔ سفید رنگ کی ساڑی ان کا مقدر ہوتی ہے لیکن کوٹھی میں جانے والی لڑکی اگر رادھا تھی تو اس نے بیوہ ہونے کے باوجود سفید ساڑی کیوں نہیں پہنی ہوئی تھی۔ بہرکیف، میں نے اس سوچ کو جھٹکا اور درخت کی اوٹ سے نکل کر گلی کی طرف بڑھا۔

گلی والی دیواریں زیادہ بلند نہ تھیں اس لیے مجھے دیوار پر چڑھنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ دوسری طرف وسیع لان تھا اور اینٹوں کی بنی ہوئی چوڑی سی روش اندرونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ لان میں اندھیرا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ کسی نے مجھے دیوار کودتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔ سامنے اندرونی حصے میں لائٹ جل رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ لڑکی اسی کمرے میں گئی تھی۔ کوٹھی سے نکلتے وقت میں نے ریوالور نکالا اور دبے قدموں چلتا ہوا اندرونی حصے میں دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے دوسری طرف سے سن گن لینے کی کوشش کی پھر میں نے ہینڈل پکڑ کر دروازہ کھول دیا۔ قبل اس کے کہ میں اندر داخل ہوتا، اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی، میں بجلی کی سی تیزی سے مڑا ہی تھا کہ ایکا ایکی کسی نے میری گردن پکڑی اور مجھے فضا

میں بلند کر دیا۔ چہرہ بلند ہونے کی وجہ سے میں اس کی شکل نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس کی گرفت خاصی تیز تھی۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے مجھے فرش پر پٹخ دیا۔

میرے حلق سے کراہ نکلی۔ سر فرش سے ٹکرانے کی وجہ سے مجھے آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں بھی تارے دکھائی دیے۔ میں نے ایک بار پھر سنبھلنے کی کوشش کی لیکن پیلوں میں پڑنے والی ٹھوکر نے مجھے دوہرا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے پاس ریوالور تھا لیکن مجھے اسے چلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا میں اس کی شکل نہیں دیکھ پایا تھا، اس نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی اور وہ اس وقت تک مجھے ٹھوکریں مارتا رہا جب تک میں بے ہوش نہیں ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے بے ہوش ہو جانے کے بعد بھی وہ مجھے ٹھوکریں مارتا رہا تھا یا نہیں لیکن جب مجھے ہوش آیا تو درد سے میرے منہ سے کراہیں نکل گئیں۔ پورا جسم پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ جسم کے جس بھی حصے پر ہاتھ رکھتا تو درد کی ایک زوردار ٹیس نکلتی۔

میں نے مکمل طور پر ہوش میں آنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھا تو میں ایک کمرے میں فرش پر موجود تھا۔ وہ کمرا خاصہ بڑا تھا لیکن فرنیچر نام کی کوئی چیز بھی موجود نہیں تھی۔ فرش بالکل صاف ستھرا تھا۔ چھت بھی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ چھت پر پنکھا لگا ہوا تھا لیکن وہ بند تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کے سارے مساموں سے پسینا نکل رہا تھا۔ کمرے کے دو دروازے دکھائی دیئے تھے۔ ان میں سے ایک یقیناً واش روم کا تھا اور دوسرا تہہ خانے سے نکلنے کا۔

میں چند لمحے فرش پر پڑا مرکری بلب کی روشنی میں چھت اور سپاٹ دیواروں کو گھورتا رہا پھر ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اس کمرے کی کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا جس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ تہہ خانہ ہے۔ سارے مناظر کسی فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گھومے اور مجھے یاد آ گیا کہ میں دیپک کی کوٹھی میں اس کی ودھوا بہن سے دیپک کے بارے میں پوچھنے آیا تھا لیکن اچانک کسی نے آ کر مجھے دبوچ لیا تھا اور فرش پر پٹخ کر مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی تھی۔

لیکن یہ سب سوچتے ہوئے میں الجھن کا شکار ہو گیا تھا اور مختلف سوالات سر ابھار رہے تھے۔ رامو نے بتایا تھا کہ دیپک کی کوٹھی میں اس کی ودھوا بہن رادھا اکیلی رہتی ہے اور دیپک کہیں گیا ہوا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو جس پر مجھے رادھا ہونے کا شبہ ہوا تھا، اکیلی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا، تو کیا اس مرد کو پتا تھا کہ میں دیپک کے بارے میں پتا کرنے کے لیے یہاں آؤں گا اور وہ مجھے چھاپ لے گا۔

مگر سوال یہ تھا کہ مجھے چھاپنے والا کون تھا اور اسے کیسے پتا چلا تھا کہ میں یہاں آ رہا ہوں؟ جس انداز میں مجھے پکڑا گیا تھا اور تہہ خانے میں قید کیا گیا تھا اس سے یہی ثابت ہوا تھا کہ کسی نے میری مخبری کی تھی، کس نے مخبری کی تھی اس بارے میں، میں خاصا الجھ گیا تھا۔

میں اس بات پر بھی حیران تھا کہ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے نہیں تھے۔ شاید وہ مطمئن تھے کہ میں یہاں سے فرار نہ ہو سکوں گا۔ مجھے وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے جیک کی بھی فکر تھی۔ پتا نہیں وہ ابھی تک باہر موجود تھا یا واپس چلا گیا تھا۔ میں کچھ دیر جیک کے بارے میں سوچتا رہا پھر میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ لکڑی کا مگر خاصہ مضبوط تھا۔ میں نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمانا چاہا لیکن یہ دیکھ کر میرے اندر مایوسی کی لہر دوڑ گئی کہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ میں نے ہینڈل کو جھنجوڑ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر میں پلٹا اور سامنے کے رخ والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر میرے دماغ پر سوچوں نے یلغار کر دی۔ مجھے جیک کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ سوچتے سوچتے مجھے اونگھ آ گئی اور میں دیوار کے ساتھ ہی ٹیک لگا کر سو گیا۔

نہ جانے میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک نیند کی حالت میں مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے ہوں۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی اور میں نے بال مٹھی میں جکڑنے والے کو دیکھا۔ پتا نہیں وہ بدبخت کون تھا۔ اس کے چہرے پر بہے پناہ درندگی تھی۔ آنکھوں میں خون جیسی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جینز اور پیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بال جکڑے ہونے کی وجہ سے مجھے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی گرفت سے بال چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملی۔

''بڑے مزے سے سو رہا تھا..... ہیں۔'' وہ اُپنے دانتوں کو کچکچاتے ہوئے بولا۔ اگلے ہی لمحے اس نے مجھے فرش پر دھکا دے دیا۔ میں ایک دھماکے سے فرش پر گرا، پھر میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر میری پسلی میں

ٹھوکر رسید کر دی۔ میرے منہ سے تکلیف سے بھری چیخ نکل گئی جس سے تہہ خانے کے در و دیوار گونج اٹھے۔

میرا سر پتھریلے فرش سے ٹکرایا تھا جس سے مجھے اپنا دماغ جھنجھناتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ میں نے دائیں کہنی کے بل اٹھتے ہوئے سر کو جھٹکا۔ اس دوران اس شخص نے ایک بار پھر میری پسلیوں پر ٹھوکر رسید کر دی اور مجھے اپنی چیخ حلق میں ہی دبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے اس پر بس ہی نہ کیا بلکہ اس نے رک رک کر مجھے ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں اور میری حالت پتلی ہونے لگی۔

ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، میں اس کو اپنی گرفت میں لے کر زیر کر سکتا تھا، میں اسے ایسا مزہ چکھاتا کہ جنم واصل ہونے کے بعد بھی مجھے یاد رکھتا مگر میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تو وہ ٹھوکر مار دیتا اور نتیجتاً میری حالت غیر ہو جاتی۔ یوں لگتا تھا کہ آج وہ اپنا سارا غصہ مجھے ٹھوکریں مار مار کر ہی اتارے گا۔ جب میں نڈھال ہو گیا تو تب اس نے میری جان بخشی اور پیچھے ہٹ کر مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگا۔ میں نے پہلی بار دیکھا تھا کہ دروازے کے پاس ہی وہ لڑکی بھی کھڑی تھی جسے میں نے راہداری میں دیکھا تھا۔ جب راجیش مجھے ٹھوکریں مار رہا تھا تو میری نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔

تبھی دروازہ کھلا اور ایک آدمی کے کندھے پر بے ہوش جیک کو لیے اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میرے منہ سے سانس خارج ہو گئی۔ اس نے جیک کو فرش پر ڈالا اور عورت کے قریب ہی جا کر کھڑا ہو گیا لیکن وہ بھی مجھے خوں خوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹھوکریں کھانے کے باعث مجھے اپنی پسلیوں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ پہلے کی نسبت اب تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں آخری دم تک لڑنا چاہتا تھا۔

نہ جانے اس لمحے میری درگت بنانے والے کے دل میں کیا سمائی کہ وہ غصے سے پھنکارتا ہوا میری طرف بڑھا اور اس نے ایک بار پھر میری پسلیوں میں ٹھوکر رسید کرنے کی کوشش کی لیکن اب کی بار میں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ میں نے تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کا پیر پکڑ لیا اور اس شدت سے مروڑ دیا کہ اس کے منہ سے دردناک چیخ نکل گئی پھر جب تک وہ سنبھلتا میں نے زور سے اسے دھکا دے دیا۔ پہلے تو وہ لڑکھڑایا پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے ہی پیچھے کھڑے آدمی اور لڑکی پر جا گرا۔ تینوں ہی عقب میں دیوار سے ٹکرا گئے لیکن گرے نہیں تھے۔

وہ مجھے غلیظ گالیوں سے نوازتا ہوا تیزی سے میری طرف بڑھا لیکن ساتھ کھڑی لڑکی نے جلدی سے اس کے سامنے آ کر اسے روک لیا۔ ''رک جاؤ راجیش۔ اب بس کرو۔''

اس کا نام راجیش تھا۔ وہ پھرا ہوا سانڈ دکھائی دے رہا تھا جیسے اپنے شکار کو چیر نے پھاڑنے کے لیے بے چین ہو۔

''میں اس کا خون پی جاؤں گا۔'' راجیش پھنکارتے ہوئے بولا۔ ''مجھے مت روکو جوتی۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے دوبارہ میری طرف بڑھنا چاہا لیکن جوتی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔

''کہیں یاد نہیں ہے، دیپک نے کیا کہا تھا؟'' جوتی نامی اس لڑکی نے شاید اسے کچھ یاد دلانے کی خاطر کہا تھا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''تم اس کے احکامات کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ تم نے اپنی بھڑاس نکال لی ہے، اسے اب اس کے حال پر چھوڑ دو۔ باقی دیپک خود ہی آ کر اس سے نمٹے گا۔''

راجیش یوں لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے اپنا غصہ سانس پر ہی اتار رہا تھا۔ پھر وہ انگشت شہادت میری طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر مجھے یہ نہ روکتی تو میں آج تجھے نرک میں پہنچا دیتا۔ پر نام کرا سے، جس نے تیری زندگی بچائی ہے۔''

''زندگی اس نے نہیں، میرے اللہ نے بچائی ہے اور میری زندگی و موت اسی کے ہاتھ میں ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''نرک میں کون جاتا ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن میں تمہیں وچن دیتا ہوں، میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے نرک میں پہنچاؤں گا۔''

میری بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور منہ سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی تھی۔ اگلے ہی پل راجیش بپھرے بیل کی طرح میری طرف بڑھا۔ جوتی نے اسے روکنے کی حتی المقدور کوشش کی لیکن وہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔ راجیش کا ارادہ میرے پیٹ میں ٹھوکر مارنے کا تھا لیکن میں اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔

اُس وقت زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اگر میں اپنے دفاع میں کچھ نہ کرتا تو وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ شاید اس کے پاس ہتھیار نہیں تھا..... یا اگر تھا تو اسے استعمال کرنا یاد نہیں تھا۔ بہرکیف میں اب اس کی ٹھوکریں کھانے کے موڈ میں نہیں تھا اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچتا میں نے انتہائی تیزی سے اٹھتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی

تھی۔ شاید راجیش کو میری طرف سے ردِعمل کی توقع نہیں تھی اس لیے اس بار وہ واقعی مار کھا گیا تھا۔ میں نے چھلانگ لگاتے ساتھ ہی اس کی ناک پر مکا رسید کر دیا۔ اگلے ہی پل ہم دونوں ہی فرش پر گرے۔ راجیش کے منہ سے نکلنے والی چیخ سے ایک بار پھر تہہ خانے کے در و دیوار گونج اٹھے۔ اس کی ناک سے خون نکل آیا تھا۔ وہ ہاتھ کی پشت سے ناک سے بہنے والا خون صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ قدرے خوفناک ہو گیا تھا۔

''آ جاؤ راجیش۔'' میں نے اسے اشتعال دلانے والے انداز میں کہا۔ ''دیکھتے ہیں کون کس کے ہاتھوں نرک پہنچتا ہے۔''

میری بات سن کر راجیش واقعی اشتعال میں آ گیا۔ وہ بپھرے ہوئے بیل کی طرح میری طرف دوبارہ بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اسی وقت جوتی دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ اس نے راجیش کو بازو سے پکڑ کر روکنے کی کوشش لیکن وہ مشتعل ہو کر پاگل ہو رہا تھا۔

''اپنے حواس پر قابو رکھو راجیش۔'' جوتی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اسے تم نہیں، دیپک کو نرک میں پہنچانا ہے۔ اگر اسے ہم میں سے کسی نے نرک میں پہنچانا ہوتا تو پھر جب یہ کوٹھی کے اندر داخل ہوا تھا میں اسے اپنے ہاتھوں سے گولیاں مار سکتی تھی۔''

راجیش اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے مجھے غصے سے دیکھ رہا تھا جبکہ میں طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ تبھی جوتی اپنے قریب کھڑے آدمی سے مخاطب ہوئی۔ ''مجھے اپنا ریوالور دو۔''

اس آدمی نے فوراً ہی اپنی جیب سے ریوالور نکال کر جوتی کے حوالے کر دیا۔ جوتی ریوالور کو چند لمحے پُرغور نظروں سے دیکھتی رہی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''مسٹر، اگر تم مزید پٹنے سے بچنا چاہتے ہو تو شرافت سے بتا دو کہ رامو کہاں ہے؟''

''اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ ریوالور کے زور پر مجھ سے اگلوا لو گی تو کوشش کر کے دیکھ لو۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

جوتی کے چہرے پر ایک تاثر آ کر گزر گیا لیکن میں نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگا لیا کہ وہ ناسمجھ کائیاں اور مکار لڑکی ہے۔ اس کا دیپک سے کیا تعلق تھا مجھے مطلق سروکار نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتی، تہہ خانے میں جیک کی کراہ گونجی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ہی وہ ہوش میں آیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جب گردن گھما کر راجیش اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا تو اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

دفعتاً میں نے جوتی کی آنکھوں میں چمک لہراتی ہوئی دیکھی۔ اس نے ریوالور کا رخ جیک کی طرف کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''رامو کے بارے میں بتاتے ہو یا میں تمہارے ساتھی کو گولی مار دوں۔ بولو۔''

میرے ذہن میں جو خدشات پیدا ہوئے تھے وہ سچ ثابت ہو گئے تھے۔ جب میں نے جوتی کی آنکھوں میں جیک کو دیکھ کر چمک لہراتی ہوئی دیکھی تھی تو مجھے یہی خدشہ لاحق ہوا تھا کہ جوتی جیک کو یرغمال بنا کر رامو کے بارے میں پوچھے گی۔

میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے جیک کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ تبھی جوتی نے ریوالور کا رخ جیک کی طرف کر کے مجھ سے کہا۔ ''میں تمہیں آخری وارننگ دے رہی ہوں، رامو کے بارے میں بتا دو ورنہ میں تمہارے اس ساتھی کو مار ڈالوں گی۔''

جیک کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی اور میں تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ دماغ میں چیونٹیوں نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس موقع پر کیا کروں؟ میں اپنی وجہ سے جیک کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے سرسراتی آواز میں جوتی سے پوچھا۔ ''تمہیں کس نے بتایا کہ رامو میری کسٹڈی میں ہے؟''

''رامو نے ہی ہمیں اطلاع دی ہے کہ تم نے اسے اغوا کر کے کسی نامعلوم جگہ پر تہہ خانے میں قید کر دیا ہے۔'' جوتی زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم نے اس سے راجیش کے ٹھکانے کا پوچھا تھا تو اس نے تمہیں ورغلا دیا۔ راجیش کی کوئی دو ٹکا بہن نہیں ہے، ہم نے تمہیں پھانسنے کے لیے جال بچھا دیا اور تم بڑی آسانی سے ہمارے جال میں پھنس گئے۔''

جوتی کی بات سن کر میرے دماغ میں دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی کہ میں نے رامو کے لباس کی تلاشی نہیں لی تھی۔ اس کے پاس سیل فون تھا اور اس نے راجیش کو میری پلاننگ کے بارے میں آگاہ کر دیا اور یوں میں بڑی آسانی سے پھنس گیا۔ ساتھ ہی جیک بھی میرے ساتھ پھنس گیا تھا۔

میرے دل و دماغ میں رامو کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ آخر اس ہندو بنئے نے اپنی اوقات دکھا ہی دی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میری زندگی بچ گئی تو میں رامو کو عبرتناک سزا دوں گا۔ اس نے پہلے بھی مجھے دھوکا دیا تھا اور دوسری بار بھی مجھے بری طرح پھنسا دیا تھا۔

''بتاؤ، رامو کہاں ہے؟'' جوتی کی آواز میری سماعت میں پڑی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''موریس۔'' دفعتاً جیک مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اسے رامو کے متعلق کچھ بھی مت بتانا۔ چاہے یہ میری جان بھی لے لیں۔''

''لیکن......'' میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس سے آگے نہ بول سکا تھا۔

''بتاؤ۔'' دفعتاً جوتی غرّائی۔

''جوتی! تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ لاتوں کے بھوت آسانی سے نہیں مانتے۔ میں جب اس کی ہڈیاں توڑوں گا تو یہ رامو کے بارے میں فرفر بتائے گا۔'' اسی لمحے راجیش نے بھیڑیے کی مانند غراتے ہوئے کہا۔

جوتی نے راجیش کو تو کوئی جواب نہ دیا البتہ اس نے ریوالور کا ٹرائیگر دبا دیا۔ تہہ خانے کی فضا گولی چلنے کی آواز سے گونج اٹھی۔ ساتھ ہی جیک بھی چیخ پڑا۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی اور وہ ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جوتی اپنے کہے پر عمل بھی کر دے گی۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف دھمکی دے کر مجھ سے رامو کے بارے میں اگلوانے کی کوشش کرے گی۔ میں جیک کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ جوتی ریوالور کا رخ میری طرف کر کے چیخی۔ ''رک جاؤ، ورنہ تمہارا پیر بھی ناکارہ کر دوں گی۔''

میں ہونٹ بھینچ کر اور خونخوار نظروں سے اسے دیکھتا ہوا رک گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں اس لڑکی کی گردن توڑ دیتا۔ جیک کی پنڈلی سے خون نکل رہا تھا اور اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات بھی ابھر آئے تھے۔

راجیش تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرا خون پینا چاہتا ہو۔ اس کی ٹھوکروں سے لگنے والی ٹیسوں کی بدولت میری پسلیوں میں تکلیف تھی تاہم میں اس تکلیف پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اگر مجھے موقع مل گیا تو راجیش کو سود سمیت واپس کروں گا۔

''کمینی، میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔'' دفعتاً جیک غصے سے چیختا ہوا جوتی کی طرف بڑھا۔ عین اسی لمحے راجیش نے آگے بڑھ کر اسے زور سے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

''آخری بار پوچھ رہی ہوں، رامو کے بارے میں بتا دو۔'' جوتی سفاکی سے بولی۔ ''ورنہ اس بار تمہارے ساتھی کو زندگی کی قید سے آزاد کرنے میں ایک لمحہ دیر نہیں لگاؤں گی۔''

''تم نے جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔'' میں نے جیک کی طرف انگشت شہادت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے اس لیے اسے کچھ مت کہو۔''

تبھی راجیش کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے غصیلی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پتلون کی جیب سے سیل فون نکالا اور ایک نظر اسکرین کی طرف دیکھنے کے بعد کال اٹینڈ کر لی۔ دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد وہ بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔''

اس نے سیل فون جیب میں رکھا تو جوتی مستفسر ہوئی۔ ''کس کی کال تھی؟''

''دیپک آ گئے ہیں۔ اور وہ ہمیں بلا رہے ہیں۔'' راجیش نے جواباً کہا تو جوتی نے گردن ہلا دی۔

جوتی نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم نے مجھے تو رامو کے بارے میں نہیں بتایا لیکن یاد رکھو، دیپک کے سامنے تمہاری ایک بھی نہیں چلے گی۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جوتی نے دروازے کے پاس کھڑے آدمی سے کہا۔ ''اجے...... دروازے کو تالا لگا کر آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے میڈم۔'' اجے نامی اس آدمی نے سعادت مندی سے کہا۔ پھر جوتی اور راجیش تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اجے بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور وہ دروازہ بند کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے برق سرعت سے آگے بڑھ کر دروازہ پکڑ لیا لیکن اس کے باوجود دروازہ بند ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور میرے ہاتھ کی جلد چھل گئی تھی۔ اجے نے دروازہ بند کرنے کی پوری کوشش کی لیکن میں نے دونوں ہاتھوں سے دروازے کا کنارہ مضبوطی کے ساتھ پکڑتے ہوئے اس کے پیٹ میں لات مار دی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی اور اس نے دروازہ چھوڑ کر اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں اس کے کراہنے کی آواز راجیش اور جوتی کی سماعتوں تک نہ پہنچ گئی ہو ورنہ

یہاں سے نکلنے میں کافی مشکل ہو جائے گی۔

میں نے بعد ازاں انجام کی پروا کیے بغیر اجے کو گردن سے دبوچ کر انتہائی سرعت کے ساتھ تہہ خانے کی ایک دیوار سے اس کا سر ٹکرا دیا۔ اس کا سر تو پاش پاش نہیں ہوا تھا لیکن پھٹ ضرور گیا تھا اور خون کی دھار میرے لباس پر بھی پڑی تھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی جس سے تہہ خانے کی فضا گونج اٹھی تھی۔ میں نے اجے کو فرش پر پھینکا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے بگڑ گیا تھا۔ میں نے اس کے لباس کی تلاشی لی تو ایک جیب میں سے ریوالور مل گیا۔ میں ریوالور تھام کر جیک کی طرف بڑھا جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پنڈلی سے ابھی تک خون نکل رہا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور جیک کی پنڈلی پر باندھ دیا تاکہ اس کا خون ضائع نہ ہو۔

''جیک...... جیک...... تم ہمت سے کام لو؟'' میں نے جیک کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے کہا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' جیک نے اذیت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری تکلیف سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم یہیں انتظار کرو، میں پہلے راجیش، جوتی اور دیپک سے نمٹ لوں، پھر تمہیں نکال کر لے جاتا ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

جواباً جیک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اٹھا اور دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید اجے کی واپسی کے لیے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تہہ خانے سے نکل کر جیسے چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں پہنچا تو اسی وقت دروازہ کھلا اور راجیش اندر داخل ہوا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی راجیش نہ صرف حیران رہ گیا بلکہ اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی۔ اگرچہ میری حالت اچھی نہیں تھی۔ میری پسلیوں اور پیٹ میں شدید درد ہو رہا تھا لیکن میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہاں سے ہاتھ پیر مارے بغیر نہیں نکلا جا سکتا تھا۔ اس سے قبل کہ راجیش ریوالور نکال پاتا میں نے ریوالور کا ٹرائیگر دبا دیا۔

گولی راجیش کے پیٹ میں لگی اور وہ چیختا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن بہ حالتِ مجبوری مجھے ایسا کرنا پڑا ورنہ وہ مجھے جان سے مار دیتا یا زخمی کر دیتا۔ دونوں صورتوں میں میرا ہی نقصان تھا۔

''راجیش...... راجیش......'' دفعتاً مجھے جوتی کی آواز سنائی دی۔ شاید اجے کی چیخ اس نے سن لی تھی۔ ساتھ ہی قدموں کی آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔ آوازوں سے یہی محسوس ہوا تھا کہ آنے والا ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ جوتی کے ساتھ یقیناً دیپک تھا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے بالکل بھی وقت نہیں تھا۔ رامو نے میرے ساتھ دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ کاش میں اس کی تلاشی لے لیتا تو میں اور جیک یوں ابتلا میں مبتلا نہ ہوتے...... بہرکیف، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب دیپک اور جوتی پر قابو پانا تھا پھر ان کے ذریعے ہی مجھے رتن کمار تک رسائی مل سکتی تھی۔

میں نے کھلے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا تو مجھے

پنڈت ہری چند اختر کسی مشاعرہ میں غزل پڑھ رہے تھے، سامعین سے اچانک ایک حضرت اٹھ کر ان کے ایک مصرعہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''اختر صاحب! دوسرے مصرعہ میں الف گر گیا ہے۔''

''تو پکڑ کر کھڑا کر دیجیے۔''

اور اختر صاحب کا یہ جواب ان حضرات کو خفیف سا کر گیا۔

رائے حکومت

قبل از اسلام

اسلام سے پہلے سندھ میں جو راجا حکومت کرتے تھے، وہ رائے کہلاتے تھے۔ جناب سرور کائنات ؐ کی ہجرت سے پہلے یہاں رائے حکومت تھی اور یہ حکومت 137 سال تک رہی۔ اس حکومت کے پانچ راجا گزرے ہیں جو عقیدے کے لحاظ سے بدھ مت کے پیرو تھے۔ ان کے نام ہیں، رائے ڈیوانج، رائے سیہرس اول، رائے ساحسی اول، رائے سیہرس ثانی، رائے ساحسی ثانی۔

جس وقت حضورؐ نے مدینہ شریف کو ہجرت فرمائی، اس وقت سندھ میں رائے سیہرس ثانی کی حکومت تھی۔ دارالحکومت شہر اروڑ تھا۔ آج بھی اروڑ نام کا ایک گاؤں روہڑی سے پانچ میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں آباد ہے اور وہاں اس قدیم زمانے کے آثار، یہاں تک کہ محمد بن قاسم کی بنائی ہوئی مسجد بھی، دریافت ہو چکی ہے۔

جوتی اور دیپک آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جوتی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا تو جوتی نے برق سرعت سے ریوالور کا رخ میری طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ میں نے چونکہ جوتی کو ٹرائیگر دباتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے اس کے ٹرائیگر دبانے سے پہلے ہی میں اندر ہو گیا تھا اور گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں چند لمحے رکا پھر میں نے باہر نکل کر ان پر گولی چلا دی لیکن وہ راہداری میں موجود نہیں تھے۔ شاید قریبی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئے تھے۔ یقیناً انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے اجے اور راجیش دونوں پر قابو پالیا ہے۔

ہمارے لیے یہاں سے نکلنا بے حد ضروری ہو گیا تھا ورنہ دیپک اپنے مزید آدمی بلا سکتا تھا۔ دفعتاً مجھے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی تو میں برق سرعت کے ساتھ مڑا۔ وہ جیک تھا جو تہہ خانے سے نکل کر لنگڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔

''جیک۔ تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' میں نے جیک کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے گولیوں کی آواز سنی تو پریشان ہو گیا تھا۔'' جیک نے جواباً کہا۔ ''اس لیے میں تہہ خانے سے نکل آیا۔''

''ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''دیپک اور جوتی دوسرے کمرے میں چھپے ہوئے ہیں۔ کسی بھی وقت ان کے ساتھی یہاں آ سکتے ہیں۔''

جیک کی نظر راجیش پر پڑی تو اس نے استفسار کیا۔ ''کیا یہ مر چکا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلایا۔ پھر میں اسے سہارا دے کر کمرے سے باہر نکال لایا۔ دیپک اور جوتی ابھی تک کمرے میں ہی چھپے ہوئے تھے لیکن میں ان کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی انہیں موقع ملا تو وہ مجھ پر قابو پانے کی کوشش کریں گے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے بائیں طرف ایک دروازہ دکھائی دیا جو شاید باہر کی طرف کھلتا تھا۔ میں جیک کو سہارا دیتے اسی دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی ہم دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دفعتاً ہمارے عقب میں دروازہ کھل گیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ جوتی اور دیپک کمار تھے۔ جوتی آگے تھی اور دیپک کمار اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

صورت حال ایک بار پھر میرے خلاف ہو گئی تھی۔ فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، جوتی نے میرے پیروں کی طرف ریوالور کا رخ کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ میری خوش بختی تھی کہ گولی میرے پیروں میں لگنے کی بجائے فرش پر لگی تھی اور فرش کے ذرات اڑ کر میرے پیروں پر پڑے تھے۔ میں جوتی کی چال سمجھ گیا تھا وہ مجھے زخمی کر کے فرار ہونے سے روکنا چاہتی تھی اسی لیے اس نے براہ راست میرے سینے یا پیٹ کی بجائے پیروں پر گولی چلائی تھی۔

قبل اس کے کہ وہ دوبارہ گولی چلاتی، میں نے گولی چلا دی لیکن وہ دونوں ہی تیزی سے جھک گئے اور گولی کا نشانہ بننے سے بچ گئے۔ اگلے ہی لمحے دیپک تو شاید اس خوف سے دوبارہ کمرے میں گھس گیا تھا کہ میں نے دوبارہ گولی چلائی تو ممکن ہے اسے لگ جائے البتہ جوتی دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی۔ میں نے عقب میں موجود دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملی۔ دفعتاً جوتی نے سامنے ہوتے ہی دوبارہ گولی چلا دی۔ عین اسی لمحے جیک میرے سامنے آ گیا اور گولی مجھے لگنے کے بجائے اس کے پیٹ میں لگ گئی اور اس کے حلق سے دردناک کراہ نکل گئی۔ یہ تو بالکل اس طرح ہوا تھا جس طرح فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ ایک فرد دوسرے کو بچانے کے لیے اس کے سامنے آ جاتا ہے اور گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھے جیک سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ مجھے بچانے کے لیے وہ خود گولی کا شکار ہو گیا تھا۔ جوتی نے دوبارہ ٹرائیگر دبایا تو اس بار ٹرچ ٹرچ کی آواز سنائی دی جس کا مطلب تھا کہ اس کے ریوالور میں گولیاں ختم ہو چکی ہیں۔

اس کے پاس نیا میگزین بدلنے کا وقت نہیں تھا اس لیے اس نے ریوالور فرش پر پھینکا اور دروازہ کھول کر کمرے میں چلی گئی۔ میں نے جیک کو وہیں فرش پر لٹایا اور دوڑ کر اس دروازے کے پاس پہنچا لیکن جوتی نے اندر سے لاک لگا دیا تھا۔ میں ریوالور کا دستہ دروازے پر مارتے ہوئے چیخا۔ ''باہر نکل۔ تم نے میرے ساتھی پر گولی چلائی ہے میں تمہارا خون پی جاؤں گا اور تم بزدل گیدڑ دیپک باہر آؤ اور میرے ساتھ مقابلہ کرو۔ عورتوں کی طرح کمرے میں چھپ گئے ہو، میں نے تمہیں نرک تک نہ پہنچایا تو میں اپنے باپ کا نہیں ہوں گا۔''

غصے کی شدت سے میری حالت بری ہو رہی تھی۔ جو منہ میں آ رہا تھا بول رہا تھا۔ غصے میں انسان واقعی اپنے حواس کھو

بیٹھتا ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ میں نے ریوالور کے دستے سے دروازے پر چند بار ضربیں لگائیں لیکن وہ دونوں باہر نہ نکلے۔ تب میں مڑ کر جیک کی طرف بڑھا جو فرش پر لیٹا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''جیک...... یہ تم نے کیا کیا؟''

جیک جواب دینے کی بجائے لمبے لمبے سانس لیتے رہا۔ اس کی کھلی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔ اس کے پیٹ سے نکلنے والا خون فرش کو سرخ کر رہا تھا۔ خون دیکھ کر مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ میں نے اسے جھنجوڑا۔

''جیک...... آنکھیں کھلی رکھو۔ میں تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے ہذیانی لہجے میں کہا اور ریوالور جیب میں رکھ کر جیک کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے لب تھرتھرا رہے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن بول نہ پا رہا تھا۔

''شاید میرا وقت ہو چکا ہے اور میں اس دنیا سے جا رہا ہوں۔'' جب جیک بولا تو اس کے منہ سے آواز بمشکل نکل رہی تھی۔ اس کی بات سے مجھے اپنا کلیجہ کٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''جیک......''

''مجھے معاف کر دینا مورس...... میں...... میں زیادہ دیر تمہارا ساتھ نہیں دے سکا...... شاید ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ گاڈ تمہاری حفاظت کرے۔ ہاروے صاحب کو کہہ دینا کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے زور سے ہچکی لی اور پھر اس کی گردن دائیں طرف ڈھلک گئی اور بالآخر اس نے دم توڑ دیا۔ مجھے اس کی موت پر بے حد افسوس تھا لیکن شاید مشیت ایزدی یہی تھی۔ ہمارا ساتھ مختصر وقت کا تھا۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں جیک کی لاش اپنے ساتھ لے جاتا۔ دفعتاً مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں سمجھ گیا کہ دیپک نے اپنے مزید ساتھیوں کو وہاں بلا لیا ہے اس لیے اب مجھے جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے کتنی تعداد میں ہیں۔ ان کے پاس یقیناً ہتھیار بھی ہوں گے اس لیے میں جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر دوسری طرف پہنچ گیا۔

دوسری طرف ایک راہداری تھی جہاں گملے رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے ہلکی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا اور پھر دوڑ لگا دی۔ راہداری کا اختتام ایک لان میں ہوا تھا۔ لان کے ساتھ باہر جانے کے لیے گیٹ لگا ہوا تھا اور اینٹوں کی بنی ہوئی چوڑی روش پورچ تک جا رہی تھی جہاں ایک کار کھڑی تھی۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک مرکری بلب اپنی روشنی بکھیرے ہوئے تھا۔ میرے اندازے کے مطابق آدھی رات کا وقت تھا۔ میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا لیکن مجھے وہاں کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔

یہ دیپک کی کوٹھی نہیں تھی یہ کوئی اور جگہ تھی۔ یقیناً ہمیں بے ہوشی کی حالت میں اس کوٹھی میں لایا گیا تھا۔

گیٹ کی طرف سے جانا خطرناک تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں دیپک کے ساتھی موجود ہوں اس لیے میں نے دیوار کا جائزہ لیا۔

دیوار دس بارہ فٹ اونچی تھی اور دیوار کودنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے اچھل کر دیوار پر ہاتھ جمائے اور پھر اپنے زورِ بازو پر اوپر اٹھتا چلا گیا۔ دیوار پر بیٹھتے ہی میں نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ گیٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کار کھڑی تھی لیکن کار میں کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ دفعتاً مجھے دوڑنے کی آوازوں کے ساتھ ہی دیپک کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''جلدی سے پکڑو اسے، وہ بھاگنے نہ پائے۔''

میں دوڑ کر کار کے قریب پہنچا۔ دروازہ اَن لاک تھا اور خوش بختی سے اگنیشن میں چابی بھی موجود تھی۔ شاید دیپک کے ساتھی اتنی عجلت میں آئے تھے کہ ان میں سے کسی نے چابی نکالنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ میں نے کار میں بیٹھتے ہی چابی گھمائی تو کار اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے گیئر لگا کر ایکسی لیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھایا تو کار چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی توپ کے گولے کی طرح آگے بڑھی۔ عین اسی لمحے گیٹ کھلا اور چند افراد باہر نکل کر کار کے پیچھے دوڑے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی کار پر گولیاں بھی برسائیں لیکن کار گولیوں کی رینج سے باہر نکل گئی تھی۔ میں نے بیک مرر میں دیکھا مگر اندھیرے کے باعث وہ واضح دکھائی نہ دیے۔ میں تیز رفتاری سے کار آگے بڑھاتا چلا گیا۔

وہ ایک کالونی کی سڑک تھی جس کے دائیں بائیں بنگلے بنے ہوئے تھے۔ رات کے پہر سڑکیں سنسان اور ویران تھیں اس لیے میں انتہائی تیزی سے کار دوڑاتا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دیپک اور اس کے ساتھی میرے تعاقب میں ضرور آئیں گے لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی مجھے کسی محفوظ

مقام پر پہنچنا تھا۔
مین سڑک پر پہنچتے ہی میں نے کار روکی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر سوچنے لگا کہ مجھے اب کس طرف جانا چاہیے۔ دور دور تک روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں پھر میں نے کار بائیں طرف موڑی اور آگے بڑھادی۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا لیکن میں کار بھگائے جا رہا تھا۔ کافی دور جانے کے بعد مجھے ایک چوک دکھائی دیا تو میں نے وہاں پہنچ کر سڑک کنارے کار روک دی اور دائیں بائیں دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میں چونک پڑا۔ میں جس چوک پر موجود تھا اتفاق سے ایک سڑک مضافات میں جاتی تھی جہاں ہاروے کی عمارت تھی اور جہاں میں اور جیک رہ رہے تھے۔

سب سے ضروری کام اس کار سے چھٹکارا پانا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں رہائش گاہ تک کیسے پہنچوں؟ کیونکہ وہ عمارت جہاں میں موجود تھا، اس چوک سے کافی دور تھی۔ کار لے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ٹریکنگ کے ذریعے اسے ٹریس کیا جا سکتا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہاروے کی وہ عمارت رتن کمار یا اس کے ساتھیوں کی نظر میں آئے۔ ڈیبک کے جو آدمی میرے تعاقب میں تھے انہیں بھٹکانے کے لیے کار کو کسی اور جگہ پہنچانا ضروری تھا چنانچہ میں نے کچھ سوچ کر کار آگے بڑھادی۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد میں نے کار سڑک کنارے گھنے درخت کی اوٹ میں روکی اور اتر کر تاریکی میں چلتا ہوا چوک کی طرف بڑھا۔

سڑک کے دائیں بائیں دکانیں تھیں۔ کسی کسی دکان کی پیشانی پر مرکری بلب جل کر قرب و جوار کو روشن کر رہا تھا۔ دفعتاً میں بے اختیار چونک پڑا۔ مجھے دور سے ہی کسی کار کی ہیڈ لیمپس دکھائی دیں۔ وہ کار اسی طرف ہی آ رہی تھی جدھر میں موجود تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید یہ ڈیبک کے ساتھی ہیں جو میری ہی تلاش میں ہیں۔ میں جلدی سے فٹ پاتھ کے قریب ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا کہ مبادا ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے اور پھر اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ کار اسی درخت کے قریب رکی جہاں میں نے کار کھڑی کی تھی۔

کار کے دروازہ کھلے اور چار آدمی باہر نکلے۔ دو کے ہاتھوں میں ریوالور تھے جبکہ دو نہتے تھے۔ ان کی جیبوں میں یقیناً ریوالور ہوں گے۔

''تلاش کرو اس سالے کو۔ وہ یہیں کہیں ہوگا۔'' ایک آدمی نے اونچی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ہمیں وہ زندہ چاہیے۔''

اس کے ساتھی اِدھر اُدھر پھیل کر مجھے تلاش کرنے لگے۔ ایک آدمی تو اسی طرف آ رہا تھا جدھر میں درخت کی اوٹ میں موجود تھا۔ میں اگر درخت کی اوٹ سے نکل کر آگے بڑھتا تو اس کی نظر میں آ سکتا تھا اس لیے میں دم سادھے اس کے آنے اور آگے نکل جانے کا انتظار کرنے لگا۔

آنے والا انتہائی چوکنے انداز میں چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آتا جا رہا تھا میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ درخت کے قریب پہنچ کر رک گیا اور غائرانہ نظروں سے اِدھر اُدھر میں دیکھنے لگا۔ میں دم سادھے ہوئے تھا لیکن سوچ لیا تھا کہ اگر وہ درخت کے قریب آیا تو میں ہر ممکن طور پر اس پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔

میں درخت کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ وہ بلی کی چال چلتا ہوا درخت کی طرف بڑھا۔ میں اس پر قابو پانے کے لیے بالکل ہی تیار تھا۔

وہ جیسے ہی درخت کے قریب پہنچا تو میں نے سب سے پہلے اس کے ریوالور پر جھپٹا مارا۔ لمحہ بھر کے بعد اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کے چیخنے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما دیا تھا۔ نتیجتاً آواز اس کے منہ میں دب کر رہ گئی تھی لیکن وہ بھی کم طاقتور نہ تھا۔ اس نے پہلے تو میرا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب وہ کامیاب نہ ہوا تو اس نے میری پسلی میں کہنی مار دی۔

کہنی کی ضرب خاصی زوردار تھی جس نے مجھے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے میرا ہاتھ ہٹ گیا تھا۔ دوسرے ہی پل اس نے مجھے گردن سے پکڑ کر پہلے گھمایا پھر میرا سر درخت کے تنے پر مار دیا۔ میرا سر تو نہ پھٹا البتہ دماغ جھنجھنا گیا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے تاریکی سی پھیلنے لگی۔ قبل اس کے کہ وہ دوبارہ مجھ پر حملہ کرتا میں لڑکھڑا کر درخت کی اوٹ میں گر گیا۔ گرتے ساتھ ہی میں نے گردن اٹھا کر اس آدمی کی طرف دیکھا، وہ جھک کر غالباً اپنا ریوالور تلاش کر رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے ہمت مجتمع کر کے اس کی پشت پر لات رسید کر دی۔ وہ اچھل کر منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ شاید اس کا چہرہ کسی ٹھوس چیز سے ٹکرا گیا تھا اس لیے اس کے منہ سے دلدوز چیخ برآمد

سنہری یادوں کا سفر

یادیں سدا انسان کے ساتھ رہتی ہیں چاہے وہ خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار..... کبھی یہ دل میں کسک جگاتی ہیں تو کبھی امید کی کرنیں پھیلاتی ہیں..... ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا ایک سفر آج سے تقریباً پچاس سال پہلے

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کی صورت شروع ہوا۔ پاپولر ادب کی دنیا میں ایک قندیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر اجالوں کی پیامبر بنی..... بقول حبیب جالب

اسے بجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغِ سحر

الحمدللہ ہم اب گولڈن جوبلی کی طرف گامزن ہیں

انہی سنہری یادوں میں آپ کا بھی رو پہلا اور سنہرا خوب صورت ساحصہ کتنا ہے؟ ہمیں بھی بتائیں..... یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1..... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف.....؟

2..... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں.....؟

3..... سینئر یا دور حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں.....؟

4..... کوئی فرمائشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

ہوئی تھی جو اس کے ساتھیوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ یقیناً اس کے ساتھی اس طرف متوجہ ہو بھی چکے ہوں گے۔

''اوہو...... یہ تو پانڈے کی آواز ہے۔'' دفعتاً ایک مردانہ آواز گونجی۔

''شاید وہ مشکل میں ہے۔'' دوسری آواز سنائی دی۔

''آجاؤ...... آجاؤ...... وہ دوشٹ ادھر ہی ہے۔'' زمین پر گرے آدمی نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اگلے ہی پل دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں بھی زمین پر ہاتھ رکھے بوکھلاتا ہوا اٹھنے لگا کہ دفعتاً میرے ہاتھ میں پانڈے کا ریوالور آگیا۔ پانڈے زمین پر گرا چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جانتا تھا اگر میں نے کچھ نہ کیا تو وہ لوگ مجھے بھاگنے نہیں دیں گے، پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

دور سے ہی دو آدمی تیزی سے دوڑتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے جدھر میں اور پانڈے موجود تھے۔ میں نے ریوالور کا رخ آنے والے آدمیوں کی طرف کرکے یکے بعد دیگرے ٹرائیگر دبا دیا۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ میرا نشانہ چوک گیا تھا اور وہ دونوں گولیوں کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے۔ فضا گولیوں کی آوازوں سے مرتعش ہوئی تھی۔ اگلے ہی پل وہ دونوں دائیں بائیں جسے جہاں چھپنے کی جگہ ملی چھپ گئے تھے لیکن انہوں نے مجھ پر فائرنگ نہیں کی تھی حالانکہ میں نے ایک آدمی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا تھا۔

پانڈے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن میں نے اسے اٹھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں نے اس کی پنڈلی پر گولی ماردی۔ اس کے منہ سے نہ صرف چیخ نکلی بلکہ وہ مینڈک کی طرح پھدکنے لگا۔ میں نے چھپے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھا، ایک جھکے ہوئے انداز میں باہر نکل رہا تھا کہ میں نے نشانہ تاک کر گولی چلادی لیکن میرا نشانہ چوک گیا۔ وہ کوڑے دان کے پیچھے چھپا ہوا تھا اس لیے وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور گولی نے کوڑے دان میں سوراخ کردیا۔ اسی لمحے میری چھٹی حس بیدار ہوگئی اور مجھے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔

میرے عقب میں ان کا چوتھا ساتھی تھا جس نے آتے ساتھ ہی مجھ پر چھلانگ لگادی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس کے ہاتھوں مار کھا جاؤں گا اور وہ مجھے گرفت میں لے لے گا لیکن میں نے تیزی سے پیچھے ہٹتے ہی اس کے پیٹ میں گھونسا رسید کردیا۔ اس کے منہ سے دردناک کراہ نکلی اور وہ گھٹنے کے بل جھک گیا۔ میں نے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر رسید کردیا تو وہ منہ کے بل زمین پر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔

میرا سانس بھی اکھڑ چکا تھا اس لیے جلدی جلدی [illegible] بننے لگا۔ میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ فٹ پاتھ پر پہنچتے ہی میں نے دوڑ لگادی۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ جدھر میں نے کار چھوڑی تھی اسی طرف جاتا تو مجھے کار بھی مل جاتی اور میں آسانی سے اس علاقے سے نکل جاتا لیکن اب دور دور تک کوئی بھی سواری دکھائی نہ دے رہی تھی۔

میں ہانپتا کانپتا بھاگتا رہا۔ میں جتنا تیز بھاگ سکتا تھا بھاگنے کی کوشش کررہا تھا۔ راجیش کی ماری ٹھوکروں کی وجہ سے ابھی تک میرے وجود میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مسلسل بھاگنے کی وجہ سے ٹانگیں شل ہورہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ کہیں بیٹھ کر ستالوں لیکن میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد میری رفتار میں کمی آنا شروع ہوگئی اور بعدازاں یہ حالت ہوگئی کہ میں لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگا۔

کچھ دور پہنچ کر میں ایک گلی کے سامنے رک گیا اور دھونکنی کی مانند چلتے ہوئے تنفس کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ گلی میں کہیں کہیں مرکری بلب جل رہے تھے اور تاحدِ نگاہ ویرانی تھی۔ دفعتاً مجھے دو آدمی دکھائی دیے جو دوڑتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے جدھر میں موجود تھا۔ یہ پانڈے کے ساتھی تھے۔ میں کچھ سوچ کر گلی میں داخل ہوگیا۔ اپنے پیچھے آنے والوں کو گلیوں میں ہی الجھانے کا میرا ارادہ تھا۔ گلیاں زیادہ سے زیادہ پندرہ فٹ چوڑی تھیں۔ کہیں اندھیرا تھا تو کہیں اونگھتے بلب کی روشنی۔ میں مختلف گلیوں میں گھومتا پھرتا رہا اور بالآخر ایک اور مین سڑک پر پہنچ گیا۔

مین سڑک کے بائیں طرف ایک ہوٹل تھا۔ اگرچہ وہاں لوگوں کا رش نہیں تھا لیکن مجھے چند لوگ دکھائی دیے تھے۔ ہوٹل سے دس گز کے فاصلے پر ایک ٹیکسی بھی کھڑی تھی جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔ ہوٹل کے آس پاس اور کوئی دکان کھلی ہوئی دکھائی نہیں دی تھی۔ جب میرا سانس اعتدال پر آگیا تو میں ہوٹل کی طرف بڑھا۔

وہ عام سا ہوٹل تھا۔ ایک لڑکا ایک طرف بنے ہوئے سنک پر برتن دھونے میں مصروف تھا۔ اس نے جینز کی پتلون اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس

کے پاس پہنچا تو وہ اچانک یوں چونکا جیسے اس نے بدروح دیکھ لی ہو۔

میری حالت دگرگوں تھی اس لیے اس کا خوف زدہ ہونا بنتا تھا۔ اس نے برتن دھونے روک دیے تھے۔ سنک کے ساتھ ہی ایک میز پر جھوٹے برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا جن میں سے اس نے کچھ برتن دھو لیے تھے۔ باقی برتنوں پر وہ صابن لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک صافی بھی تھی۔

''سنو، مجھ سے ڈرو مت۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر نرم لہجے میں کہا۔ ریوالور میں نے پہلے ہی پتلون کی جیب میں رکھ دیا تھا۔

''ک...... کون ہو تم؟'' لڑکے نے پُرغور نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کی عمر چودہ یا پندرہ سال ہوگی۔ اس کی رنگت گہری سانولی تھی۔ ہونٹ کالے تھے۔ ابھی اس کے چہرے پر داڑھی مونچھ نہیں نکلی تھی۔

''یہ ٹیکسی کس کی ہے؟'' میں نے ٹیکسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں نے کہیں جانا ہے۔'' میں نے کہا اور غیر ارادی طور پر میں نے مڑ کر بھی دیکھ لیا لیکن دور دور تک کسی ذی روح کے آثار دکھائی نہ دیے تھے۔

''دیال سنگھ تو سو رہا ہے۔'' لڑکے نے جواباً کہا۔ ''تم نے کہاں جانا ہے...... مجھے تو تم......'' کہتے کہتے وہ رک گیا۔

''دیکھو میں اس وقت کشٹ میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس سواری بھی نہیں ہے اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔ اگر تم ایک کرپا کردو تو میں تمہارا احسان مند رہوں گا۔''

''کیا کروں؟'' لڑکے نے دریافت کیا۔

''دیال سنگھ کو بلا کر لاؤ، میں تمہیں انعام بھی دوں گا۔'' میں نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا۔ میرے پاس انڈین کرنسی تھی۔ پھر میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا تو لڑکے کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

اس نے نوٹ اپنی پتلون کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، تم یہاں رکو، میں دیال سنگھ کو جگا کر آتا ہوں، ویسے وہ اس وقت کہیں جاتا نہیں ہے لیکن اگر تم اسے ڈبل کرایا دو گے تو وہ چل پڑے گا۔''

''میں ڈبل کرایا دے دوں گا۔'' میں نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے بلا لاؤ۔''

لڑکے نے صافی سنک پر رکھی اور ہاتھ دھونے کے بعد سیڑھیوں کی طرف چلا گیا جس کے ساتھ ہی چھوٹی سی ایک راہداری تھی۔ میں نے ایک بار پھر قرب و جوار کا جائزہ لینے کے بعد اطمینان کی سانس لی۔ سامنے کی دیوار پر ایک گھڑی ٹنگی ہوئی تھی جس پر رات کے پونے دو بجے کا وقت تھا۔

میرے سر میں شدید درد ہورہا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی۔ میری پیشانی پر چھوٹا سا ایک گومڑ بنا ہوا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا جب پانڈے نے میرا سر درخت پر مارا تھا۔ ایک دیوار پر دھندلا سا آئینہ بھی لگا ہوا تھا میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ میری پیشانی پر گومڑ بن چکا تھا جس پر نیل بھی پڑ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد اس لڑکے کے ساتھ ایک نوجوان آگیا۔ اس نے شلوار پانجامہ اور کرتہ پہنا ہوا تھا، سر پر سکھوں والی روایتی پگڑی تھی۔ نیند سے جگانے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ٹھگنے قد کا سکھ تھا۔ وہی دیال سنگھ تھا۔ وہ چند لمحے پُرغور نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔ ''اتنی رات کو کدھر جانا ہے شریمان؟'' اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری بھی تھی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا، بے وقت جگانے پر اس کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات موجود تھے۔ ظاہری بات تھی، میں نے اسے سوتے میں اٹھوایا تھا اس نے غصہ تو ہونا ہی تھا۔

میں نے اسے مضافاتی علاقے کی طرف جانے کا بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر اس نے ڈبل کرایا مانگا تو میں نے ہامی بھر لی، میں نے لڑکے کو بھی انعام کے طور پر کچھ پیسے دیے تو وہ بھی خوش ہوگیا۔ اور دیال سنگھ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر تک تو وہ خاموش بیٹھا ڈرائیونگ کرتا رہا پھر اس نے دلیر مہندی کا گانا لگا دیا۔ آواز ہلکی ہی رکھی تھی۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا لیکن اب میں غور سے راستہ دیکھتا جارہا تھا۔ کچھ دیر سفر کرنے کے بعد دیال سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''سرکار! تواڈا لباس بڑا خراب ہو رہا ہے۔ کیا کسے دے نال لڑائی مارکٹائی ہوئی ہے؟'' وہ اردو اور پنجابی مکس کرکے بول رہا تھا۔

اس کے سوال پر میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اسے کیا

جواب دوں؟ میرا لباس واقعی خراب ہو گیا تھا، ٹی شرٹ نیلے رنگ کی تھی اس لیے اس پر خون کے دھبے واضح دکھائی نہ دے رہے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''ہاں دیال سنگھ، میں جس جگہ کام کرتا ہوں وہاں ایک ورکر کے ساتھ ہاتھا پائی ہو گئی تھی۔''

دیال سنگھ سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔ دلیر مہندی کا گانا مسلسل چل رہا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ جس علاقے سے ہم مضافات کی طرف جا رہے تھے وہاں تک کتنا فاصلہ تھا مگر میں دیال سنگھ کو بھی احساس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میں اس شہر کا رہنے والا نہیں ہوں۔ کہیں وہ میرے لیے مشکل پیدا نہ کر دے۔

میں جیک کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے اس کی موت کا بے حد دکھ تھا۔ یہ پریشانی بھی دامن گیر تھی کہ جب میں ہاردے کو جیک کی موت کے بارے میں بتاؤں گا تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ یقیناً وہ مجھ پر غصہ کرے گا، یہ میرا قیاس تھا۔

راجیش کو تو میں نے جہنم واصل کر دیا تھا، جیک کی قاتلہ جوتی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا، یہ میں نے خود سے تہیہ کر لیا تھا۔ دلیر مہندی کا ایک گانا تو ختم ہو گیا تھا اب دوسرا چل رہا تھا لیکن میری توجہ گانے کی طرف نہیں تھی۔

''سرکار! بور تے نہیں ہو رہے؟'' دفعتاً دیال سنگھ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔

''نہیں۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ پتا نہیں اس نے کیوں پوچھا تھا۔

''سرکار! کیا توانوں گانے شانے پسند ہیں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔ شاید وہ بہت باتونی تھا حالانکہ جب لڑکا اسے جگا کر لایا تھا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے اب اسے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا یہ وہی دیال سنگھ ہے۔

''زیادہ نہیں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''کبھی کبھی سن لیتا ہوں۔''

''واہ جی وا۔'' دیال سنگھ نے سر دھنتے ہوئے کہا۔ ''ہماری پنجابی موسیقی کی کیا بات ہے، ساتھ ہی اگر بھنگڑا ہو جائے تو مزہ ہی آ جاتا ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ابھی بھنگڑا ڈالنا مت شروع کر دینا۔''

میری بات پر وہ کھسیا کر ہنس دیا۔ ''او نہیں جی، یہ وقت تو بھنگڑا ڈالنے کا نہیں ہے لیکن سچی بتاؤں۔ بھنگڑا ڈالنے کا دل بہت کر رہا ہے۔''

''پھر بھی اپنی خواہش پوری کر لینا۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔ واقعی مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ ٹیکسی چلانا چھوڑ کر بھنگڑا ڈالنا شروع نہ کر دے۔ ایسی صورت میں ٹیکسی کا توازن بگڑ سکتا تھا لیکن صد شکر، دیال سنگھ نے اپنے کہے پر عمل کیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد جب ٹیکسی مضافات کی طرف جانے والی سڑک کی طرف مڑی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا اس لیے اب مجھے پریشانی نہیں تھی کہ دیپک یا اس کے گرگے مجھے تلاش کر پائیں گے۔ اگرچہ رامو قید میں تھا اور جتنی مرضی کوشش کر لیتا وہ تہ خانے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

ابھی تو میں نے رامو سے بھی نمٹنا تھا جس کی وجہ سے میں اور جیک نہ صرف دیپک کے جال میں پھنسے تھے بلکہ جیک اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ جس کا مجھے بے حد دکھ تھا۔

''سرکار! تسی کرتار پور میں کہاں اترنا ہے؟'' دیال سنگھ نے پوچھا۔ اس علاقے کا نام کرتار پور ہی تھا جہاں ہاردے کی ملکیتی عمارت تھی۔

''جہاں اترنا ہوگا میں تمہیں بتا دوں گا۔'' میں نے جواباً کہا تو دیال سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

''سرکار! کیا تسی روز ہی کرتار پور جاتے اور شہر آتے ہو؟''

مجھے اس کے بولنے پر اکتاہٹ ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد دوبارہ بول پڑتا۔ میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ ''نہیں ہفتے میں ایک دن گھر جاتا ہوں، آج چونکہ کام زیادہ تھا اس لیے اوور ٹائم لگانا پڑا اور دیر ہو گئی۔''

دیال سنگھ نے سر ہلا دیا۔ تھوڑی ہی دور آنے کے بعد ہمیں ایک ٹرک دکھائی دیا جو سبک رفتاری سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا اور چند لمحوں کے بعد ٹیکسی کراس کر گیا۔ سڑک کے دائیں بائیں کھیت تھے جو اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''ویسے سرکار، میں رات میں مضافات میں سفر نہیں کرتا۔'' چند لمحوں کے بعد دیال سنگھ نے دوبارہ کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ سرکار، ادھر ڈاکوؤں شاکوؤں کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔'' دیال سنگھ نے وجہ بتائی۔ ''پر تسی بے فکر رہو، میرے اوپر کرم دی خاص کرپا ہے، ڈاکو شاکو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

میں ہنکاری بھر کر خاموش ہو گیا۔ دیال سنگھ دوبارہ بول پڑا۔ ''اس طرف جانے کی دوسری وجہ بھی ہے سرکار۔''

''وہ کیا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

''کرتار پور میں میرا یار بیلی رہتا ہے۔'' دیال سنگھ نے وجہ بتائی۔ ''تسی تو تواڈی منزل تے اتار کر میں اپنے دوست دھرم سنگھ کے پاس چلا جاؤں گا، باقی دی رات وہیں گزاروں گا پھر صبح واپس شہر چلا جاؤں گا۔''

میں نے جواباً سر ہلا دیا۔ اب ساری بات سمجھ آ گئی تھی کہ دیال سنگھ کرتار پور جانے کے لیے کیوں راضی ہوا تھا۔ ایک تو اسے ڈبل کرایا مل رہا تھا دوسرا اس کا دوست بھی اسی علاقے میں رہتا تھا وہ اس سے بھی مل لے گا۔ کچھ سوچ کر میں نے دیال سنگھ سے پوچھا۔ ''دیال سنگھ! کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے۔''

''او نہیں سرکار۔'' دیال سنگھ نے فوراً جواب دیا۔ ''ابھی میری شادی نہیں ہوئی پر جلد ہی ہو جائے گی۔''

اب کی بار میں خاموش ہو گیا۔ اس دوران ہم مضافات میں کافی دور نکل آئے تھے۔ مضافات میں یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ سڑکوں پر روشنی کا انتظام نہیں ہوتا۔ گھنے درخت ہیولوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ اس دوران تین چار اور ٹرک بھی گزرے تھے۔ شاید ان پر سامان تھا اور وہ شہر جا رہے تھے۔

کچھ ہی دور جانے کے بعد جب مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اب ٹیکسی سے اتر جانا چاہیے کیونکہ میں عمارت کے قریب پہنچ گیا تھا تو میں نے دیال سنگھ کو ٹیکسی روکنے کا کہا۔

دیال سنگھ کے چہرے پر حیرت لہرائی۔ ''سرکار، یہاں ویران جگہ پر کیوں اترنا چاہتے ہو، ہم کرتار پور کے قریب ہی موجود ہیں۔ تسی مینوں اپنے گھر کا ایڈریس بتا دو، میں آپ کو گھر کے دروازے پر اتار دوں گا۔''

''نہیں، تم مجھے یہیں اتار دو۔'' میں نے کہا۔ ''باقی کا راستہ میں پیدل چل کر طے کر لوں گا۔''

''سرکار! کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالنا چاہتے ہو؟'' دیال سنگھ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگر کہیں کوئی ڈاکو شاکو مل گیا تو؟''

''یار! میں پہلی بار اپنے گھر نہیں جا رہا۔'' میں نے برا منانے والے لہجے میں کہا۔ ''تم ٹیکسی روکو۔''

مجھے اب احساس ہوا تھا کہ میں نے ٹیکسی ہائر کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے باقی رات کہیں گزار کر صبح سفر کرنا چاہیے تھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں خطرے نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ میری تلاش میں آنے والے دیپک کے ساتھی اُدھر بھی جا سکتے تھے جدھر ہوٹل تھا۔ بالفرض اگر وہ ہاں پہنچ گئے اور لڑکے نے میرے بارے میں بتا دیا کہ میں دیال سنگھ کے ساتھ کرتار پور گیا ہوں تو وہ میرے پیچھے آ سکتے تھے۔

ایک غلطی اور بھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ اگر میں دیال سنگھ کو رام پور گاؤں کے بارے میں بتا دیتا تو کم از کم اگر دیال سنگھ پکڑا بھی جاتا تو وہ رام پور گاؤں کا ہی نام لے لیتا اس طرح وہ مجھ تک نہ پہنچ سکتے۔

یہ میرا قیاس تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ دیپک کے گرگے میری تلاش میں اُس ہوٹل تک پہنچ گئے ہوں لیکن یہ سب باتیں میرے مدِنظر تھیں اور میں انہی نکات پر سوچ رہا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آ سکتا اسی طرح اب میں دیال سنگھ کو رام پور گاؤں جانے کا کہہ کر بھٹکا نہیں سکتا تھا ورنہ وہ شک میں پڑ جاتا۔

دیال سنگھ کو شاید میرے لہجے کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس نے سڑک کے کنارے ٹیکسی روک دی۔ میں نے اسے ڈبل کرایا دیا اور ٹیکسی سے اتر گیا۔ جب دیال سنگھ نے ٹیکسی آگے بڑھا دی اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں پیدل ہی آگے بڑھا۔ ابھی میں نے چند گز کا فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں ہیڈ لیمپس کی روشنی سامنے سڑک پر پڑتی دکھائی دی تو میں بے اختیار ٹھٹک کر رک گیا۔ یکبارگی میرا دل بھی دھڑک اٹھا تھا۔ وہ ہیڈ لیمپس کسی کار کے ہی تھے اور میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ یقیناً اس کار میں دیپک کے ساتھی سوار ہیں اور ہوٹل والے لڑکے سے میرے بارے میں پوچھ کر ہی اس طرف آئے تھے۔

وہ کار سبک رفتاری سے آ رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ ہمارے درمیان فاصلہ کم پڑتا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی۔ مجھے اپنے حواس مختل ہوتے محسوس ہوئے تو میں جلدی سے سڑک کنارے جھاڑیوں میں دبک گیا کہ مبادا ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑ جائے اور میں خطرے میں گھر جاؤں۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

دردِ آزادی

محترم مدیر
السلام علیکم!
یہ ایک ایسی روداد ہے جسے بھولنا بھی چاہوں تو بھول نہیں سکتی۔ گو کہ یہ واقعات میری پیدائش سے بھی پہلے کی ہے۔ بزرگوں سے سنی ہے لیکن اس میں وہ باتیں ہیں جو آج کے نوجوان کو جاننا چاہیے۔ یہ آزادی ہمیں پلیٹ میں سجا کر نہیں ملی ہے اس کے لیے ہمارے بزرگوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں اس کو لوگ بھولتے جارہے ہیں۔

نگہت بانو
(لاہور)

روپ نگر میں 'لوہی' کی شب تزک و اہتمام سے منایا جاتا تھا، اس شب کا آغاز ہو چکا تھا۔

گوکہ روپ نگر اتنا بڑا گاؤں نہ تھا۔ لدھیانہ کے جنوب مشرق میں پچیس کلومیٹر دور واقع تھا اور معمولی سا عام سا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی آٹھ سو نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ یہاں کی زمینیں زرخیز اور درخت قد آور و سایہ دار تھے۔ آبادی کا نوّے فیصد سے زائد حصہ سکھ اور ہندو برادری جبکہ بقیہ ماندہ مسلم برادری پر مشتمل تھا۔ باہمی اتفاق اور محبت بے مثل تھی۔ ہر موسمی اور مذہبی تہوار مکمل جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔

لوہی کی شب پوہ اور ماگھ کی درمیانی رات ہوتی تھی۔ روپ نگر کے باسیوں نے تہوار کی مکمل تیاری کر لی تھی۔ لکڑیاں' اُپلے' جھاڑ اوپر تلے چنے ہوئے تھے۔ ان کے اردگرد سہ رنگی دھاگوں کی پیچک لٹکی نظر آرہی تھیں۔ کڑاکے کی سردی کے باعث اس انبار کو آگ لگا دی گئی۔ کچھ ہی دیر گذری تھی کہ گاؤں کی جوان عورتیں اپنے بچے گود میں لیے الاؤ کے گرد بیٹھ گئیں۔ ان سب میں مشترک پہلو یہ تھا کہ وہ دلہنوں کی طرح آراستہ تھیں اور انہوں نے کوئی نہ کوئی منت مان رکھی تھی۔

کچھ دیر اور گذری تو اس تقریب میں شامل بچوں اور عورتوں کو چاول' چڑوے' ریوڑیاں اور مکئی کے پھول بانٹے جانے لگے۔ الاؤ کی روشنی تیز تر ہوئی تو چوراہوں کے درو بام کے علاوہ گھر کے صحنوں میں بیٹھی دوشیزاؤں کے چہرے بھی دمکنے لگے۔ روپ نگر میں لوہی کی یہ رات دیوالی کے بعد روشن ترین شب ہوتی تھی ورنہ گاؤں کا عام معمول یہ تھا کہ چند دیے سرشام ٹمٹما کر بجھ جاتے۔ دالانوں کے کواڑ بھی جلد ہی بند ہو جاتے۔ کسی اِکا دُکا دکان پر ہی کوئی چراغ جلتا نظر آتا تھا۔

رات جیسے جیسے ڈھلتی جوبن پر آنے لگی شرکاء کا جوش و خروش سوا ہوتا گیا۔ اب کچھ غیر روایتی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایک سمت نوجوانوں کا ایک گروہ یوسف زلیخا کا قصہ پڑھنے لگا۔ خوش گلوئی میں یوسف کا حسن' ان کی داستان فراق' مصر کا بازار' زلیخا کا مبتلائے عشق اور زنان مصر کا مبتلائے حیرت ہو جانا' یوسف کا پایۂ ثبات بیان کرتا یہ قصہ ہر

سننے والے پر بلا تخصیص مذہب گداز پیدا کرنے لگا۔ قصہ یوسف زلیخا کا اختتام ہوا تو تین صدیوں سے پنجاب کے رگ وپے میں لہو بن کر دوڑنے والے قصہ ہیر رانجھا کا آغاز ہوگیا۔ ہر وجود ساکت اور ہر دل ودماغ مسحور تھا۔

"ہیر آکھدی جوگیا کیوں جھوٹ بولیں
کون رٹھڑے یار ملاؤندا ای؟
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی
جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاؤندا ای"

یہ الفاظ سماعت میں پڑتے ہی دھرم سنگھ کے جذبات میں تلاطم برپا ہونے لگا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اپنے ہم نشین چوہدری حنیف کو دیکھا جو اسی کی طرح گداز کیفیات کا شکار ہو جایا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل ساکت اور کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

"کیا بات ہے حنیفے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟ اتنا چپ کیوں ہے آج؟"

"ہاں! سب ٹھیک ہے دھرمے!" حنیف نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

"لگتا ہے شملہ سفر کی تھکاوٹ ابھی اتری نہیں ہے۔ تھوڑا آرام کر لیتا گھر میں۔" دھرم سنگھ نے اسے تجویز دی۔

حنیف ابھی کچھ دیر پہلے ہی شملہ سے لوٹا تھا۔

"تھکاوٹ کیسی؟ اس سفر نے تو مجھے بالکل بھی نہیں تھکایا؟" وہ سرشاری سے کہنے لگا۔

"لگتا ہے بھنگ پی لی ہے تو نے۔ اتنا لمبا سفر تھکاتا نہیں تو اور کیا سکون دیتا ہے؟" دھرم سنگھ نے اپنے بچپن کے دوست کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں یار! تجھے پتا ہے میری شملہ میں کس سے ملاقات ہوئی تھی؟" حنیف نے اسے مکمل بات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"کس سے مل آیا ہے؟ کہیں اس عمر میں نیا ویاہ کرنے کے چکروں میں تو نہیں ہے؟" دھرم سنگھ نے اسے چھیڑا۔

"او نہیں وے کملیا! تیری تان ہر وقت ویاہ پہ ہی آ کے ٹوٹتی ہے۔" حنیف بدمزہ ہوا۔ "میں قائداعظم سے مل کر آیا ہوں شملہ میں۔"

"تیرا مطلب ہے محمد علی جناح سے؟" دھرم سنگھ حیرت سے اچھل پڑا۔ "لیکن کیسے؟ میں نے تو سنا ہے وہ بڑا 'بابو' ہے۔ تو نے کیسے مل لیا؟" وہ اپنے مخصوص پنجابی تلفظ کے تحت کہنے لگا۔

"بابو ہی ہیں۔ ایک دم بابو۔" حنیف نے عقیدت سے بتایا۔ "شملہ میں وہ جن کے پروہنے تھے ناں، ان کا ایک رشتہ دار میرے پیر کلیم اللہ شاہ کا مرید تھا۔ اتفاق سے وہ شخص خود بھی وہیں اور پیر صاحب میرے ساتھ موجود تھے۔ انہوں نے پیر صاحب کی بہت عزت کی۔ پیر جی کی جوتیوں کے صدقے مجھے بھی بہت اچھی طرح پوچھتے رہے۔ جب قائداعظم آئے تو 'جی آیاں نوں' کہنے کے لیے میں بھی وہیں سب کے ساتھ تھا۔ میں ان سے گلے ملا۔ ہاتھ بھی ملایا۔"

"لیکن تو ملا کیسے ان سے؟ یہ تو بتا!" وہ بے صبری سے بولا۔

"بتا رہا ہوں۔ اتا وَلا کیوں ہو رہا ہے؟ ان کے ساتھ مسلم لیگ کے چند اور اہم لوگ بھی تھے۔ مرید اکبر علی ان سے واقف تھا۔ میں نے اکبر کی منت کی تو اس نے انہی لوگوں میں سے کسی کو کہہ کہلا کر میری عرضی قائداعظم تک پہنچا دی۔" حنیف نے رسان سے جواب دیا۔

"کیا کیا باتیں ہوئیں تم لوگوں میں؟" دھرم سنگھ مکمل متجسس ہو چکا تھا۔

"میں نے انہیں کہا کہ جو کچھ بھی وہ مسلمانوں کے لیے کرنا چاہتے ہیں اللہ کرے اس میں جلد ہی کامیاب ہو جائیں۔ پتا نہیں میرے نصیب میں پاکستان جانا لکھا ہے یا نہیں؟ لیکن میں ان کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کے لیے تیار ہوں۔" وہ جذب کے عالم میں بولا۔

"اتنا پریم کرنے لگا ہے تو ان سے؟ کیا تو واقعی پاکستان چلا جائے گا؟" دھرم سنگھ افسردہ ہوا۔

"ہاں! بہت پیار کرتا ہوں میں ان سے۔" حنیف نے گہری سانس بھری۔ "وہ شخص ہے ہی اس قابل کہ اس سے شدید محبت کی جائے۔ ایک دم کھرا اور سچا بندہ ہے۔ پہلے تو میں صرف ریڈیو پر ان کی تقریریں سن کر تیرے یا اپنے بیٹوں میں سے کسی سے مطلب پوچھ لیتا تھا لیکن اب ان سے مل کر دل میں محبت اور عقیدت مزید بڑھ گئی ہے۔"

"کیا تو واقعی پاکستان چلا جائے گا؟" دھرم سنگھ نے اپنا سوال دہرایا۔

"پتا نہیں یار! مجھے واقعی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ پاکستان جانے کا سوچوں تو دل کتا بھی ہے۔ اپنے پرکھوں کی یہ زمین اور ان کی ہڈیاں چھوڑ کر جانا آسان بھی تو نہیں ہے یار!"

"اچھا اور کیا بات ہوئی تیری قائداعظم سے؟" دھرم

سنگھ نے اسے افسردہ دیکھ کر موضوع گفتگو تبدیل کرنا چاہا۔

"میں نے انہیں ستر تولے سونا دینے کا وعدہ کیا۔" اس نے فخر سے بتایا۔

"کیا کہا؟ ستر تولے؟ تو ہوش میں تھا کہ نہیں؟" دھرم کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔

"میرے قائداعظم سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے وہ سونا۔" حنیف نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"ہاں بھئی! پریم کا بھلا کیا مول ہوتا ہے؟" دھرم سنگھ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "انہوں نے جواب میں کچھ کہا نہیں تجھے؟"

"وہ بہت خوش ہوئے اور پتا ہے مجھ سے کیا کہا؟" حنیف کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا کہا؟ جلدی بتا ناں۔" دھرم سنگھ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

"تھینک یو چوہدری صاحب!" حنیف نے انہی کے انداز ولہجہ میں کہا۔ دھرم سنگھ کے چہرے پر مرعوبیت کے تاثرات ابھر آئے۔

"اب یہ سونا ان تک کیسے پہنچائے گا تو؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"دہلی جاؤں گا دینے۔ میں نے ان سے یہی وعدہ کیا تھا۔"

"آپاں کو بھی لے جانا ساتھ۔ بڑا شوق ہے آپاں کو انہیں قریب سے دیکھنے اور ملنے کا۔" دھرم سنگھ نے فرمائش کی۔

"ضرور لے چلوں گا' اور قریب سے دیکھ کر تو ان کا بالکل ہی شیدائی ہو جائے گا۔" اس نے محبت سے چور لہجہ میں کہا۔

اس کے بعد دونوں لوہی کے مختلف مراحل سے لطف اندوز ہوتے ممکنہ سفر کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

☆☆☆

حنیف اور دھرم سنگھ کی دہلی روانگی میں ابھی کچھ روز باقی تھے۔ حنیف کے اہلِ خانہ میں بھی خواتین نے اپنے زیورات نہایت محبت وعقیدت سے اس کے حوالے کر دیے۔ حنیف کا سینہ فخر سے چوڑا ہونے لگا۔ اہلِ خانہ کے اس ردِعمل نے اسے بہت خوشی اور اطمینان فراہم کیا تھا۔ وہ مزید جوش وخروش سے سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ اسی دوران اس کے دونوں بیٹے شجاعت اور لیاقت کو کسی ضروری کام کے سلسلہ میں لدھیانہ جانا پڑا۔ ان کی روانگی حنیف کے لیے خلاف معمول تو نہیں تھی البتہ اس بار وہ یکدم ہی خاصی مشکل کا شکار ہوگیا۔

ہوا کچھ یوں کہ ان کے روانہ ہونے کے اگلے ہی روز ریڈیو پر قائداعظم کی تقریر نشر ہونے لگی۔ حنیف ایسی کسی بھی تقریر کا متن سمجھنے کے لیے شجاعت یا لیاقت کو اپنے پاس ضرور بٹھاتا تھا۔ ان دونوں نے ہی لدھیانہ سے انٹر کر رکھا تھا۔ اب ان کی غیر موجودگی میں دھرم سنگھ کے اکلوتے بیٹے مان سنگھ کو بلائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ حنیف کو اسے بلانے میں کبھی کوئی عار تو محسوس نہیں ہوا تھا تاہم کچھ ماہ سے مان سنگھ کے تیور اسے مناسب محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ اب وہ اسے گھر بلوانے سے گریز ہی کرتا تھا۔ اس وقت اور کوئی راہ نہ پا کر حنیف نے چار و ناچار اسے پیغام بھیج دیا۔

مان سنگھ کی آمد خلاف توقع جلد ہی ہوگئی۔ وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا اور داڑھی کو ہاتھ سے برابر کرتا اس کے پاس آبیٹھا۔

"ہاں جی! خیر سے بلایا تھا آپاں کو؟" وہ کسی علیک سلیک کے بغیر کہنے لگا۔

"تقریر آئی ہے آج ریڈیو سے۔ مجھے اسی کا مطلب پوچھنا تھا تجھ سے۔" حنیف نے ضبط کرتے ہوئے رسان سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جی! آپاں تو سیوک ہیں تساں کے۔" اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

کچھ ہی دیر بعد تقریر کا آغاز ہوگیا۔ چوہدری حنیف کا وجود ایک ہی پل میں سنسنا اٹھا۔ اس نے بے اختیار ایک نعرہ بلند کر دیا۔

"پاکستان زندہ باد! قائداعظم زندہ باد!"

مان سنگھ ہونٹوں پر مبہم مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا۔ تقریر کے دوران اس نے چہرے پر سنجیدہ تاثرات سجا رکھے تھے۔ تقریر کے اختتام پر اس نے گہری سانس بھری اور اسی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"یہ کیا انرتھ ہوگیا ہے چاچا جی! تساں کا قائداعظم نے پاکستان بنانے کے نام پر ہی اب کانوں کو ہاتھ لگا رہا ہے۔ کہتا ہے مسلم لیگ سے بہت بڑا اپرادھ ہوگیا جو انہوں نے اتنے سال ایک فضول سپنے کے پیچھے برباد کر دیے۔ ان سب نے ہندوستان اکھنڈ ہی رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"بکواس بند کراوئے!" حنیف بھڑک گیا۔

"گروجی کی سوگھند! یہی کہا ہے اس نے۔" مان سنگھ نے محظوظ ہو کر کہا۔

"میں تیری زبان کھینچ لوں گا اگر تو نے ایک لفظ بھی اور بولا تو۔" حنیف کے عضلات غصے سے پھڑکنے لگے۔

"لو جی! تساں میں تو سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔" مان سنگھ نے تاسف سے سر ہلایا۔ "وہ تو تساں کے بھلے کی ہی بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ مسلم لیگ نے ہندوستان کو دو ٹکڑے کرنے کا جو سپنا دیکھا تھا اس کے پرائشچت میں ہر مسلمان گھر سے ایک یا دو لڑکیوں کی شادی کسی ہندو یا سکھ گبرو جوان سے کر دی جائے۔ اس سے ان مسلمانوں کا تو بہت ہی بھلا ہوگا جن کی بہن بیٹیاں رشتے کی تلاش میں بوڑھی ہونے لگتی ہیں۔"

مان سنگھ کے ان زہریلے فقرات پر حنیف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنے آخری فقرہ میں اس کے خاندان کو ہی ذاتیات کا نشانہ بنایا تھا۔ حنیف کی ایک بہن مناسب رشتہ نہ مل پانے پر تاحال کنواری ہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور مان کے چہرے پر پوری قوت سے تھپڑ رسید کر دیا۔

"افسوس ہو رہا ہے مجھے کہ تو دھرم سنگھ جیسی اُجلی روح کا بیٹا ہے۔ ترس آ رہا ہے مجھے اس باپ پر جس کی تجھ جیسی اولاد ہے۔" وہ طیش میں کہنے لگا۔

"افسوس تو اب تساں کو ہوگا چوہدری صاحب!" مان سنگھ نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کینہ توز نظروں سے اسے گھورا۔ "ترس تو تساں کو اپنے آپ پر آئے گا۔ بس ذرا اس ویلے کا انتظار کرو۔ انتظار کرو اور دیکھو کہ مان سنگھ اس اپمان کا بدلہ کیسے لیتا ہے۔"

"اپنی بکواس بند کر اور دفع ہو جا یہاں سے۔ ورنہ خدا پاک کی قسم میں بھول جاؤں گا کہ تو میرے بھائیوں جیسے دوست دھرے کا بیٹا ہے۔ ٹوٹے ٹوٹے کر دوں گا میں تیرے۔ چلا جا ابھی اور اسی وقت یہاں سے۔" حنیف نے دھاڑ کر کہا۔

"جا رہا ہوں چوہدری! بس انتظار کر۔ آپاں کا وقت بہت جلدی آنے والا ہے۔" مان سنگھ نے دیدہ دلیری سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مان سنگھ کی یہ بدگوئی اور تیور ایسے ہرگز نہیں تھے کہ حنیف انہیں نظر انداز کر دیتا۔ اس نے اسی رات دھرم سنگھ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دھرم ساری گفتگو کے متعلق جان کر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ کئی لمحوں ... تک تو وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہا۔ چند اثناء بعد اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ حنیف اس کی کیفیت اور ردعمل دیکھ کر بے کل ہو گیا۔ اس کے پاس بھی دھرم کو تسلی دینے کے لیے سب الفاظ یکدم ہی ختم ہو گئے تھے۔ دھرم سنگھ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"شما کر دے یار! اس حرامی سے آپاں خود بھی بہت تنگ ہوں۔ جانے کس جنم کی سزا دے رہا ہے وہ اساں کو؟"

"میرا مقصد تیرا دل دکھانا نہیں تھا یار! میں تو بس تجھے بتانا چاہ رہا تھا کہ اس کے طور طریقے بہت عجیب ہو گئے ہیں۔" حنیف کو اس کی کیفیت سے ندامت ہونے لگی۔

"پتا ہے آپاں کو یار! سب پتا ہے۔ تو چنتا نہ کر۔ آپاں بیساکھی کے بعد اسے اپنی بہن کے پاس لدھیانہ بھیج دوں گا۔ وہاں رہ کر کوئی کام دھندا سیکھے گا تو دماغ خود ہی ٹھکانے آ جائے گا۔" وہ سخت تناؤ زدہ تھا۔

"رب سب بھلی کرے گا انشاء اللہ! تو بس اپنی صحت کا خیال رکھ۔ میرے ساتھ دہلی چلنا ہے ناں تجھے؟" حنیف نے رسان سے اسے سمجھایا۔

دھرم سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب وہ ایک بار پھر ممکنہ سفر اور قائداعظم سے ملاقات کی بابت خیال آرائی کرنے لگے۔

☆☆☆

دہلی کا سفر نہایت اُمیدوں اور خوابوں کے سنگ طے ہوا۔ لیاقت بھی ان دونوں کے ہمراہ تھا۔ دہلی پہنچ کر ان کے دلوں میں ایک نئی ترنگ تھی۔ قائد نے بہت وقار سے ان کا خیر مقدم کیا۔ حنیف نے اپنا 'تحفہ' ان کے حوالے کیا اور عاجزی سے کہنے لگا۔ "یہ ہمارے خواب کے لیے ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے جی!"

"میں آپ کے جذبے کی داد دیتا ہوں۔" انہوں نے اپنے مخصوص سنجیدہ، گمبھیر اور پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔

دھرم سنگھ یک ٹک ان کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ لمحے بعد اس نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی پوٹلی سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر عقیدت سے ان کے سامنے رکھ دی۔

"یہ اساں کی طرف سے پاکستان کے لیے ہے۔"

"پاکستان کو آپ جیسے سپاہیوں اور ان کے جذبے کی ہی ضرورت ہے۔" انہوں نے حنیف سے کہا۔ "یہ بھی حق و باطل کی اس جنگ میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں، ان کی قدر کرنا۔" حنیف صاحب کا آخری جملہ دھرم سنگھ کے لیے تھا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ اپنے ضروری کام کے لیے روانہ ہو گئے۔

"یہ پیسے تو نے بیساکھی کے لیے جمع کر رکھے تھے ناں؟" حنیف نے اس سے دریافت کیا۔

"ہاں! وہی تھے۔" دھرم سنگھ نے مختصراً کہا۔

"مجھے ایک بار بتا ہی دیتا۔ کوئی ذکر ہی نہیں کیا تو نے مجھ سے۔" اس نے شکوہ کیا۔

"تو منع کر دیتا۔ آپاں کو کوئی نہ کوئی تحفہ تو لانا ہی تھا ناں۔ اپنے سب سے بڑے تہوار کے لیے جمع کی ہوئی رقم سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا تھا؟"

دھرم سنگھ کے اس جواب پر حنیف حیرت سے اسے دیکھنے لگا اور کچھ اثناء بعد رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس سال بیساکھی کا سارا خرچا میں اٹھاؤں گا۔ کون جانے اگلے سال ہم کہاں ہوں اور کہاں نہیں؟ اس برس روپ نگر میں سب سے بڑا اور شاندار میلہ لگے گا۔"

دھرم سنگھ کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ وہ بے اختیار حنیف سے بغلگیر ہو گیا۔ اس کے بعد ان تینوں نے چند روز دہلی میں سیر و سیاحت کی اور اپنے دلوں میں یادوں، محبت اور عقیدت کا خزانہ لیے روپ نگر واپس چلے آئے۔

☆☆☆

روپ نگر کی فضائیں باہمی یگانگت اور خیال و محبت سمیٹے وقت کا بہاؤ دیکھتی رہیں۔ اسی دوران بیساکھ کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ بیساکھ کی اہمیت سوا تھی کیونکہ اس کی آمد سال نو کا آغاز ہوا کرتی ہے۔

بیساکھ کی ابتداء ایک ہنگامہ ہاؤ ہو سے ہوتی تھی۔ روپ نگر میں تو یہ ہنگامے مزید بڑھ جاتے تھے۔ گیہوں کے سنہرے خوشے، تاحد نگاہ پھیلے ہوئے کھیت، سورج کی تمازت میں لرزاں افق کے مناظر، کاشت کاروں کے لیے سرمستی کا پیغام لایا کرتا۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ یکم بیساکھ سے دس روز قبل ہی گاؤں کے میدان میں ڈھول پیٹا جانے لگا۔ بھنگڑے کی مشق بھی کی گئی۔ دھرم سنگھ نے چوہدری حنیف کے ایماء آس پاس کے گاؤں سے بھی کئی معزز افراد کو اس میلہ میں شرکت کی دعوت دی۔ حنیف نے میلے کا خرچ برداشت کرنے کے لیے اپنی فصلیں اور گھر میں پڑی اجناس بھی فروخت کر دیں۔

میلے کا آغاز ہوتے ہی لوہے کے ایک بہت بڑے برتن (کڑاہ) میں گنے کا رس ابال کر گڑ بنایا جانے لگا۔ اس برتن کا حجم اتنا بڑا تھا کہ پانچ سو لیٹر گنے کا رس بہ آسانی اس میں سما جاتا۔ اس کے بعد دیسی گھی اور گڑ کا حلوا بھی تیار کیا جاتا تھا۔ عام طور پر تین چار بڑے زمیندار مل کر گھی اور گڑ اکٹھا کر کے حلوے کی تیاری کے لیے دے دیا کرتے تھے لیکن اس بار یہ سارا بندوبست چوہدری حنیف نے ہی کیا تھا۔ اس نے کبڈی، کشتی اور دوڑ کے مقابلوں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ بیلوں کی دوڑ کا مقابلہ بھی ہوتا۔ حنیف کو اس میلے میں ذاتی طور پر 'ونی' کا کھیل بہت پسند تھا۔ پنجاب کے اس مشہور کھیل میں دو جوان اس طرح باہمی مقابلہ کرتے تھے کہ پہلے ایک دوسرے کا بازو جکڑ لیتا اور دوسرا اس سے چھڑوانے کی کوشش کرتا۔ یہ مقابلہ اسی انداز میں تین یا پانچ بار کیا جاتا تھا۔ اپنے عہد شباب میں حنیف خود بھی کئی بار ان مقابلوں میں ناقابل شکست رہا تھا۔ اس بار بھی اسے یقین تھا کہ یہ میلہ بہت یادگار ثابت ہوگا۔

اس بھاگ دوڑ میں دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ دھرم سنگھ اور حنیف میلے کے انتظامات کی ممکنہ بہتری کے متعلق تبادلہ خیال کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پڑوس کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے چوہدری رفیق، شیام لال اور نہال سنگھ بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔

"بہت ودھیا انتظام کیے ہیں اس بار تو نے۔" نہال نے توصیفی انداز میں دھرم سنگھ کی جانب دیکھا۔

"اس میں آپاں کا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ سارا کچھ آپاں کے اس متر نے کیا ہے۔" دھرم نے بلاتامل جواب دیا۔

"کیوں بھئی؟ ہر سال تو یہ سارا کچھ تو ہی کرتا رہا ہے۔" شیام لال کو اچنبھا ہوا۔

"اس بار نہیں کر سکا۔" دھرم سنگھ نے اتنا کہہ کر اسے اصل معاملہ سے آگاہ کر دیا۔

شیام لال اور نہال سنگھ تو یہ جان کر خاموش ہو گئے۔ چوہدری رفیق البتہ شدید حیرت زدہ تھا۔

"تو نے اپنے جمع کیے ہوئے قائداعظم کو دے

دیے؟" اس نے تصدیق چاہی۔
"ہاں! آپاں کا دل کیا تو دے دیے۔" دھرم نے بے نیازی سے جواب دیا۔
"بے کار ہی ضائع کیے۔" نہال نے فوراً اسے ٹوکا۔
"بے کار تو مت کہو اب۔" رفیق نے تڑپ کر کہا۔
"تو اور کیا کہوں؟ تساں لوگوں کو سمجھ کیوں نہیں آ رہی کہ یہ نیتا لوگ صرف اپنے سوارتھ کے لیے یہ کھیل رچا کر بیٹھے ہیں۔" اس نے حنیف کی آنکھوں میں جھانکا۔
"سوارتھ کیسا؟ ہمارے سیاسی رہنماؤں کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ وہ تو مخلصی سے ہمارے بھلے کے لیے ہی لڑ رہے ہیں۔" حنیف نے بھی فوراً جواب دیا۔
"اساں کے لیے کوئی کچھ نہیں کر رہا بھولے بادشاہ! یہ سب کچھ نیتا لوگ اپنی جیب بھرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اب تساں دونوں کی مثال ہی لے لو۔ تم نے اپنے گھر سے سارا زیور اور اس نے پیسے دے دیے۔ یہ سب کچھ ان کی جیب میں ہی گیا ناں؟ پاکستان صرف ایک نعرہ ہے۔ اس کا بننا سپنا ہی سمجھو۔" اس نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔
"سپنا تو خیر نہیں ہے۔ کیا تم ساری زندگی انگریزوں کی غلامی میں ہی بسر کرنا چاہتے ہو؟" حنیف نے سوال کیا۔
"انگریزوں سے آزادی کے لیے ہندوستان دو ٹکڑے کرنے کی کیا تک ہے؟" شیام لال کہنے لگا۔ "یہ تو وہی بات ہوگئی ناں کہ اگر ہمارے گھر میں کوئی جانور گھس آیا ہے تو اسے نکالنے کے لیے اپنے گھر کی دیواریں ہی ڈھا دو۔ کمرے الگ الگ کر دو۔ بھئی ذرا دھیرج سے اس جانور کو باہر نکال کر اپنے گھر میں ویسے ہی سر کھشت بھی تو رہا جا سکتا ہے ناں؟"
"میں تمہاری مثال اور ذہانت کی داد دیتا ہوں۔" حنیف نے متانت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے بس ایک بات کا جواب دے دو۔ کیا تم میرے استعمال کیے ہوئے کسی برتن میں کھانا کھا سکتے ہو؟ میرا جھوٹا پانی پی سکتے ہو؟ ہماری برادری میں کسی بہن بیٹی کی شادی کر سکتے ہو؟"
"شادی تو تم لوگ بھی نہیں کر سکتے ہماری برادری میں۔" شیام لال نے فوراً جواب دیا۔
"ہاں! بالکل نہیں کر سکتے اسی لیے تو یہ تقسیم بہت ضروری ہے۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اکٹھا رہنا ممکن نہیں رہا۔ الگ نہ ہوئے تو ایک دوسرے کو برداشت کرنا ہی مشکل ہو جائے گا۔" حنیف نے اپنا سابقہ انداز برقرار رکھا۔
"تقسیم... تقسیم... تقسیم... کس طرح کرو گے تقسیم؟" نہال سنگھ جھنجلا گیا۔ "کہاں بنے گا یہ پاکستان؟ کیا اساں اپنے گھروں کو پہیے لگا کر گھسیٹتے ہوئے کہیں اور لے جائیں گے کہ یہ لو بھیا! تم رہو پاکستان بنا کر۔ یا کیا ہم اپنا گھر بار، مکان، بوریا بستر کسی بیل گاڑی پر لاد کر یہاں سے لے جائیں گے؟ آپاں کو تو یہ بات سمجھ ہی نہیں آئی کہ آخر کرنا کیا چاہتے ہو تساں لوگ؟"
"ہم لوگ صرف اپنے مذہب اور ثقافت کے مطابق سکون و آرام سے رہنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے قائدین پر مکمل بھروسا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے کوئی نہ کوئی بہتر حل ہی نکالیں گے۔" حنیف نے تحمل کا دامن تھامے رکھا۔
"تو ابھی بھی تو اپنے دھرم اور سنسکرتی کے حساب سے ہی رہ رہے ہو ناں؟ کسی نے روکا ہے تمہیں کبھی؟" شیام لال نے منہ بنایا۔
"روپ نگر یا آس پاس علاقوں میں کبھی ایسا کچھ دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا۔ لیکن امرتسر، چندی گڑھ اور دہلی میں تو فساد ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس بات کو جھٹلا نہیں سکتے تم!" رفیق نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
"جو بھی ہے! آپاں کو تو تقسیم کا وچار ہی سرے سے غلط لگتا ہے۔ یہ سارا کھیل نیتا لوگ اپنے سوارتھ کے لیے کھیل رہے ہیں۔" نہال سنگھ کی ہٹ دھرمی ہنوز برقرار تھی۔
ان کی یہ بحث یونہی جاری رہتی لیکن میدان میں ڈھول پر پڑنے والی تھاپ نے توجہ اپنی جانب مبذول کر والی۔ گذشتہ دس روز کی بھنگڑے کی مشق کے بعد ان نوجوانوں کے قدم ہم آہنگ ہو چکے تھے۔ وہ آج صبح سے ہی ڈھول کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ اپنی برداشت کے مطابق شراب کا مزہ بھی لے لیا جاتا۔ اپنے تیسرے پہر ڈھول پر چوٹ پڑتے ہی نوجوانوں کا یہ مجمع بڑے میدان کی طرف حرکت میں آیا تھا۔ مان سنگھ نے اپنے کان پر ہاتھ رکھا اور بلند آواز میں تان لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"موتیاں دے لونگ والیے
تیری ہر مسیا بدنامی"

مجمع نے داد کے لیے فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور دائرہ ایک بار پھر گھومنے لگا۔ ڈھول کی تال تیز ہونے سے دائرہ سمٹ جاتا تاہم اس کی حرکت تیز تر ہو جاتی تھی۔ مجمع کے وہ

شرکاء نشے میں ہونے کے باعث اپنے دونوں پاؤں پر کھڑے ہونے میں دشواری محسوس کرنے لگے تو ایک پاؤں پر رقص کا آغاز کر دیا۔ ان کی واسکٹوں میں جڑے ہوئے شیشے، بٹنوں کی لاتعداد قطاریں، گھمبروں میں ٹنگی ہوئی موتیوں کی جھالریں، تہبندوں کی ڈبوں میں اچھلتی ہوئی بوتلیں اور ان سے بہتی شراب ماحول مزید گرما رہی تھی۔
اس پُررونق منظر سے دھرم سنگھ، نہال سنگھ، شیام لال اور رفیق بھی بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔ حنیف کی نظریں البتہ مان سنگھ پر ہی مرکوز تھیں۔ اس کی نگاہوں میں جھلکنے والی آتش نے چہرے اور اطوار کو ایک الگ ہی روپ دیا ہوا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں یہ سرگرمیاں ایسے روایتی موڑ پر چلی آئیں جو حنیف کو سخت ناپسند تھیں۔ اس مرحلے میں ہر برہنگی روا اور ہر عریاں گیت جائز سمجھا جاتا تھا۔ مان سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں تان لگائی اور اشعار کی زبان میں ایک ایسی دوشیزہ کے ساتھ تعلقات کا ذکر چھیڑ دیا جس کے حصول کی ضد میں چند بزرگوں نے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی لیکن وہ دوشیزہ ایک نوجوان سے ہم آغوش ہونے کے لیے بے تاب تھی۔
حنیف کا خون یک دم کھول گیا۔ وہ اس ذومعنی گیت کا پس منظر اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ دھرم سنگھ کا چہرہ بھی متغیر دکھائی دینے لگا۔ باقی تینوں افراد البتہ لاعلمی اور بے نیازی سے اس گیت اور مان سنگھ کی خوش گلوئی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ حنیف نے اٹھ کر میدان میں جانے کا قصد کیا ہی تھا کہ وہاں یک لخت ہی حالات بگڑ گئے۔ مجمع میں سے چند افراد کو اس گیت پر سخت تعرض تھا۔ غالباً وہ بھی اصل مقصد سے باخبر ہو گئے تھے۔ آن کی آن میں وہاں جیسے ایک شعلہ بھڑک گیا۔ مان سنگھ کے حمایتی اور مخالفین آستینیں چڑھائے باہم گتھم گتھا تھے۔ لاٹھیاں ابھر کر گرنے لگیں۔ کئی نکوے اور چھریاں یوں لہرائیں جیسے گھٹا میں بجلی کا کوندا لپک گیا ہو۔ دکانیں الٹ گئیں۔ مٹھائیوں کے تھال زوردار آواز سے چہار سمت بکھر گئے۔ میدان میں موجود بچے اس آفت سے سخت بوکھلا گئے تھے۔ ان کے ساتھ چند امن پسند افراد بھی سراسیمہ دکھائی دینے لگے۔ وہ محفوظ گوشوں کی تلاش میں پتنگوں کی مانند بکھر چکے تھے۔ نہال سنگھ اور شیام لال کے علاوہ کئی معززین بیچ بچاؤ کرانے کے لیے میدان میں کود پڑے۔
"اوئے! ہوش کرو جوانو! کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟" نہال چلایا۔
اس کی آواز ایک دھکا لگنے سے حلق میں ہی گھٹ گئی۔ برستی ہوئی لاٹھیاں تھامنے کی کوشش میں اس سمیت کئی افراد کی پگڑیاں اچھل کر زمین بوس ہو چکی تھیں۔
"اوئے دھرم سنگھ! میرا خیال ہے پولیس کو بلوا لینا چاہیے۔ یہ باؤلے کتے اس طرح خاموش نہیں ہوں گے۔" شمشیر سنگھ نے اپنی پاٹ دار آواز میں چلا کر کہا تو کئی لاٹھی بردار ساکت ہو گئے۔ انہیں اس جوش میں اب اپنا ہی خسارہ دکھائی دے رہا تھا۔
مان سنگھ کی آنکھوں میں شراب کے خمار سے شدید ڈورے تھے۔ وہ اپنے پاؤں پر ٹھیک طرح کھڑا بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ دھرم سنگھ اسے دھکیلتا ہوا واپس گھر لے گیا۔ نہال، شمشیر، شیام اور رفیق اس صورتِ حال پر افسردہ تھے۔
"مجھے امید نہیں تھی کہ اتنے بہترین انتظامات کا انجام ایسا ہوگا۔" رفیق نے تاسف سے سر ہلایا۔
"بیساکھی کے میلوں میں ایسے چھوٹے موٹے مسئلے ہوتے ہی رہتے ہیں۔" نہال نے ٹالنا چاہا۔
"لیکن ایسا واہیات ہنگامہ کبھی نہیں ہوا۔" شیام لال نے صاف گوئی سے جواب دیا۔
ان سب کی بحث و نکات سے قطع نظر چوہدری حنیف کے ذہن میں ایک نیا خیال پروان چڑھنے لگا۔ یہ حقیقت تھی کہ اپنی بہترین اور پُرخلوص کوششوں کے اس انجام نے اسے دلی طور پر افسردہ کیا تھا تاہم وہ اب بھی اس تلخی کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک چبوترے پر کھڑا ہوا اور مجمع کو پُرسکون ہونے کا کہہ کر روانی و متانت سے گویا ہوا۔
"زندگی ایک بہت عجیب شے کا نام ہے میرے ساتھیو! اور اس سے بھی عجیب شے ہے قسمت! انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ آج میں روپ نگر میں سلوک و محبت دیکھ کر بہت خوش تھا... پھر ایک غلط قدم نے سب مزہ کرکرا کر دیا۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ روپ نگر سے میری محبت اپنے والدین اور اولاد سے کسی بھی طور کم نہیں ہے۔ اسی محبت کے ناتے آج میں اعلان کرتا ہوں کہ گاؤں کے ہر فرد کو وہ رقم معاف کرتا ہوں جو ان کے ذمے میرا قرض ہے۔ گاؤں کا ہر وہ فرد جو گندم خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا میری جانب سے سال بھر وقتاً فوقتاً بلا معاوضہ گندم حاصل کر سکتا ہے۔ میں اپنی دس کلے زمین روپ نگر میں مسجد کی توسیع اور گردوارے کو دیتا ہوں۔ روپ

نگر کے نوجوانوں کی کبڈی اور دوسرے کھیلوں کے لیے دو کلے زمین نام کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ پروردگار میرے روپ نگر کا یہ روپ اور محبتیں ہمیشہ برقرار رکھے۔ زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں۔ کون جانے اگلے برس ہم اس موقع پر یہاں اکٹھے ہوں گے یا نہیں؟''

''ایسی باتیں نہ کرو چوہدری حنیف!'' روپ نگر کے ایک معزز شخص بلونت سنگھ نے کہا۔ ''واہگرو ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے ہمارے لیے بہت کیا ہے۔''

بلونت کے بعد گاؤں کے دیگر لوگ بھی قرض معاف ہونے اور دیگر سہولیات پر اس کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

حنیف کی آنکھوں میں بار بار نمی آرہی تھی۔ جانے کیوں اس کے دل میں بار بار ایک ہی خیال آرہا تھا اگلے برس وہ ان پیاری فضاؤں اور ان محبت لٹاتی شفیق نظروں کے حصار میں ہوگا یا نہیں؟ دل کا گداز بڑھنے لگا تو وہ آنکھیں مسلتا ہوا چبوترے سے نیچے اتر آیا۔

☆☆☆

دھرم سنگھ اپنی بیٹھک میں مان سنگھ کے سامنے بیٹھا اسے شرر بار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ مان سنگھ ہنوز شراب کے خمار میں تھا۔ اسے والد کی ان نظروں یا کیفیات سے بالکل سروکار نہیں تھا۔

''کیا تو نے کوئی سوگندھ کھائی ہے کہ باپ کا نام یوں ہی بدنام کرے گا؟'' اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپاں تو تیرا نام روشن کر رہا ہے باپو!'' وہ ہنکی لیتے ہوئے بولا۔

''کالج میں داخلہ لینا نہیں چاہتا تو۔ سارا دن لور لور پھرتا رہتا ہے۔ آخر مسیا کیا ہے تیری؟'' دھرم سنگھ جھنجلایا۔ ''کرنا کیا ہے آخر؟''

''آپاں کا بیاہ کردے باپو!'' وہ ایک توقف سے بولا۔

اس فرمائش پر دھرم سنگھ دنگ رہ گیا اور مشکوک نظروں سے بیٹے کو گھورنے لگا۔ اس کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ مان سنگھ نے اس کے لیے کوئی نہ کوئی گمبھیر مسئلہ ہی کھڑا کرنا ہے۔

''آپاں پاروتی کور سے بات کروں گا۔ ڈھونڈ لیں گے تیرے لیے کوئی رشتہ۔'' اس نے دانستہ طور پر اپنی اہلیہ کا نام لیا۔

''ماتا جی سے کہنے کی کیا لوڑ ہے؟ لڑکی تو آپاں کی نظر میں پہلے سے ہی ہے۔'' وہ سرور سے کہنے لگا۔

''کون ہے وہ؟'' دھرم سنگھ مضطرب ہوا۔

''تساں سبھی جانتے ہوا سے۔ پسند بھی بہت کرتے ہو۔'' مان سنگھ کی آنکھوں کے ڈورے گہرے ہونے لگے تھے۔

''پر مینڈر ہی ہوگی وہ۔ چنگی کڑی ہے۔'' دھرم سنگھ نے نام لے کر ٹٹولا۔

''نہیں! وہ پھیکا گونگلو آپاں کو بالکل پسند نہیں۔'' مان سنگھ نے منہ بنایا۔

''تو پھر کون ہے وہ؟'' دھرم سنگھ کا دل ڈوبنے لگا۔ اندیشوں کی یلغار میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا تھا۔

''سلمٰی ہے وہ باپو! سامنے کی بات تساں کو کیوں سجھ نہیں آرہی۔'' وہ جھنجلایا۔

''سلمٰی؟'' دھرم کے ہونٹوں سے سرسراتے الفاظ برآمد ہوئے۔ ''حنیف کی بیٹی سلمٰی؟''

''ہاں وہی! آپاں کو وہ بچپن سے ہی بہت پسند ہے۔ آپاں کی غیرت ہے وہ۔ بیاہ تو اسی سے کرنا ہے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

''وہ دوسرے دھرم کی ہے۔ یہ بیاہ کیسے ہوگا؟'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''آپاں کو دھرم یا سنسکرتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے بھی ہو بیاہ تو اسی سے کرنا ہے ورنہ کسی اور سے بھی نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ سرد مہری سے بولا۔

''اگر اتنا ہی باؤلا ہو رہا تھا اس کے لیے تو حنیفے سے بدتمیزی کرنے کی کیا لوڑ پڑ گئی تھی؟'' دھرم سنگھ نے طنز کیا۔

''دماغ خراب ہو گیا تھا بس! چاچا حنیف ہر ویلے پاکستان جانے کی باتیں کرتا رہتا ہے تو آپاں سے برداشت نہیں ہوا۔ اسی لیے سنا دیں بغیر سوچے سمجھے۔''

مان سنگھ کے اس جواب اور انداز نے اسے مزید اندیشوں میں مبتلا کر دیا۔ وہ بیٹے کی رگ رگ سے واقف تھا۔ سلمٰی کو اپنی ضد بنا لینے کے بعد وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ بچپن ہی سے انتہائی لاڈ پیار میں پلنے کے باعث وہ منتقم مزاجی میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔

''کب کرو گے پھر حنیف چاچا سے بات! ساں کے رشتے کی؟'' اس کی اگلی فرمائش مزید ہولناک تھی۔

''کس بنیاد پہ کروں بات؟'' دھرم سنگھ نے دانستہ طور پر پیشتر ابدلتے ہوئے نرمی اور افسردگی جتائی۔ ''وہ اتنا

امیر اور زمینوں کا مالک ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک گبھرو جوان ڈھونڈ سکتا ہے۔ وہ بھلا کسی ایسے رشتے کو کیوں سویکار کرے گا جس کے پاس کوئی ملازمت یا کام ہی نہ ہو۔''

''آپاں کر لے گا ناں کام! وچن دیتا ہوں کہ کام کروں گا۔'' مان سنگھ حسب توقع اس کے دام میں آ گیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ پھر آپاں کی طرف سے بھی وچن ہے کہ تو ایک ڈیڑھ سال تک کوئی کام دھندا کر لے تو تیرا رشتہ سلمٰی سے پکا کروا کے ہی دم لوں گا۔ آپاں کو پورا وشواس ہے کہ بچپن کی دوستی کے ناتے حنیفا انکار نہیں کرے گا۔'' دھرم سنگھ نے اسے خواب کا ایک جگنو تھمایا۔

یہ حربہ کامیاب رہا۔ مان سنگھ کی آنکھیں خوابوں کے بوجھ سے مخمور دکھائی دینے لگیں۔ چہرے پر ایک نیا عزم جھلک اٹھا۔

''ٹھیک ہے باپو! میں تیار ہوں۔'' وہ جوش سے بولا۔

''لدھیانہ سے تیری بوا کئی بار لکھ چکی ہے کہ وہاں نوکری کا بندوبست موجود ہے۔ کل ہی لدھیانہ چلا جا۔ نوکری کرنا شروع کرے گا تو آپاں جیجے کے پاؤں بھی پڑ کر تیرا رشتہ مانگ لوں گا۔'' دھرم سنگھ نے ایک اور خواب دکھایا۔

مان سنگھ ایک نئے سرور کیف میں وہاں سے اٹھا تو دھرم کے وجود سے شدید اضطراب جھلکنے لگا تھا۔

☆☆☆

میلے کی رونق اب ماند پڑ چکی تھی۔ سرمئی شام رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگی تھی۔ روپ نگر کے باسی اپنی رہائش گاہوں میں سونے کی تیاریوں میں مگن تھے۔ چوہدری حنیف کی حویلی میں بھی یہی سرگرمیاں جاری تھیں۔ کمروں سے روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ صرف لیاقت کا کمرا ایسا تھا جہاں قدرے اضطراب اور ہلچل کے آثار تھے۔ اس نے بڑے بھائی شجاعت کو بھی ضروری بات چیت کے لیے وہاں بلوایا تھا۔ کچھ اثناء بعد شجاعت اس کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر سنجیدگی ثبت تھی۔

''تیرا انداز دیکھ کر لگتا ہے کہ تو بھی وہی سوچ رہا ہے جو میرے دماغ میں ہے۔'' لیاقت کہنے لگا۔

''اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں میں؟ بس آج جو کچھ میلے میں ہوا اچھا نہیں تھا۔'' شجاعت نے جواب دیا۔

''ہاں! مان سنگھ کی بے ہودگیاں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ مجھے کافی عرصے سے اس کی حرکتیں اور عادتیں کوفت زدہ کرتی رہی ہیں۔'' لیاقت نے اپنا نقطۂ نظر بتایا۔

''میں اباجی کو بھی منع کر دوں گا کہ اسے گھر نہ بلایا کریں۔ ایسے شخص سے دوری ہی اچھی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس کی پرورش دھرم چاچا جیسے نفیس اور دھیمی طبیعت کے مالک نے کی ہے۔''

''تمہاری بات اپنی جگہ بالکل درست ہے! لیکن میں اس وقت کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں۔'' لیاقت نے اضطراب سے کہا۔

''یقیناً اباجی کے اعلان کی ہی سوچ ہوگی۔'' شجاعت فوراً بھانپ گیا۔

''ہاں! مسجد کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن گردوارے اور کھیلوں کے لیے اتنے کلے زمین دینے کی آخر کیا تک تھی؟'' اس کے انداز میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

''انہوں نے کچھ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ آپ نے آج سے پہلے تو ان کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔'' شجاعت کو حیرانی ہوئی۔

''اب بھی نہ کرتا لیکن اب حالات مختلف ہیں۔'' لیاقت کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دینے لگا۔

شجاعت اس کا اشارہ بھانپ گیا۔ لیاقت کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے اور ایک طویل انتظار کے بعد اسے اب اولاد کی نعمت سے سرفراز ہونے کی نوید ملی تھی۔

''سمجھ نہیں آتی کہ جب گھر بار، زمینیں سب یہیں رہ جائیں گی تو ایک نئے ملک میں ہم کس طرح رہیں گے؟ اپنی اولاد کو کس طرح سہولیات دیں گے؟'' اس کا خدشہ زبان پر آ ہی گیا۔

''قائدین نے اس معاملہ میں کچھ بہتر ہی سوچا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تقسیم کا مرحلہ بہ آسانی طے ہو جائے گا۔ ہم سب کا مستقبل روشن ہی نہیں محفوظ بھی ہوگا۔ ہماری نئی نسل ایک نئے اور بہترین انداز میں پروان چڑھے گی۔'' شجاعت پُرعزم تھا۔

''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو! مجھے جانے کیوں تقسیم کے خیال سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی بہت بڑی عفریت ہم سب کو نگلنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ کوئی انہونی ہونے والی ہے۔'' وہ شدید تناؤ زدہ تھا۔

''یہ سب آپ کے واہمے ہیں۔ پروردگار نے اتنے

عرصے بعد اس خوشی سے نوازا ہے تو اسی لیے دل میں یہ خدشات چلے آتے ہوں گے۔" شجاعت نے تسلی دی۔

لیاقت ہونٹ بھینچے خاموش ہوگیا۔ اسے کوئی بھی حرف تسلی دلاسہ دینے میں ناکام ثابت ہورہا تھا۔ وہ حالات کی موافقت اور کسی بھی پریشانی سے بچاؤ کے لیے دعا کے سوا کچھ بھی نہ کرسکتا تھا۔

☆☆☆

بیساکھی کے میلے کو دو ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ حنیف اپنے زرعی معاملات میں مصروف رہنے لگا۔ اس کی دھرم سنگھ سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔ وہ گزشتہ کئی ہفتوں سے بخار میں مبتلا تھا۔ کوئی بھی دوا یا ٹوٹکا کام آکے ہی نہ دے رہا تھا۔ اسی دوران تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان بھی ہوگیا۔ سالہا سال سے جاری جدوجہد کو بالآخر ایک منزل کی نوید مل ہی گئی تھی۔ حنیف خوش اور بے حد سرشار تھا۔ وہ اپنے اسی جوش میں دھرم سنگھ سے ملنے چلا آیا۔

"یہ کیا حال بنالیا ہے تو نے اپنا؟" حنیف اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

دھرم کی رنگت سرسوں کی طرح زرد اور نقاہت سے ہڈیاں تک نمایاں ہوچکی تھیں۔

"بس یار! یہ بخار جان ہی نہیں چھوڑ رہا۔" وہ بدقت بولا۔

"میرے ساتھ لدھیانہ چل صبح ہی۔ میں وہاں تجھے کسی اسپتال میں دکھاتا ہوں۔" حنیف نے خلوص سے کہا۔

لدھیانہ کے ذکر پر دھرم سنگھ کی رنگت مزید متغیر دکھائی دینے لگی۔ اس کا دھیان مان سنگھ کی جانب مبذول ہوگیا جو اپنے ہر خط میں دھرم سنگھ سے سلمٰی کا ہاتھ مانگنے کی یاددہانی کرواتا۔

"تو پھر تقسیم کا اعلان ہو ہی گیا۔" اس نے اپنی توجہ ہٹانے کے لیے حنیف کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

"ہاں! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے یہ دن دیکھنا بھی نصیب فرمایا۔" حنیف نے سرشاری سے جواب دیا۔

"روپ نگر میں سب خوش تو بہت ہوں گے؟" دھرم سنگھ نے استفسار کیا۔ وہ اپنی علالت کے باعث کافی عرصہ سے سماجی سرگرمیوں اور میل ملاپ سے دور تھا۔

حنیف اس کی بات پر خاموش ہوگیا۔

"پتا نہیں؟ اگر اسے خوشی کہتے ہیں تو جانے یہ خوشی کی کون سی قسم ہے؟" وہ الجھ کر بولا۔

"ایسا کیا ہوگیا ہے آخر؟" دھرم سنگھ حیران ہوا۔

"تجھے یاد ہے ناں کہ خشونت سنگھ کے گھر سے ہر بار موسم کا نیا پھل میرے گھر ضرور آتا تھا۔ کمار بھی ہر دوسرے تیسرے دن اپنے گھر میں بنائی گئی لسی اور پکوان بھجوا رہا تھا لیکن اب ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ خشونت جہاں بھی نگاہیں پھیر کر گزر جاتا ہے۔ کمار کے انداز میں بھی تکبر سا آگیا ہے۔ اور تو اور نوجوانوں نے بھی ماتھے پر آنکھیں رکھ لی ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ ہمیں کوئی مجرم سمجھنے لگے ہیں۔ بات بھی کریں تو عجیب روکھا پھیکا سا انداز ہوتا ہے ان کا۔" حنیف نے اپنا تجزیہ بتایا۔

"تیرا وہم ہوگا یہ۔" دھرم سنگھ نے بے یقینی سے جواب دیا۔ "ورنہ یہ سب تو تیرا بڑا احسان کیا کرتے ہیں۔"

"اللہ کرے یہ میرا وہم ہی ہو۔ ورنہ مجھے روپ نگر کی فضائیں بدلتی اور رویے سرد محسوس ہونے لگے ہیں۔" اس نے افسردگی سے جواب دیا۔

"اچھا چھوڑ ان باتوں کو!" دھرم نے ٹالا۔ "یہ بتا کر روپ نگر میں ہی رہے گا یا پاکستان چلا جائے گا؟"

"جانا تو پاکستان ہی ہے۔ جو میرے قائداعظم کی منزل ہے وہی میرا ٹھکانا ہوگا۔" وہ محبت سے بولا۔

"جتنی جلدی ہوسکے پاکستان چلا جا! یہاں اب خطروں کے سوا کچھ نہیں رکھا۔" دھرم نے مبہم سے انداز میں کہا۔

حنیف حیرانی سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ دھرم سنگھ نے آج سے قبل کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔

"لیاقت کے گھر اولاد کی پیدائش کا مرحلہ ختم ہوجائے گا تو ہم چلے جائیں گے۔ اس ساون تک کے ہی مہمان ہیں ہم یہاں۔" اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ساون تو ابھی بہت دور ہے۔ جتنی جلدی ہوجائے چلے جانا۔" وہ بضد رہا۔

"کیا بات ہے دھرمے؟ تو مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہا؟" حنیف کو اچنبھا ہوا۔

"نہیں! بس آپاں کی ایک بنتی ہے تجھ سے۔ یہاں سے جاتے ہوئے کسی کو بھی کچھ نہ بتانا۔" اس نے نظریں چرائیں۔

چوہدری حنیف کچھ ثانیوں کے لیے خاموش رہا پھر سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہورہی ہے۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ چھپا رہا ہے مجھ سے۔"

جانکاری بہت گھاتک ہوجایا کرتی ہے۔ کبھی کبھی جانکاری جتنی کم ہو جیون میں اتنا ہی سکون ہوتا ہے۔ بس تو جلدی ہی چلا جا یہاں سے۔ اپنی منزل پر پہنچ جا اس سے پہلے کہ بہت دیر ہوکر راز تھ ہوجائے۔" دھرم سنگھ نے زور دے کر کہا اور نقاہت سے اپنی آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

روپ نگر میں ساون رت کا آغاز ہوچکا تھا۔ سال بھر کے دیگر موسموں کی طرح یہ موسم بھی اپنی خوبصورتی کے ڈھیروں رنگ بکھیر دیا کرتا تھا۔ اساڑھ کا پہلا چھینٹا ہی رحمت خداوندی کا پیغام ہوتا تھا۔ تپش زدہ دوپہروں میں کچے مکانوں کے کونوں میں چھپنے والے لوگ میدانوں میں نکل آیا کرتے۔ روپ نگر میں برکھا رت درحقیقت حیات نو کا سندیسہ ہوتی تھی۔ ساون کے ہر اتوار کو صبح سے ہی ہر گھر میں 'ساواں' منانے کا اہتمام کیا جاتا۔ پوڑے پکتے، پکوان تیار ہوتے اور لڑکے بالے اپنی جوان بہنوں، بھاوجوں کے ساتھ تیسرے پہر تالاب کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس موقع کا مزہ اس وقت مزید دوبالا ہوجاتا جب یکدم ابر امڈ آتا اور پھوار پڑنے لگتی۔ ٹھنڈی ہوائیں ہر سمت دھانی رنگ کی چنریاں لہرانے لگتی تھیں۔ تالاب میں برسات کا تازہ گدلا پانی، عورتوں کے کونے میں بچوں کا غل غپاڑہ، گنوگھاٹ پر لڑکوں کی قطاریں جو آگے پیچھے اس تیزی سے تالاب میں کودتے جاتے کہ لمحہ بھر میں ہی پوری قطار غائب ہوجاتی تھی۔ اس کے بعد جب وہ ابھرتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا تالاب میں بیسیوں آبنوسی کٹوڑے تیر رہے ہوں۔

زیادہ منچلے افراد تالاب کے کنارے کھڑے ان دو کہنہ سال پیپل کے درختوں پر چڑھ جاتے جن کی شاخیں پانی کی طرف ہی قدرے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکے ان شاخوں پر چڑھ کر پانی میں 'شڑاپ شڑاپ' کودا کرتے۔ برسات میں آس پاس کا پانی جب سمٹ کر تالاب میں گرتا تو بوسیدہ پانی دو نالیوں کے ذریعے برابر میں ہی ایک جوہڑ میں منتقل ہوجاتا تھا۔

آغاز میں 'ساواں' صرف جوان سال عورتوں اور کم سن بچیوں کا تہوار ہوتا تھا مرد ادھر سے عمداً ہی کم گزرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی اس تہوار میں شریک ہونے لگے۔ تالاب کی دوسری جانب نئے جتے ہوئے کھیتوں میں کشتی لڑتے یا کبڈی کھیلتے۔

آپ اٹلی کے پاس ٹاور ہی کو دیکھ لیں۔ وہ ایک طرف سے اس طرح جھکا ہوا ہے کہ جیسے ابھی گر جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ اسے اس کے ڈیزائن کی خوبی سمجھتے ہوں لیکن دراصل یہ ڈیزائن بنانے والے کی غلطی ہے۔

مرسلہ: نصیر جوکھیو، حیدرآباد

****

کبھی کبھی فلموں میں اور ادبی شاہ پاروں میں بھی غلطیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ آئیں کچھ ادبی غلطیوں کو دیکھتے ہیں۔

جان کیٹس، بلاشبہ انگریزی زبان کا بہت بڑا شاعر تھا اس کو نہ صرف مغرب میں بلکہ مشرق میں بھی پذیرائی حاصل ہے۔ اس نے بہت لکھا اور بہت اچھا لکھا۔

اس کی ایک مشہور نظم ہے۔ On First looking into اس نظم میں اس نے کارٹز کے لیے لکھا ہے کہ اس نے پیسفک ارشین دریافت کیا تھا جبکہ پیسنک ارشین کو بالبوا نے دریافت کیا تھا۔

شیکسپیئر نے اپنے مشہور ڈرامے جولیس سیزر کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک ہورہی تھی۔

یاد رہے کہ جولیس سیزر رومنی عہد سے تھا۔ اور اس وقت گھڑی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ پھر یہ کون سی گھڑی تھی جو ٹک ٹک ہورہی تھی۔

مشہور کردار شرلاک ہومز کی ایک کہانی میں ڈاکٹر واٹسن کی بیوی کئی بار اپنے شوہر کا نام کچھ اور بتاتی ہے۔

ڈینیل ڈی فو کے مشہور ناول رابن سن کروسو کا ایک منظر بہت دلچسپ ہے۔

ہیرو (مرکزی کردار) ننگے بدن ہے۔ وہ اس حال میں تیرتا ہوا کشتی تک جاتا ہے اور جیب میں کھانے کے لیے کچھ چیزیں رکھ لیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب ننگے بدن تھا تو جیب کہاں سے آگئی۔

مرسلہ: احمد سلمان، لاہور

ساون برسات کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ ملاپ کی ایک خصوصی تقریب بھی شمار ہوتا تھا۔ سسرال سے میکے لوٹ آنے والی دلہنیں اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملتیں یا سسرال آئی ہوئی نوبیاہتا نئی برادری سے متعارف ہوا کرتیں۔ روپ نگر میں یہ دن محبتوں کی بیداری کے ہوا کرتے تھے۔ شام کے وقت جب یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچتی تو گاؤں کی زندگی کے رچاؤ میں اضافہ ہو چکا ہوتا لیکن اس روز سب کچھ مختلف تھا۔ تہوار کی تیاری میں کسی قسم کی کوئی گرم جوشی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

حنیف پژمردگی سے تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کا دل بے حد گداز ہو چکا تھا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک کر کپڑوں اور پھر زمین میں جذب ہونے لگے۔ اسے روپ نگر اور اپنی ذات میں صدیوں کا فاصلہ محسوس ہو رہا تھا۔ دھرم سنگھ کی الجھی بکھری باتوں نے بھی ذہن بوجھل کر رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر خالی الذہنی کے عالم میں وہاں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اذان کی آواز سماعت میں پڑتے ہی بوجھل سانس لیتے اٹھا اور نماز کی ادائیگی کے لیے چل دیا۔

☆☆☆

ماہ اگست کے ابتدائی روز تھے۔ چوہدری حنیف کی حویلی کے اس ہال نما کمرے میں سکوت طاری تھا۔ منقش کرسیوں پر حنیف، دھرم سنگھ، نہال سنگھ، شیام لال، رفیق، شمشیر سنگھ، رام کمار، بہادر سنگھ اور کرم سنگھ براجمان تھے۔ حنیف نے ان سبھی کی بہترین مہمان نوازی کی تھی۔ کھانے کے بعد فرحت بخش مشروبات اور پھلوں سے خاطر تواضع کی گئی۔

اس خاطر مدارات کے باوجود حاضرین کی اکثریت کے چہرے تناؤ زدہ تھے۔ آنکھوں میں گریز اور کھنچاؤ کی کیفیت بھی واضح محسوس ہو رہی تھی۔

"میرا وچار ہے کہ اب کام کی بات ہو جانی چاہیے۔" شیام لال کہنے لگا۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں!" حنیف نے متانت سے جواب دیا۔

"ہندوستان بھر کے حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔" رفیق نے گفتگو کی تمہید باندھی۔

"میں ان معاملات سے بے خبر نہیں ہوں۔" حنیف نے نرمی سے کہا۔ "مجھے اخبارات کے ذریعے ہر بات کا علم ہوتا رہتا ہے۔"

"افسوس کا مقام ہے کہ ہم ساری زندگی ایک ساتھ رہے ہیں اور اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔" رفیق سخت ملال زدہ تھا۔

حنیف افسردگی سے اپنا سر جھٹک کر رہ گیا۔ گورداسپور، لدھیانہ، چندی گڑھ اور امرتسر سے موصول ہونے والی خبریں سخت تشویش ناک تھیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اخبارات میں بھی یہ معاملات زیادہ تفصیل اور سچائی سے بیان نہیں کیے جا رہے تھے۔ حالات ابتری کی طرف جا رہے تھے۔ ان علاقوں کے مسلمانوں پر قیامت ڈھائی جا رہی تھی۔ مکانات مکینوں سمیت نذرِ آتش کیے جاتے۔ بچوں کی اعضاء بریدگی ہوتی۔ معمر افراد کو زندگی بچانے کے لیے تیز دوڑ کا حکم دیا جاتا اور جب وہ ہانپتے ہوئے اس پر عمل کرتے تو قہقہے بلند کرتے ہوئے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ خواتین کے ساتھ ناروا سلوک کی انتہا کر دی گئی تھی۔ انہیں برہنگی کے عالم میں گلیوں، سڑکوں اور چوراہوں پر پھرایا جاتا۔ سرِ راہ عصمت دری کی جاتی اور اعضاء بریدگی کے بعد سسکتی موت کے حوالے کر دیا جاتا۔

"غلطی تو تم لوگوں کی ہی ہے ناں!" رام کمار نے سرد مہری سے کہا۔ "ہم سب تو سلوک اتفاق سے رہ رہے تھے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال کر پھر سے ایک ہو کر رہنے لگتے لیکن تم لوگوں کو الگ دیس لینا تھا۔ تبھی لوگوں کو پاکستان بنانے کے لیے آگ لگی ہوئی تھی۔ اب یہ آگ سب کچھ جلا کر خاک کر رہی ہے تو شور کیوں مچا رہے ہو؟"

"یہ تم کہہ رہے ہو رام کمار؟" حنیف نے تاسف سے اسے دیکھا۔ "تم جیسے پڑھے لکھے انسان سے ایسی سوچ اور الفاظ کی اُمید نہیں تھی مجھے۔"

"بات تو اس نے سچ ہی کی ہے۔" بہادر سنگھ کہنے لگا۔

"اگر سچ کہنے یا جتانے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے ایک بات بتاؤ؟" حنیف کو بھی غصہ آیا۔ "ہمارے سماج کے اکثر ہی گھروں میں بھائی بھائی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ شروع میں سب کچھ بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ اتفاق اور محبت سے وقت گزرتا ہے۔ پھر اولاد بڑی ہونے پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ایک بھائی دوسرے سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیتا ہے۔ اسے اپنے حساب کتاب اور سوچ سے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ تو کیا اس کے مطالبے کی صورت میں تم اس کے ساتھ ایسا سلوک کرو گے؟ اپنی ماؤں جیسی بھابیوں، اولاد جیسے بھتیجے بھتیجیوں کو اس طرح رسوا کر کے مارو گے؟ یہ

اپنا شیام لال یہاں بیٹھا ہے۔ پچھلے سال اس کے چاروں بھائیوں نے بھی تو کاروبار اور حویلی کے حصے کیے تھے۔ پوچھو اس سے کہ کیا اس نے بھی ان سے ایسا ہی سلوک کیا تھا؟"

حنیف کے اس سوال پر بہادر سنگھ سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ شیام لال کی رنگت بھی فق ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ اس بات کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ تم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ تمہیں نفرت نے اتنا اندھا کر دیا ہے تم رشتے ناتوں کی پہچان ہی بھول گئے ہو۔" حنیف نے ایک اور چوٹ کی۔

"دیکھو چوہدری حنیف! ہم تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی زبان کو قابو میں ہی نہ رکھو۔" کرم سنگھ نے منہ بنایا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ عزت بھی کس بنیاد پر کی جاتی ہے۔" حنیف مزید سنجیدہ ہوا۔ "میں نے آج تک روپ نگر کے لیے جو کچھ کیا ہے یہ شاید اسی کا صلہ ہے لیکن یہ سب کرتے ہوئے بھی میرے ذہن میں ہمیشہ ایک بات ضرور گونجتی تھی کہ جس پر احسان کرو اس کے شر سے ضرور بچو۔"

حنیف کی اس بات پر وہ سبھی افراد جز بز ہو کر رہ گئے۔ حقیقت یہی تھی کہ اس نے ماضی قریب و بعید میں اہل علاقہ کی بلاتخصیص مذہب بھرپور مدد کی تھی۔ معاشی طور پر کمزور افراد کی مالی مدد، ان کی بیٹیوں کا سارا خرچ، بیٹوں کی تعلیمی اخراجات، گندم اور گیہوں کی بلا معاوضہ فراہمی، مکانات پکے کرنے کے لیے امداد، مذہبی تقریبات میں شرکت کا خرچ اور نئے موسمی پھلوں کی فراہمی تک ممکن بنائی تھی۔ روپ نگر میں اس کی عزت و احترام کا خیال رکھا جاتا لیکن اب موجودہ صورتِ حال نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ چوہدری!" شمشیر سنگھ کہنے لگا۔

حنیف کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے اسی بات کی توقع تھی۔

"میں بہت جلد یہاں سے اپنے بڑے بھائی کے پاس قصور چلا جاؤں گا۔ وہاں میری بیٹی کی بچپن سے ہی منگ ہے۔ میں اس آخری فرض سے بھی سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔"

حنیف کی اس بات پر دھرم سنگھ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے وجود میں ایک اضطراب در آیا تھا۔

"اگر حالات زیادہ خراب ہو گئے تو کسی کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ اپنی زمینیں بیچ کر جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ!" رام کمار کہنے لگا۔

"میں اپنے خاندان کے ساتھ اکیلا نہیں جاؤں گا۔ کسی صورت بھی نہیں۔" وہ چٹانی انداز میں بولا۔

"تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" شمشیر سنگھ نے بھنوئیں اچکائیں۔

وہ کافی عرصہ سے اس کی زمینوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ان حالات میں وہ زمینیں اونے پونے خرید لینے کا بہترین موقع تھا۔

"میں روپ نگر کی مسلمان آبادی کو تم لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ان کی بحفاظت روانگی کی بھی ضمانت چاہیے۔"

اس نئے مطالبے نے ان سبھی کو حیرت زدہ کر دیا۔

"ہوش کے ناخن لو چوہدری!" نہال سنگھ نے بے ساختہ کہا۔ "یہ ایسی ضد بازی کا موقع نہیں ہے۔"

"ضد نہیں ہے یہ! میں اپنے مسلمان بھائیوں کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ پھر چاہے مجھے موت ہی کیوں نہ آجائے میں پروا نہیں کروں گا۔" وہ دوٹوک بولا۔

"یہ حماقت نہ کرو چوہدری! اپنا اور اپنے پریوار کا سوچو بس!" شیام لال نے کہا۔

"اگر تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں نے کبھی زندگی میں کسی پر کوئی احسان کیا ہے تو میرے اس کام میں روڑے نہ اٹکانا۔"

حنیف کے اس مطالبے پر ان کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

"اتنے لوگوں کے سفر کا بندوبست کیسے کرو گے؟" شمشیر سنگھ نے کچھ اثناء بعد اس سکوت کا خاتمہ کیا۔

"وہ میرا دردِ سر ہے۔ میں خود ہی کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔" اس نے شمشیر کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اگر اپنی زمینیں بیچنا چاہتے ہو تو میں لینے کے لیے تیار ہوں۔" شمشیر نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

حنیف کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے اپنے سامنے بیٹھے ان افراد سے ایسی ہی سوچ کی توقع تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر رضامندی کا عندیہ دے دیا۔

"یہ کام اگلے ایک ہفتے میں کر لو تو بہتر ہی ہے ورنہ انجام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" کرم سنگھ نے اسے تنبیہ کی۔

"مجھے انجام کی کوئی پروا نہیں ہے۔ جو رات قبر میں آنی ہے وہ تو وہیں گذرے گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" وہ بے خوفی سے بولا۔

کچھ دیر بعد سبھی مہمان رخصت ہو گئے۔ دھرم سنگھ اپنی ہی سوچوں میں غرق وہاں بیٹھا رہا۔

"کیا بات ہے دھرمو؟ تیری طبیعت کیوں نہیں ٹھیک ہو رہی؟" وہ محبت بھری تشویش سے بولا۔

"یہ شاید اب کبھی ٹھیک ہو بھی نہیں سکے گی۔" اس نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے پژمردگی سے کہا اور مزید گویا ہوا۔ "اپنی بھی ایک دو روز کے لیے ادھار دے سکتا ہے کیا؟ آپاں نے کسی کام سے لدھیانہ جانا ہے۔"

"ایک شرط پر دوں گا۔"

"ہاں بول؟ کیسی شرط؟" دھرم سنگھ مضطرب ہوا۔

"تو وہاں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس بھی جائے گا۔" حنیف نے سنجیدگی سے کہا۔

دھرم سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ذہن میں مان سنگھ سے ممکنہ ملاقات کا تصور کلبلا رہا تھا۔

☆☆☆

لدھیانہ میں مان سنگھ کی زندگی ایک نئے مدار میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے جوش محبت میں لدھیانہ آ کر ملازمت تو کر لی تھی لیکن اب یکساں معمولات سے اوبنے لگا تھا۔ وہ فطری طور پر ہی آزاد منش، متلون مزاج اور بھنورا صفت انسان تھا۔ کوئی بھی کام مستقل مزاجی سے کرنے کی صلاحیت ہی مفقود تھی۔ اب بھی اسے روپ نگر میں گذرے روز و شب یاد آیا کرتے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں خونی تغیر بھی اس کا خون گرمایا کرتا۔

وہ اکثر یہی سوچتا تھا کہ ان دنوں اسے روپ نگر میں ہی ہونا چاہیے تھا۔ ساون کے تہوار میں شرکت نہ کرنے کی خلش ہی کیا کم ستاتی تھی کہ اب بھادوں کا موسم بھی طلوع ہونے والا تھا۔ مان سنگھ کو بچپن سے ہی بھادوں کا موسم بھاتا تھا۔ اس رت کا تضاد اسے بے حد پسند تھا۔ ساون کی جھڑیاں گذر جانے کے بعد "ساداں" کی رونق بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔

بھادون کی آمد چبھتی ہوئی دھوپ اور حبس کے ساتھ ہوتی تھی۔ ایک طرف تو یہ عالم ہوتا کہ کبھی کبھار کوئی بدلی کہیں سے اڑ کر آ جایا کرتی اور اس ادا سے برستی کہ بھینس کا ایک سینگ تر ہو جاتا تو دوسرا خشک ہی رہتا اور کبھی یہ عالم ہوتا کہ ہر جانب جل تھل ہو جاتا۔ مان سنگھ کو کھیتوں اور چراگاہوں کی ہریالی پر دھوپ اور چھاؤں کا ایک دوسرے کے تعاقب میں گھومنا بہت بھاتا تھا پھر جب دھوپ بے جان ہونے کے بعد سائے لمبے ہونے لگتے تو طبیعت میں اداسی اور اضمحلال جڑ پکڑ لیتے۔ مان سنگھ کو یاد تھا کہ وہ بھی دیگر لڑکوں کے ساتھ گاؤں کے راستوں پر غول کی صورت میں ہر راہ گیر کا دامن تھامے یک زبان پکارا کرتا۔

"موہ ماہی دے کے جا
داڑھی پھل پوا کے جا"

راہ گیر اور مسافران ہنستے اور کلیلیں کرتے بچوں کی ٹولی کو مایوس کرنا مناسب نہ سمجھتے۔ وہ ان کے ہاتھ میں دھیلا، پیسا تھما کے اپنا دامن چھڑا ہی لیتے تھے۔ کئی ایک البتہ ان سے بچ کر دور ہی سے کنی کترانے کی کوشش کرتے۔ مان سنگھ کو ایسے راہگیروں کا تعاقب اور پھر ان سے رقم اینٹھنے کا بہت شوق تھا۔

اپنی ان سرگرمیوں کی یاد آتے ہی مان سنگھ روپ نگر واپسی کے لیے بے چین ہو گیا۔ اپنی ان کیفیات سے مغلوب ہو کر اس نے اگلی صبح روانگی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نصف گھنٹے بعد دھرم سنگھ کی آمد ہو گئی۔ وہ ایک شاندار بگھی میں سوار تھا۔ اس کے پاس مٹھائی کا ایک بڑا سا ٹوکرا اور چہرے پر شدید چمک تھی۔ مان سنگھ نے چوہدری حنیف کی وہ بگھی پہچان لی تھی۔

دھرم سنگھ اپنی بہن، بہنوئی اور بھانجے سے بہت محبت سے ملا۔

"یہ مٹھائی کس خوشی میں لایا ہے بھئی؟" کرتار سنگھ نے استفسار کیا۔

"اپنے مان سنگھ کی بات پکی کر آیا ہوں ناں۔ اسی خوشی میں۔" اس نے سرشاری سے بتایا۔

"بات کہاں پکی کر دی؟ آپاں کو بتایا بھی نہیں۔" نرملا کور نے گلہ کیا۔

"اپنے پنڈ کا ہی چوہدری ہے۔ اس کی بیٹی ہے۔" دھرم سنگھ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اعتماد سے جواب دیا۔

مان سنگھ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ حیرت و بے یقینی سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

"روپ نگر میں تو ایک ہی چوہدری ہے۔ چوہدری حنیف۔" کرتار سنگھ نے فوراً کہا۔ "تو اس کی بیٹی کی بات تو نہیں کر رہا؟"

"بالکل! آپاں نے اسی کی بات کی ہے۔" دھرم سنگھ نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا۔ اس جیسے بے ریا اور سیدھے سادے شخص کے لیے اداکاری کرنا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

"وہ تو مسلا ہے۔ اس نے بیٹی دینے کی ہامی کیسے بھر لی؟" کرتار سنگھ حیرت سے بولا۔

"آپاں کے بچپن کا دوست ہے۔ تساں کو تو شاید یاد نہ ہو پر آپاں نے بچپن میں اسے ایک بار نہر میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اس کے بعد وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ دھرمے! آپاں کی زندگی تیری قرض دار ہے۔ تو جو چاہے آپاں سے مانگ لینا۔" دھرم سنگھ نے دانستہ طور پر ماضی بعید کی ایک بات کا حوالہ دیا۔

مان سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے یہ بات یاد تھی۔ دھرم سنگھ اور چوہدری حنیف کئی بار اس واقعہ کا ذکر کر چکے تھے۔

"پھر بھی...... آپاں کی بدھی میں یہ بات نہیں سما رہی کیونکہ مسلے اپنی بہن بیٹیوں کا بیاہ کبھی دوسرے دھرم میں نہیں کرتے۔" کرتار سنگھ ہنوز مشکوک تھا۔

"ہندوستان کے حالات نے بھی اسے مجبور کر دیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ عزت سے بیٹی کا بیاہ کر کے خود پاکستان چلا جائے گا۔ وہ جوان بیٹی کو ساتھ لے جا کر اس کی عزت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" دھرم سنگھ نے فوراً پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

"ارے! چھوڑو اب یہ بحث۔" نرملا کور نے بدمزگی سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ "آپاں نے یہ مٹھائی پورے علاقہ میں بانٹنی ہے۔" وہ پُرجوش بھی تھی۔

"ضرور بانٹنا میری بہن! ضرور بانٹنا!" دھرم سنگھ نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور مان سنگھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"روپ نگر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ وہاں کے سارے مسلمان پاکستان جانے کے لیے اتاؤلے ہیں۔ چوہدری حنیف بھی یہی چاہتا ہے کہ ان کے جاتے ہی سکھنی کا بیاہ کر دے۔"

"اس کے بیٹوں نے تو کوئی ہیر پھیر نہیں کی؟" مان سنگھ نے اسے ٹٹولا۔ "وہ کیسے تیار ہو گئے اس بیاہ کے لیے؟"

"لیاقت کے گھر تو آج صبح ہی لڑکا پیدا ہوا ہے۔ وہ اسی خوشی میں مست ہے۔ چوہدری کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے پورے روپ نگر میں موتی چور کے لڈو بانٹے ہیں۔ شجاعت کو بھی ابھی اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور مٹھائی کا ایک ٹکڑا نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔

"آپاں آج بہت خوش ہے میرے پتر! واہگرو تساں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ بھادوں ختم ہوتے ہی تیرا بیاہ کر دوں گا۔"

باپ کی اس جذباتیت پر مان سنگھ بھی جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوابوں کے بے شمار جگنو اتر آئے تھے۔

☆☆☆

پاکستان بننے کا اعلان ہو گیا تھا۔ چوہدری حنیف کی خوشی اور جوش دیدنی تھا۔ پوتے کی پیدائش کے بعد یہ خبر اسے آبدیدہ کر گئی۔ اس نے رات بھر شکرانے کے نوافل ادا کیے اور سجدہ ریز ہو کر جانے کتنی دیر آنسو بہاتا رہا۔

اگلے روز اس نے قافلوں کی تشکیل اور روانگی کا بندوبست شروع کر دیا۔ روپ نگر کی دو سو آبادی میں سے ڈیڑھ سو افراد نقل مکانی کے لیے تیار ہوئے تھے۔ دیگر افراد دوسرے علاقوں میں مقیم اپنے رشتہ داروں کے ہاں منتقل ہونا چاہتے تھے۔

اس نے اپنی زمینوں کا ایک مخصوص حصہ شمشیر سنگھ کو فروخت کر دیا۔ حاصل شدہ رقم کا مصرف بھی اس نے سوچ لیا تھا۔ حنیف نے ڈیڑھ سو افراد کے پانچ لشکر بنائے۔ پہلے قافلے کے ساتھ لیاقت اور اس کی بیوی مریم سفر کرتے۔ دوسرے قافلے کے ہمراہ شجاعت اور حنیف کی بہن ہو لیتے۔ تیسرا قافلہ اس کی بڑی بیٹی محمودہ اور داماد ساجد کی معیت میں ہوتا۔ چوتھا قافلہ رفیق سنبھالتا جبکہ پانچویں کے ہمراہ وہ خود اپنی اہلیہ اور سلمٰی کے ساتھ روانہ ہوتا۔ روپ نگر کے چاروں اطراف میں راستے نکلتے تھے۔ ان قافلوں کو انہی مختلف راستوں سے یکے بعد دیگرے نکلنا تھا۔

زمین کی فروخت سے حاصل شدہ رقم قافلے کے ہر فرد کو مخصوص تناسب میں دینے کے بعد اس نے ان کی اشیائے خورد و نوش کے لیے گڑ، خشک چنے اور مکئی کے بھنے ہوئے دانے بھی فراہم کیے۔

اس کام سے فراغت ملی ہی تھی کہ دھرم سنگھ اس سے ملنے چلا آیا۔ وہ حد درجہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''اچھا ہوا تو یہیں چلا آیا۔ میں تجھ سے ہی ملنے کے لیے آرہا تھا۔'' اس نے عجلت میں کہا۔

دھرم سنگھ خاموش نظروں سے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھتا رہا۔

حنیف نے اپنی الماری سے چند کاغذات نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیے۔

''یہ میری باقی زمینوں کے کاغذ ہیں۔ میں نے یہ زمینیں تیرے نام کردی ہیں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے یار؟'' دھرم سنگھ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''ضرورت کیوں نہیں ہے؟'' وہ مزید سنجیدہ ہوا۔ ''مجھے مان سنگھ سے بالکل کوئی اُمید نہیں ہے۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ تیرا بڑھاپا خوار کردے گا۔ میں تیرا مستقبل محفوظ دیکھ کر ہی یہاں سے جانا چاہتا ہوں بس!'' اس نے محبت سے کہا۔

دھرم سنگھ اس فیاضی پر دنگ تھا۔

''سب کچھ یہیں بانٹ جائے گا تو آگے جاکر کیا کرے گا؟ اپنے پریوار کو کیسے سنبھالے گا؟'' وہ سخت حیرت زدہ تھا۔

''وہاں قصور میں بھی پرکھوں کی زمینوں میں میرا حصہ ہے۔ زندگی رہی تو اسی سے کام چلتا رہے گا۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

دھرم سنگھ کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

''تساں نے اپنا پریوار خطرے میں ڈال کر اچھا نہیں کیا۔ ایک ساتھ لے کر جاتا انہیں۔''

''نہیں! ایک ساتھ لے جانے میں زیادہ خطرہ تھا۔ ہندوستان کے حالات تیری سوچ اور اندازوں سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ ایک ساتھ جائیں گے تو کسی بھی حملے کی صورت میں کوئی بھی بچ نہیں پائے گا۔ اس طرح یہ اُمید تو سلامت رہے گی ناں کی کوئی نہ کوئی اپنی منزل تک پہنچ ہی جائے گا۔ میں نے انہیں ممکنہ ٹھکانے سمجھادیے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کا وہاں دو ہفتوں تک ضرور انتظار کرے گا۔

حنیف کے اس تفصیلی جواب پر دھرم سنگھ کے آنسو بہہ نکلے۔ بچپن کی رفاقت جدائی میں بدلتے دیکھ کر وہ شدید جذباتی بحران کا شکار تھا۔ اس پر مستزاد مان سنگھ کا ذہنی فتور اور اس معاملہ کو سلجھانے کے لیے اپنے بولے گئے جھوٹ بھی اسے سخت تناؤ زدہ کیے ہوئے تھے۔

چوہدری حنیف نے بغلگیر ہوکر اسے رخصت کیا اور دوبارہ ہال کمرے کی طرف چلا آیا جہاں لیاقت اور شجاعت اپنے قافلوں کے ہمراہ روانگی کی تیاری میں تھے۔ حنیف کچھ لمحے محبت اور افسردگی سے انہیں دیکھتا رہا۔ لیاقت نے عقیدت سے والد کا ہاتھ تھاما اور اسے ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے قدموں میں زانو پر سر رکھے بیٹھ گیا۔ شجاعت بھی بڑے بھائی کی تقلید میں وہیں آبیٹھا۔ حنیف شفقت سے ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

''میرے جگر گوشو! رب جانتا ہے کہ تمہیں کس حوصلے سے رخصت کررہا ہوں۔ میری دلی دعا ہے کہ تم سب بحفاظت اس سرزمین تک پہنچ جاؤ جس کی محبت اور مسافت میں ہم نے بہت سے خواب دیکھے ہیں۔ آج سے ہماری شناخت تبدیل ہوگئی ہے۔ آج سے پہلے ہم ہندوستانی تھے لیکن اب ہم پاکستانی ہیں۔ ہم سب نے قائداعظم کے ساتھ مل کر ایک خواب دیکھا ہے۔ ہم سبھی نے اس خواب سے محبت کی ہے اور اسی محبت کے صدقے راستے میں آنے والی مشکلات کا سامنا کرنا۔ ہر محبت قربانی مانگتی ہے۔ تم بھی کوئی قربانی دینے سے دریغ نہ کرنا۔ میری اپنے پروردگار سے دلی دعا ہے کہ تم لوگ سلامتی وخیریت سے پاکستان پہنچ کر نئی زندگی کا آغاز کرو۔ بس میری ایک نصیحت یاد رکھنا! کبھی کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اپنی اولاد کو ہمیشہ رزق حلال کھلانا۔ اپنی کمائی اور اعمال میں حرام کی ذرا سی بھی آمیزش نہ ہونے دینا۔ غریب پروری کرتے رہنا۔ مسکینوں اور حاجت مندوں کی مدد سے کبھی پیچھے نہ ہٹنا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے گئے راستوں کی تقلید کرنا۔ غربت یا کسی مشکل میں کبھی ہمت نہ ہارنا۔ اپنا ظرف ہمیشہ بلند اور خاندانی وقار کبھی فراموش نہ کرنا۔ حقیقی مشکل کشا صرف اللہ کی ذات ہے۔ اپنی ہر پریشانی اور حاجت میں صرف اسی کو پکارنا۔''

''آپ ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں اباجی؟ اللہ نے چاہا تو ہم اپنی منزل پر پہنچ کر ایک نئی زندگی کا آغاز ضرور کریں گے۔'' لیاقت نے تڑپ کر کہا۔

''ہاں! اگر اللہ نے چاہا تو ضرور۔'' حنیف نے ایک گہری سانس لے کر جواب دیا۔

وہ اپنے وجود میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ اس نے بلونت سنگھ، راجندر سنگھ اور ابھیمنیو سنگھ کی معیت

میں تینوں قافلے تین مختلف راستوں سے روانہ کردیے۔ بلونت، راجندر اور ابھی منیو انہیں قصور کی سرحد تک پہنچا کر واپس روپ نگر چلے آئے۔ حنیف کے قافلے کی تاخیر سے روانگی کا سبب قریبی علاقوں کے ایک دو مسلم خاندانوں کی ممکنہ آمد اور ان کے ساتھ شمولیت تھی۔

قافلوں کی روانگی کے بعد حنیف نے نوافل کی ادائیگی کا آغاز کردیا، اس کے دل کا گداز بے حد بڑھ چکا تھا۔

☆☆☆

رات اپنے اختتامی پہر میں تھی۔

دھرم سنگھ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ چوہدری حنیف کے دیے گئے کاغذات اس کے سرہانے ایک تپائی پر رکھے تھے جنہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھیں بار بار بھیگنے لگتیں۔ وہ اپنی واپسی کے بعد سے اب تک شدید جذباتی کشمکش میں تھا اور صبح ہوتے ہی حنیف کو اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر تیز دستک نے اسے چونکا دیا۔ انداز بہت مانوس تھا۔ دھرم سنگھ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اٹھا اور اپنا وجود بمشکل گھسیٹتا ہوا دروازے تک چلا آیا۔ اس ذرا سی مشقت سے وہ بے طرح ہانپ کر رہ گیا تھا۔

''کون ہے بھئی؟'' اس نے نقاہت سے کہا۔

سانس لینے سے سینے پر دباؤ بڑھنے لگتا تھا۔

''دروازہ کھول باپو!''

اسے مان سنگھ کی آواز سنائی دی تو قدموں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا اور حیرت سے بولا۔ ''سب خیر تو ہے ناں؟ تو اس وقت یہاں؟''

مان سنگھ دندناتا ہوا اندر آیا اور خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تو آپاں کے ساتھ کیا کھیل رچا رہا ہے باپو؟''

''کیا ہوا؟ آپاں نے کیا کردیا؟'' وہ مزید حیران ہوا۔

''پکی خبر ملی ہے کہ سلمٰی قصور میں کسی کی منگ ہے اور چوہدری اپنے پریوار کو وہیں لے کر جارہا ہے۔'' وہ غرایا۔

دھرم سنگھ کا سر چکرا سا گیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس روز ہال کمرے میں موجود کسی شخص نے اسے یہ خبر دی ہے۔ کیوں اور کس طرح کے سوالات پر غور کرنے کا وقت تھا نہ ہی مہلت۔ دھرم سنگھ کو کسی بھی صورت یہ معاملہ فوری طور پر سنبھالنا تھا۔

''اپنے باپو پر شک کررہا ہے؟'' اس نے جارح مزاجی سے کہا۔ ''ہاں! یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ چوہدری نے کچھ دن پہلے ایسی کوئی بات کی تھی لیکن روپ نگر کے مسلمانوں کے سامنے سچا ہونے کے لیے کہا تھا یہ سب۔ اگر اس میں ذرا بھی سچائی ہوتی تو وہ اب تک یہاں سے چلا نہ گیا ہوتا؟ اب بھی وشواس نہیں ہوتا تو یہ دیکھ! چوہدری نے اپنے جوائی کے لیے زمینوں کے کاغذ دیے ہیں۔ وہ خود تو یہاں سے چلا جائے گا پر بیٹی اور جوائی کے نام زمینیں لگادے گا۔''

دھرم سنگھ نے وہ کاغذات اس کے سامنے پٹخ دیے۔

مان سنگھ بے یقینی سے ان کاغذات کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تنے عضلات اب کسی حد تک پُرسکون ہوگئے تھے۔

''تو سچ کہہ رہا ہے ناں باپو؟'' اس نے دھرم سنگھ کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہنے لگا۔

''واہگرو کا شکر ہے اس نے آپاں کو پاپ سے بچا لیا... ورنہ آپاں نے سلمٰی کو اٹھوالینا تھا آج۔ آپاں نے تو سوچ لیا تھا اگر اس کا چوہدری بیاہ کے لیے نہ مانا تو اسے بن بیاہی لگائی بنا کر لدھیانہ لے جاؤں گا۔''

مان سنگھ کے اس اعتراف وانکشاف پر دھرم سنگھ تھرا کر رہ گیا۔ سینے پر دباؤ میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے پل بھر میں ہی ایک فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

فضا میں نیم تاریکی غالب تھی۔ چوہدری حنیف نماز فجر کی باجماعت ادائیگی کے بعد لوٹ رہا تھا کہ اس کی نظر سنگی مجسمے کی طرح ساکت دھرم سنگھ پر پڑی جس نے جس میں بھی ایک بڑی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید زردی کھنڈی تھی۔

''کیا بات ہے دھرمے؟ تیری طبیعت کیوں نہیں سنبھل رہی؟ اپنا خیال کیوں نہیں کرتا ہے تو؟'' وہ غصے میں کہنے لگا۔

دھرم سنگھ نے چادر تلے سے ایک ہاتھ نکالا اور حنیف کا بازو تھام کر اس کی حویلی کے دالان میں گھسیٹ لایا۔ حنیف کو اس کے وجود میں لرزش محسوس ہونے لگی تھی۔ دالان میں آتے ہی دھرم سنگھ نے اس کا بازو چھوڑا اور لرزیدہ آواز میں کہنے لگا۔

’’تجھے تیرے اللہ اور رسول ﷺ کا واسطہ ہے حنیفے! چلا جا یہاں سے۔ چلا جا ورنہ بڑا انرتھ ہو جائے گا۔‘‘

’’چلے تو جانا ہی ہے میرے یار! پھر جانے کب ملاقات ہو اور کب نہیں۔ لیکن تو مجھے کچھ تو بتا کہ آخر ہوا کیا ہے؟‘‘

اس کی افسردگی بھرے استفسار پر دھرم سنگھ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے ہچکیوں میں حنیف کو تمام تر ماجرے سے آگاہ کردیا۔

’’اس...... کی جرأت اتنی بڑھ گئی ہے؟ میں اسے زمین میں زندہ گاڑ دوں گا۔‘‘ اسے طیش آیا۔

’’تیرا یہ کام بھی میں نے کر دیا ہے حنیفے! تیرے اپکار چکانے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا میرے پاس۔‘‘

اس نے چادر سے دوسرا ہاتھ نکالا اور مان سنگھ کا سر اس کے سامنے کر دیا۔ اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ تصور میں وہ لمحات اجاگر تھے جب اس نے بیٹے کو دودھ میں افیم پلا کر سلایا اور پھر اپنی کرپان سے اس کا سر ہی تن سے جدا کر دیا تھا۔

’’یہ کیا کر دیا تو نے؟‘‘ حنیف ششدر رہ گیا۔

’’تو ٹھیک ہی کہا کرتا تھا حنیفے! ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اولاد کو زیادہ سر پر نہ چڑھا۔ اس پر سختی بھی رکھ ورنہ وہ تیرا بہت بڑا امتحان بن جائے گی۔ کاش آپاں نے تیری بات مان لی ہوتی تو ... یہ سب نہ ہوتا۔‘‘ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لرزش اور زردی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔

’’چلا جا یہاں سے۔‘‘ اس نے حنیف کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

حنیف نے اس کا بازو تھپکا اور بوجھل قدموں سے اندر بڑھ گیا۔ اس کی ذہنی رو اپنی اولاد اور ان کے ممکنہ سفر کی جانب منتقل تھی۔ وہ ان کی بحفاظت قصور رسائی کے لیے دعا گو تھا لیکن وہ قبولیت کا لمحہ ہی نہیں تھا۔ اس کی تمام تر دعاؤں اور آرزوؤں کے برخلاف وہ قافلے کچھ ہی در بعد ہی مختلف اوقات میں اپنے اپنے مقامات پر بھیانک حادثوں سے دوچار ہونے والے تھے۔

☆☆☆

لیاقت اپنی اہلیہ کو سنبھالتے بے حال تھا۔

زچگی کے بعد اس کی نقاہت میں شدید اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے لیے قافلے کے ساتھ متوازن انداز میں قدم ملا کر چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ کبھی تھکی ہوئی اور کبھی جھنجلاہٹ بھری نگاہوں سے اہل قافلہ کو دیکھنے لگتی۔ ہر جانب گرد و غبار اور پسینے کی ملی جلی بدبو کا ایک طوفان تھا۔ مختلف رنگ و نسل کے افراد چہروں پر اُمید و خوف کے رنگ لیے اپنی نئی منزل کی جانب رواں تھے۔ کسی نے اپنے سر پر سامان کی گٹھری تو کسی نے بچوں کو اٹھا رکھا تھا۔

اس کی نظریں بار بار اپنے چند روزہ بیٹے محمد علی کی جانب بھی اٹھ جاتیں۔ وہ اس افتاد سے بے خبر تاہم بے آرامی کے باعث نڈھال تھا۔ مریم کی حالت اور نقاہت کے پیشِ نظر اسے کبھی لیاقت بھی گود میں اٹھا لیتا تھا لیکن اپنی بھوک مٹانے لیے اسے مریم کے پاس ہی آنا پڑتا۔ مسلسل سفر اور تھکاوٹ کے باعث وہ بیٹے کا پیٹ بھرنے سے قاصر تھی۔ نتیجتاً وہ وقفے وقفے سے رو کر اپنا احتجاج بیان کرنے لگتا۔ یہی حال قافلے میں موجود دو اور شیر خوار بچوں کا بھی تھا۔ چند گھنٹوں بعد اہل قافلہ ان کے شور و غل سے بیزار دکھائی دینے لگے۔

’’ان کو کسی طرح چپ کرواؤ بھئی! سکھ اور ہندو جتھے یہیں آس پاس گشت پر رہتے ہیں۔ کسی کو ہماری یہاں موجودگی کی بھنک بھی لگ گئی تو کوئی ایک سلامت نہ رہے گا۔‘‘ ایک معمر شخص کرم دین کہنے لگا۔

تینوں خواتین اس اعتراض پر بلبلا کر رہ گئیں۔ مریم نے ایک بار لیاقت سے تھوڑی دیر سفر موقوف کرنے کے لیے بھی کہا تاکہ وہ بیٹے کا پیٹ بھر سکے۔ اس بات پر بھی کئی افراد چیں بہ جبیں ہونے لگے۔

’’پہلے ہی اتنی سست رفتاری سے چل رہے ہیں ہم۔ اگر یہی حال رہا تو اگلے سال ہی منزل پر پہنچ سکیں گے۔‘‘ کئی افراد نے برملا کہا۔

وہ لمحات بہت بوجھل اور دشوار تھے۔ لیاقت اور مریم نے زندگی کا ایک بہت اہم سبق سیکھا۔ ان کے والد سے امداد اور وسائل لے کر انہی کے زورِ بازو پر سفر کا آغاز کرنے والے وہ افراد ان پر کس قدر آرام و سکون سے معترض تھے۔ یہ احسان فراموشی کی ایک عظیم تر مثال تھی۔

تھوڑی مسافت مزید طے ہونے کے بعد انہیں کسی جانب سے مخصوص نعروں کی آواز سنائی دی۔

’’جو بولے سو نہال...... ست سری اکال...... ہر ہر مہادیو۔‘‘

’’حملہ...... حملہ ہو گیا ہے۔‘‘ کرم دین چلّایا۔

’’اِدھر کماد کے کھیت میں چھپ جاؤ! درختوں کے پتوں میں روپوش ہو جاؤ۔ جلدی کرو سب!‘‘ لیاقت نے ہدایات دیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ سبھی افراد بقاء کی جبلی خواہش کے تحت اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ اسی اثناء میں درجن بھر مسلح افراد کا جتھا وہاں چلا آیا۔ وہ شراب کے نشے میں مخمور کسی ایسے علاقے میں کامیاب واردات کا ذکر کر رہے تھے جہاں انہیں بہت سا مال و زر اور خواتین حاصل ہوئی تھیں۔

کھیتوں میں چھپے افراد ان کی لغو گوئی اور ہرزہ سرائی دم سادھے سننے پر مجبور تھے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ محمد علی نے ایک بار پھر بھوک سے بلبلانا شروع کر دیا۔ لیاقت نے متوحش ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ مسلح افراد کو ان کی وہاں موجودگی کا علم ہو گیا تھا۔

’’مسلے ہیں یہاں...... وہ یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔‘‘ ایک سکھ چلّایا۔

’’تو چل پھر! شکار کھیلتے ہیں۔ مزہ آئے گا۔‘‘ دوسرے سکھ نے سرشاری سے کہا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑی تلواروں سے کھیت کی تلاشی کا آغاز کر دیا۔

اگلے چند لمحوں میں وہاں خونی کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ان درجن بھر افراد کے تقریباً دو درجن ہتھیاروں کی زد میں آ کر کئی مسلمان جان کی بازی ہار گئے۔ مسلح دشمن کے خوف نے انہیں اس قدر ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ یہ حقیقت ہی فراموش کر بیٹھے ان کی عددی تعداد سکھوں سے کہیں زیادہ ہے اور وہ کسی حکمت عملی کے تحت ان پر غلبہ پا سکتے ہیں۔

کماد کا وہ کھیت سکھوں کے نعروں اور وحشی نعروں سے گونجتا لیاقت، مریم اور محمد علی سمیت جانے کتنے افراد کو تہ تیغ کر گیا۔ کماد میں لہو کی آبیاری ہونے لگی۔ اس شکار کے بعد خواتین کے زیور اتار کر وہ واپس چلے گئے۔ بچ جانے والے اہل قافلہ سراسیمگی میں درختوں سے نیچے اتر آئے اور ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا۔

’’ان بچوں کو اب یہیں چھوڑ کر جانا ہو گا۔‘‘ ایک اور معمر شخص نے سرد مہری سے کہا۔

’’ایسا کیسے ممکن ہے؟ اتنے چھوٹے بچے یہاں کیسے رہیں گے؟‘‘ ایک شیر خوار کی والدہ تڑپ اٹھی۔

’’تو پھر تم بھی ان کے ساتھ یہیں رہ لو۔ اب یہ بچے قافلے کے ساتھ ہرگز نہیں جائیں گے۔‘‘ ایک اور شخص نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

دونوں خواتین کی سٹی گم تھی۔ پھر چشم فلک نے ایک نیا اور انقلابی منظر بھی دیکھا۔ ان بچوں کو کسی پرانے اور میل خوردہ کپڑے پر لٹا کر اس کپڑے کا جھولا بنا کے درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ خواتین کی آنکھیں مسلسل اشک زن تھیں۔ گاہے بگاہے لبوں سے چیخ بھی برآمد ہو جاتی۔

’’ان کے منہ میں پتے ٹھونسو! یہ چیخ و پکار تو بند ہو ان کی۔‘‘ کرم دین نے درشتی سے کہا۔

دیگر خواتین نے ایسا ہی کیا اور ان کے مچلتے وجود اپنے ساتھ گھسیٹتے آگے بڑھنے لگیں۔ درختوں کی اوٹ میں خلاء میں معلق وہ بچے روتے ہوئے ہلکان ہو کر اب نیم بے ہوش ہو چکے تھے۔ کھیت میں بکھری لاشیں فضا میں منڈلاتے گدھوں کی ضیافت کا سامان بننے والی تھیں۔

☆☆☆

شجاعت کا قافلہ کافی مسافت طے کر چکا تھا۔

اس قافلے میں شامل افراد قدرے منظم انداز میں رواں تھے۔ دوپہر سے پہلے ان کا گزر دھرم کوٹ کے قریب سے ہوا۔ دھوپ کی تمازت اور مسلسل سفر نے بھوک پیاس سوا کر رکھی تھی۔ اسی لمحہ ان کی نظر چند باریش اور سنجیدہ و متین صورت افراد پر پڑی۔ وہ درختوں کے سائے میں قرآن پاک لیے بیٹھے تھے۔

’’لگتا ہے بہت دور سے سفر کر کے آئے ہو؟‘‘ ان میں سے ایک شخص نے شجاعت کو مخاطب کیا۔

’’جی ہاں! روپ نگر سے آرہے ہیں۔‘‘ اس نے بوجھل سے انداز میں بتایا۔

’’اس جانب سے کئی علاقوں کے قافلے یہاں سے گزرے ہیں۔ ہم نے روٹی ٹکر اور پانی وانی سے ان کی خدمت کر کے ہی آگے بھیجا تھا۔ اگر تم لوگ بھی ضرورت محسوس کرو تو کھانا مل سکتا ہے۔‘‘

اس پیشکش پر کئی افراد کے چہرے چمک اٹھے۔ وہ خشک چنے، مکئی اور گڑ کے استعمال سے اوب گئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہامی بھر لی۔ اگلے نصف گھنٹے میں ایک ادھیڑ عمر شخص دال اور چاول لیے چلا آیا۔ دوسرے شخص نے ایک بڑی سی طشتری میں پیتل کے پانی سے بھرے جگ رکھے ہوئے تھے۔ کھانے سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ سبھی افراد اس کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ شجاعت نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا۔

''منزل کہاں ہے جوان تمہاری؟'' کھانا لانے والے شخص نے شجاعت سے دریافت کیا۔

''قصور جانے کا ارادہ ہے۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ شجاعت کو اپنے وجود میں ایک عجیب سی تخی نے مضطرب کرنا شروع کر دیا۔ کچھ اثناء بعد اسے اپنے آس پاس ابکائیوں کی ہولناک سی صدائیں بلند ہوتی سنائی دیں۔ اسی پل اسے بھی حلق اور سینے میں شدید جلن کا احساس ہوا اور یک لخت ایک رقیق مادہ ناک ومنہ سے بہہ نکلا۔ شجاعت کا چہرہ اور بدن اپنے ہی لہو میں لتھڑ گئے تھے۔ اس نے حیرت بھری نظروں سے اپنے ان میزبانوں کو دیکھا اور ایک ہی پل میں ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ وہ لوگ بلاشک وشبہ مسلمانوں کے بھیس میں دشمن ہی تھے جو نہ جانے اپنی کون سی حس کی تسکین کے لیے یہ کھیل رچائے بیٹھے تھے۔ کچھ ہی لمحوں میں اس بات کی تصدیق بھی ہوئی۔ شجاعت اور اس کے ساتھیوں کو خون آلود قے کرتے دیکھ کر وہ مخصوص نعرے بلند کر رہے تھے۔

شجاعت کے وجود سے زندگی کی رمق تیزی سے معدوم ہونے لگی۔ ان کے میزبان اب بڑے اطمینان سے تلاشی لیتے ہوئے تلواروں کے وار سے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔

''الٰہی! میرے خاندان کی حفاظت فرمانا۔ انہیں اپنی منزل پاکستان تک پہنچنے کی ہمت وسعادت نصیب فرمانا۔'' تلوار کی چمک آنکھوں کے سامنے لہراتے ہی شجاعت نے تڑپ کر دعا مانگی۔

قبولیت کی گھڑی ہنوز بہت دور تھی۔ رفیق اور ساجد بھی اس پل اپنے دردناک انجام سے دوچار ہو چکے تھے۔ ساجد کے قافلے میں پانی جلد ختم ہونے پر انہوں نے رستے میں آنے والے ایک کنوئیں سے اپنے مشکیزے بھرے اور وہیں خوب سیر ہو کر پانی بھی پیا۔ کچھ ہی دیر بعد انہیں اندازہ ہوا کہ کم ظرف دشمن یہ آبی ذخیرہ زہر آلود کر چکا ہے۔ ساجد اور محمودہ سمیت تقریباً تین درجن افراد اس سریع الاثر زہر سے پل بھر میں ہی موت سے بغلگیر ہو گئے۔ رفیق اور اس کے ساتھی بھی مسلح ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے کی زد میں آ کر تہ تیغ ہو گئے۔ پاکستان تک رسائی کا خواب ایک اذیت بن کر بے نور آنکھوں میں ثبت تھا۔

☆☆☆

دھرم سنگھ اپنے کمرے میں بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کی وحشت بھری نگاہیں چھت کی کڑیوں میں الجھی تھیں۔ چند گھنٹے پہلے اپنے بیٹے اور بیوی کی آخری رسومات ادا کر کے آیا تھا۔ اس کی اہلیہ بیٹے کی موت پر اگلا سانس بھی نہ لے سکی تھی۔ دھرم سنگھ نے پل بھر میں ہی اپنے سب رشتے کھو دیے تھے۔ اس کے سینے پر دباؤ اور سانس لینے میں دقت غیر معمولی رفتار سے بڑھ رہی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر اسی حالت میں ساکت پڑا رہا۔ کچھ لمحوں بعد دروازے پر دستک نے اسے چونکا دیا۔ انداز بالکل شناسا نہیں تھا۔ وہ اپنا وجود بمشکل گھسیٹتا ہوا دروازے تک آیا اور بنا استفسار ہی قفل کھول دیا۔ اس کے سامنے کرتار سنگھ کا بیٹا انوپ اور دو مزید نوجوان کھڑے تھے۔

''آؤ انوپ! ٹھیک تو ہو؟ لدھیانہ میں سب کیسے ہیں؟'' اس نے کھینچ کر سانس لیتے ہوئے کہا۔

''بھلے چنگے ہیں سب! مان سنگھ کہاں ہے؟'' انوپ نے بے تابی سے دریافت کیا۔

''وہ تو کل ہی واپس چلا گیا تھا۔'' دھرم سنگھ کی زبان سے بے ساختہ پھسلا اور وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ اسے مان سنگھ کی یہاں آمد کا اعتراف کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

''جھوٹ مت بولو ماما!'' انوپ مزید مضطرب ہوا۔ ''وہ اساں کو کہہ کر آیا تھا کہ سلمٰی کو اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ پھر وہ ہم سب کی لگائی بنے گی۔ مان سنگھ واپس نہیں آیا تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ گھوٹالا ہے۔''

انوپ کے اس انکشاف پر دھرم سنگھ کا بچا کھچا ملال بھی ختم ہو گیا۔ اسے مان سنگھ کے قتل کا اب رتی بھر افسوس نہیں رہا تھا۔

''مامی کہاں ہے؟ وہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔'' انوپ نے اس کے عقب میں نظریں دوڑائیں اور اسے پیچھے دھکیل کر اندر چلا آیا۔

دھرم سنگھ کے لیے اب سانس لینا مزید دشوار ہو رہا تھا۔ وہ بے بس نظروں سے انوپ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنے لگا۔ کمرے میں ادھر اُدھر جھانکتے اس کی نظر کاغذات پر پڑ گئی۔ مندرجات پر نگاہ دوڑاتے ہی اس کی آنکھوں میں حریص چمک بیدار ہو گئی۔

''یہ چوہدری اپنی زمینیں کس خوشی میں بانٹتا پھر رہا ہے؟'' اس نے دھرم سنگھ کی طرف دیکھا۔

''یہ کاغذ چھوڑ دے انوپے! تساں کا اس معاملہ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔'' وہ جھنجلایا۔

''لینا دینا کیوں نہیں ہے ماما!'' اس نے بدلحاظی سے کہا۔ ''اگر وہ زمینیں بانٹ رہا ہے تو ہم بھی تھوڑا حصہ لے لیتے ہیں۔''

انوپ نے یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی تجویز سے متفق دکھائی دے رہے تھے۔ حرص نے آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی تھی کہ ان کے ذہنوں سے مان سنگھ کا خیال بھی ایک ہی پل میں فراموش ہو گیا تھا۔ دھرم سنگھ نے آگے بڑھ کر انوپ سے وہ کاغذات چھیننے چاہے۔ انوپ نے بے اختیار اس کے سینے پر ایک گھونسا جڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔ دھرم سنگھ کے لبوں سے ایک کراہ نکل گئی۔ وہ اپنا سینہ تھام کر زمین بوس ہو گیا۔ تنفس بے طرح اکھڑ چکا تھا۔

''واہگرو! آپاں کے متر کی رکھشا کرنا۔'' اس کے لب بے آواز ہلے اور سر ایک جانب ڈھلک گیا۔

☆☆☆

چوہدری حنیف اپنی حویلی کے دالان میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے اگلی صبح روانگی کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں تاہم ذہنی رو ہنوز بھیجے گئے چاروں قافلوں اور اپنی اولاد کی جانب مرکوز تھی۔ ان قافلوں کے ساتھ بھیجے گئے افراد میں سے کسی ایک کی بھی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ حنیف کا دل خدشات وتفکرات سے ڈوب رہا تھا۔ وہ مسلسل ان سبھی کی سلامتی کے لیے دعا گو تھا۔

دالان میں ٹہلتے اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ تین افراد دندناتے ہوئے اندر چلے آئے۔ ان کے تیور خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ حنیف کو اس لمحہ اپنی ایک حماقت کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے حویلی کے محافظوں کو اپنا سامان باندھنے کے لیے ان کے رہائشی کوارٹرز میں بھیج دیا ہوا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں ان افراد کا یوں بھرا مار کر چلے آنا کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔

''ہاں بھئی چوہدری! سنا ہے کہ بیٹی کی شادی کی خوشی میں زمینیں بانٹ رہے ہو۔'' انوپ نے استہزائیہ کہا۔

''اپنی زبان کو لگام دے اوئے! میں تیرے ٹوٹے کر دوں گا اگر کوئی بکواس کی تو۔'' حنیف بھڑک اٹھا۔

انوپ معنی خیز نظروں سے اپنے دونوں ساتھیوں وجے اور آنند کی جانب دیکھنے لگا۔

''تو آپاں کا اندازہ ٹھیک تھا۔ ماما دھرم سنگھ اپنے ہی پتر کو دھوکا دے رہا تھا۔''

''وہ ملعون انسان تو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔'' حنیف نے مزید طیش میں کہا اور اپنے لباس میں پوشیدہ ہتھیار نکال کر انوپ کی جانب بڑھنا چاہا۔

وجے اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے اپنی ہتھیلی کے زوردار وار سے حنیف کی بازو پر کاری ضرب لگائی۔ آنند نے فوراً اسے عقب سے دبوچ لیا۔

''اسے یہیں پکڑ کر رکھ آنند! اپنے متر مان سنگھ کا پورا پورا بدلا لیں گے اس سے۔'' وہ زہرخند ہوا اور مرکزی دروازہ بند کر کے وجے کے ہمراہ اندر بڑھ گیا۔

حنیف آنند کی گرفت میں مچلتے ہوئے خود کو چھڑوانے کی ناکام کوششیں کرتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد انوپ اور وجے سلمٰی اور اس کی ماں کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔

''چھوڑ دے انہیں بے غیرت انسان!'' وہ چلایا۔

''اچھا! تو اتنی ہی ضد کرتا ہے تو چھوڑ دیتا ہوں۔ بس بدلے میں اپنے پاکستان اور محمد علی جناح کے خلاف ایک نعرہ لگا دے۔ واہگرو کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں ان دونوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' انوپ نے اسے پچکارا۔

''نہیں! میں ایسا کوئی نعرہ نہیں لگاؤں گا۔ پاکستان زندہ باد! قائداعظم زندہ باد!'' وہ شدومد سے سر ہلاتے ہوئے چلایا۔

انوپ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے وجے کو مخصوص اشارہ کیا اور دونوں نے ان خواتین کا لباس تار تار کر دیا۔ وہ ان کے سامنے دہائیاں دینے لگیں لیکن ابلیسیت کا غلبہ سوا تر تھا۔ حنیف اپنی اہلیہ اور بیٹی کی اس حالت پر شدید طوفان کی زد میں تھا۔ انوپ اور وجے اب نہایت اہتمام سے اپنے نئے کھیل میں مصروف ہو گئے تھے۔ حنیف نے پوری قوت لگا کر اپنا وجود چھڑوایا اور اپنے اس خنجر کی طرف جست لگا دی جو وجے کے وار سے کچھ ہی دور گرا تھا۔ آنند نے فوراً اس کی ٹانگ دبوچ لی۔

''اسے یہ نظارے ہر حال میں دکھانے ہیں آنند! پکڑ کر رکھ اس حرامی کو۔'' انوپ نے سلمٰی کو روندتے ہوئے کہا۔

حنیف بے بسی کی انتہا پر تھا۔ بیٹی اور بیوی کی یہ بے حرمتی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے اپنی ٹانگ چھڑوانے کی ناکام کوشش کے بعد جب آنند کو عقب سے اپنے بازو گرفت میں لیتے محسوس کیا تو خنجر کی نوک یکے بعد دیگرے دونوں آنکھوں میں گھسا دی۔ لہو کا ایک فوارہ نکلا اور اس کی بصارت سے وہ انسانیت سوز مناظر روپوش

ہو گئے۔ انوپ نے غصے اور تنفر سے اسے دیکھا اور سلمیٰ کو مکمل رونڈنے کے بعد آنند کے حوالے کر دیا۔

''کیا کرتا ہے اس کا استاد؟'' وجے نے پوچھا۔

''اس حویلی اور زمینوں پر تو اپنا ہی قبضہ سمجھو آج سے۔ باقی رہا یہ چوہدری! تو اس کا انجام بھی آپاں نے سوچ لیا ہے۔'' انوپ کی آنکھوں میں شیطانی چمک لہرائی تھی۔

☆☆☆

لدھیانہ میں 'ہولی' کا تہوار تھا۔ تقسیم ہند کے بعد حالات اب قدرے متوازن ہو چکے تھے۔ جلاتے بھرکے لوگ رنگوں میں نہاتے دکھائی دینے لگے۔ ایسے میں لباس سے عاری ایک شخص کسی سمت سے نمودار ہوا۔ اس کے بال میل خوردہ اور داڑھی جھنکاڑ تھی۔ چہرہ نہایت خوفناک تاثر دیتا تھا۔ آنکھوں کی جگہ رستے زخموں کی دید دیکھنے والوں کو کراہیت محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی۔

وہ کچھ دیر ساکت کھڑا اپنے اردگرد آوازوں کا ماخذ اور پس منظر جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی اثناء میں اسے ہاتھوں میں رنگ لے کر بھاگتے کسی شخص کا دھکا لگا۔ اس نے بے اختیار اس شخص کا بازو پکڑ لیا۔

''چھوڑ مجھے بھکاری کہیں کے!'' وہ شخص کراہیت سے بولا۔

''پاکستان کیسا ہے؟ کتنا بڑا ہو گیا ہے؟ لیاقت اور شجاعت اس کا خیال تو رکھتے ہیں ناں؟ انہوں نے محمد علی کو قائداعظم سے ملوا لیا ہے ناں؟ بڑے دن ہو گئے دھرم سنگھ نہیں آیا۔ اس کی طبیعت اب ٹھیک رہتی ہے ناں؟''

حنیف کے یہ سوال ہولی کے ہنگاموں میں اس شخص کی سماعت میں ہی نہ پڑے۔ وہ اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھ گیا تھا۔ حنیف نے اب کسی دوسرے شخص کا بازو تھام لیا تھا۔

''پاکستان کیسا ہے؟ کتنا بڑا ہو گیا ہے؟ لیاقت اور شجاعت اس کا خیال تو رکھتے ہیں ناں؟ انہوں نے محمد علی کو قائداعظم سے ملوا لیا ہے ناں؟ بڑے دن ہو گئے دھرم سنگھ نہیں آیا۔ اس کی طبیعت اب ٹھیک رہتی ہے ناں؟'' وہ ایک بار پھر اپنے سوال دہرانے لگا۔

''پاکستان تو ہندوستان کے پاس واپس چلا آیا ہے۔'' اس شخص نے زہریلے انداز میں کہا۔

حنیف کی سماعت یہ فقرہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے مقابل کو رگید کر زمین پر گرا لیا۔

''بکواس کرتا ہے۔ تو بکواس کرتا ہے۔ پاکستان کو کچھ نہیں ہوا۔ پاکستان کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کو کبھی کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ زور زور سے چلّانے لگا۔

مجمع سے کئی افراد اب اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے بھائی بندو کی اس حالت اور حنیف کی زبان سے برآمد ہونے والے فقرات پر سخت برافروختہ تھے۔ انہوں نے حنیف کو گھونسوں اور ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔

''تیرا پاکستان گھٹنوں کے بل واپس آئے گا۔'' کسی شخص نے اس کے بال دبوچے۔

حنیف نے اپنے سر سے اسے ٹکر ماری اور مزید بلند آواز سے کہنے لگا۔

''پاکستان زندہ باد...... پاکستان زندہ باد...... پاکستان زندہ باد......''

مجمع کے مزید افراد اسے پُرتشدد انداز میں زدوکوب کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں حنیف کے جسم کا ہر حصہ لہولہان ہو گیا تھا۔

''مرنے دو سالے کو یہیں۔'' ایک شخص نے ٹھوکر مارتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا۔

'' پاکستان بالکل ٹھیک ہوگا۔ اب تو بڑا ہو گیا ہوگا۔ میرے لیاقت اور شجاعت ساجد کے ساتھ مل کر اس کا خوب خیال رکھتے ہوں گے۔ انہوں نے محمد علی کو قائداعظم سے بھی ملوایا ہوگا۔ وہ اس سے ملاقات کے بعد بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ انہوں نے اسے اپنی قوم کا ننھا سپاہی قرار دیا ہوگا۔ ہماری 'محبت' پاکستان کو حاصل کرنے کے 'خواب' کا یہ 'سفر' ضرور کامیاب ہو گیا ہوگا۔ دھرم سنگھ بھی ٹھیک ہوگا۔ اس کی طبیعت سنبھل گئی ہوگی۔ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گا۔'' حنیف دردبھری کراہوں میں خود کلامی کرتا رہا۔

مجمع میں ایک دوسرے پر رنگ پھینکنے کے بعد شور و غل میں سماعت شکن اضافہ ہو چکا تھا۔ اس شور سے بے نیاز حنیف زمین پر ادھ موئی حالت میں لیٹا کسی تسبیح کی طرح ایک ہی گردان کرنے لگا۔

''پاکستان زندہ باد!''

''پاکستان زندہ باد!''

''پاکستان زندہ باد!''

++

خوابِ ناتمام

مکرمی مدیر

آداب عرض

اس بار ایک ایسی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوا ہوں جو آنکھوں میں آنسو اور دل میں تڑپ پیدا کر دے گی۔

خالد شیخ طاہری
(جامشورو)

نثار بیگ کی عمر پندرہ سال تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا ایک لگن اور جستجو تھی کہ کسی طرح محمد علی جناح کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ نجانے کیوں اسے ایک ایسے انسان سے عشق سا ہو گیا تھا جسے اس نے دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ یہ بات تو سمجھ گیا تھا کہ مسلمان گوروں کے غلام ہیں اور اب آزادی ملنی چاہیے اور ایک ایسا ملک ہو جہاں اسلامی نظام

اور معاشرہ تشکیل پا سکے۔ اسی خواب کی تعبیر پانے اور جدوجہد کی تحریک کے قائد محمد علی جناح ہیں جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایسی جنگ جو ایک نہیں دو دشمنوں کے خلاف ہے۔

''ہم آزاد ہو کر کہاں جائیں گے؟'' ایک دن نثار نے اپنے ماموں سے سوال کیا۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''پاکستان جائیں گے۔'' نثار کے ماموں نے مختصر جواب دیا۔ وہ اس موضوع پر نثار سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نثار کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔

''ماموں ہم آزاد ہو کر واقعی ایک اسلامی ملک کے شہری بن جائیں گے؟'' اس سوال کا جواب اب مختصر نہیں تفصیلاً دینا ضروری ہو گیا تھا۔ انہوں نے نثار کو اپنے پاس بٹھایا اور سمجھانے لگے۔ ان کی باتیں اس کے ذہن میں پرت در پرت بیٹھتی چلی گئی۔

جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اس پر بس ایک ہی دھن سوار ہو چکی تھی۔ وہ دھن ایک آزاد اسلامی ملک کے قیام کی تھی۔

☆☆☆

پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ پورا ہندوستان اس نعرے سے گونج رہا تھا۔ ایک جوش و ولولہ تھا جو مسلمانوں کے رگ رگ میں دوڑ رہا تھا۔ ہر طرف آزادی کے نعرے گونج رہے تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی سحر ہو چکی تھی۔ آزادی کا سورج طلوع ہونے کو بیقرار تھا۔

آگرہ میں رات پر پھیلانے لگی۔ مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ مسجد کے کچھ نمازی صحن میں نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ نثار اپنے والد وقار بیگ کے پہلو میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی پیش امام صاحب بھی تشریف لے آئے تو خاموشی چھا گئی۔ وہ اپنی مخصوص جگہ سنبھال کر تسبیح پوری کرنے لگے۔ تسبیح پوری کر کے ...... جیب میں ڈالی، ایک نظر نمازیوں کو دیکھا اور گویا ہوئے۔ ''یہ وقت بھی ہم پر آنا تھا کہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تین حصوں میں بٹ جائیں۔ یہ آزادی نہیں، ہم مسلمانوں کو تقسیم کرنے کی بہت بڑی سازش ہے اور یہ سازش ہندوؤں، گوروں کے ساتھ مل کر ہم مسلمانوں کے خلاف کررہے ہیں۔''

آگرہ کی یہ مسجد شہر کے وسط میں تھی۔ پیش امام صاحب کی بات سن کر نثار بیگ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی مگر وہ اپنے والد کی وجہ سے اپنا غصہ دبا کر بیٹھا رہا۔

''امام صاحب یہ تو اب ہو کر رہے گا کیونکہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ لوگ اپنا سب کچھ سمیٹ کر کوچ کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔'' وقار بیگ نے کہا۔

''یہ سب اس جناح کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ دیکھنا، لوگ ایک روز پچھتائیں گے۔'' امام صاحب کی آواز تیز ہو گئی۔ نثار امام صاحب کی بات سن کر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے اپنے قائد کے بارے میں پیش امام کے کہے الفاظ بالکل بھی پسند نہیں آئے تھے۔ اس کے والد بھی پاکستان بننے کے سخت خلاف تھے۔ وہ امام صاحب کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اس لیے کہ وہ سب اپنی پارٹی کے بہکاوے میں آئے ہوئے تھے۔ وقار بیگ مسجد کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ مسجد کا سارا انتظام انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ مؤذن کی غیر موجودگی میں کبھی کبھی اذان و اقامت کے فرائض بھی سرانجام دے دیا کرتے تھے۔

''لیکن ہم کہیں نہیں جائیں گے۔'' امام صاحب کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''جی...... جی ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ اپنا گھر، اپنے لوگ، کاروبار کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اگر بٹوارہ ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔'' اس بار بھی وقار بیگ نے جواب دیا۔ دیگر نمازی بھی تائید میں سر ہلانے لگے۔ نثار کے دل میں بغاوت کی ایک لہر سی اٹھی جس نے طوفان بن کر وقار بیگ کا سامنا کرنا تھا۔

☆☆☆

وقار بیگ کے تین بیٹے اور ایک ہی بیٹی تھی۔ نثار بیگ سب سے بڑا تھا۔ نثار کا ننھیال اپنا سب کچھ سمیٹ کر کراچی کا رخ کر چکا تھا... کیونکہ کراچی اس حصے میں تھا جو ہر حال میں پاکستان بننا تھا۔ دو ماموں ایک کنواری خالہ اور نانی سب خیریت سے کراچی پہنچ چکے تھے۔ نثار کے بڑے ماموں رحمت بیگ نے جانے سے پہلے بہن کی خاطر آخری بار کوشش کی کہ وقار بیگ بھی کراچی چلیں مگر انہوں نے نہ صرف صاف انکار دیا بلکہ انہیں بے عزت کر کے گھر سے بھی نکال دیا۔ نثار کی والدہ ایک مشرقی عورت تھیں۔ بھائی کی بے عزتی سہہ کر سہاگ کے پہلو سے لگی کھڑی رہ گئیں اور نم دیدہ اپنے پیاروں کو رخصت کر دیا۔ اسی رات وقار بیگ نے انتہائی سخت لہجے میں اعلان کر دیا۔ ''اگر اس گھر میں کسی

نے یہاں سے جانے کی بات کی تو سمجھو وہ میرے لیے اور میں اس کے لیے مر گیا۔'' باپ کا اعلان سن کر بچے اور عابدہ بیگم سہم گئے مگر نثار نے سر جھکا کر سب سن تو لیا مگر دل میں عہد کر چکا تھا کہ وہ کراچی ضرور جائے گا۔ نثار کے جذبات عابدہ بیگم سے کیسے چھپ سکتے تھے؟ وہ ماں تھیں سب جانتی تھیں کیونکہ نثار اپنے ننھیال سے بہت قریب تھا۔ وہ صابر عورت بھائیوں کے بعد بیٹے کی جدائی بھی برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں نثار کو سمجھایا بھی مگر وہ ہر بار کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل جاتا۔ وہ مجبور تھیں۔ سمجھ رہی تھیں کہ ایک دن بیٹے کے جذبات کا آتش فشاں پھٹے گا۔ نفرت اور ضد کی دیوار اسے روکنے کی کوشش کرے گی۔ اس کوشش میں شوہر جیتتا یا بیٹا وہ چشم تصور سے ایک ماں اور بیوی کو ہارتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

''نثار......!'' قریبی مسجد سے نثار نماز پڑھ کر جب باہر نکلا تو وجاہت کو اپنے پیچھے آتا دیکھا۔ وجاہت اس کا جگری دوست تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ قریب پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک گلی میں گھس گیا۔ نثار کو جلوس میں جانے کی جلدی تھی۔

''کیا ہوا......؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' نثار اس کی عجلت سے جھنجھلا سا گیا۔

''سب خیریت ہے۔ ہم لوگ جمعے والے دن یہاں سے چلے جائیں گے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا تو نثار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وجاہت کے والد اکرام اللہ مسلم لیگ کے مقامی رہنما تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جیسے ہی بٹوارے کا اعلان ہوگا ایک طوفان سا آجائے گا جس میں سب سے زیادہ نقصان ان مسلمانوں کا ہوگا جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آزاد ملک کی طرف ہجرت کریں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنے گھر والوں اور قریبی رشتے داروں کا پہلے ہی کراچی جانے کا انتظام کر دیا تھا۔

''ابو ابھی نہیں جائیں گے۔ ہمارے گھر اور دکان کا سودا ہو رہا ہے جیسے ہی سودا پکا ہوا وہ بھی ہم سے آن ملیں گے۔''

''تو......''

''اگر تو چاہے تو ہمارے ساتھ چل سکتا ہے۔ ابو سے اجازت لینا میرا کام ہے۔ بس تو چچا وقار کو سنبھال لینا۔'' وجاہت، نثار کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔

''تجھے تو پتا ہے وہ نہیں مانیں گے۔ اگر میں نے یہ بات کی تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے مگر اجازت نہیں دیں گے۔'' نثار کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

''اگر بغیر اجازت کے ہمارے ساتھ چلے تو......'' وجاہت نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ نثار کا دل یکدم تیز تیز دھڑکنا شروع ہو گیا۔ اس کے سامنے ماں کا چہرہ لہرا گیا۔

''میرا تو دل چاہتا ہے مگر یار یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس سے پہلے کہ وجاہت کوئی جواب دیتا۔ فضا ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے سے گونج اٹھی۔

معتبر خان کی مسجد کے سامنے سے گزر کر جلوس بازار میں داخل ہو رہا تھا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا...... لا الہ الا اللہ'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یہ نعرے بازی ختم ہوتی تو ایک بار پھر نعرہ لگتا ''قائداعظم''...... پورا جلوس ''زندہ باد'' سے جواب دیتا۔ نثار نے ایک نظر وجاہت کی جانب مایوسی سے دیکھا اور جلوس میں شامل ہو گیا۔ ہر نعرے کا جواب پورے جوش و خروش سے دے رہا تھا۔ پورا علاقہ ہی مسلمانوں کا تھا۔ جوش و ولولہ عروج پر تھا۔ نثار ہر دوسرے تیسرے دن نکلنے والے اس جلوس میں وقار بیگ سے چوری چھپے بھرپور شرکت کرتا۔ عصر کی نماز کے بعد یہ جلوس شروع ہوتا اور مغرب کی اذان کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا اور سب لوگ نماز ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ آج نثار اس بات سے بے خبر جلوس میں آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ دو شعلہ بار نظریں کافی دیر سے اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

☆☆☆

کمرے میں عابدہ بیگم کی دبی دبی سی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ سامنے نثار کھڑا تھا۔ ماں کے استفسار پر ماں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسی اثناء میں گھر کا مرکزی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ عابدہ بیگم نے ایک نظر صحن کی طرف ڈالی تو وقار بیگ غصے میں طویل صحن پار کر کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ نثار کی طرف بڑھے دوسرے ہی لمحے زوردار تھپڑ کی آواز سے کمرا گونج اٹھا۔ نثار نے بس سر اٹھا کر ایک نظر ماں کو دیکھا جو منہ میں دوپٹا دبائے رو رہی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی ماں سے چپکے ہوئے تھے۔ ماں کی آنکھوں میں التجا دیکھ کر نثار نے خاموشی سے دوبارہ سر جھکا لیا۔

''جان سے مار دوں گا اگر میں نے اب دوبارہ تجھے

ان لوگوں کے ساتھ دیکھا۔'' وقار بیگ کی دہاڑ کمرے میں گونجی۔ عابدہ بیگم بے اختیار بیٹے کی طرف بڑھیں مگر وقار بیگ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ ''آخری بار سمجھا دینا اسے..... ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے شعلہ بار نظروں سے نثار کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئے۔ عابدہ بیگم نے لپک کر نثار کو سینے سے لگا لیا۔

''کیا تکلیف ہے تجھے یہاں..... ہاں..... مجھے دیکھ! سب کو چھوڑ دیا۔ ہو سکتا ہے بھلا بھی دوں مگر رہنا تو ان کے ساتھ ہی ہے ناں۔'' عابدہ بیگم بیٹے کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں لے کر بولیں۔

''مگر امی..... میں یہاں غلام بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ میں کراچی جانا چاہتا ہوں اور میں جا کر رہوں گا۔'' نثار ایک قدم پیچھے ہٹا اور قطعی لہجے میں بولتا ہوا اسی کمرے میں کھلنے والے دوسرے کمرے کے دروازے سے اندر چلا گیا۔ عابدہ بیگم نے آہٹ سن کر مڑ کر دیکھا تو دھک سی رہ گئیں دروازے پر وقار بیگ کھڑے تھے۔ انہوں نے ماں بیٹے کی تمام باتیں سن لی تھیں۔

☆☆☆

بیٹا چار روز کا بھوکا پیاسا ہو تو ماں کو سکون کیسے مل سکتا ہے۔ دوسرے دن عشاء کی نماز کے بعد سب کھانا کھا رہے تھے مگر عابدہ بیگم کے حلق سے لقمہ اتر ہی نہیں رہا تھا۔ وہ بار بار اس کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتیں جہاں کل رات سے نثار قید تھا۔ وقار بیگ کھانا کھاتے ہوئے بیوی کی بے قراری کو محسوس کر رہے تھے۔

''اگر وہ اپنی ضد چھوڑ دے تو کھانا دے دینا ورنہ بھوکا رہنے دینا۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانے گا۔'' وقار بیگ نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ نہیں مانے گا۔'' عابدہ بیگم نے جواب دیا۔ ''ماں ہوں..... کوشش کر چکی ہوں۔ کہتا ہے بھوکا مر جاؤں مگر اپنی ضد نہیں چھوڑوں گا۔'' عابدہ بیگم کو علم تھا اس بات پر وقار بیگ کا غصہ بڑھ جائے گا کیونکہ انہوں نے ان کے حکم کے برخلاف دو مرتبہ کھڑکی سے نثار کو کھانا اور پانی دینے کی کوشش کی تھی۔ وقار بیگ نے گھور کر ان کی طرف دیکھا اور دسترخوان سے کھڑے ہو گئے۔

''پھر بھوکا ہی مرنے دو۔ اب اگر دوبارہ کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر حسبِ عادت صحن میں ٹہلنے لگے۔ عابدہ بیگم برتن سمیٹنے لگیں۔ کمرے میں دروازے پر دستک ہوئی وقار بیگ دروازے کی جانب چل دیے جیسے ہی انہوں قدم باہر نکالا انہوں نے برتن وہیں رکھے اور دروازے کی جانب لپکی۔

''نثار بیٹا..... میرا بچہ!'' انہوں نے دروازے سے لگ کر آوازیں لگائیں۔ کچھ ہی لمحوں بعد دروازے کے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔

''میرا بچہ۔'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

''امی اگر آپ مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہیں تو صبح فجر سے پہلے پہلے یہاں سے نکال دیں۔ میں وجاہت کے گھر والوں کے ساتھ کراچی چلا جاؤں گا۔'' جذبات سے عاری جواب سن کر وہ تڑپ اٹھیں۔

''نہیں بیٹا..... میں تیرے باپ کو منا لوں گی۔'' انہوں نے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کے کہنے پر ہو سکتا ہے مجھے اس کمرے سے رہائی مل جائے۔ کھانا مل جائے مگر وہ کبھی مجھے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ غلامی کی زندگی جینے سے بہتر ہے میں اسی کمرے میں مر جاؤں۔'' اس بار بھی لہجے میں کوئی جذبات نہیں تھے۔ ابھی عابدہ بیگم کچھ بولنا چاہتی تھیں کہ مرکزی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی وقار بیگ لوٹ آئے تھے۔ وہ جلدی سے برتن اٹھا کر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ عابدہ بیگم کے سامنے ایک امتحان آن کھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف سہاگ تو دوسری طرف ممتا۔ اس امتحان میں یا تو سہاگ کامیاب ہوتا یا پھر ممتا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ موسم تبدیل ہو رہا تھا مگر رات اب بھی سرد تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھیں ایک نظر چھوٹے بیٹے کو دیکھا جو ان کے پاس ہی سو رہا تھا۔ احتیاط سے لحاف سے نکل کر وقار بیگ کی چارپائی کی جانب دبے دبے بڑھیں۔ چابیوں کا گچھا ان کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

وجاہت کے والد اکرام اللہ کو اندازہ ہو گیا کہ نثار رات کے اس پہر کیوں آیا ہے۔ وجاہت نے کل ہی نثار کے بارے میں سب بتا دیا تھا لیکن پرائے بچے کو اس طرح کراچی بھیجنا ان کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ ایک کمرے میں وہ اور نثار آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ نثار کے ہاتھ میں ایک کپڑے کی پوٹلی تھی۔

''دیکھو بیٹا میں اس طرح تمہیں اپنے بچوں کے ساتھ نہیں بھیج سکتا..... ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ لاہور تک تم ان سب سے الگ سفر کرو، پھر ان کے ساتھ مل جانا۔ الگ سفر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اکیلے ہو گے۔ وجاہت تمہارا پورا خیال رکھے گا مگر احتیاط کے ساتھ، سمجھ رہے ہو ناں بیٹا میری بات.....!'' وہ تو چاہتے ہی نہیں تھے کہ کوئی مسلمان اس غلام ملک میں رہے۔ وہ ہر ممکن مدد کرنے کو تیار تھے اصل مسئلہ یہ تھا کہ انہیں ابھی کچھ دن یہاں رہنا تھا تاکہ گھر اور دکان کا سودا پکا ہو جائے اس لیے وہ یہ سب احتیاط کر رہے تھے۔ یہ سب باتیں انہوں نے نثار کو اچھی طرح سمجھائیں۔ نثار کے لیے اب گھر لوٹ جانا ممکن نہیں تھا لہٰذا اس نے ہامی بھر لی۔

صبح صادق ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ وجاہت کے خالو اور خالہ ان کی بیٹیاں اور والدہ ٹانگے میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔ نثار کو انہوں نے پہلے ہی اکیلے ریلوے اسٹیشن کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ نثار ریلوے اسٹیشن کے ایک کیبن کے کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ بار بار بوتل پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جس میں چار روپیاں جن میں آلو کی بھجیا لپٹی ہوئی تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے ماں نے اس کی ہتھیلی پر کچھ پیسے اور ماتھے پر ممتا بھرا بوسہ رکھا تھا۔ نثار کو اور کچھ نہیں ماں کے آخری الفاظ رلا رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''جا بیٹا، چلا جا مگر یاد رکھنا تیری ماں کی دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ تو میری فکر مت کرنا۔'' اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انہوں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی اور باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

اسٹیشن پر اب لوگ آنا شروع ہو چکے تھے۔ جس چھوٹے سے کیبن کی آڑ میں نثار چھپ کر بیٹھا تھا اس کا مالک بھی پہنچ گیا اور کیبن کھولنے کی تیاری کر رہا تھا۔ نثار اپنے خیالوں میں گم تھا کہ پلیٹ فارم پر کچھ لوگوں کی آمد ہوئی اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وجاہت اور اس کے گھر والے پہنچ گئے تھے۔ وجاہت چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا وہ یقیناً اسے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ نثار اندھیرے سے نکل کر تھوڑا آگے آیا جیسے ہی وجاہت کی نظر اس پر پڑی وہ دوبارہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا وجاہت پرسکون ہو گیا ہے اور گھر والوں کا سامان ترتیب سے رکھ رہا ہے۔ اب انہیں گاڑی کا انتظار تھا۔ اسی اثناء میں فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ اس کا دل زور سے دھڑکا، تصور میں ماں کا چہرہ گھوم گیا۔ جن پر وقار بیگ کی قہر بار نظریں شعلے برسا رہی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے ہاتھ بھی اٹھ گیا ہو۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ اندھیرے پر سپیدی غالب آتی جا رہی تھی۔ گاڑی آنے میں ابھی وقت باقی تھا مگر پلیٹ فارم پر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کا دل انجان خدشات سے دھڑکنے لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ ابھی کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ وجاہت لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتا ہوا تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''بھاگ نثار! چچا وقار اسٹیشن میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ لوگ بھی ہیں۔'' وجاہت اس کے پاس سے بولتا ہوا آگے نکل گیا۔ نثار اپنی جگہ سے باہر نکلا اور جہاں سے آیا تھا اسی ٹنگلے کو پھلانگ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ واپس شہر کی طرف جائے یا یہیں کہیں چھپ جائے۔ اسٹیشن کے قریب چھپنے میں خطرہ تھا۔ اسے معلوم تھا اگر آج نہیں تو پھر کبھی نہیں کم از کم وقار بیگ کے جیتے جی تو ممکن نہیں تھا کہ وہ کراچی جا سکے۔ اس نے رک کر ادھر اُدھر دیکھا، ایک فیصلہ کیا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی وقار بیگ کے ساتھ ساتھ طوفان بھی بیدار ہو گیا۔ نثار کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ عابدہ بیگم کی جانب بڑھے اور ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا اور غصے سے باہر نکل گئے۔ ان کا رخ مسجد کی جانب تھا۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد ہی نثار کو ڈھونڈنے ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈے کی جانب دو ٹولیاں روانہ ہو چکی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن جانے والے ٹولی میں وقار بیگ خود شامل تھے۔ وہ جیسے ہی پلیٹ فارم پر پہنچے انہوں دیکھا اکرام اللہ کی فیملی چوبی بینچ پر سامان سمیت بیٹھی ہے۔ وجاہت انہیں ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔

''نثار کہاں ہے؟'' اس کے قریب آتے ہی سوال کیا۔ اتنے میں وجاہت کے خالو بھی اٹھ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔

''کیا ہوا وقار سب خیریت ہے ناں؟'' اس سے پہلے کہ وجاہت کوئی جواب دیتا انہوں نے وقار بیگ سے الٹا

سوال کر ڈالا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے تجھ سے!'' اب ان کا لہجہ جارحانہ ہوگیا۔

''چچا مجھے نہیں پتا۔ دو دن سے تو مجھے ملا ہی نہیں ورنہ نماز میں اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔'' خالو کی بات وہ سمجھ گیا اس لیے گول مول سا جواب دیا۔

''دیکھو وقار تمیز سے بات کرو۔ تمہارا بیٹا ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہم سے پوچھنے سے بہتر ہے خود تلاش کرو۔'' وجاہت کے خالو نے درشت لہجے میں کہا تو وقار بیگ نے غصے سے ان کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھ آنے والوں کو کہا۔

''کریم، نوید تم لوگ اس طرف دیکھو۔ ظفر اور نجیب تم ادھر جاؤ۔'' اور خود ویٹنگ رومز کی جانب بڑھ گئے۔

ویٹنگ رومز کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ جیسے ہی باہر نکلے لوگوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی ہر کوئی اپنا اپنا سامان اٹھا کر ٹرین میں چڑھنے کے لیے تیار تھا کیونکہ ٹرین کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔ ظفر، نجیب، کریم اور نوید بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔

''وقار بھائی ہر جگہ دیکھ لیا کہیں نہیں ہے۔'' کریم نے مایوسی سے کہا۔

''جیسے ہی گاڑی رکے چڑھ جانا اور ہر ڈبے کی اس وقت تک تلاشی لینا جب تک کونا کونا نہ چھان مارو۔ میں روانگی کا وقت بڑھواتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ اسٹیشن ماسٹر ان کا جاننے والا تھا انہیں یقین تھا کچھ وقت مل جائے گا۔ نثار کا اس طرح چلے جانا وقار بیگ کے لیے شکست کی بات تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے کیونکہ پاکستان بننے کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ پہلے ہی سسرال والوں کی وجہ سے ان کی کافی بے عزتی ہو چکی تھی۔ اب بیٹا بھی چلا جاتا تو وہ اپنے جیسے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے بھی چلے جاتے۔ اسٹیشن ماسٹر نے انہیں پندرہ منٹ کا وقت دیا۔ پندرہ منٹ کیا پندرہ گھنٹے بھی گاڑی رکی رہتی پھر بھی نثار انہیں نہیں ملتا۔ نثار کی چالاکی کو وہ سمجھ ہی نہیں پائے تھے۔ ٹرین نے الوداعی سیٹی دی اور رینگنے لگی۔ وقار بیگ پلیٹ فارم پر کھڑے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ وہ اس وقت تک کھڑے رہے جب تک ٹرین اسٹیشن کو چھوڑ کر کافی دور تک نہ نکل گئی۔ انہیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ نثار اسی گاڑی میں سوار ہو چکا ہے۔ وہ مایوسانہ انداز سے چلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

نثار کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ جس طرف ٹرین کو جانا تھا اسی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ تھوڑی دور جا کر اس نے مڑ کر اسٹیشن کی طرف دیکھا تو اسٹیشن پر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ٹرین آنے والی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا پٹریوں کے دوسری طرف نکل گیا وہاں گندا پانی جمع تھا مگر اسے کوئی فکر نہیں تھی وہ دوڑتا ہوا جلد از جلد ان جھاڑیوں تک پہنچنا چاہتا تھا جن کے قریب سے ٹرین کو گزرنا تھا۔ گو کہ اس وقت ٹرین کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوتی تھی پھر بھی چلتی ٹرین میں چڑھنا جان لیوا ہو سکتا تھا مگر وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ نثار جھاڑیوں میں چھپ کر اپنا سانس بحال کرنے لگا کیونکہ ابھی اصل امتحان باقی تھا۔ اجالا پھیلنے لگا تو ہر چیز واضح نظر آنے لگی۔

ٹرین کو رکے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ''اتنی دیر تو گاڑی نہیں رکتی۔'' وہ بڑبڑایا۔ فوراً اس کا دھیان وقار بیگ کی جانب گیا انہوں نے ہی رکوائی ہوگی۔

آدھا گھنٹا گزر گیا اب ٹرین نے چلنا شروع کیا۔ نثار کی دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے ماں کی دی ہوئی کپڑے کی پوٹلی سوئٹر کے اندر ڈالی اور اندازہ کرنے لگا۔ اسے اس وقت اپنی جگہ سے نکلنا تھا جب ٹرین اس کے اور اسٹیشن کے درمیان آ جاتی۔ ٹرین رفتار پکڑ چکی تھی جیسے ہی نثار کی نظر سے اسٹیشن اوجھل ہوا وہ نکلا اور تیزی سے دوڑتا ہوا ٹرین کی جانب لپکا۔ کھڑکی کی سائیڈ پر بیٹھے کئی لوگوں کی چیخیں نکل گئیں وہ سمجھے شاید کوئی خودکشی کرنے آ رہا ہے۔ انہیں لوگوں میں وجاہت بھی شامل تھا مگر جب نثار کو اس طرح بھاگتے ہوئے آتے دیکھا تو چیخ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ نثار نے آواز پہچان کر اپنی رفتار تیز کر دی اور اسی ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھا جس سے وجاہت کی آواز آئی تھی۔ نثار نے سر اٹھا کر دیکھا تو وجاہت دروازے پر کھڑا نظر آیا۔ نثار اب قریب پہنچ چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ وہ نہیں پہنچ پائے گا مگر اس کے اندر کا جنون اسے دوڑا رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح دروازے کا ڈنڈا تھام لے۔ وجاہت ایک ہاتھ باہر نکال کر اسے تھامنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ''یا اللہ مدد'' نثار کے دل سے نکلا۔ وہ اب دروازے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس نے وجاہت کا ہاتھ تھامنے کے بجائے ڈنڈا پکڑا اسی

تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ ہی گیا

رنگا رنگ تحاریر سے سجا جولائی 2022ء کا گولڈن جوبلی نمبر

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

دلشاد نسیم اور ناہید سلطانہ اختر کے معرکتہ الآرا ناول اپنے کلائمکس کی طرف گامزن

نصف صدی کا سفر..... افشاں آفریدی کے مشاق قلم کا شاہکار مکمل ناول

پاکیزہ کلاسک سے انتخاب ذکیہ بلگرامی کا پُرلطف افسانہ

پڑھیے انجم انصار کے قلم سے سنہری یادوں کی دلکش باتیں

ماہنامہ پاکیزہ کی گولڈن جوبلی

کے سلسلے میں نامور ادبی و سماجی شخصیات

کے قابلِ قدر خیالات

محفل میں قارئین کی پُرخلوص باتیں، قابلِ غور تجاویز، آرا و مشورے

اس کے علاوہ

مایہ ناز مصنفات عقیلہ حق، شیریں حیدر، نگہت سیما،

نایاب جیلانی و نبیلہ ابر راجا کی بے حد خوب صورت تحریریں

پُرتنوع سلسلوں سے سجا، خوب صورت تراشوں پر مبنی، شعر و شاعری سے مرصع اور حسن و صحت کے متعلق متن سے آراستہ ماہنامہ پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے.....

لمحے وجاہت نے جھک کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لیے تو ایسا لگا کہ دونوں باہر پتھروں پر جا گریں گے مگر نثار نے اپنی ایک ٹانگ لمبی کی اور دروازے کے پائدان پر پاؤں رکھ دیا۔ وجاہت کے ہاتھ پر زور کم ہوا تو اس نے نثار کو اندر کھینچ لیا۔ اب وہ دونوں فرش پر پڑے ہانپ رہے تھے۔

☆☆☆

وقار بیگ نے گھر لوٹ کر ایک ہنگامہ ہی برپا کر دیا تھا۔ وہ سب سے پہلے میرے پاس آئے اور الزام لگایا کہ میں نے تمہیں بہکایا ہے۔ جس کی وجہ سے تم گھر سے بھاگے ہو۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کہاں چھپایا ہے تمہیں۔ میرے انکار پر وہ آگ بگولا ہو گئے۔ میرے سخت جواب سن کر میرا تو کچھ نہیں بگاڑ سکے مگر گھر پہنچ کر انہوں نے عابدہ بیگم کو خوب مارا۔ تمہارے بہن بھائیوں نے سہم کر پڑوسیوں کے گھر میں پناہ لی۔ جب عابدہ بیگم کی چیخوں سے محلہ گونجنے لگا تو آس پڑوس کے لوگوں نے انہیں قابو کیا ورنہ ان کے تیوروں سے لگ رہا تھا کہ عابدہ بیگم کو مار ہی دیں گے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر نثار دوبارہ انہیں نظر آیا وہ اسے ذبح کر دیں گے۔ میں نے بھابی کی طبیعت معلوم کرنے جب ایک عورت کو تمہارے گھر بھیجا تو پتا چلا عابدہ بیگم۔ رنج والم کی تصویر بن کر رہ گئیں۔ وہ خود کو اس ساری صورتِ حال کا قصوروار سمجھتی تھیں۔ وہ اس وجہ سے خاموش ہو کر بیٹھ گئیں کہ اگر وہ تمہیں جانے نہیں دیتیں تو تمہارے اور نثار بیگ کے درمیان نجانے اور کتنی رنجشیں، نفرتیں پیدا ہو جاتیں جس کا اثر دوسرے بچوں پر بھی پڑتا۔ وہ اس آسرے پر زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئیں کہ ہو سکتا ہے وقار بیگ کی عقل میں یہ بات بیٹھے گی کہ یہاں رہنا اب ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارے والد نے بھی لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ختم کر دیا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے پہلے وجاہت کے والد بھی ان سے آن ملے تھے۔ یہ ساری روداد انہوں نثار کو سنائی جسے سن کر نثار زار و قطار رونے لگا۔ اسے رہ رہ کر ماں کا خیال آ رہا تھا۔ نثار کے ماموں رحمت بیگ نے نثار کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا مگر اکرام اللہ نے نثار کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ ہی رکھا کہ ''یہ میرا دوسرا بیٹا ہے۔'' نثار کی رضامندی دیکھ کر رحمت بیگ نے خاموشی اختیار کر لی۔ اکرام اللہ نے نثار کی تمام ذمہ داریاں اپنے ذمہ لے لیں۔

چھ ماہ بعد ہی پاکستان بن گیا، ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نثار بھی بہت خوش تھا۔ اکرام اللہ کی کوشش سے نثار کی دلی خواہش بھی پوری ہو گئی نہ صرف اس نے قائداعظم محمد علی جناح کو دیکھا بلکہ ہاتھ بھی ملایا۔ جب قائداعظم کو یہ بتایا گیا کہ نثار کن حالات اور کس طرح پاکستان پہنچا تھا تو انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی بھی دی تھی۔ جس پر نثار کو زندگی بھر فخر رہا۔ ایک ماں تھی جس کی یاد میں نثار اکثر رو دیا کرتا تھا۔ تین سال بعد وجاہت اور نثار نے انٹر پاس کر لیا۔ وجاہت تو نوکری کی تلاش میں لگ گیا جبکہ نثار کو اکرام اللہ نے اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا۔

''نثار بیٹا مجھے کچھ بات کرنی ہے۔'' رات کا کھانا کھا کر جب سب اٹھنے لگے تو ایک دن اکرام اللہ نے نثار کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی چچا۔'' نثار دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ وجاہت بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ وجاہت کی والدہ نادرہ بیگم بھی برتن باورچی خانے میں رکھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ نثار سمجھ گیا کوئی اہم بات ہے۔

''بیٹا ہم چاہتے ہیں تمہاری اور وجاہت کی شادی کر دی جائے۔'' اکرام اللہ کی بات سن کر نثار نے پہلے وجاہت کی طرف دیکھا جس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پھر اس نے نادرہ بیگم کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھیں۔

''ماشاء اللہ..... میرے گھر میں دو بہوئیں ایک ساتھ آئیں گی۔''

''مگر چچی.....'' نثار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔

''میں جانتا ہوں بیٹا تم کیا سوچ رہے ہو۔ ہم نے صرف اپنی چاہت بتائی ہے۔ فیصلہ تم خود کرو گے۔'' اکرام اللہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ نثار کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''ایک بار کوشش کرتے ہیں۔ میں خود آ کر وہ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وقار بیگ کے دل میں کچھ نرمی آ چکی ہو اور.....''

''نہیں چچا اگر آپ گئے تو ان کا شک یقین میں بدل جائے گا کہ میں آپ کے کہنے میں آ کر پاکستان آیا تھا۔'' نثار نے جلدی سے اکرام اللہ کی بات کاٹ کر کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں امی کے نام خط لکھوں گا۔ اگر ان کا جواب آ گیا تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کم از کم امی کو میری شادی کا علم ہونا چاہیے۔''

نثار کی اس بات پر اکرام اللہ نے تائید میں سر ہلایا اور

بولے۔ ''ٹھیک ہے بیٹا..... مگر تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ ہم تم دونوں کی شادی کہاں کر رہے ہیں۔''

نثار نے نادرہ بیگم کی طرف دیکھا تو وجاہت بھی انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''آپا سے میں نے زینت اور جنت اپنے بیٹوں کے لیے مانگ لی ہیں۔ انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ تم لوگوں سے بات کرنا باقی تھی سو وہ بھی آج کر لی۔ نثار بیٹا تم جلدی سے عابدہ کو خط لکھو۔ جواب آ جائے تو بسم اللہ کرتے ہیں۔'' نادرہ بیگم نے تفصیل بتائی۔

دوسرے دن ہی نثار نے ماں کے نام ایک طویل خط لکھا۔ جس میں اس نے ساری صورتِ حال لکھ دی۔ اسے یقین تھا اتنی بڑی خوشی کی خبر پڑھ کر جواب ضرور آئے گا۔ اکرام اللہ نثار کی کیفیت سے آگاہ تھے۔ اکرام اللہ نے نثار کے علم میں لائے بغیر رحمت بیگ کے مشورے سے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا وقار بیگ کو کاروبار میں کافی نقصان ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انہیں گھر کا ایک بڑا حصہ جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا بیچنا پڑا۔ سائیکل کے کارخانے کو کرایے پر اٹھا دیا۔ جس سے کاروبار تو سنبھل گیا مگر ان کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ وہ پاکستان بننے کو انگریزوں کی سازش قرار دیتے ہیں اور آج بھی پاکستان کے سخت خلاف ہیں۔ گھر کے اندر حالات کیا ہیں اس بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ رحمت بیگ بھی بڑی بہن کی وجہ سے پریشان تھے۔ وہ بھی کوشش کر چکے تھے۔ کئی خط لکھے مگر کسی کا جواب نہیں آیا تھا۔ دو ماہ گزر گئے نثار کے خط کا بھی جواب نہیں آیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا نثار کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ تیسرے ماہ بھی جب جواب نہیں آیا تو اس نے اکرام اللہ کی چاہت پر سر جھکا دیا۔ نثار کی شادی میں اس کے ماموں رحمت بیگ اور پورے ننھیال نے بھرپور شرکت کی۔

☆☆☆

شادی کے بعد نثار نے کئی بار آگرہ جانے کے لیے ہمت باندھی مگر باپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ ایک سال بعد جب بیٹے کی ولادت ہوئی تو اس نے بیٹے کا نام وقار بیگ رکھا۔ اکرام اللہ کے گھر میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں مگر آگرہ کے ایک گھر میں صورتِ حال مختلف تھی۔ ایک دن وہ دکان سے دوپہر کا کھانا کھانے گھر پہنچا تو زینت نے بتایا۔ ''انڈیا سے آپ کا خط آیا ہے۔''

''یا اللہ خیر.....'' خط کا سن کر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے لپک کر بیٹھے پر رکھا خط اٹھایا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جا رہا تھا اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے خط کے اختتام تک وہ باقاعدہ رونے لگا۔ زینت نے جب شوہر کی یہ حالت دیکھی اس کی طرف بڑھی مگر نثار چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ کھانا کھائے بغیر ہی دکان واپس پہنچا تو اکرام اللہ حساب کتاب میں مصروف تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اکرام اللہ نے تعجب سے ایک نظر اسے دیکھا اور حساب کا رجسٹر ایک طرف رکھ دیا۔

''چچا میں انڈیا جانا چاہتا ہوں۔'' نثار نے جب اکرام اللہ کو فارغ ہوتے دیکھا تو خط ان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ اکرام اللہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر خط لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔

''تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے فوراً انڈیا جانے کی تیاری کرو۔'' خط پڑھ کر وہ جلدی سے بولے۔

''چچا میں چاہتا ہوں زہنت اور وقار بھی میرے ساتھ جائیں۔'' نثار نے خط واپس لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے میں تم لوگوں کے جانے کا انتظام کرتا ہوں اور رحمت کو بھی اطلاع کرتا ہوں۔'' اکرام اللہ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے مگر رحمت بیگ کے پاس بھی خط پہنچ چکا تھا۔ جب وقار انڈیا پہنچا واقعی اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقار بیگ کے انتقال کو پانچ دن گزر چکے تھے۔ عابدہ بیگم شوہر کے جانے کا غم مناتیں یا بیٹے کے آنے کی خوشی وہ بس نثار سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ بہو کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوتے کو گود میں لے کر بیٹھ گئیں۔ نثار کے بھائی اسرار، ابرار اور بہن دردانہ ماں کے کمرے میں موجود تھے۔ موقع ایسا تھا کہ کوئی گلے شکوے نہیں ہوئے بس عابدہ کے لیے یہ بہت تھا کہ بیٹے کو دیکھ لیا، پوتے کو گود میں اٹھا لیا اور بہو کے قدم اس گھر کی دہلیز پر پڑ گئے۔ یہ وہ گھر ہرگز نہیں تھا جو نثار چھوڑ کر گیا تھا۔ سات کمرے، بڑا سا صحن اب سمٹ کر تین کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل ہو گیا تھا۔

''میرا خط ملا تھا؟'' دوسرے دن جب نثار اپنے چھوٹے بھائی ابرار کے ساتھ نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو پوچھا۔

''ملا تھا..... ابو نے پڑھا اور اسی وقت پھاڑ دیا۔ کسی کو بتایا بھی نہیں کہ خط میں کیا لکھا تھا۔'' ابرار نے سر جھکا کر جواب دیا پھر سر اٹھا کر بولا۔ ''ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ خط آپ کا تھا۔ امی بہت اداس ہوئی تھیں مگر ابو کو کچھ نہیں کہا۔ ویسے بھی ان دنوں ابو کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ بس ایک خط رحمت ماموں کا ہم نے پڑھا تھا جس میں آپ کا ذکر اور پتا بھی لکھا تھا۔ ابو کی اجازت کے بغیر ہمت نہیں ہوئی کہ ماموں کو بھی جواب دیا جائے۔''

''ہم..... اب تم لوگوں نے کیا سوچا ہے؟'' شار نے گھر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہم کیا سوچ سکتے ہیں۔ امی نے بڑے سخت فیصلے کر رکھے ہیں۔'' ابرار نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' شار تعجب سے پوچھا۔

''آپ خود امی سے بات کر لیجیے گا۔'' ابرار نے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور وہ دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ گھر میں ہر طرف اداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ صحن میں رکھی واحد چارپائی پر دردانہ اور زینت بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ جب کہ عابدہ بیگم کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ شار ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

شار نے ماں کو ہر طرح سے راضی کرنے کی کوشش کی مگر اس وفا شعار بیوی نے پاکستان جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ممتا سے مجبور ہو کر وہ ایک غلطی کر چکی تھیں اب وہ کس سے اجازت لے کر پاکستان جاتیں اجازت دینے والا تو منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ انہوں نے تو وصیت بھی کر دی تھی انہیں وقار بیگ کے قدموں میں دفنایا جائے۔

''بیٹا تجھے خوش و خرم دیکھ کر میرے دل کو سکون مل گیا ہے مگر تو نہیں جانتا اس کی میں نے کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ تیرے جانے کے بعد انہوں نے کبھی مجھے مخاطب نہیں کیا۔ بس آخری دنوں میں ان کی جو خدمت کر سکتی تھی، کی مگر ان کے دل میں دوبارہ جگہ نہ بنا سکی۔ مرنے کے بعد ان کے قدموں میں جگہ مل جائے میرے لیے یہ ہی بہت ہوگا۔ ماں کے صاف انکار کے بعد شار ایک ماہ آگرہ میں رہا اس دوران شار کا بیٹا وقار زیادہ تر عابدہ بیگم کے پاس ہی رہا۔ اسی دوران رحمت بیگ بھی بہن کے پاس پہنچ چکے تھے۔ شار ایک بار پھر اپنے سگے رشتوں کو چھوڑ کر ماموں کے ساتھ پاکستان لوٹ آیا مگر اتنا ہوا کہ اب خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ہر ماہ خط آتے اور جاتے رہتے۔ دردانہ کی شادی لکھنو میں ایک اچھے گھر میں کر دی گئی وہاں سے بھی بہن کا خط آ جاتا تھا۔ ایک دن شار کو پھر آگرہ جانا پڑا۔ یہ آخری بار تھا جب شار انڈیا گیا۔ عابدہ بیگم کو دو سال میں ہی شوہر کا غم کھا گیا۔ وہ اچانک ہی دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ وصیت کے مطابق انہیں وقار بیگ کے قدموں میں دفنا دیا گیا۔ اس کے بعد شار کبھی انڈیا نہیں گیا۔ ایک بار بہن اور بہنوئی ملنے آئے اور ایک بار بھائیوں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا البتہ خط و کتابت جاری رہی۔ پینسٹھ کی جنگ کے بعد یہ سلسلہ بھی آہستہ، آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبھی سال میں ایک آدھ خط آ جاتا جس کا شار جواب دیتا۔ اکرام اللہ کا بھی انتقال ہو گیا پھر وہ شار کے نام بہت کچھ چھوڑ کر گئے جس پر وجاہت کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شار نے تو انٹر کے بعد آگے نہیں پڑھا مگر وجاہت نے نوکری کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ وہ اب ایک سرکاری دفتر میں افسر لگ گیا تھا۔ وجاہت کی والدہ اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ جب بھی ان کا دل کرتا وہ شار کے گھر آ جاتی تھیں... کیونکہ شار نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ شار بیگ کے صحن میں وقار کے بعد سلطان اور پھر ناہید کی قلقاریاں گونجی جو اب جوان ہو کر قہقہوں میں بدل گئی تھیں۔ شار نے اپنی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے۔ اپنے محبوب قائد کی وفات، لیاقت علی خان کی شہادت، فاطمہ جناح کی شکست، جنگیں، ملک کا دو ٹکڑے ہونا، مارشل لاء، جمہوریت، بھٹو صاحب کی پھانسی مگر وہ جس ملک کا خواب دیکھ کر اپنا سب کچھ چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کی تعبیر نہیں مل سکی۔ اب تو اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا جب وہ لسانی بنیاد پر ایک دوسرے کو دست و گریباں ہوتے دیکھتا یا فرقہ وارانہ فسادات میں بے گناہوں کے خون میں رنگین لاشے دیکھتا۔ پھر انیس سو اٹھانوے میں دل کا دورہ پڑنے سے اپنے تمام ناتمام خوابوں سمیت اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ آج بھی کئی شار جو آزاد اسلامی ملک کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر بے یار و مددگار ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے ہیں۔ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کاش ہمارا وطن اس نعرے کی عملی تصویر بن جائے جس کو لگاتے ہوئے لاکھوں لوگوں نے بیشمار قربانیاں دی تھیں۔

++

منا

مکرم و محترم مدیر
السلام علیکم:
ایک سچ بیانی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی روداد ہے جو سقوط ڈھاکا کی ستائی ہوئی لڑکی ہے۔ اگر پسند آجائے تو اسے بھی شاملِ اشاعت کرلیں۔

حبیب الرحمن

میں ڈھاکا میں رہنے والی نہایت معمولی شکل و صورت کی ایک غریب لڑکی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد۔ والد نسلی فسادات کی نظر ہو چکے تھے۔ والد صاحب بے شک محنت مزدوری ہی کیا کرتے تھے لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے ہوتے ہم ماں بیٹی نہ صرف دو وقت کی روٹی بڑے آرام سے کھا لیا کرتی تھیں بلکہ دیگر بنیادی ضروریات بھی کافی حد تک پوری ہو جایا کرتی تھیں۔ پاکستان کا یہ مشرقی حصہ غربت کا شکار ضرور تھا لیکن ایک خوبی اس میں مغربی حصے سے بہت زیادہ تھی اور وہ تھی تعلیم کے اوسط کا فرق۔ سنہ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں بھی پاکستان کے مشرقی حصے میں تعلیم کا اوسط پچاس فیصد سے زیادہ تھا۔ میرے والد صاحب معاشی مجبوریوں کی وجہ سے آٹھ جماعتیں ہی پڑھ سکے تھے لیکن اس زمانے میں آٹھ جماعت پاس بھی بہت پڑھا لکھا کہلاتا تھا اور عام لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ 1965 کی جنگ کے بعد سے پاکستان کے اس مشرقی حصے کے حالات کافی تیزی کے ساتھ بگڑنے لگے تھے اور نہ جانے کیوں بھائیوں کی طرح آپس میں رہنے والے آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ کیا رہی ہوگی، اس پر میں نے کبھی سوچا ہی

نہیں ایک مرتبہ ڈھاکا میں شدید ہنگامے ہوئے جس کے نتیجے میں میرے والد صاحب خانہ جنگی سے جاملے۔ یہ سانحہ ہم ماں بیٹیوں کے لیے قیامت سے کم نہیں تھا۔ جس کے دم سے گھر گھر تھا وہی جب نہ رہا ہو تو کیا گھر رہا ہوگا؟ گھر کی ساری ضروریات پوری کرنے والا فرد ہی جب اللہ کو پیارا ہو جائے تو گھر ویرانہ اور زندگی بے ٹھکانا ہو کر رہ جاتی ہے۔ عزیز و اقارب بہت تھے لیکن وہ بھی معاشی اعتبار سے اتنے مضبوط نہیں تھے کہ مستقل بنیادوں پر ہماری مدد کر سکیں۔ میں اس وقت چھٹی جماعت کی طالبہ تھی۔ اپنے اسکول کی ہونہار طالبات میں شمار ہوتی تھی۔ والد صاحب دیسے تو آٹھ جماعت ہی پڑھے ہوئے تھے لیکن ان کی انگلش بہت اچھی تھی۔ وہ روانی سے انگلش بول لیا کرتے تھے اور رائیٹنگ پاور بھی بہت عمدہ تھا۔ انھوں نے مجھے بھی اپنے جیسا ہی بنا دیا تھا لیکن میں نے کبھی انگریزی کو اس انداز میں نہیں اپنایا کہ ہم جماعتوں پر اپنی قابلیت ثابت کروں یا اساتذہ کے مقابلے پر آؤں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ گھر والوں کے علاوہ شاید ہی کسی اور کے علم میں یہ بات ہو کہ میں انگریزی میں کتنی رواں ہوں۔ یہ بات بھی مجھے اپنے والد ہی سے وراثت میں ملی تھی۔ وہ بھی ضرورت کے بغیر کبھی بھی کسی سے انگریزی میں بات نہیں کیا کرتے تھے۔

ہم سب اپنے گھر میں اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔ والد صاحب کہا کرتے تھے ہمارے قائد، قائداعظم محمد علی جناح (رح) نے پاکستان بننے کے بعد ڈھاکا میں کھڑے ہو کر صاف صاف فرما دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہوگی اس لیے ہم سب کو اردو ہی بولنا اور لکھنا چاہیے۔ اوّل اوّل تو کسی ایک بنگالی کو بھی اس فرمان پر کوئی اعتراض نہ ہوا لیکن آہستہ آہستہ ہم بنگالیوں میں اپنے "بنگالی" ہونے کا احساس نہ جانے کیوں بڑھتا گیا۔ والد صاحب ہوں، میری والدہ ہوں یا میں، ہمیں اردو اور پاکستان، دونوں سے بہت محبت تھی اور ہم رات دن یہی دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ پورے پاکستان کو جوڑ کر رکھے لیکن ہر آنے والا دن جو کہانی سنا رہا تھا وہ کہانی ہماری دعاؤں اور تمناؤں کے بالکل برعکس ہوتی نظر آ رہی تھی۔

معاشی حالات بہت تنگ ہونے لگے تو اپنی والدہ کی مخالفت کے باوجود میں نے تعلیم کے سلسلے کو موٴخر کر کے عملاً معاشی میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ والد صاحب کی جمع پونجی سے میں نے پرانا لیکن اچھی حالت کا ایک آٹو رکشا خرید لیا جسے وہاں بے بی ٹیکسی کہا جاتا تھا۔ پاکستان کے اس مشرقی بازو میں خواتین اور نوعمر لڑکیاں اشیائے صرف سروں پر رکھ کر گھر گھر جا کر بیچا کرتی اس لیے یہ کوئی نئی یا قابل اعتراض بات بھی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے میرے اس کام پر اعتراض نہ کیا۔ یہ کام آسان تو نہ تھا لیکن جب انسان کسی کام کا ارادہ کر لے تو اللہ تعالیٰ ہمتوں کو جوان کر ہی دیتا ہے۔ میری صحت بھی اپنی ہم عمروں کے مقابلے میں اچھی تھی اس لیے دو چار دن کے اندر اندر میں مشقت سہنے کی عادی بھی ہو گئی۔ اگلے ہی برس ہمارا مشرقی حصہ پاکستان سے علیحدگی کی جانب چل نکلا جس کے نتیجے میں پورے مشرقی بازو میں سخت خونریزی ہوئی اور آخر کار ہم سب پاکستانی سے بنگلہ دیشی بن گئے۔ میری والدہ اس سانحے پر نہ جانے کتنے عرصے ہچکیوں کے ساتھ روتی رہیں۔ میں نے اس انداز میں اپنی والدہ کو روتے ہوئے اپنے والد صاحب کی وفات پر بھی نہیں دیکھا۔ میرا دل بھی جیسے کٹ سا گیا تھا اور کئی ماہ مجھے قرار ہی نہ آیا لیکن کہتے ہیں کہ وقت بڑا مرہم ہوتا ہے لہٰذا گھاؤ کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں، بھر ہی جاتے ہیں۔

اس ہنگامے میں ہمارے محلے میں رہنے والا ایک خاندان جس کا تعلق پاکستان کے مغربی بازو کے سب سے بڑے شہر کراچی سے تھا، وہ بھی زد میں آیا اور نسلی جنونیوں نے اس پر حملہ کر کے آگ لگا دی۔ جب شورِ قیامت برپا ہو تو ہر جانب نفسا نفسی مچ جایا کرتی ہے اس لیے کسی کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کیا جائے۔ ہم سب تو یہی سمجھے کہ اس گھر کا شاید ہی کوئی ایک زندہ بچا ہوگا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ حملے سے چند منٹ قبل ہی اس گھر کے تینوں افراد، میاں بیوی اور ان کا ایک بیٹا جو مجھ سے تین چار برس چھوٹا تھا، گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن وہ زندہ رہ سکے تھے یا نہیں، اس کی خبر کسی کو بھی نہ ہو سکی اس لیے کہ پورا مشرقی بازو اور غیر بنگالیوں کی مقتل گاہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ چھوٹی عمروں تین ساڑھے تین سال کا فرق بھی بہت بڑا فرق سمجھا جاتا ہے۔ مغربی پاکستانی اس فیملی کا یہ بچہ ہمارے محلے میں ہی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ میرے گھر والوں کا ان کے گھر آنا جانا تھا اس لیے میں اس بچے کو منا منا کہا کرتی تھی۔ ہم ایک ساتھ کھیلا بھی کرتے تھے۔ اسی کھیل کھیل میں ہم بڑے بھی ہو گئے لیکن اسے میں ہی نہیں میرے گھر والے بھی منا کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔ اس منے کا ایک بڑا بھائی بھی تھا جو اس سے سات سال بڑا تھا لیکن وہ کراچی میں اپنی ددھیال میں ہی رہ گیا تھا۔ والدین کے ساتھ نہ آنے کی وجہ پڑھائی بتائی گئی تھی۔

مسلمان ہونے کے باوجود لسانی و نسلی تعصب نے ایک

ہی ملک کو نہ صرف دولخت کر دیا معیشت تباہ کر دی۔ انسانی جان و مال، عزت و آبرو سے جس انداز میں ہولی کھیلی گئیں، ایسے مناظر شاید چنگیزی دور میں بھی نہ دیکھے گئے ہوں۔

حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہا کرتے۔ اب بنگلہ دیش بہت پُرسکون ہو چکا تھا۔ امن لوٹ چکا تھا۔ حالات معمول پر آ چکے تھے اور کاروبارِ زندگی اپنی آب و تاب کے ساتھ رواں دواں نظر آ رہا تھا۔ میرا آٹو رکشا بھی ڈھاکا شہر کی سڑکوں پر کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر دوڑیں لگانے لگا تھا۔ رکشا سے ہونے والی ایک قابلِ اطمینان بات تھی۔

بنگلہ دیش بنے تین برس گزر چکے تھے۔ نہ جانے کیوں ہم چند خاندان جن کو پاکستان سے عزیز کوئی شے بھی نہ تھی، ان کے علاوہ سب کے چہرے کیوں کھلے کھلے نظر آتے تھے۔ زخم بے شک بھر جایا کرتے ہیں لیکن ان کے نشانات بار بار اس اذیت کو یاد دلاتے رہتے ہیں جو اُس وقت کے لگے زخموں کی وجہ سے پورا جسم اٹھا چکا ہوتا ہے۔ اپنے محلے میں رہنے والا وہ ایک خاندان جو کئی برس ہمارے محلے میں آباد رہا تھا، اس کے افراد اکثر ہم ماں بیٹیوں کے درمیان موضوعِ گفتگو رہتے۔ ہمیشہ ہمارے دلوں سے یہی دعا نکلتی کہ وہ سب زندہ ہوں اور جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔ پچپن میں گزارے ہوئے ایام انسان بھی فراموش نہیں کر سکتا اور ان کا اکثر یاد آتے رہنا کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے انہونی کہا جائے۔ میں اپنے اس پیارے سے بھائی کو کیسے بھول سکتی تھی جس کے ساتھ ہنستی کھیلتی بڑی ہوئی تھی۔ دل سے یہی دعا نکلتی کہ اللہ ان سب کو سلامت رکھے، نہ جانے کیوں آج مجھے وہ سب کیوں یاد آ رہے تھے۔

آج ایئرپورٹ سے کافی عمر کی ایک شخصیت کو سوار کرنے کا موقع ملا جو اپنے قد کاٹھ اور شکل و صورت کے اعتبار سے پاکستانی ہی لگتی تھی البتہ رنگت کے لحاظ سے وہ ہم سے بہت مختلف نہ تھی۔ میں بھی کسی سواری کی منتظر تھی کہ اتنے میں ایک نکلتے قد والے کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ مجھ سے پہلے کسی سواری کو اپنی جانب آنے کا اشارہ کر چکے تھے لیکن مجھے دیکھ کر جیسے چونک سا گئے اور کسی دوسری جانب جانے کی بجائے میرے قریب آ گئے۔ کافی عمر کی شخصیت تھی۔ ان کے چونکنے کا انداز ایسا بھی نہیں تھا کہ جسے واقعی چونکنا ہی کہا جا سکے۔ بے شک انھوں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا بھی لیکن یہ بھی شاید میرا ہی احساس رہا ہو اس لیے کہ اس انداز میں بھی کوئی بہت اپنا پن نہ تھا۔ میرے قریب آ کر مجھے انھوں نے ایک پرچہ، جو انگریزی زبان میں تھا، نکال کر کچھ بتانا چاہا۔ میں دیکھ چکی تھی کہ وہ کہاں کا پتا ہے۔ نہ جانے کیوں بے ارادہ میں نے وہ کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ حالانکہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس پر ہمارے محلے کا نام درج تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک کم عمر لڑکی اور وہ بھی رکشا چلانے والی اور اس کی انگلش سے واقفیت پر حیران سے ہوئے مجھے لے جا سکتی ہو۔"

میں نے اقرار میں گردن ہلائی تو وہ ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس کے ہمراہ میرے رکشا پر سوار ہو گئے۔ مجھے سارے راستے ایسا لگا جیسے وہ میری جانب متوجہ ہوں لیکن میں جب بھی سڑک کے دائیں بائیں دیکھنے کے بہانے شیشے میں اچٹتی سی نظر ڈالتی، انھیں گردن جھکائے یا راستے کی جانب تکتا پاتی۔ میں بالکل اپنی گلی کے سامنے جا کر رکی تو وہ رکشا سے اترے۔ مجھ سے کرایہ پوچھا تو میرے بتائے ہوئے کرائے سے کچھ سوا دینے کی کوشش کی جس پر میں نے شکریے کے ساتھ لوٹا دیا۔ کہنے لگے اگر دو چار منٹ انتظار کر سکو تو اچھا ہے کیونکہ مجھے یہاں قریبی دفتر میں بھی کام ہے۔

میں نے کہا۔ "میں کھڑی ہوں اور مجھے چند منٹ انتظار کرنے میں کوئی پریشانی نہیں۔"

انھوں نے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور گلی میں داخل ہو گئے۔ میں نے سوچا یہاں یہ کس سے ملنے گئے ہوں گے، یہاں تو کوئی پاکستانی نہیں رہتا۔ اس تجسس نے مجھے رکشا سے اتر کر گلی میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ آٹھ دس گھر دور میرا اپنا گھر بھی اسی گلی میں تھا اس لیے میرا اس طرح گلی میں کھڑا ہونا کسی کے لیے کوئی غیر مناسب حرکت بھی نہیں تھی۔ میں نے جب ان صاحب کو اپنے ہی گھر کے دروازے پر دستک دیتے دیکھا تو جیسے میں پتھر کی سی ہو کر رہ گئی۔ میں جو پہلے صرف ایک جیتی جاگتی رکشا ڈرائیور تھی، بے جان پتھر کی مورتی سی بن کر رہ گئی پھر میں نے دیکھا کہ جیسے گھر کا دروازہ کھلا ہو۔ وہ صاحب نہایت شریف اور مہذب انسان کی طرح دروازے کے ایک جانب دیوار سے اس طرح چپکے کھڑے تھے کہ دروازہ کھلنے پر گھر والوں کی ذرا بھی بے پردگی نہ ہو۔ یہ انداز مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ تھا جو انھوں نے اندر دینا چاہا لیکن مجھے ایسا لگا جیسے وہ لوٹایا جا رہا ہے جس پر انھوں نے لفافے کے اندر سے ایک کاغذ نکالا جس پر شاید کچھ تحریر تھا۔ انھوں نے غالباً وہ پڑھنے کے لیے دیا۔ نہ جانے اس میں کیا لکھا تھا کہ اس کے بعد میں نے والدہ کو دروازے سے گردن نکال کر چادر کی اوٹ سے

ان صاحب کو دیکھتے دیکھا جو آنکھیں جھکائے دروازے کے ایک جانب سٹے کھڑے تھے۔ فوراً ہی وہ پھر دروازے کی اوٹ میں ہوگئیں اور جب اس بار ایک بڑا لفافہ ان کو پیش کیا گیا تو وہ جیسے شرمیلے کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔ مجھے یہ چند منٹ صدیوں برابر لگے۔ میں نے ان کو واپس آتا دیکھ کر رکشا کی گدی سنبھال لی لیکن پورا بدن ہوا میں پرواز کرتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بدن کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور اس کپکپاہٹ کو میں کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ بس جی یہی چاہ رہا تھا کہ میں سواری کو آگے لے جانے سے انکار کر کے اپنے گھر لوٹ جاؤں۔ وہ صاحب واپس آ کر چپ چاپ بیٹھ تو گئے لیکن مجھے یوں لگا جیسے میری بدلی ہوئی کیفیت ان سے چھپ نہ سکی۔ میں منتظر تھی کہ وہ مجھے اپنی دوسری منزل کا نام و پتا بتائیں گے لیکن کچھ توقف کے بعد ایک چھوٹا سا پرچہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگے کہ مجھے یہاں جانا ہے۔ یہ پتا بھی انگریزی میں تھا جس پر پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن کے دفتر کا مکمل پتا درج تھا۔ میں اپنے آپ کو اب کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ میں نے اس مرتبہ بھی اقرار میں سر ہلایا لیکن نہ معلوم کیوں باوجود کوشش میں اپنے رکشا کو پہلی کوشش میں چلانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہاتھوں میں جان ہی نہ رہی ہو۔ سواری جیسے میری کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی، کیا ہوا بی، انھوں نے ہولے سے پوچھا۔ انھی میں کوئی جواب نہیں دے پائی تھی کہ انھوں نے اپنے ہاتھ میں ولی سوفٹ ڈرنک کی بوتل میری جانب بڑھاتے ہوئے چند گھونٹ لینے کو کہا اور رکشا سے اتر کر کہا کہ بیٹی لگتا ہے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے چند گھونٹ لینے کے بعد کہا کہ پلیز آپ رکشا میں تشریف رکھیں، میں اب بہتر ہوں۔ یہ بات میں نے بہت عمدہ اردو میں کہی تو وہ بہت خوش ہوئے اور واپس رکشا میں سوار ہو گئے۔ جب وہ مطلوبہ دفتر کے سامنے رکے تو نہ صرف انھوں نے مجھے کرایہ ادا کیا بلکہ مشفقانہ لہجے میں کچھ زائد رقم قبول کرنے کی درخواست کرتے ہوئے میری جانب بڑھائی۔ یہ درخواست بنگالی زبان میں کی گئی تھی اور انداز اتنا بزرگانہ و مہذب تھا کہ میں انکار بھی نہ کر سکی۔ وہ میرے رکشا سے اتر کر مزید کچھ کہے آفس کی سیڑھیاں طے کرنے لگے اور میں ان کی بزرگانہ لہجے کے وقار میں ایسا گم ہوئی کہ چند سیکنڈ کے لیے ان کا اپنے محلے کی گلی میں داخل ہو کر اپنے ہی گھر میں کچھ دینے کی بات ہی کو بھلا بیٹھی۔ سحر ٹوٹا تو میں ایک مرتبہ پھر سے دیوانوں کی طرح گھر کی جانب لوٹی۔

میری والدہ مجھے اتنی جلد گھر آتا دیکھ کر جیسے نہ صرف حیران ہوئی ہوں بلکہ کسی حد تک پریشان بھی ہو گئیں۔ انھیں میرا چہرہ بھی کچھ اڑا اڑا سا ہی لگا ہوگا۔ وہ جلدی جلدی اٹھیں اور میری بلائیں لینے لگیں۔ کسی بھی ماں کی کوئی بیٹی، اور خاص طور سے باہر نکل کر عملی زندگی میں کود جانے والی، اگر میرے جیسا چہرہ بنائے گھر میں داخل ہو تو ماؤں کے کلیجے کا منہ تک آ جانا تو بنتا ہی ہے۔ یہ بات میرے تصور میں بھی نہیں تھی کہ میری ماں مجھے اس شکل میں دیکھ کر اس حد تک پریشان ہو جائیں گی۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ پر قابو پایا اور کہا کہ ایک کے بعد ایک سواریاں ملتی رہیں جس کی وجہ سے میں کافی تھک سی گئی ہوں اس لیے سوچا کہ کیوں نہ کچھ دیر گھر میں آرام کر لوں۔

میرے اطمینان دلانے پر ماں تو مطمئن ہو گئی لیکن میں اس بے چینی کو کیا کروں جو کچھ دیر پہلے کے واقعے کی وجہ سے میرے دل کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ کیسے کہوں کہ میں اپنے ہی گھر کے دروازے پر کسی کو کھڑے اور کچھ دیتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ وہ کون تھا اور کیا پیغام یا امانت لایا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنی ماں سے پوچھوں لیکن ہر مرتبہ بہت جواب دے گئی۔

باتیں کرتے کرتے جیسے میری ماں کو کچھ خیال آیا ہو۔ وہ اٹھیں اور اپنے بستر کے نیچے سے ایک بڑا لفافہ نکال کر لائیں۔ یہ وہی لفافہ تھا جو میں نے اپنی سواری کے ہاتھوں میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ اسے میری ماں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' کا جواب خود ہی دیکھ لو کی صورت میں ملا۔ اس میں اس وقت کے حساب سے ایک اچھی رقم لفافے میں موجود تھی۔

ماں نے کہا کہ جب میری نظر لفافے میں موجود رقم پر پڑی تو میں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ نہ جانے آنے والا کون ہے اور مجھے یہ رقم کیوں دینا چاہتا ہے۔ میرے اس طرح انکار پر اس نے مجھے یہ پرچہ پکڑا دیا۔ یہ کہہ کر میری ماں نے مجھے وہ پرچہ میری جانب بڑھا دیا۔ میں اپنے والد کے دستخط خوب اچھی طرح پہچانتی تھی جس پر سب سے پہلے میری نظر پڑی۔ یہ کوئی سرکاری کاغذ تو نہ تھا۔ ایک دوستانہ معاہدہ تھا جس کے تحت کسی کاروبار میں میرے والد صاحب نے اپنا حصہ ملایا تھا۔ اس کاروبار میں جو منافع بنتا تھا وہ نسبت و تناسب کے اعتبار سے تقسیم ہونا تھا لیکن اچانک بہت زیادہ سنگین حالات کی وجہ سے رقم کی تقسیم عمل میں نہیں آ سکی تھی۔ رقم کے ساتھ ایک اور پرچہ پر اصل رقم اور اس کا مجموعہ بھی درج تھا جو گن لینے پر درست حساب تھا۔ اماں کہنے لگیں کہ پھر بھی میں نے اطمینان

کے لیے ان صاحب کی شکل دیکھنے کے لیے دوپٹے کی اوٹ سے جھانکنا مناسب سمجھا تب مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ ہماری گلی میں رہنے والی بہاری فیملی کے بھی صاحب تمہارے والد کے ساتھ ہمارے گھر میں کسی کاروبار کی بات کر رہے تھے اور پھر انھوں نے ایک سادہ کاغذ پر ایک معاہدہ تحریر کیا تھا۔ مجھے وہ سال، ماہ، دن اور تاریخ نہ جانے کیوں یاد رہ گئی تھی جبکہ مجھے تمہارے والد کے کسی بھی معاملے سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ایسا شاید اس لیے بھی ہو کہ معاملہ شراکت کا تھا اور میں جانتی ہوں کہ جو بھی رقم شراکت داری میں لگائی گئی وہ تمہارے والد کے خون پسینے کی کمائی تھی۔ حالات کی بدلتی صورت حال بھی میرے سامنے تھی اس لیے ہر دم رقم ڈوب جانے کا احساس رہتا تھا۔ اسی دوران تمہارے والد مارے گئے تو میں نے رقم پر فاتحہ ہی پڑھ لی تھی لیکن ہماری گلی میں رہنے والی بہاری فیملی نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ آپ کی رقم اللہ نے چاہا تو کہیں نہیں جائے گی لیکن ہوا یہ کہ چند ماہ بعد وہ خود بھی اسی نعصب کی آگ کی لپیٹ میں آ گئے جس آگ میں تمہارے والد صاحب آئے تھے۔ میں نے بھی چپ سادھ لی تھی اور تمہارے والد کے راز کو سینے میں ہی دفن کر لیا تھا۔

میری حالت بالکل اسی طرح کی ہو کر رہ گئی تھی جو چند گھنٹوں پہلے تھی۔ ماں بولتی جا رہی تھی اور سواری کے میرے اپنے ہی گھر کے سامنے رک کر میرے ہی گھر کے دروازے پر دستک دینے، لفافہ پکڑانے سے لے کر واپسی تک کے سارے مناظر ایک فلم کی طرح چل رہے تھے۔

بہت ہی دیانتدار لوگ تھے، مجھے ایسا لگا جیسے یہ آواز بہت دور کا سفر کر کے میرے کانوں تک پہنچی ہو۔ مجھے میری ماں کے الفاظ واپس میرے گھر لے آئے تھے۔ شکر ہے کہ ہماری گلی میں رہنے والے بہاری خیر خیریت سے ہیں۔ اللہ ان کو اس کا اجر دے۔

ابھی اس بات کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ میں نے واپسی پر اپنی ماں کو عجیب حالت میں اپنا منتظر پایا۔ ان کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے ذہن میں جو الفاظ ابھرے وہ ''بے چین خوشی'' کے ابھرے۔ میرے سامنے ماں کا چہرہ مصور کا ایک ایسا شاہکار لگا جس نے ایک ہی چہرے میں ایک بھرپور خوشی، بے کلی کے ساتھ بھر دی ہو۔ وجہ پوچھی تو ماں کہنے لگی کہ وہی صاحب جو ہمارے گھر رقم لے کر آئے تھے وہ اپنے بھتیجے کے لیے تمہیں مانگ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان کا کہنا ہے کہ میرا بھتیجا آپ کا دیکھا بھالا ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ مجھے مایوس نہ کریں گی۔ اس سے قبل کہ میں ان سے دریافت کرتی کہ وہ صاحب کب اور کیسے آئے تھے، انھوں نے ایک خط میری جانب بڑھا دیا جس میں شستہ بنگلہ میں وہی سب کچھ تحریر تھا جو مجھے ماں زبانی بتا چکی تھی۔

اب کہاں بنگلہ دیش اور کہاں پاکستان۔ پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے بھتیجے کو ہم نے دیکھا ہوا ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ کیا تحریر یا باپ کی جانب سے نہیں آ سکتی تھی۔ ایسے نہ جانے کتنے سوالات اور خدشات بیک وقت دل میں گھر کرنے لگے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ دل میں یہ سارے خیالات اور خدشات بدگمانیوں کو جنم نہ دے سکے۔

کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنا کرتے ہیں۔ ہم ماں بیٹی جو اس وقت بھی پاکستان ہی کے دیوانے تھے اس رشتے سے انکار نہ کر سکے۔

رشتہ بھیجنے والوں نے ہمارے پاکستان جانے کے سارے انتظامات از خود کیے لیکن ایک لڑکی کی ذات کا لحاظ کرتے ہوئے برات بنگلہ دیش ہی آئی۔ مسجد میں نکاح ہوا اور ہم وہیں سے سیدھے ایئر پورٹ پہنچے۔ لڑکے کے والد تقریب میں شریک نہ ہو سکے البتہ ان کے وہی تایا جو مجھے کی رقم لے کر آئے تھے وہ نکاح میں موجود تھے۔ شرکت نہ کرنے کی وجہ بہت دردناک بتائی گئی تھی کہ مشرقی پاکستان سے پاکستان جاتے ہوئے وہ جنونیوں کی زد میں آ گئے تھے۔ ان کے سر پر لگنے والی ضرب نہایت کاری ثابت ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے۔ ایک اور عجیب شرط پاکستان پہنچتے پہنچتے یہ بھی لگا دی گئی تھی کہ دلہن دولہا کی شکل جملہ عروسی ہی میں دیکھ سکے گی۔

ہم جب پاکستان پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ جس گھر میں ہمیں لایا گیا ہم بنگلہ دیشیوں کے اس وقت کے حالات کے لحاظ سے اچھا بڑا بنگلا تھا۔ جب میری نظر ساس پر پڑی تو میرا دل خوشی سے بھر گیا کیونکہ یہ تو وہی بہاری خاتون تھیں جو ہمارے محلے میں آباد تھیں۔ تو کیا میری شادی اسی ''منے'' سے ہوئی ہے جو مجھ سے تین چار سال چھوٹا اور مجھے بھائیوں کی طرح عزیز تھا، یہ سوچ کر مجھے کچھ اچھا نہ لگا لیکن جملہ عروسی میں جس سے... ملاقات ہوئی وہ اس کا بڑا بھائی تھا جو اس سارے عرصے میں صرف ایک مرتبہ اس وقت کے مشرقی پاکستان آئے تھا۔ اگلی صبح نہ صرف میرے ''منے'' دیور سے میرا تعارف کرایا گیا بلکہ مجھے بتایا گیا کہ تمہارے دیور ہی کی ضد تھی کہ اگر بھابی لانی ہے تو پھر تم ہی کو بھابی بنا کر لانا ہے۔ اس پاکیزہ جذبے پر میری آنکھوں سے خوشی اور تشکر کے آنسو رواں ہو گئے۔

++

پراسرار شادی

جناب مدیر محترم
السلام علیکم!
یہ میری حالاتِ زندگی ہے۔ جی ہاں میری آپ بیتی۔ ایسی آپ بیتی جس پر اگر کوئی چاہے تو فلم بھی بنا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے افسانہ سمجھیں کیونکہ کچھ انوکھی جو ہے۔ لیکن یاد رہے کہ حالاتِ زندگی میں کوئی انوکھا پن ہو تبھی لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے سرگزشت کے قارئین کو بھی میری آپ بیتی پسند آئے گی۔

قمر الحسن
(لاہور)

میں نے دیوار گیر پھرا پنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا تو پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں گھر جانے کے لیے اٹھ رہا تھا۔ میں ہر روز اسی وقت اٹھ جاتا تھا۔ گھر سے نادیہ کا پھر فون آیا۔

''آج بارہ تاریخ ہے جناب.....! ڈاکٹر رشیدہ جہاں سے رپورٹ لے کر آنا بھولیے گا نہیں۔''

اس دن نادیہ کا یہ تیسرا فون تھا جو اس نے مجھے یاد دلانے کے لیے کیا تھا۔ حالاں کہ اسے یاد دلانے کی قطعی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں اس سے کہیں زیادہ بے قرار تھا۔ آج کا دن میرے لیے بڑا صبر آزما اور اذیت ناک بن گیا تھا۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وقت کی نبض رک گئی ہے۔ سبھی مجھ پر ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ کس طرح دن کاٹا میرا دل جانتا تھا۔ حالانکہ دفتر میں بہت کام تھا۔ مصروف ہوجانے کے باوجود میں ایک عجیب سی ذہنی دباؤ میں تھا۔

چونکہ ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے چھ بجے کا وقت دیا تھا اس لیے میں قبل از وقت جا نہیں سکتا تھا۔ وہ ٹھیک شام چھ بجے کلینک پر آتی تھی۔ بعض اوقات اسے پندرہ بیس منٹ کی تاخیر بھی ہوجایا کرتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ نادیہ پر کیا بیت رہی ہوگی۔ میری جو کیفیت ہے اس کی اس سے کہیں زیادہ کرب ناک ہوگی۔ اس پر بھی لمحہ لمحہ صدی کی طرح بھاری ہو رہا ہوگا۔

جس وقت میں رپورٹ لینے جا رہا تھا تب میں سوچ رہا تھا کہ نادیہ بلاوجہ اس قدر متفکر اور پریشان ہو رہی ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو رپورٹ مثبت ہی ہوگی۔ جیسا کہ میری کل کی رپورٹ مثبت نکلی تھی۔

میں نے دھڑکتے دل سے کلینک میں قدم رکھا تو میری حالت ایسی تھی جیسے تختہ دار کی طرف لے جایا جا رہا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد میں ڈاکٹر رشیدہ جہاں کے کمرے میں کھڑا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بیگم نادیہ افشاں ماں نہیں بن سکتی۔''

مجھ پر جیسے کوئی بجلی سی آگری اور میں ساکت و جامد سا ہوگیا۔ مجھے اپنی سماعت پر فتور کا سا احساس ہوا۔ میرے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ کے فرش پر گر گیا۔ میں نے جھک کر لفافہ اٹھایا اور زخم خوردہ لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر! کیا علاج معالجے سے یہ نقص دور نہیں ہوسکتا۔ میڈیسن کتنی ترقی کرتی جا رہی ہے؟''

''جی نہیں۔'' ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چونکہ یہ ایسا نقص ہے جس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوسکا ہے۔ میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دوں گی کہ یہ مشیت ایزدی ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ لہٰذا آپ اس علاج پر رقم اور وقت ضائع نہ کریں۔ عاملوں، اتائی ڈاکٹر، پیر، نیم حکیم پر پیسا ضائع نہ کریں۔ یہ قانون قدرت ہے۔ اولاد دینا نہ دینا اس کے ہاتھ میں ہے۔ آپ قدرت کے اس فیصلے کو بہتر ہے کہ بلاچوں و چرا تسلیم کرلیں۔ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے۔ صبر کریں۔''

جب میں لیڈی ڈاکٹر کا مشورہ سن کر باہر آیا تو میری حالت ایک ہارے ہوئے جواری کی سی ہو رہی تھی جو اچانک بڑی بازی ہار کر پوری طرح قلاش ہوگیا ہو۔ واقعی میں قلاش ہوگیا تھا۔ جب میں گھر جا رہا تھا تو کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ذہن ماؤف تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک مرد ہونے کے ناتے میری ایسی حالت ہو رہی ہے تو نادیہ کا کیا حال ہوگا اولاد کے حصول کے لیے میرے سامنے ایک راستہ تو تھا۔

نادیہ کو طلاق دے کر دوسری شادی کرلوں۔ یہ میں کرسکتا تھا مگر یہ سوچ کر رک جاتا کہ اگر نادیہ سوکن برداشت نہیں کر پائی تو؟ بالفرض وہ تیار بھی ہوجائے تو سوکن کے ساتھ رہنے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوگی۔ اگر میں چوری چھپے شادی کرلوں تو یہ گاڑی کتنے دن چلے گی؟ آخر کب تک پوشیدہ رہے گی؟ میں نادیہ کو طلاق دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

جب میں نے گھر کے دروازے پر گاڑی روکی تو میرا دل زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں نادیہ کے بانجھ پن کی رپورٹ نہیں لایا ہوں بلکہ ڈاکٹر سے اس کی موت کا پروانہ لایا ہوں۔

میں یہ سب کچھ افسردہ اور دل برداشتہ ہوکر سوچ ہی رہا تھا کہ نادیہ نے دروازہ کھول دیا۔ دستک دینے یا اطلاعی گھنٹی بجانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس نے شاید مجھے خواب گاہ کی کھڑکی سے، گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا اس نے فوراً ہی اس طرح سے دروازہ بند کیا جیسے کوئی عفریت میرے تعاقب میں ہو۔ جب وہ دروازہ بند کر کے پلٹی تو میں نے اسے بازوؤں میں محصور کرلیا۔

دل بہت خراب تھا اور جذبات پر اوس پڑی ہوئی تھی، اس کے باوجود بھی میں نے نہ چاہتے ہوئے اس لیے اسے بازوؤں میں محصور کیا تھا کہ رپورٹ کے لیے اسے ذہنی طور پر تیار کرلوں تاکہ وہ فوری طور پر صدمے سے دوچار نہ ہوجائے۔ وہ ایک عورت تھی۔ اس ناتے سے اسے بچے کی خواہش مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ آج کل کی ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو شادی کے دس برس تک اس لیے ماں بننا

نہیں چاہتیں کہ ماں بننے سے جسم اور اس کے تناسب ڈھل جائیں گے۔ وہ فربہ، بھدی اور بے کشش ہو جائیں گی۔ جبکہ عورت تب مکمل ہوتی ہے جب وہ ماں بنتی ہے۔ وہ عورت بھی تھی اور اپنا ادھورا پن دور کرنے اور ایک مکمل عورت بننے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔ مامتا کا خلا پُر کرنے کے لیے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے چہرے پر جھکنے نہیں دیا، میرے بازوؤں کے حصار سے نکل کر بولی۔ ''رپورٹ لائے ہیں کہ نہیں.....؟ کیا کہا ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے۔''

میں اسے کیا بتاتا۔ کیا جواب دیتا۔ میں نے جیب سے رپورٹ والا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر نے جو کچھ کہا وہ مختصر طور پر اسے بتا دیا۔

رپورٹ سن کر اس کا صدمے سے برا حال ہو گیا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، پھر دکھ اور غم سے بے ہوش ہو گئی۔ میں اسے گود میں اٹھا کے خواب گاہ میں لے آیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ اس کی یہ حالت اور کیفیت دیکھ کر میرا سینہ اندر سے کٹ رہا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو میں نے اسے سمجھایا۔

''نادیہ.....! اس دنیا میں صرف تم ہی ایک بانجھ نہیں ہو۔ سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں ہوں گی۔ آخر وہ بھی تو زندگی گزار رہی ہیں۔''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میرے بدن سے لپٹ کر، سینے میں جذب ہو کر آنسو بہاتی رہی۔ اس کے آنسوؤں کی جھڑی نے میرا گریبان بھگو دیا۔ میں اس کے بالوں کو سہلاتا اور اس کے آنسوؤں کو جذب کرتا رہا پھر اسے سلا دیا تو وہ سو گئی۔

کتنے ہی دنوں تک وہ اس احساس محرومی کے غم میں آنسو بہاتی رہی تھی۔ اس نے نہ صرف کھانا پینا چھوڑ دیا بلکہ گھر سے نکلنا اور ہر قسم کی تقریبات میں شرکت کرنا بھی بند کر دیا تھا۔ میں دفتر سے آ کر رات کو بڑے اصرار سے کچھ نہ کچھ کھلا دیتا یا باہر لے جاتا تا کہ اس کا دل بہل جائے۔ دفتر جانے سے قبل اسے ناشتا کراتا جو ایک سلائس اور ایک کپ چائے پر مبنی ہوتا۔

ہماری شادی کو چھ برس ہو چکے تھے۔ کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ اگر کمی تھی تو ایک بچے کی جو ہمارے گھر کے آنگن کا پھول اور زندگی کی رونق بنتا اور ہماری خوشیوں میں بے پناہ اضافے کا باعث ہوتا۔ بچے کے بغیر گھر ویران کسی کھنڈر کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ پہلے تو میں یہ سوچتا تھا کہ زندگی اور گھر کے ویرانے میں کسی دن چپکے سے بہار آ جائے گی لیکن بہار تو روٹھی ہوئی محبوبہ بن کر رہ گئی تھی۔

کچھ دنوں تک اس کی یہی حالت رہی تھی لیکن پھر میرے سمجھانے بجھانے اور دلاسا دیتے رہنے پر اس نے خود کو سنبھالا اور نارمل ہونے لگی۔ گویا اس نے حالات سے جیسے سمجھوتا کر لیا۔ حوصلہ سے جینے اور معمولات زندگی میں حصہ لینے لگی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

اس رپورٹ نے میرے آبگینہ کو ایک نوکیلے پتھر کی طرح توڑا تھا۔ اس کی کرچیاں میرے وجود میں چبھ گئی تھیں اور میرے تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ میرے دل کو جو دکھ پہنچا تھا اس کا احساس میرے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔

میرے ذہن میں دوسری شادی کا خیال آنا ایک فطری امر تھا۔ بہت لوگ اولاد کے لیے دو دو تین شادی کر لیتے ہیں۔ یہ شرعی اور قانونی حق ہے۔ میرے جاننے والوں میں کئی لوگ ایسے تھے لیکن میرے لیے دوسری شادی کرنا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ میں اپنے چچا سسر کی فرم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ مجھے ایک لاکھ روپے ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا۔ ہمارا خوب صورت، آراستہ و پیراستہ فلیٹ جو گلشن کی تھا وہ نادیہ کی ملکیت تھا۔ میرے پاس جو گاڑی تھی وہ بھی نادیہ نے ہی خرید کے دی تھی اور پھر نادیہ کے پاس دولت اور جایداد کی کوئی کمی نہ تھی۔ چونکہ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کی بے پناہ دولت اور جایداد کی وہ تنہا وارث تھی، مالک تھی۔ اسے جایداد سے کئی لاکھ کی آمدنی تھی۔ دولت مند ہونے کے باوجود اس میں ذرہ برابر غرور اور نخوت نہ تھی۔ وہ اخلاق کی دولت سے بھی مالا مال تھی۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب اور ملازمین سے بھی اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتی تھی۔ اس کے برتاؤ نے ہر کسی کا دل موہ لیا تھا۔

ہم دونوں کی شادی چار برس کی گہری محبت کا نتیجہ تھی۔ وہ حسین تھی، پرکشش تھی۔ اس میں ایسی دل کشی اور جاذبیت تھی کہ جو بے اختیار دل میں اتر جاتی تھی۔ ذہین اور روشن خیال تھی۔ خوش لباسی اس کے حسن و جمال میں چار چاند لگا دیتی تھی وہ اس بات کا بڑا خیال رکھتی تھی کہ اس کے لباس سے بے حجابی نہ جھلکے۔ مطالعے کا اسے حد سے زیادہ شوق بلکہ جنون تھا۔ کوئی شعری مجموعہ اور پسند کی کتاب جب

نئی پہلی فرصت میں نہ پڑھ لے اسے چین نہیں آتا۔ مشاعروں میں بھی جاتی تھی۔ آرٹس کونسل کی ممبر شپ بھی لے رکھی تھی۔ نادار مصوروں اور شاعروں کی وقتاً فوقتاً مالی مدد بھی کرتی رہتی تھی۔ کوئی سوالی آ جاتا تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسے خالی ہاتھ جانے دیا ہو۔

اسے کرکٹ سے بھی لگاؤ تھا۔ میں کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ میں نے کئی فرسٹ کلاس میچز میں سنچریاں بھی بنائی ہوئی تھیں مگر وہ ایک ٹیسٹ میچ کے بعد کھیل سیاست کی نذر ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے میں کرکٹ کے میدان میں اپنا کیریئر نہیں بنا سکا تھا مگر میں نے نادیہ کا دل جیت لیا تھا کیونکہ میں نے ایک ٹیسٹ میچ کو اپنے بہترین اسٹروک سے ہار کو جیت میں بدل دیا تھا۔ ہمارے عشق کا آغاز کھیل کے میدان سے ہوا تھا۔ شادی سے پہلے وہ مجھے جس طرح ٹوٹ کر چاہتی تھی، شادی کے بعد محبت میں اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھتا تھا۔ اس کا میری چاہت میں پاگل ہونا شاید اس لیے بھی تھا کہ میں نہ صرف وجیہہ اور خوب صورت تھا بلکہ دراز قد بھی۔ ٹیم میں کوئی کھلاڑی میری طرح دراز قد نہ تھا۔ قامت نے میری شخصیت کو سحر انگیز بنا دیا تھا۔ ہائی سوسائٹی کی لڑکیاں، عورتیں جن کی کمزوری دراز قد ہوتے ہیں انہوں نے چاہا تھا کہ میں ان کا اسیر ہو کر بہک جاؤں لیکن میں ان سے دور ہی رہا۔

چھ سات ماہ کا عرصہ دوسری شادی کے بارے میں سوچتے گزر گیا۔ ادھر نادیہ کی محبت اور نشاط انگیز لمحات میں اس کی گرم جوشی، وارفتگی اور والہانہ پن میں جو اور شدت آنے لگی تھی میں سمجھ گیا تھا کہ کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں دوسری شادی کروں۔ وہ باتوں باتوں میں غیر محسوس انداز سے ان لوگوں کی مثالیں دے جاتی تھی جو بوڑھے ہونے تک بے اولاد ہی رہے۔ ان مردوں نے اولاد اور وارث کے لیے دوسری شادی نہیں کی۔ اپنے مقدر پر شاکر رہے۔ اس کے باوجود میں نے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا ترک نہیں کیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہ بات میرے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھی کہ خوشی سے نادیہ سے علیحدگی کر لوں۔

نادیہ سے علیحدگی کی صورت میں اتنی اچھی ملازمت، خوشگوار زندگی سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا۔ اب تو میں کرکٹ کا کھلاڑی بھی نہیں رہا تھا۔ سنے سنائے جو کھلاڑی آ رہے تھے انہوں نے مجھے ماند کر کے رکھ دیا تھا۔ اب تو لوگ میرے نام اور کھیل سے بھی واقف نہیں رہے تھے۔ پھر میں سوچتا کہ مجھے شادی اولاد نرینہ کے لیے کرنا ہے نہ کہ عیاشی کے لیے۔ قبول صورت لڑکی بھی میرے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ رات میں جب نادیہ جذبات کے طوفان سے نکل کر سو جاتی تو میں دوسری شادی کے بارے میں سوچتا ہوا کروٹیں بدلتا رہتا۔ بستر ایسا لگتا جیسے کانٹوں سے بھرا ہوا ہو۔ میری نیند اڑ کے رہ جاتی۔ جب میں بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے تھک جاتا تو بے زار سا ہو کر صوفے پر براجمان ہو جاتا۔

میں جتنی دیر جاگتا رہتا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا۔ چائے بنا کر پیتا۔ صبح نادیہ کمرے میں سگریٹ کی بُو محسوس کر کے کہتی۔ ''کیا بات ہے آج کل تم بہت سگریٹ پینے لگے ہو۔ پہلے تو تم ہفتے عشرے میں ایک آدھ سگریٹ پیتے تھے اور اب جانے ایک رات میں کتنے سگریٹ پھونک دیتے ہو۔ ایش ٹرے میں ٹوٹے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اتنی سگریٹ نوشی ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں دفتر میں کسی بات سے پریشان تو نہیں؟''

میں جواب میں کہتا۔ ''جان.....! معلوم نہیں کیا بات ہے کہ رات سینے میں بڑی جلن ہوتی ہے جس کی وجہ سے نیند نہیں آتی اس لیے کچھ زیادہ ہی سگریٹ پی لیتا ہوں۔ بد ہضمی دور کرنے کے لیے گرین ٹی پی لیتا ہوں۔''

''جب نیند اڑ جایا کرے تو مجھے جگا دیا کرو یا پھر ٹی وی دیکھ لیا کرو۔ چہتکو کی بھرمار ہے۔ دل بہل جایا کرے گا۔'' وہ مسکرا کر کہتی۔

''میں تمہاری نیند اس لیے خراب کرنا نہیں چاہتا کہ تم دن بھر کی تھکی ماندی ہوتی ہو۔ ٹی وی کے پروگرام مجھے پسند نہیں آتے۔ میں کل ہی ڈاکٹر کو دکھا کر کیپسچر لیتا آؤں گا جس سے بدہضمی بھی دور ہو جائے گی۔ نیند بھی آ جائے گی۔ تم اتنی فکرمند اور پریشان نہ ہوا کرو۔''

وہ میرا جواب سن کر مسکرا کے رہ جاتی۔ وہ اتنی سیدھی اور معصوم تھی کہ میری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی۔ رات میں جب بھی وہ میرے کروٹیں بدلنے یا کسی وجہ سے بیدار ہو جاتی تو میرے لیے چائے بنا کے لے آتی اور اس وقت تک جاگتی اور باتیں کرتی رہتی جب تک میں سو نہیں جاتا۔

ایک روز اخبار پڑھتے پڑھتے میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ میرے ذہن میں دوسری شادی کی نادر تدبیر بجلی کا کوندا بن کر لپکی تھی۔ خوشی کے احساس نے میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑادی تھی۔ بات یہ تھی کہ دوسری شادی کے لیے کسی لڑکی یا عورت کا تلاش کرنا میرے لیے آسان نہ تھا۔ اگر میں اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے کہتا تو اس کی خبر کسی نہ کسی طرح نادیہ تک پہنچ جاتی۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اس معاملے میں کسی کو بھی اعتماد میں نہیں لے سکتا تھا اور کوئی ایسا مخلص دوست بھی نہ تھا کہ جس پر میں اندھا اعتماد کرسکوں۔ یہ کام مجھے خود ہی کرنا تھا جو کسی بھی طرح جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کنواں خود پیاسے کے پاس آگیا ہو۔

اخبار نے نہ صرف میرا پیچیدہ مسئلہ آسان کردیا تھا جو میرے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا بلکہ مجھے ایک راہ بھی دکھادی تھی۔

اخبارات میں ''ضرورت رشتہ'' کے اشتہارات روز ہی چھپتے تھے لیکن وہ اِکادُکا ہوتے تھے، جب کہ چھٹی والے دن کے ایڈیشن میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے ان اشتہارات کا خیال بھولے سے بھی نہ آیا تھا۔

اس وقت نادیہ بھی کمرے میں موجود تھی۔ میں اس کی نظریں بچا کے ضرورت رشتہ کے اشتہارات پڑھنے لگا اور ساتھ ساتھ جو سمجھ میں آتا جارہا تھا اس پر نشان لگانے لگا۔ نادیہ چوں کہ اشتہارات کا صفحہ پڑھتی نہیں تھی اس لیے پکڑے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا اور نہ ہی اس میں ڈرنے کا کوئی سوال پیدا ہوتا تھا۔

اتوار کو میری نظروں سے ایسے چار پانچ اشتہارات گزرے جو میرے مطلب کے تھے۔ ان کی عبارت اور متن سے ایسا لگا تھا جیسے وہ میرے لیے ہی شائع کیے گئے ہوں پھر میں نے مشتہرین کو خط لکھے۔ میں نے انہیں صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیا کہ میری بیوی چوں کہ بانجھ ہے۔ میری شادی کو سات برس کا عرصہ گزر چکا ہے اور میں وارث کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن میری یہ شادی صیغہ راز میں رہے گی اس لیے کہ میں کسی صورت میں اس شادی کے متعلق اپنی بیوی کو بتانا نہیں چاہتا۔ مہر کی رقم پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لین دین کی کوئی ضرورت نہیں۔ شادی انتہائی سادگی سے ہوگی۔ میرا ذاتی بینک بیلنس دس گیارہ لاکھ تھا۔ میں گھر کے کسی بھی خرچ اور اخراجات کے لیے رقم نہیں دیتا تھا۔ نادیہ ہی گھر کے تمام اخراجات برداشت کرتی تھی۔ اس نے کبھی میری تنخواہ کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا۔ میں دوسری شادی کر کے دوسرے گھر کے اخراجات بہ آسانی اٹھا سکتا تھا۔ میں نے دوسرے دن ہی سے دو روم کے فلیٹ کے لیے متعدد اسٹیٹ ایجنسیوں سے رابطے شروع کردیے۔ میں نے جلد از جلد دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اس بات کا بھی خواہشمند تھا کہ دوسری بیوی نہ صرف خوبصورت بلکہ جوان ہو تاکہ دوسری زندگی بھی خوشگوار اور پُرلطف گزرے۔ جوان اور حسین عورتوں کی کوئی کمی بھی نہ تھی لیکن ایک اور بات کا خوف و خدشہ کسی زہریلے سانپ کی طرح ڈستا تھا کہ کہیں دوسری بیوی عیار و چالاک نہ ہو۔ کہیں وہ بلیک میلر نہ بن جائے۔ جب اس کے علم میں یہ بات آئے گی کہ میں اپنی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ میری پہلی بیوی کروڑ پتی ہے اور میں نے یہ شادی اس سے چوری چھپے کی ہے تو وہ اس امر سے فائدہ اٹھانے کی ہر طرح سے کوشش کرے گی۔ کسی کا کوئی بھروسا نہیں کیوں کہ ہر شخص خودغرض اور مفاد پرست ہے۔ کسی کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے چوکتا نہیں ہے۔

یہ سب کچھ سوچتے اور تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس مسئلے کا حل میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں شادی سے پہلے لڑکی کے سرپرست اور والدین سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ اگر ایسی کوئی حرکت ہوئی تو میں فوراً طلاق دے دوں گا...... اگر ان لوگوں نے کوئی انتقامی کارروائی کی تو نادیہ سے میں معافی مانگ لوں گا کہ میں نے اتنا بڑا قدم اولادِ نرینہ کے لیے اٹھایا تھا۔ یہ میرا شرعی اور قانونی حق ہے۔ مجھے بہرحال ہر صورت سے خطرہ مول لینا ہی تھا۔ کوئی ایک ہفتہ کے بعد میرے خطوط کے جوابات آنے شروع ہوگئے جو بڑے حوصلہ افزا تھے۔ لکھا گیا تھا کہ گھر کی کسی با اختیار خاتون کو بھیج دیں کہ وہ آکر باقی معاملات طے کریں۔ ان میں سے دو ایک سرپرست لڑکیوں کو دکھانے سے پہلے مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ اب مسئلہ ان لڑکیوں کو دیکھنے کا درپیش تھا۔ وہ موبائل پر اس کی تصویر بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ وقت اتنا بدل گیا تھا کہ معاملات فون پر طے ہونے لگے تھے پھر لوگ جانے کیوں محتاط تھے۔ میری نظر میں ایسی کوئی عورت نہیں تھی جسے میں ان کے ہاں بھیج سکتا

اس لیے میں نے خط لکھے کہ لڑکیوں کو میں خود دیکھ کر اور ان سے مل کر پسند کروں گا اس لیے کہ معاملہ دوسری اور چوری چھپے شادی کا ہے۔ ان خطوط میں تین خط ایسے تھے جن میں لڑکیوں کی تصویریں بھی تھیں۔ ایک لڑکی سولہ برس کی، دوسری بیس برس اور تیسری چوبیس برس کی تھی۔ میں نے سب سے پہلے سولہ برس کی لڑکی کو جا کر اس لیے دیکھا کہ اس کی عمر اور دوشیزگی سنسنی خیز تھی۔ اس کی تصویر دس برس پرانی تھی جب وہ زیر تعلیم تھی۔ وہ تیس برس سے زیادہ کی ہی لگتی تھی۔ بیس برس والی خاصی موٹی اور بڑی بھی تھی، چوبیس برس والی چھتیس برس سے کم نہ تھی۔ عمر کی پختگی اس کے جسم اور چہرے سے ظاہر تھی۔ میں ان لوگوں سے بھی ملا جو مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ان میں صرف ایک گھر موزوں اور معیار کا تھا۔ باقی دوسرے لوگ مشکوک قسم کے تھے۔ باپ نے لڑکی دکھانے اور تصویر دینے سے صاف انکار کردیا پھر کچھ اور گھروں سے جواب آئے کہ آپ کسی دن آکر لڑکیوں کو دیکھ جائیں۔ اگر ہوسکے تو خواتین کو بھی ہمراہ لیتے آئیں۔

میں ان لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھنے کے لیے پہنچا۔ شہناز پروین نامی لڑکی نے اپنے فلیٹ پر مدعو کیا تھا، میں پہنچا۔ وہ ایک لگژری فلیٹ میں رہتی تھی جب میں نے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا جیسے میرا انتظار کیا جارہا ہو۔ شہناز پروین کو دیکھا تو مجھ پر بجلی گر پڑی۔ وہ ایسی ہوش ربا حالت میں کھڑی تھی کہ میرے قدم ڈگمگا سکتے تھے اور کسی بھی لمحہ پھسل سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں نے غلطی سے کسی کال گرل کے فلیٹ کا دروازہ تو نہیں کھٹکھٹا دیا۔ میں نے تصدیق کی کیا یہ مس شہناز پروین کا فلیٹ ہے۔ اس نے بتایا کہ وہی شہناز پروین ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس خیال سے اندر داخل ہوگیا کہ اس کے گھر والے ہوں گے، ان کی موجودگی میں بہکنے بھٹکنے سے بچ جاؤں گا۔

میں نے اندر داخل ہونے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ کے والدین اور بھائی وغیرہ نہیں ہیں؟

اس نے بتایا کہ والدین کسی کام سے دبئی گئے ہوئے اور ان کی واپسی اگلے ہفتے متوقع ہے۔ بھائی کینیڈا میں ہے۔ میں اکیلی ہوں۔ آپ مجھ سے معاملات طے کرسکتے ہیں۔

میں کوئی بچہ تو نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ چکر کیا ہے۔ یہ محترمہ مجھے غلاظت میں گرانا چاہتی تھیں پھر مجھے بلیک میل کیا جاسکتا تھا۔ کوئی شریف عورت اس حالت میں سامنے نہ آتی۔ میرے بیٹھنے کے بعد اس نے کہا میں آپ کے لیے کچھ لاتی ہوں۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دفعتاً میری نگاہ سامنے والے کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئی تو میں نے دیکھا نیچے روشنی جھانک رہی تھی اس کی روشنی میں کسی کے پیر کے عکس جھانک رہے تھے۔ دروازے کے تالے پر چابی لگی تھی۔ میں نے فوراً ہی بڑھ کر اسے مقفل کیا اور چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹرے میں دو گلاس میں کولڈ ڈرنکس لیتی آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کولڈ ڈرنکس نہیں پیتا۔ میں نے اجازت چاہی کہ میں آپ کے والدین سے بات کروں گا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا تو اس نے میرے گلے میں بانہیں حائل کردیں۔ میرے چہرے پر جھک گئی۔ وہ ایسی قیامت تھی کہ زاہد بھی بہک جائے۔ میں نے اسے کہا جلدی میں گاڑی ان لاک رہ گئی ہے۔ اگنیشن میں چابی بھول آیا ہوں۔ ابھی چابی لے کر آتا ہوں۔ اتفاق سے دروازے پر کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ لگادی۔ پھر میں نیچے آگیا۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے اس کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ٹھینگے دکھا رہی تھی۔ وہ میری شان میں کیا نازیبا قسم کے الفاظ بک رہی تھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں سیدھا گھر آگیا۔ جانے وہ کب تک کمروں میں اسیر رہے تھے۔ میں نے دوسرے دن ایک روزنامے کے کرائم رپورٹر واجد قریشی سے اس کا ذکر کیا جو میرا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ شہناز پروین ایک کال گرل ہے اور اس کا شوہر بلیک میلر۔ پولیس کو چونکہ ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا اس لیے ان پر ہاتھ ڈالنے میں ناکام رہی ہے۔

میں اب بڑا محتاط اور چوکنا ہوگیا تھا کہ کیسے کیسے شکاری جال لیے پھر رہے ہیں۔ اس واقعہ کے باوجود میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ رات گئے تک جاگتا رہتا اور اشتہارات پڑھتا رہتا کیونکہ دفتر میں سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ نادیہ کو نیند کے سمندر میں غرق دیکھتا تو بریف کیس لے کر نشست گاہ میں بیٹھ جاتا۔ پھر میں وہ خطوط نکالتا جو اخبار کے پوسٹ بکس پر آئے، انہیں پڑھتا۔ جو مناسب اور موزوں ہوتے انہیں جواب لکھتا۔ میں نے کبھی بھی اپنا موبائل فون نہیں دیا تھا۔ حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ لڑکیوں اور عورتوں کے والدین اور سرپرست کتنی غلط بیانی

اور مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ عمر اور رنگ کے بارے میں۔

میں نے اپنی اس مہم کو بڑی رازداری اور محتاط انداز سے جاری رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک فرضی نام رکھ لیا تھا اور اس نام سے خط و کتاب ہو رہی تھی۔ نادیہ کے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگ پائی تھی کہ میں اندر ہی اندر کیا کھیل، کھیل رہا ہوں۔ اگر اسے حقیقت کا علم ہو جاتا تو وہ ایک طوفان کھڑا کر دیتی اس لیے کہ وہ مجھ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتی تھی۔ وہ لاکھ حقیقت پسند سہی لیکن وہ کسی قیمت پر ایک سوکن کو برداشت نہیں کر پاتی۔

ایک روز شام کے وقت میں دفتر سے گھر پہنچا تو ایک اجنبی جواں سال عورت کو دیکھ کر چونک پڑا۔

گو وہ حسین تو نہیں تھی لیکن غیر معمولی طور پر پُرکشش تھی۔ اس کے چہرے کے تیکھے تیکھے خدوخال دل میں اتر جانے والے تھے۔ اس کا قد نکلتا ہوا تھا جس نے اس کے سراپا کے نشیب و فراز کو سنسنی خیز بنا دیا تھا وہ متناسب اور چھریرے بدن کی تھی۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور وضع قطع سے ایک عام گھرانے کی عورت لگی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر بڑے مؤدبانہ انداز سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے مجھے سلام کرنے کے بعد سر جھکا لیا اور نگاہیں فرش پر مرکوز کر دیں۔ اس کے چہرے پر فطری حیا کی لہر دوڑی تو اس نے چہرے کے نکھار میں ایک عجیب سی جاذبیت پیدا کر دی۔ نادیہ نے اس سے میرا تعارف کرایا۔

"راحت......! یہ میرے شوہر قمر ہیں۔"

راحت نے اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کے مجھے دوبارہ سلام کیا پھر وہ نادیہ کی طرف گھوم کے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ نادیہ نے جیسے حکم دیا۔ "جاؤ صاحب کے لیے چائے بنا کے لے آؤ۔"

وہ جانے کے لیے گھومی تو میں نے اس کے ریشمی سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی کو دیکھا جو کسی ناگن کی طرح اس کی کمر سے نیچے تک غضب ناک انداز سے لہرا رہی تھی۔

میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور نادیہ کے پاس بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر شوخی سے پوچھا۔ "یہ نیا چہرہ کون ہے؟ تم نے کہاں سے دریافت کیا ہے؟"

"اسے میں نے مہراں کی جگہ رکھ لیا ہے۔ وہ کام چور، بدحرام بہت ناغے کرنے لگی تھی۔ اسے میری ایک سہیلی نے بھیجا ہے۔"

میں نے اس کے متعلق معلوم کرنے کے خیال سے بڑی بے نیازی اور رسمی انداز سے پوچھا۔

"اس کا شوہر کیا کرتا ہے؟ اس کے کتنے بچے ہیں؟"

"اس کا شوہر ہے اور نہ ہی بچے ہیں۔" نادیہ نے جواب دیا۔ "ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔"

"غریب گھرانے کی لڑکی ہوئی تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "کیا غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی ہے؟"

"غریب کیا...... متوسط اور اچھے گھروں کی لڑکیوں کی بھی شادی نہیں ہوتی ہے۔" نادیہ تکرار کے انداز میں کہنے لگی۔ "آج شادی روز بہ روز مہنگی اور مشکل ہوگئی ہے کہ ان کے پاس جہیز کے لیے پیسے نہیں ہوتے ہیں اس لیے لڑکیاں رشتوں کے انتظار میں نہ صرف خوار بلکہ بوڑھی ہو رہی ہیں۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کاش! یہ لڑکی میرے ہاتھ لگ جاتی تو میں اس سے آنکھیں بند کرکے شادی کر لیتا۔ اب تک میں نے جتنی لڑکیاں دیکھی تھیں ان سب کے مقابلے وہ لاکھ درجے بہتر تھی۔

اس بات میں ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ راحت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی مگر کسی اچھے گھرانے کی لگ رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب قسم کی انفرادیت تھی اور وہ عام نوکرانیوں کی طرح نہیں لگتی تھی۔ یہ میری دوسری بیوی بن کر خوشگوار زندگی گزار سکتی تھی اور مجھے وارث بھی دے سکتی تھی۔

میں حیران تھا اور یہ بات میرے لیے ناقابل فہم بھی تھی کہ نادیہ نے ایک نوجوان کنواری لڑکی کو اپنے ہاں ملازم کیسے رکھ لیا؟ جو کسی زہریلی ناگن کی طرح مرد کو آسانی سے ڈس سکتی تھی۔ مرد کو ڈگمگانے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ کیا نادیہ کو مجھ پر اتنا اعتماد ہے؟ اگر کل کچھ ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ نادیہ نے ایک عورت ہونے کے ناتے یہ بات کیوں نہیں سوچی؟

میں نادیہ سے سیاسی موضوع پر باتیں تو کر رہا تھا لیکن بار بار میری نگاہیں غیر محسوس انداز یا کسی حیلے بہانے کچن کی طرف اٹھ جایا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد راحت کچن سے ٹرالی دھکیلتی ہوئی چاند کی طرح نمودار ہوئی۔ جب وہ ہمارے پاس رکی تو نادیہ نے اسے چائے بنانے کے لیے کہا۔ پھر پکوڑے کی پلیٹ ٹرالی سے اٹھا کے میری طرف بڑھائی۔ راحت نے بڑے سلیقے سے چائے بنا کر ہم دونوں کو پیش کی۔ اس کے علاوہ پکوڑے بھی بہت عمدہ اور ذائقہ دار تھے۔ بڑی نفاست سے اس نے تلے تھے۔ وہ چائے بنانے کے بعد لوٹ گئی۔ اتنی اچھی چائے میں نے بہت کم پی تھی۔ میں نے گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے اس ملازمہ کے بارے میں اچھی طرح سے چھان بین کی ہے کہ نہیں؟"

"کیسی چھان بین؟" نادیہ نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

"آج کل نوکروں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔" میں نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ گھر کی چھوٹی موٹی اور نادر اشیا ایک ایک کرکے غیر محسوس انداز سے غائب ہوتی رہیں...... پہلے بھی تم نشانہ بن چکی ہو۔ الماری بھی کھلی چھوڑ دیتی ہو...... اس کے باوجود بھی تم نے اسے رکھ لیا۔ مہراں کو رہنے دیتیں۔ وہ کم از کم ایماندار تو تھی۔ آخر اس میں حرج ہی کیا تھا۔ کام اچھا نہیں کرتی تھی کیا ہوا؟"

"وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے اور اس نے میٹرک پاس کیا ہوا ہے۔" نادیہ نے اس کا دفاع کیا۔ "تہمینہ نے اس کی ضمانت لی ہے۔ اس کے کام کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کا تعلق شریف گھرانے سے ہے۔"

"اگر وہ شریف گھرانے کی لڑکی ہے تو پھر اس کی شادی اب تک کیوں نہیں ہوئی؟ کیا ایسے گھروں کی لڑکیاں گھروں میں کام کاج کرتی پھرتی ہیں۔" میرا لہجہ طنزیہ تھا۔ "کوئی اور بھی ملازمت مل سکتی ہے۔"

"کسی کی مجبوریوں اور پریشانیوں کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ تہمینہ بتا رہی تھی کہ اس کا گھرانا مالی مسائل اور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے اس لیے اسے گھروں میں جا کر نوکرانی کا کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ شاید اس کا باپ مقروض بھی ہے۔ اس کی دکھ بھری کہانی سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ اس نے راحت کو اس لیے میرے پاس بھیجا کہ میں اسے اچھی تنخواہ دوں۔ تہمینہ تین برس کے لیے امریکا جا رہی ہے میں نے رکھا تھا۔"

رات میں بستر پر دراز ہوا تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں یوں سونا نہیں چاہتا تھا۔ راحت کا چہرہ نظروں کے سامنے تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے سامنے کھڑی پوچھ رہی ہو۔ صاحب جی......! چائے بنا دوں......! میں دفتر سے آنے کے بعد صرف ایک کپ چائے پیتا تھا لیکن آج ایک گھنٹے میں دو کپ چائے پی لی جس کی خبر نادیہ کو نہیں ہوئی تھی۔ جس وقت میں نے چائے کی فرمائش کی تھی اس وقت نادیہ نہا رہی تھی۔ تب میں نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا تھا۔ جب ایک پڑوسن نادیہ سے ملنے آئی تھی نادیہ نے راحت سے کہا تھا کہ مہمان کے لیے چائے لے آؤ۔ جب وہ نشست گاہ سے نکل کر کچن کی طرح جا رہی تھی تو تب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ تم مہمان کے لیے کیا لے جا رہی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ چائے...... میں نے اس سے کہا کہ میرے لیے بھی چائے دے جانا، لیکن چائے کا ذکر بھولے سے بھی بیگم صاحبہ سے نہیں کرنا کیونکہ تمہاری بیگم صاحبہ کو میرا زیادہ چائے پینا گراں گزرتا ہے۔ وہ کسی بھی صورت میں NRO نہیں دیں گی۔ میں نے اس کے مرمریں، سڈول اور خوبصورت ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ تم بہت عمدہ چائے بناتی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے۔ میں نے اب تک ایسی چائے نہیں پی۔

پہلے تو وہ اپنی تعریف سن کر سرخ ہوگئی۔ پھر دل فریب انداز سے مسکرا دی۔ اس کی پُرکشش مسکراہٹ نے دل پر قیامت ڈھا دی۔ دل چاہا اس کی مسکراہٹ پر آ جاؤں لیکن اتنی جلدی پیش قدمی کرنے سے قاصر تھا اور اجنبیت کی دیوار نہیں گرا سکتا تھا کیونکہ اسے آئے ہوئے صرف ایک دن ہی ہوا تھا۔

چائے تو واقعی بہت عمدہ اور ذائقہ دار تھی لیکن اس سے زیادہ مجھے اس کے سڈول، مرمریں ہاتھ پسند آ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں جو دل کشی اور جاذبیت تھی وہ مجھ پر جادو کر گئی تھی۔ میں اس وقت چشم تصور میں ان ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ کاش! میں اس کا ہاتھ تھام سکتا۔

شام سات بجے وہ اپنے گھر جانے کے لیے نکلی تو اس وقت نادیہ اپنی خواب گاہ میں اپنی کسی سہیلی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ میں بالکنی میں آ کر اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی لیکن دل سے اوجھل نہ ہو سکتی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں سوچتے سوچتے گھپ اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن نظر آئی تو میں خیالوں کی دنیا میں بہت دور نکل گیا۔ میری سوچ کے دروازے ایک ایک کرکے کھلتے گئے۔

اس دنیا میں کیا ممکن نہیں تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ

آج دنیا میں ہر چیز کا تعلق جیب سے مشروط ہے۔ کیا کچھ خریدا نہیں جاسکتا تھا۔ میں اس کی مجبوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کے گھر والوں کی تنگ دستی اور احساس محرومیوں کا حل میری جیب میں موجود تھا۔ نادیہ نے اس کی مالی حالات کے متعلق جو کچھ بھی بتایا تھا وہ میں نے بڑے غور اور توجہ سے سنا تھا۔ اس دنیا میں سب سے بڑا کھیل پیسے کا ہے۔ مجھے دوسری شادی کے لیے ایک ایسی ہی اچھی عورت کی تلاش تھی۔ وہ میری پسند تھی اور کتنی حیرت کی بات تھی کہ کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس آگیا تھا۔ قسمت مجھ پر مہربان ہو رہی تھی۔ اگر میں استفادہ نہ کرتا اس سنہرے موقع سے تو میں احمق ترین شخص ہوتا پھر میں نے بستر سے نکل کر تمام خطوط اور ان کے جوابات ایک بڑے لفافے میں رکھے تاکہ صبح دفتر جاتے وقت انہیں تلف کرکے کوڑے دان میں ڈال دوں۔ اب مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جب میں واپس خواب گاہ میں گیا تو نادیہ گہری نیند میں غرق تھی۔ اگر راحت کا سحر مجھ پر چھایا ہوا نہ ہوتا تو میں اس کی نیند خراب کر دیتا۔ پھر میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کاش! نادیہ بانجھ نہ ہوتی..... میرے بچے کی ماں ہوتی تو راحت کیا کسی بھی عورت کا سحر مجھ پر نہ چھاتا۔ معلوم نہیں میری قسمت میں کیا لکھا تھا۔

راحت ٹھیک صبح سات بجے آجاتی تھی۔ جب وہ اطلاعی گھنٹی بجاتی تو گھڑی سے وقت ملایا جاسکتا تھا۔ شام سات بجے واپس جاتی تھی۔ اگر کام ہوا تو ایک گھنٹے کے بعد بھی چلی جاتی۔ اس نے کبھی دوسری نوکرانیوں کی طرح نخرے نہیں دکھائے تھے۔ وہ نہ صرف سگھڑ بلکہ سلیقہ مند بھی تھی بلکہ اس کے ہر کام میں بڑی نفاست بھی تھی۔ وہ خود بھی صاف ستھری رہتی تھی۔ مہمان عورتیں اور لڑکیاں جو ملنے والی ہوتی تھیں وہ راحت کو نادیہ کی کزن سمجھتی تھی۔ نادیہ نے اسے اپنے اچھے کپڑے دیئے ہوئے تھے۔

گھر میں قدم رکھتے ہی وہ سب سے پہلے بیڈ ٹی تیار کرتی اور اخبار دے جاتی پھر میرے لیے شیو کا پانی رکھ جاتی۔ میرے کپڑوں پر استری اور جوتوں پر پالش کرتی۔ میں نہا دھو کر میز پر آتا تو ناشتا تیار ہوتا۔ میں ناشتے سے فراغت پا کر چائے پی رہا ہوتا تو وہ ایک طرف مؤدبانہ کھڑی ہو کر پوچھتی۔ ''صاحب جی! رات کو آپ کیا کھائیں گے؟''

راحت جب سے اس گھر میں ملازمت کر رہی تھی۔ تب سے نادیہ دیر تک سونے لگی تھی اس لیے کہ راحت کو جو کام بتا اور سمجھا دیا گیا تھا وہ اچھی طرح سے انجام دیتا۔ مزید کچھ کہنے سننے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ دوسری ملازماؤں کے ساتھ مغز ماری کرنی پڑتی تھی۔ جب کہ دفتر جاتے نادیہ کو اٹھاتا تو وہ بستر پر لیٹے لیٹے مجھے خدا حافظ کہتی..... راحت میرا بریف کیس تھامے دروازے تک رخصت کرنے آتی تھی۔ جب وہ مجھے اپنی شیریں آواز میں اللہ حافظ کہتی تو میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ اسے بازوؤں کے حلقے میں قید کرلوں۔ اگر بالفرض میں ایسا کرتا تو وہ شاید تعرض نہ کرتی..... وہ چونکہ عورت تھی جو پہلی ہی نگاہ میں مرد کی نیت بھانپ لیتی ہے اس لیے اسے بھروسا تھا کہ میں ایسی جرأت ہرگز نہیں کروں گا۔ شاید اس لیے کہ میری بیوی اس سے حسین اور پُرکشش تھی۔ ایک روز شام کے وقت میں نے گھر میں قدم رکھا تو آتش فشاں دہک رہا تھا۔ راحت نے بھڑکیلا جوڑا پہن رکھا تھا۔ نادیہ نے مجھے ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ راحت نے جو بھڑکیلا جوڑا پہنا ہوا تھا اس میں اس کا بھڑکیلا بدن بھڑک رہا تھا۔ یہ میرے لیے امتحان تھا کہ اپنی سرکش نگاہوں پر پہرے بٹھاؤں۔ یہ میری آزمائش تھی۔ اس سے پہلے نادیہ نے اسے جو جوڑے دیے تھے وہ ایسے بھڑکیلے نہ تھے لیکن پھر بھی اس کے حسن و شباب کی کرشمہ سازیوں کی نمائش ہوتی رہتی۔

وہ جب بھی کسی کام سے میرے پاس آتی تو میں نادیہ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے نظروں میں جذب کرنے لگتا۔ وہ میری نگاہوں میں ہم آغوش ہو کر دل کے نہاں خانوں میں اتر جاتی تھی۔ میری اس بے باکانہ حرکت سے نادیہ کے دل پر کیا گزرتی تھی اس کا خیال کرکے اس بات کی بڑی کوشش کرتا تھا کہ نادیہ کی موجودگی میں اس حرکت سے خود کو باز رکھوں۔ معلوم نہیں میری اس حرکت سے اس کے دل پر کیا گزرتی تھی لیکن یہ حیرت کی بات تھی اس کے بشرے پر ناگواری نہیں ابھری تھی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور سوچتی ہوگی۔ آخر وہ ایک عورت تھی اور میری بیوی بھی تھی۔

میں غیر محسوس انداز سے راحت سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں کوئی جذبہ کارفرما تھا لیکن کھل کر کچھ کہنے سے گریزاں تھا۔ میری اس حرکت سے اس بات کا بھی امکان تھا کہ کہیں وہ برگشتہ نہ ہو جائے اور میں کف افسوس نہ ملتا رہ جاؤں۔

اس سے بات کرنے کا موقع مجھے سویرے ملتا تھا۔

اس وقت نادیہ گہری نیند سو رہی ہوتی تھی۔ اب صبح کے وقت دروازہ کھولنا میرا معمول بن گیا تھا۔ راحت سے پہلے میں دروازہ نہیں کھولتا تھا کیونکہ ان ملازماؤں کی صورت دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جاتی اور سارا دن بدمزہ گزرتا تھا جبکہ راحت کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں تراوٹ اتر جاتی تھی۔

ادھر گھنٹی بجی اور ادھر میں کودتا ہوا جا کر دروازے پر لپک جاتا۔ البتہ شام کے وقت خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا جا رہا تھا۔ ٹی وی دیکھنے لگتا۔ میں راحت کی آنکھوں اور باتوں میں اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا اور وہ اب مجھ سے کھل کر بات کرنے لگی تھی لیکن احتیاط برتتی تھی۔ وہ نادیہ کے سامنے کوئی بات نہ کرتی تھی۔ خاموش اور سنجیدہ رہتی۔ اگر کوئی ضروری بات ہوتی تو پوچھ لیتی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک انجان سا تعلق پیدا ہو گیا تھا جو میرے لیے بڑا حوصلہ افزا تھا لیکن میں نے فاصلہ کم کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ان میں سے نہیں تھی جو پکے پھل کی طرح جھولی میں آکر گر جاتی ہیں اور نہ ہی میری نیت میں کوئی فتور تھا کیونکہ میں دوسری شادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ایک روز شام پانچ بجے گھر پہنچا تو نادیہ گھر پر موجود نہیں تھی۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ راحت اکیلی تھی اور اس کے اکیلے ہونے کے احساس نے میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ نادیہ میرے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی اپنی سہیلی کے ساتھ گئی تھی۔ قسمت کی دیوی مجھ پر یوں مہربان ہو جائے گی میں نے سوچا نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو نادیہ نے مجھ پر اعتماد کرکے میرے خوش قسمتی کا ایک در کھول دیا تھا۔ وہ بتا گئی تھی کہ دو تین گھنٹے سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں ہے۔

آج راحت سے کھل کر بات کرنے، قدرے بے تکلف اور قریب آنے کا سنہرا موقع ملا تھا۔ میں اس سے ہر صورت بات کرنا چاہتا تھا مگر جلد بازی میں ایسی کوئی حرکت کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی ہرنی کی طرح سہم جائے۔

میں چاہتا تھا کہ پہلے اسے پوری طرح اپنے اعتماد میں لوں اور اپنی شرافت کا سکہ بٹھاؤں۔ ادھر نادیہ نے مجھ پر اندھا اعتماد کرکے راحت کو گھر پر اکیلا چھوڑا تھا۔ میں اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے لیے چائے لے کر آئی تو میں نے اس سے کہا۔ ''ایک کپ چائے اور لے آؤ۔''

اس نے حیرانی سے اِدھر اُدھر اور پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا آپ کے کوئی دوست بھی آئے ہوئے ہیں؟''

''جی نہیں.....'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ ہوتے تو کیا ساتھ نہیں ہوتے؟ تم یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس وقت تک چائے نہیں پیتا جب تک کوئی ساتھ نہ دے۔''

''جی.....'' وہ میری بات کی تہ تک پہنچ کر یوں کھلا سی گئی۔ ''جب میں نے بیگم صاحبہ اور ان کی سہیلی کے لیے چائے بنائی تھی تو تب میں نے پی لی تھی..... اب طلب نہیں ہو رہی ہے۔''

''تو پھر یہ چائے بھی لے جاؤ۔ ہم بھی چائے نہیں پیتے۔ جب تمہاری بیگم صاحبہ آئیں گی ان کے ساتھ پی لیں گے۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

پھر وہ کپ لے آئی۔ پہلے اس نے مجھے چائے بنا کر دی پھر اپنے لیے نصف سے کم چائے بنائی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک طرف مؤدبانہ کھڑی تھی لیکن میں اس کی نگاہوں کی گرفت میں تھا۔ میں نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''راحت..... ! کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھی نہیں کھڑی رہی۔ اسے شاید جھجک ہو رہی تھی یا پھر اپنی حیثیت کا احساس تھا۔ وہ نظریں چرانے لگی۔ میں نے اسے اپنائیت کے لہجے میں مخاطب کیا۔ کبھی اس سے قبل اس انداز سے مخاطب نہیں کیا تھا۔

''راحت..... ! دیکھو بھئی..... تم اس گھر کی ملازمہ نہیں بلکہ ایک فرد ہو۔ ہم نے تمہیں کبھی ملازمہ سمجھا ہی نہیں..... چلو شاباش بیٹھ جاؤ..... مجھے جلدی سے چائے پی کر ایک ضروری کام سے جانا ہے..... مجھے کہنی.....'' آخری جملہ بے ارادہ زبان سے نکل گیا تھا۔

''صاحب جی..... ! یہ آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔'' وہ نظریں نیچے کیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بیگم صاحبہ بھی مجھے بہن کہتی ہیں لیکن مجھے اپنی جگہ رہنے دیں..... میں اپنی اوقات نہیں بھولتی۔''

''اگر تم نہیں بیٹھو گی تو پھر میں بھی کھڑا ہوا جاتا ہوں۔'' میں اپنی بات ختم کرکے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا کپ اٹھا لیا۔ ''کیا تم چاہتی ہو کہ میں بھی کھڑے کھڑے چائے

ہوں۔"

اس نے سراسیمہ ہو کر اپنی لانبی سرمگیں پلکیں اٹھا کے مجھے دیکھا اور پھر سامنے والے صوفے پر آہستہ سے بیٹھ گئی۔ اس نے پیالی اٹھانے کے لیے اپنا گداز ہاتھ بڑھایا اور میری طرف دیکھا۔ اس لمحے میری نظریں اس کی نظروں میں باہم پیوست ہوگئیں۔ نظروں کے اس تصادم نے میرے دل کی دھڑکن پھر تیز کر دی۔ اس کے چہرے پر حجاب کی لہر دوڑ گئی۔ پسینے سے ننھے ننھے قطرے آب دار موتی کی طرح دمکنے لگے۔ وہ کسی مورتی کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کپ پر مرکوز تھیں۔ یہ کیفیت اس پر اس لیے طاری تھی کہ کبھی اس انداز سے نظریں نہیں ملی تھیں۔ یہ ایک جذباتی سی کیفیت تھی۔ دو جوان دلوں نے آنکھوں کے ذریعے سے ایک انجانا عہد و پیمان کر لیا تھا۔ جو بات زبان نہ کہہ سکی وہ نگاہوں نے کہہ دی تھی اور دونوں نے ہی محسوس کر لی تھی۔

اس کا سانولا روغنی چہرہ اور پرشکوہ سراپا میری نظروں کی گرفت میں تھا۔ آج پہلی مرتبہ تنہائی میں آزادی سے میں نے غور و دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر کے دل کے نہاں خانوں میں اتر رہی تھی۔

"راحت! تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے بھی بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ تم نے اتنا اچھا کھانا پکانا کس سے سیکھا ہے؟"

"اپنی امی سے....." وہ دوپٹے کے پلو سے چہرے کا پسینا پونچھنے لگی۔ "میری امی بہت ہی اچھے کھانے پکاتی ہیں۔ جب بھی خاندان میں کوئی تقریب ہوتی ہے تو انہیں کھانا پکانے کے لیے بلا لیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اچھے کھانے پکانا عورت کی پہچان ہوتی ہے اس لیے انہوں نے مجھے اس ہنر میں طاق کر دیا ہے۔"

"تم کسی اچھے گھرانے کی دکھائی دیتی ہو۔" میں نے بات آگے بڑھائی۔ "تم میں بڑا سلیقہ اور سگھڑ پن ہے۔ کام میں نفاست بھی ہے جو ہر کی عورت میں نہیں ہوتی..... تمہیں گھروں میں کام کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"تنگ دستی اور مجبوری نے ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا۔ میری امی بیمار رہتی ہیں۔ ابو کی تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کی آدھی تنخواہ اسی کے علاج معالجے کی نذر ہو جاتی ہے۔ کوشش کرتے ہیں کہ قرض نہ لیں کیونکہ اس کا اتارنا کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔" اس نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

"تم اپنی باتوں سے پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔"

وہ کہنے لگی۔ "میں میٹرک کا امتحان نہیں دے سکی کیونکہ امتحان کی فیس کے لیے رقم نہیں تھی۔ ان دنوں ابو بڑے بے روزگار تھے اس لیے کوئی دس روپے قرض دینے کو تیار نہ تھا۔ فیس کی رقم کہاں اور کس سے ملتی۔ میں نے تو یہی جماعت کا امتحان فرسٹ کلاس پاس کیا تھا۔ اگر میں میٹرک کا امتحان دے دیتی تو یقیناً ٹاپ کر جاتی۔"

وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ بھلا اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ گفتگو کے دوران ایک انجانا سا خیال میرے ذہن میں آیا تو میرے بدن میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ دل و دماغ میں ایک عجیب سی کشمکش ہونے لگی۔ میں اس کی تنگ دستی اور مالی پریشانیوں کا سدباب کر سکتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ ملازمت چھوڑ کے چلی جائے..... مجھے جسم کی نہیں بلکہ ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو میرے بچوں کی ماں بن سکے۔ مجھے ہر قیمت پر راحت کو دوسری بیوی بنانا تھا۔ اس کے لیے ہر صورت جذبات پر قابو پانا تھا۔

میں نے ایک بات جو بڑی شدت سے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ راحت، نادیہ کی بڑی عزت کرتی تھی۔ اس کے خیال میں نادیہ اس کی محسن تھی اس لیے راحت کو دوسری شادی کے لیے بڑی ہوشیاری سے تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سے محبت کرنا اور اس کا دل جیتنا ہوگا۔ تب شاید وہ دوسری شادی کے لیے تیار ہو جائے۔

میں تھوڑی دیر بعد گھر سے نکل گیا۔ نادیہ اس سے کہہ گئی تھی کہ اگر صاحب گھر پر رکیں تو وہ کھانا تیار کر کے چلی جائے۔ اگر صاحب باہر جا چکے ہوں تو وہ اس کی واپسی کا انتظار کرے۔ جب میں واپس آیا تو نادیہ آ چکی تھی اور اپنی سہیلی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

اس روز کے بعد دو تین مرتبہ ایسے مواقع ملے تھے کہ راحت گھر پر اکیلی تھی میں نے اس کی تنہائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ راحت کو اب میری ذات پر اعتماد ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگی تھی۔

ایک روز میں دفتر سے گھر لوٹا تو راحت اکیلی تھی۔ نادیہ کسی سہیلی کے ہاں تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ اسے میں نے بہت اداس اور پریشان پایا۔ اس کی آنکھوں سے اس کا غم

جھانک رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"راحت کیا بات ہے؟ تم بے حد اداس اور فکرمند دکھائی دے رہی ہو؟"

"صاحب جی..... غم اور پریشانیاں ہمارا مقدر ہیں۔" اس نے رندھی آواز میں جواب دیا۔

"بتاؤ معاملہ کیا ہے؟ میں شاید تمہاری اداسی اور پریشانی دور کر سکوں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

"جی..... جی..... بات یہ ہے کہ امی سخت بیمار ہیں اور اسپتال میں داخل ہیں۔ ان کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ کہیں سے بندوبست نہیں ہو پا رہا ہے۔"

"تم نے نادیہ سے بات کی ہوتی۔" میں نے کہا۔

"نادیہ دے دیتی۔"

"ان سے کہا تھا کہ یہ رقم تنخواہ سے کاٹتی رہیں لیکن صاحب جی! انہوں نے صاف انکار کر دیا۔" اس نے نظریں نیچی کر کے بتایا۔ "میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی کچھ پیسے لیے تھے۔ شاید اس لیے انہوں نے جواب دے دیا۔"

"اوہ..... ابھی تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی....." اس نے پلکوں کی چلمن اٹھا کے مجھے دیکھا اور قدرے تذبذب سے بولی۔ "پانچ ہزار روپے کی..... کیونکہ کچھ ضروری ٹیسٹ ہیں جو بڑے مہنگے ہیں۔"

ایک عام سی بات ہے عورت کو مرد کی مدد درکار ہوتی ہے تو وہ دل فریب اداؤں سے مرد کو فتح کرتی ہے..... اور جب مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے اپنی فیاضی اور دریا دلی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔

میرے لیے ایک لحاظ سے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ میں راحت کو اپنی فیاضی سے اپنا اسیر کر لوں۔ اگر میں اس رقم کے عوض کوئی سی بھی انجانی شرط رکھتا تو وہ میری ہر بات مان لیتی۔ کیونکہ وہ بہت غم زدہ، تنگدست اور پریشان تھی کیونکہ اس کی ماں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ بیٹی ہونے کے ناتے اسے اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔

پرس میں سے میں نے چھ ہزار کی رقم نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو..... میں ایک ہزار روپے بڑھا کے دے رہا ہوں..... اپنی ماں کا اچھی طرح سے علاج کراؤ۔ اگر مزید رقم کی ضرورت پڑے تو مجھ سے بلا جھجک مانگ لینا۔"

رقم دیکھ کے اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ اس نے ایک ہزار روپے مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف پانچ ہزار روپے درکار تھے۔"

میں نے ایک ہزار روپے واپس نہیں لیے۔ میں نے اسے سمجھایا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ کلینک، اسپتال ذبح خانے ہیں۔ ڈاکٹر، ڈاکٹر نہیں قصاب ہیں۔ علاج معالجے پر ضرورت سے زیادہ رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ یہ ٹیسٹ..... وہ ٹیسٹ..... الٹراساؤنڈ..... ایکسرے..... کے حیلے بہانے۔ اپنے ہاں کی لیبارٹریز چلاتے ہیں۔ ہر پرس نئی اور قیمتی گاڑیاں خریدتے ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے امریکا، یورپ اور دبئی وغیرہ جاتے ہیں مریض کی کھال اتار کے۔ لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے لیکن انکم ٹیکس دس بیس ہزار سے زیادہ نہیں دیتے۔ تمہیں کیا کیا بتاؤں راحت! یہ لٹیرے اور ڈاکو ہیں۔ ان کے دل کے کسی کونے میں رحم دلی اور خدمت کے جذبے کی رتی تک نہیں ہوتی ہے۔ ان کی بیگمات، بیٹیاں اور بہنیں دبئی جا کر شاپنگ کرتی ہیں۔ عین وقت پر اچانک مزید رقم کی ضرورت پڑ گئی تو کہاں کہاں بھاگتی پھرو گی....."

"صاحب جی! سنا ہے کہ کافر ملکوں میں ڈاکٹر ایسے نہیں ہوتے ہیں۔" وہ کہنے لگی۔ "بے رحم اور سفاک ڈاکٹر جو مسلمان ہوتے ہیں وہ ہمارے مسلمان ممالک میں کیوں ہوتے ہیں؟ جب میں پہلی بار امی کو اسپتال لے گئی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کی بڑی تعریف سنی۔ اس نے ایک سیمینار میں کہا تھا کہ ڈاکٹروں کو انسانیت کی خدمت کرنی چاہیے۔ اس کی مشورہ فیس تین سو روپے تھی۔ میں نے جب اس سے کہا کہ میرے پاس صرف سو روپے ہیں تو بری طرح بگڑ گئی اور برہمی سے کہنے لگی یہ کوئی خیراتی اسپتال ہے جبکہ وہ بڑی امیر کبیر تھی۔ اس نے سو روپے کی رعایت نہیں کی۔ اب تو مجھے ہر لیڈی ڈاکٹر کسی چڑیل کی طرح نظر آتی ہے۔"

میں اس کا آخری جملہ سن کر اک دم سے ہنس پڑا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ وہ ڈاکٹرنیاں چڑیلیں دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے چہروں پر ہر وقت پھٹکار برستی رہتی تھی۔ وہ کسی ڈائن سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ مریض عورتوں کا خون پیتی رہتی ہیں۔

میں نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ امریکا اور یورپ میں ڈاکٹر واقعی ایسے بے رحم اور خود غرض نہیں ہوتے ہیں۔ انہیں دولت کی خواہش ہوتی ہے لیکن ہوس نہیں ہوتی ہے۔ خواہش اور ہوس میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہاں کسی کی بھی

مریض کو جو کسی حادثے اور کسی سنگین بیماری کے سبب اسپتال لایا جاتا ہے اسے فوری طبی امداد دی جاتی ہے لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ جب کسی کی جان خطرے میں ہوتی ہے تو اس کے لواحقین سے کہا جاتا ہے کہ پہلے رقم جمع کرائیں۔ رقم جمع کرانے سے پہلے اگر وہ مرگیا تو انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ تمہیں چلتے چلتے سچا واقعہ سناؤں جس کا گواہ میں خود ہوں۔ میں کالج سے گھر جا رہا تھا کہ سڑک پر ایک حادثہ رونما ہوا۔ ایک گاڑی نوجوان کو ٹکر مار کے نکل گئی۔ اسے زخمی حالت میں اسپتال لے جایا گیا۔ وہ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ اس اسپتال کا مالک ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کی فیس بہت زیادہ تھی۔ وہ نوجوان لڑکا اسپتال کے اسٹریچر پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ سر سے بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو تر کردیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا جو اس وقت آپریشن تھیٹر سے نکل رہا تھا کہ یہ کیس دیکھ لیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ پچیس ہزار روپے جمع کرادیں۔ میں نے کہا کہ وہ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے لمحہ لمحہ اس کے قیمتی ہیں میں اس کے لواحقین کو تلاش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ اسے سرکاری اسپتال لے جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ اسے لے جانے میں وقت لگے گا۔ یہ جانبر نہ ہوسکے گا۔ وہ نہ مانا۔ مجبوراً اسے سرکاری اسپتال لے جایا گیا تو مجھ سے کہا گیا کہ پانچ ہزار روپے جمع کرادیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ فی الوقت میرے پاس صرف تین ہزار روپے ہیں وہ جمع کرلیں۔ میں دو ہزار روپے کا بندوبست کرتا ہوں۔ ڈاکٹر نہ مانا...... مزید دو ہزار روپے کا بندوبست کرکے آنے تک وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ نہ جانے روز کتنے لوگ اس طرح مرتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ ڈاکٹر جو لٹیرے بنے ہوئے ہیں کیا یہ دولت قبر میں لے جائیں گے؟''

''واقعی بڑا ظلم ہوا......'' وہ افسوسناک لہجے میں بولی۔ ''اس لیے آپ کے لہجے میں اتنی تلخی ہے۔''

''ہاں...... میں اس دردناک لہجے کو کیسے بھول سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''آپ کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ ممنونیت سے بولی تو اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں آپ کی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے لوٹا دوں گی۔''

''یہ میں نے تمہیں قرض نہیں دیا ہے جو تم لوٹا دوگی۔'' میں نے کہا۔ ''انسانیت کی خدمت کرنا ہمارا بھی فرض ہے۔''

''جی......'' اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ اس لمحے وہ اتنی حسین لگی کہ میرا جی چاہا کہ اپنے ہونٹوں میں اسے جذب کرلوں۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ...... مگر صاحب جی......! بیگم صاحبہ کہیں برا تو نہیں مانیں گی؟ نہ جانے وہ کیا سوچیں؟''

''بیگم صاحبہ سے اس رقم کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا اور تمہارا معاملہ ہے...... آیندہ جب کبھی بھی تمہیں رقم کی ضرورت پڑے تو مجھ سے کہہ دینا۔''

راحت تھوڑی دیر کے بعد چھٹی لے کر چلی گئی تاکہ رقم اپنے گھر والوں کو پہنچا سکے۔ وہ بہت خوش خوش گئی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ تو میں خوش تھا۔ اس سے میرا ایک انجانا رشتہ غیر محسوس انداز سے قائم ہوگیا تھا جو بڑا مستحکم، مضبوط اور پائیدار تھا۔ اس سے پہلے یہ رشتہ بڑا رسمی تھا۔ مالک اور آقا کا...... اب ایسا جذباتی ہوگیا تھا کہ وہ کسی ان جانی حرکت پر کوئی تعرض نہ کرے ایسا لگنے لگا کوئی فاصلہ، دیوار اور زنجیر نہیں رہی۔

میرا دماغ غبارے کی طرح بلندی کی طرف اڑا جارہا تھا۔ اس وقت میری کیفیت کسی فاتح عالم جیسی تھی۔ مجھے اپنی منزل آسان اور قریب دکھائی دیتی تھی۔ میں اسے اپنے احسانات کے بوجھ تلے اتنا دبا دینا چاہتا تھا کہ وہ میری کسی بات سے انکار نہ کرسکے۔ دو دن بعد میں دفتر سے آیا تو نادیہ نہا رہی تھی، وہ ابھی ابھی نہانے کے لیے غسل خانے میں گھسی تھی۔ وہ دیر تک نہانے کی عادی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی خاصہ وقت صرف کرتی تھی۔ بعض وقت تو میں چڑ سا جاتا تھا۔

ان دو دنوں میں مجھے راحت سے بات کرنے اور اس کی ماں کی خیریت دریافت کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بھنک نادیہ کے کان میں پڑ جائے اور اسے شک ہوجائے۔ یوں بھی عورت بڑی شکی ہوتی ہے۔ خصوصاً بیوی بننے کے بعد۔

آج موقع تھا۔ نادیہ چونکہ نہا رہی تھی اس لیے دیر تک راحت سے سکون اور آزادی سے بات کی جاسکتی تھی اس لیے میں کچن کی طرف تیزی سے بڑھ گیا۔ وہ میرے لیے چائے بنانے میں مصروف تھی۔ ان دو دنوں میں اس کے چہرے پر طمانیت دیکھ کر میں نے بھانپ لیا تھا کہ اب اس کی امی کی طبیعت ٹھیک ہے لیکن یہ بات میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔

میں بے آواز قدموں سے اس کی پشت پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے مجھے محسوس کرکے پلٹ کر دیکھا۔

''آپ......؟''

''جی......'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم کیا سمجھیں؟ کیا کوئی روح آگئی؟''

''آپ نے تو مجھے ڈرا دیا صاحب جی......!'' اس نے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں نے اس کے قریب ہوکر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ''ہاں بھئی...... راحت......! اب تمہاری امی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا بڑا کرم ہے وہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے دلکش تبسم کی چاندنی نچھاور کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نشیلی آنکھوں میں برقی قمقمے جل اٹھے تھے۔ ''سچ پوچھیے تو آپ کی بروقت مدد سے ان کی جان بچ گئی اور انہیں ایک نئی زندگی مل گئی۔ آپ نے سچ کہا تھا کہ یہ ڈاکٹر بڑے لٹیرے ہیں اگر چھ ہزار کی رقم نہ ہوتی تو واقعی میرے لیے مشکل ہوجاتی...... امی اور ابو آپ کے ممنون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا یہ احسان وہ ساری زندگی بھلا نہ سکیں گے۔''

''یہ میرا انسانی فرض تھا جو میں نے ادا کیا ہے۔'' میں سنجیدگی سے یہ جملہ ادا کرتے وقت اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تو اس نے پلکیں جھکا ئیں۔ اس کے چہرے پر شادابی ابھری اور اس کا حسن نکھر گیا۔ میں نے قدرے تذبذب سے پوچھا۔ ''ویسے تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ کیا تمہیں اس بات کی توقع نہیں تھی کہ میں تمہاری اس مصیبت میں کام آؤں گا۔ جبکہ بیگم صاحبہ نے رقم دینے سے انکار کردیا تھا۔''

''آپ کچھ بھی کہہ لیں، آپ کا یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ ہم ساری زندگی اتارنا چاہیں تو اتار نہیں سکتے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بیگم صاحبہ کے انکار کرنے کے بعد میری کیا حالت ہوئی آپ اس کا اندازہ لگا نہیں سکتے۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کے احسان کا شکریہ کیسے اور کس طرح ادا کیا جائے۔ میرے پاس تو الفاظ بھی نہیں ہیں۔''

''شکریہ ادا کرنے پر اگر تم بضد ہو تو اس کی بہت ساری صورتیں موجود ہیں۔'' میں نے برف پگھلتی دیکھی تو اس کے اور قریب ہونے لگا۔ اچانک نادیہ نے غسل خانے سے راحت کو آواز دی تو وہ بدحواسی کے عالم میں بال اور لباس کی شکنیں درست کرتی ہوئی غسل خانہ کی طرف لپکی۔ اگر اس وقت نادیہ اسے نہیں پکارتی تو شفاف آئینے پر ضرور ذرا سا بال آجاتا۔ میں نشست گاہ میں آکر بیٹھ گیا۔ میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ آج نادیہ نے غسل خانہ سے اتنی جلدی فراغت کیسے پالی ہے۔ میں صلہ نہ ملنے کے باوجود بھی خوش تھا۔ میرے لیے یہ خوش آیند بات تھی کہ اس کی آنکھوں میں میرے لیے محبت کا جذبہ کروٹیں لینے لگا۔ میری اس نوازش نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ میں اپنی اس اچانک اور غیر متوقع کامیابی اور فتح پر مسرور ہورہا تھا کہ یک لخت میری ساری خوشی کافور ہوگئی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں نادیہ نے ہم دونوں کو کچن میں باتیں کرتے اور ایک دوسرے کے قریب کھڑے تو نہیں دیکھ لیا؟ اس لیے اس نے راحت کو آواز دے کر بلالیا۔ وہ شاید نہانے نہیں بلکہ منہ دھونے گئی ہو۔ مٹھاس کڑواہٹ میں بدل گئی۔ میرے دل میں ایک انجانا سا خیال سانپ کی طرح ڈس رہا تھا اس نے مجھے لرزا سا دیا کہ آج اور اسی وقت کھڑے کھڑے راحت کی چھٹی ہوجائے گی اور کسی بوڑھی، بدصورت یا کسی بے کشش، موٹی بھدی ملازمہ رکھ لی جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد راحت مجھے چائے کے لیے بلانے آئی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں نے سکون اور اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے چہرے پر جو طمانیت تھی اس نے میری ڈھارس بندھائی۔ میز پر نادیہ میری منتظر تھی۔ جب اس نے مجھ سے محبت بھری باتیں کیں تو میں سمجھ گیا کہ نادیہ نے اسے کسی اور کام سے بلایا تھا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اک دن میں دفتر سے آیا تو راحت کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ نادیہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا ہلکا اور نفیس میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کا جوڑا بھی خوشنما لگ رہا تھا۔ جامنی کناروں والی سفید ساڑی، سفید بلاؤز میں اس کا دل فریب حسن نظر آرہا تھا۔ اس کا یہ حسین روپ میرے دل پر قیامت ڈھانے لگا تھا۔ نادیہ نے بھی آج غضب کا سنگار کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں تیار ہوکر کہاں جارہی تھیں مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ جب نادیہ نے اسے زیور پہنایا تو وہ کسی دلہن کی طرح دکھائی دی تھی۔ اگر سفید کی جگہ کوئی رنگین ساڑی راحت کو پہنائی گئی ہوتی تو وہ سچ مچ کی دلہن معلوم ہوتی۔

مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں نے راحت کو نظر بھر کے دیکھنے کے بعد نادیہ سے پوچھا۔ ''یہ تم دونوں دلہنوں کا روپ بھر کے کہاں جارہی ہو؟ کیا کسی ہوٹل میں دلہن شو ہو رہا ہے؟''

"تہمینہ کے ایک کزن کی مہندی ہے ہم وہاں جا رہی ہیں۔" نادیہ نے جواب دیا۔ "یہ بہت اچھا ڈھولک بجاتی ہے۔ گاتی بھی بہت اچھا ہے۔"

راحت کی آواز کے بارے میں یہ انکشاف نادیہ نے جو کیا تھا اس پر مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی اس لیے کہ جب بھی وہ بات کرتی تھی تو اس کی ریشمی آواز کا زیروبم فضا میں نغمگی کی طرح بج اٹھتا تھا۔ اس کی آواز سن کر میرے دل کو ایک عجیب سی راحت محسوس ہوتی تھی۔ اس کا نام راحت جو رکھا گیا وہ غلط نہ تھا۔

وہ دونوں رات ایک بجے مہندی کی تقریب سے لوٹیں۔ میں ان دونوں کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ راحت نادیہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین تھی۔ ایک وقت تھا جب میں اس کی دلکشی کا دیوانہ تھا مگر جب سے راحت آئی تھی وہ میری راحت جان ہوگئی تھی لیکن اس کے حسن کے طلسم نے مجھے اس طرح اپنا اسیر بنا لیا تھا کہ اس کے سوا مجھے کوئی اور نظر نہ آتا تھا۔

اس وقت میں راحت ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ نادیہ نے بتایا تھا کہ راحت آج گھر ہی رہے گی۔ کل شام واپس جائے گی۔ یہ ایک طرح سے میرے لیے خوش خبری تھی۔ میرے رگ و پے میں ایک سنسنی بجلی کی رو کی طرح دوڑنے لگی تھی۔ نادیہ خواب گاہ میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔ جب راحت بھی کپڑے بدلنے کے لیے ایک کمرے کی طرف بڑھی تو میں نشست گاہ سے تیزی سے نکل کر اس کی طرف لپکا اور اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے سرگوشی میں اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف وہی سن سکے۔ یوں بھی نادیہ تک آواز پہنچنے کا امکان اس لیے نہیں تھا کہ وہ خواب گاہ سے ملحق غسل خانے میں گئی تھی۔

"راحت......! تم بہت حسین لگ رہی ہو؟"

وہ میرا یہ جملہ سن کر اس بری طرح چونکی جیسے اس نے کوئی خوفناک چیز دیکھ لی ہو۔ دوسرے لمحے اس نے خوف زدہ نظروں سے ہماری خواب گاہ کی طرف دیکھا پھر وہ حواس باختہ ہوکر کترانے لگی تو میں نے اس کی راہ روک لی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے اپنے بازوؤں میں محصور کرتا وہ ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو آزاد کرا کے کمرے میں گھس گئی۔ میں ایک نامراد شخص کی طرح رہ گیا۔

میرے دل میں آیا کہ دروازے پر جاکر دستک دوں؟ لیکن وہ لمحہ بیت گیا جو مجھے سرفراز کر سکتا تھا۔ نادیہ نہانے نہیں کپڑے بدلنے گئی تھی۔ مجھے کمرے میں نہ پاکر مشکوک ہوجاتی اس لیے مجھے اپنے کمرے میں آنا پڑا۔ ابھی میں دراز ہوا تھا کہ نادیہ غسل خانے سے باہر آئی اور بولی۔ "سوئے نہیں؟ اب تک جاگ رہے ہو؟"

"مہندی کی تقریب کیسی رہی؟" میں نے مصنوعی جماہی لے کر پوچھا۔ "کون جیتا؟"

"بہت ہی شاندار......" نادیہ نے جواب دیا۔ "ہم لوگ جیتے۔ لڑکے والے راحت کے سامنے بےبس ہوکر رہ گئے۔"

میں چاہ رہا تھا کہ نادیہ جلد سو جائے تاکہ میں بارگاہ حسن میں حاضری دے سکوں لیکن نادیہ جاگ رہی تھی۔ مہندی کی تفصیلات بتا کر بور کر رہی تھی۔ پھر کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد جاکر سوئی تھی۔ اب راحت کے دروازے پر جانا بیکار تھا۔ وہ ہرگز دروازہ نہ کھولتی۔ اس نے اندر سے چٹخنی لگالی ہوگی۔

میں رات کے آخری پہر ایک پل بھی سو نہ سکا تھا اس لیے کہ راحت میرے وجود میں رات کی رانی کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرح بس گئی تھی۔ وہ میری کمزوری بن گئی تھی کہ مجھے اپنی زندگی پھیکی، بےکیف اور بےرونق سی لگ رہی تھی۔ میں اب صرف اس کے بارے میں سوچتا اور تصور میں ہر لمحہ دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ میں کتنی ہی مرتبہ اس کے دروازے پر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی دستک بھی دی تھی۔ دروازے کو نہیں کھلنا تھا نہ کھلا...... وہ بےخبر سو رہی تھی یا پھر کسی انجانے خوف اور اندیشے کی وجہ سے اس نے دروازہ نہ کھولا تھا پھر وہ ایک عورت تھی۔ ایک شادی شدہ مرد کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح کس طرح گر سکتی تھی جب کہ اس شخص کی بیوی بھی دوسرے کمرے میں موجود تھی۔

فجر کی اذان کے بعد کہیں جاکر میری آنکھ لگی۔ اس وجہ سے میں دیر تک سوتا رہا۔ میں نے نیند کے عالم میں کئی بار نرم و نازک انگلیوں کا لطیف اور انوکھا لمس اپنی گردن اور ماتھے پر محسوس کیا تھا۔ ایک ایک ہاتھ نے بڑے پیار سے میرے بالوں کو سہلایا اور کبھی کبھی چٹکی بھی لی تھی۔ ہونٹوں کی مٹھاس اور تپش بھی سرور و کیف بخشتی رہی تھی۔ نادیہ میری نیند میں مجھے بہلاتی تھی۔ کوئی دس بجے کے بعد راحت نے میرا شانہ ہلا کر مجھے بیدار کیا۔ وہ ٹرے میں چائے لیے کھڑی مجھے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"صاحب جی......! آج بڑی دیر تک سوئے رہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس کے لہجے میں فکرمندی

تھی۔

"بیگم صاحب......! کہاں ہیں؟" میں نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "نادیہ بیگم صاحبہ کا صبح سات بجے فون آیا تھا۔ وہ اس وقت ناشتا کیے بغیر نکل گئیں۔"

"کیا؟" اچانک میری نظروں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا پھر ایک ایک کرکے تمام پردے ہٹتے گئے۔ کیا راحت کے نرم و گداز ہاتھ نے میرے ماتھے کو چھوا تھا؟ ان نرم و نازک ہاتھوں نے میرے سر کے بالوں کو سہلایا تھا؟ ہونٹوں کی مٹھاس اور تپش؟ کیا راحت اندر ہی اندر مجھے چاہنے لگی ہے؟

جب وہ واپس جانے لگی تو میں نے اسے محبت بھرے لہجے میں پکارا۔ "راحت......!"

اس نے رک کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرالی۔ "کیا تم میرے کمرے میں آئی تھیں راحت......! کیا تم نے؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی گہری خاموشی سے اس کے دل کا اقرار عیاں تھا۔ وہ نظریں نہ تو اٹھا سکتی تھی اور نہ اس میں چھپانے کی ہمت تھی اس پر موتی کا گمان ہو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے اس کے شانے تھام لیے اور کہا۔ "راحت......! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔"

اس نے اچانک اپنی جھکی پلکیں اوپر اٹھائیں اور ایک قدم پیچھے ہٹی اور گھبرا کے بولی۔ "نہیں صاحب......! نہیں...... صاحب جی نہیں......"

"کیوں نہیں......" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی تو میں دو قدم بڑھ گیا۔ "تم بھی تو مجھ سے محبت کرتی ہو۔ تمہاری محبت کا ثبوت مجھے آج ہی تو ملا ہے۔"

"میں آپ سے محبت ضرور کرتی ہوں صاحب جی......!" وہ نگاہیں نیچی کیے اٹک اٹک کر کہنے لگی۔ اس کی سانسیں زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ "مگر میں بیگم صاحب کے ساتھ کوئی احسان فراموشی نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے بسے بسائے گھر کو اجاڑنا نہیں چاہتی۔ یہ پیار و محبت سے بسا آشیانہ ہے۔"

"یہ گھر نہیں اجڑے گا اور ہماری محبت بھی سلامت رہے گی۔" میں نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے صاحب جی؟" اس نے پہلی بار اپنی پلکیں اٹھا کے دیکھا۔ "کیا ایک میان میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں؟"

"ایک میان میں تو دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔" میں اک دم سے مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "ایک میاں کی دو بیویاں تو ہوسکتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ ششدر سی رہ گئی۔ "آپ مجھ سے شادی کریں گے؟"

"ہاں راحت......!" میں نے پورے یقین سے کہا۔ "میں تم سے شادی کروں گا۔"

"کیا آپ مجھ سے شادی کرنے کے بعد بیگم صاحبہ کو طلاق دے دیں گے؟ نہیں...... صاحب جی...... ایسا ان کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔" وہ پریشان ہوکر بولی۔ "وہ آپ سے بےانتہا محبت کرتی ہیں۔ وہ جتنی حسین ہیں اتنی ہی دل کی بھی صاف ہیں...... میں ان کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں انہیں طلاق دے دوں گا۔" میں زیرلب مسکرا دیا۔ "مجھے نادیہ سے اتنی محبت ہے کہ اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔"

"مگر صاحب جی! کیا یہ دوغلا پن نہیں ہے کہ آپ ان سے شدید محبت کرتے ہیں اور مجھ سے بھی...... اس سے بڑی ریاکاری اور منافقت کیا ہوسکتی ہے؟" راحت نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"میں نہ تو دوغلا ہوں اور نہ ہی ریاکاری اور منافقت سے کام لے رہا ہوں۔ میں نے تم سے اس لیے محبت کی ہے کہ تم سے شادی کروں تاکہ تم میرے بچوں کی ماں بنو۔ مجھے اولاد کی ضرورت ہے تاکہ میری نسل آگے بڑھ سکے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے بیٹا دو گی۔"

"اگر میں بیگم صاحبہ کی طرح آپ کے خواب کو پورا نہ کرسکوں...... اور میں ماں نہ بن سکی تو پھر آپ کیا کریں گے؟ کیا تیسری شادی کرلیں گے؟" اس کے شریں ہونٹ تھرتھرائے۔

"عورت ایک سرسبز و شاداب اور زرخیز زمین ہوتی ہے...... ضروری تو نہیں کہ ہر زمین بنجر ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے یہ سوچا کہ اس شادی کی خبر سے بیگم

صاحب پر بھی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ کوئی عورت ہو [illegible] برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔ "چاہے وہ کتنی ہی [illegible] کیوں نہ ہو۔"

"بیگم صاحبہ کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تم سے چوری چھپے نکاح کروں گا۔ نکاح کے بعد تم ایک فلیٹ میں رہو گی۔ میں دن کے اوقات میں تمہارے پاس آ جایا کروں گا۔ [illegible]"

"ایک نہ ایک دن انہیں پتا چل ہی جائے گا۔" وہ بولی۔ [illegible]

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

[illegible]

میں اس کی یہ بات سن کر خوش ہو اٹھا۔ اس نے میری ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ [illegible]

"کہیں آپ بیچ منجدھار میں میرا ساتھ تو نہیں چھوڑ دیں گے؟ میں ایک غریب عورت ہوں۔ [illegible]"

"اگر مجھے صرف تمہارے حسن و شباب سے دلچسپی ہوتی تو میں تم سے شادی کے بارے میں نہیں سوچتا۔ میں تمہاری مجبوریوں اور احساس محرومیوں سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔"

"آپ میرے [illegible]" اس کے چہرے پر پھول کھلنے لگے۔ [illegible]

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ [illegible]

اس نے میرے قریب ہو کر بے اختیاری سے [illegible] "آپ کی محبت نے مجھے [illegible] کر دیا ہے۔ [illegible]"

☆☆☆

میں سہ پہر کے وقت باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بیگم نے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں تمہارے انکل کے پاس جا رہا ہوں، کل کی میٹنگ کا ایجنڈا بنانے کے سلسلے میں تفصیلی بات کرنی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم ایسا کرو انکل کے ہاں جاتے ہوئے راحت کو اس کے گھر چھوڑتے جانا۔ اس کا گھر راستے ہی میں [illegible]"

"یہ روز ہی بسوں میں آتی جاتی ہے۔ ایک دن چلی جائے گی تو کیا فرق پڑے گا؟"

میں نے بظاہر کہا لیکن دل سے یہی چاہتا تھا کہ اسے لفٹ دوں اور اس کے گھر آج ہی اس کے والدین سے شادی کی بات چیت کروں۔

"پلیز ڈیئر..." بیگم نے میری منت کی۔ "وہ غریب کل سے یہاں رکی ہوئی ہے۔ اس کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" [illegible] محبت کی آگ میں صرف میں ہی نہیں وہ بھی جل رہی تھی۔ [illegible] دوسری طرف راحت بھی [illegible] اس غریب اور بدنصیب کی زندگی میں اچانک اور غیر متوقع خوش نصیبی کے [illegible] تھے۔

جب میں راحت کے ہاں پہنچا تو اس کے والد [illegible] نے میرا بڑا پرتپاک استقبال کیا اور مجھے بڑی عزت و احترام سے بٹھایا۔ [illegible]

میں نے غیر محسوس انداز سے راحت کے مکان کا جائزہ لیا۔ [illegible]

[illegible]

اللہ نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ جمعرات کی شام میں اسے اور اس کی سہیلیوں کو رخصت کرنے [illegible] کے بعد راحت کے قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں میرا نکاح ہو گیا۔ [illegible] میں راحت

کو ساتھ لے کر ہوٹل پہنچا۔ میں نے اس ہوٹل میں پہلے ایک کمرا بک کرا لیا تھا۔ [illegible]

راحت دلہن بنی بیٹھی تھی۔ مجھے آج یہ سب کسی سہانے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ میری زندگی میں دھنک کے تمام رنگ بکھر گئے تھے۔ [illegible]

دوسری طرف خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا [illegible]

میرے ذہن میں ایک کشمکش جاری تھی۔ پھر میں نے پلٹ کر راحت کی طرف دیکھا [illegible]

راحت میرے قریب آ کر رک گئی۔ پھر اس نے اپنی

دونوں مرمریں بانہیں میرے گلے میں حمائل کر کے بڑے جذباتی لہجے میں پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں میرے سرتاج.....! کہیں آپ مجھ سے شادی کر کے پچھتا تو نہیں رہے ہیں؟''

''پچھتا تو نہیں رہا.....'' میں نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کر دیا اور چہرے پر جھک کر آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ''نادیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اگر اسے اس شادی کی خبر ہوگئی تو ہمیں زندگی کی تمام تر رنگینوں سے محروم ہونا پڑے گا۔ اس گھر اور نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ پھر ایک عام سی زندگی گزارنا ہوگی؟ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''کیوں نہیں میرے سرتاج!'' راحت کے وجود میں دوسری عورت بولنے لگی۔ ''میں ایک غریب گھرانے کی عورت ہوں۔ میں نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میرے لیے عام اور کڑی زندگی کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ میں نے کبھی خواب نہیں دیکھے۔ میرے لیے سب سے بڑی دولت آپ کی محبت ہے۔ میں ایک وقت کی روٹی کھا کر خوش رہوں گی۔''

میں اس کا جواب سن کر سرشار ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی سمجھدار ہے۔ ایک نایاب اور انمول ہیرا ہے میں اسے اب تک ایک عام عورت سمجھ رہا تھا۔ پانچ روز تک ہم دونوں ہوٹل میں سہاگ راتیں اور جشن مسرت مناتے رہے۔ نادیہ کی واپسی سے ایک روز قبل ہوٹل چھوڑ دیا۔ ایک روز میں نے اور راحت نے مل کر گھر کی اچھی طرح صفائی کی۔ ساتویں روز نادیہ آئی تو بہت خوش تھی۔ آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے اس کے چہرے پر بڑی تازگی اور شادابی تھی۔ اس رات مجھے نادیہ کے ساتھ بڑی محبت اور گرم جوشی سے پیش آنا پڑا۔ سہاگ کی پہلی رات کی یاد تازہ کر دی۔ اس رات مجھے نادیہ کے ساتھ آدھی رات تک جاگنا پڑا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی اور وہ چیزیں دکھاتی رہی جو وہ میرے لیے خرید کے لائی تھی۔ وہ راحت کے لیے ایک کشمیری شال اور کچھ ملاقاتی جوڑے بھی لائی تھی۔ منصوبے کے مطابق جب نادیہ گہری نیند سو گئی تھی تو میں اچھی طرح سے اطمینان کر کے راحت کے کمرے میں چلا گیا جہاں وہ میرا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ دو گھنٹے گزار کے اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

اب جب شام کو آتا تو اکثر یہ ہوتا تھا کہ نادیہ گھر پر موجود نہیں ہوتی تھی۔ تنہائی کے خاصے مواقع ملنے لگے تھے۔ اس طرح چار ماہ کا عرصہ بے خبر و خوبی کے گزر گیا۔ نادیہ کے فرشتوں کو بھی ہماری شادی کی خبر نہ ہو سکی۔

ایک روز راحت دو دن کی چھٹی لے کر گئی تو دو دن بعد آئی۔ نادیہ پر بے حد غصہ آیا تھا۔ اس روز نادیہ رات دیر تک جاگتی رہی۔ سو کیوں نہیں جاتی ہے۔ خدا خدا کر کے رات ایک بجے وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔ جب میں راحت کے کمرے میں پہنچا تو وہ میرے انتظار میں اضطرابی کیفیت میں ٹہل رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے قدم رکھا اس نے میرا بڑا والہانہ انداز اور دارفتگی سے استقبال کیا۔ اس نے خوش ہو کر یہ خبر سنائی کہ وہ اُمید سے ہوگئی ہے۔ پھر بولی۔ ''اللہ نے آپ کی مراد پوری کر لی..... دعا کریں کہ بیٹا ہو۔''

''انشاء اللہ..... بیٹا ہی ہوگا۔''

ہم دونوں یہ آواز سن کر اچھل پڑے۔ نادیہ دروازے میں کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نادیہ غیظ و غضب کی بجائے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے راحت کے پاس جا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ میں نے سوچا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں شرمندہ اور نادم سا کھڑا تھا۔

''بات یہ ہے کہ جب مجھے بانجھ ہونے کی خبر ملی تو میں بانجھ ہونے کے دکھ سے روتی رہی کہ اب تم اولاد نرینہ کے لیے ضرور دوسری شادی کرو گے پھر میرا خیال درست نکلا۔ تم اخبارات میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیکھنے لگے۔ تم نے ایک فرضی اشتہار شائع کرایا۔ میں نے سوچا کہ یہ تمہارا جائز حق ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم کسی غلط عورت کے ہتھے چڑھ جاؤ..... مجھے چونکہ تم سے بے پناہ محبت ہے اس لیے میں نے طلاق پر سوکن کو ترجیح دی۔ مجھے سوکن منظور تھی طلاق نہیں..... پھر میں نے راحت کو اپنے یہاں کام کرنے پر راضی کیا۔ یہ تمہیں کے ہاں ملازم تھی۔ اسے گھر میں رکھ کر مواقع دیے۔'' میں اس عظیم عورت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے یقین ہے یہ آیندہ بھی اسی طرح اس گھر میں رہ کر تمہاری خدمت کرتی رہے گی۔ صرف اس سے ہی نہیں اس کے گھر والوں سے بھی میں نے معاہدہ کر رکھا ہے کہ تمہارے بچے میرے کہلائیں گے۔ برتھ سرٹیفکیٹ پر بھی ماں کی جگہ میرا نام لکھا ہوگا۔''

++

سردیوں کی ایک ٹھٹرتی صبح، جب ہر چیز کو دھند نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سورج کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا اوس کے قطرے درختوں سے ٹپک رہے تھے۔ ہر ایک چیز اپنے مسکن میں بیٹھی قدرت کے دیئے ہوئے موسم سے بھرپور لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسی صبح اپنے معمول کے مطابق علی اصغر جاگنگ کرتا ہوا پارک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بلاناغہ جاگنگ کیا کرتا، وقت آگے پیچھے ہو جاتا لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ وہ جاگنگ کرنے پارک نہ آیا ہو۔

اس روز بھی وہ اپنے معمول کے مطابق سردی اور دھند میں جاگنگ کرتا ہوا پارک کی اندرونی سڑک پہ جا رہا تھا۔ دھند اتنی شدید تھی کہ ایک فٹ سے کوئی چیز بمشکل ہی نظر آ رہی تھی پارک کے عین وسط میں پہنچے پر اچانک اسے ایک عمر رسیدہ شخص اپنے پاس سے گزرتا ہوا دکھائی دیا اس نے دھیان نہ دیا، اپنی جاگنگ مکمل کر کے گھر لوٹ آیا۔ ناشتا کیا اور دفتر چلا گیا۔

اگلے روز پھر شدید دھند میں علی اصغر اپنے آپ میں گم جاگنگ کرتا ہوا پارک میں آیا پھر اسی جگہ جہاں پچھلے روز اسے عمر رسیدہ شخص دکھائی دیا تھا، آج بھی وہی آدمی اپنا چہرہ ڈھانپے، خوبصورت سا اوورکوٹ پہنے ہوئے اسے دکھائی دیا۔

علی اصغر کا تو معمول تھا کہ وہ بلاناغہ جاگنگ کرتا۔ اسے کسی سے کوئی مطلب نہ تھا اور نہ وہ کسی سے بات چیت کرتا۔

سراب

محترم مدیر
السلام علیکم!
دنیا بھر میں ایلوشن کا مرض تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس کے سدباب کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ اس مرض میں مبتلا شخص کی روداد۔

ظہیر ملک

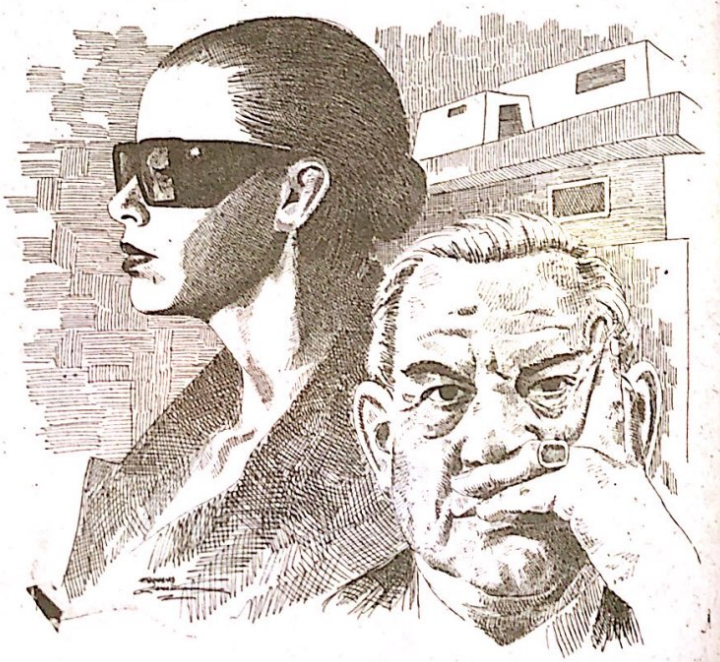

تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، وہ عمر رسیدہ شخص اسے اسی جگہ جہاں پہلے دن دکھائی دیا تھا، وہیں دوبارہ دکھائی دیا۔ آج اصغر نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ اسے مخاطب کرنا چاہتا تھا مگر اس کی حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ شخص جو اسے نظر آیا تھا اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ تھوڑا پیچھے کی طرف دوڑا تو اپنے آپ کو ناکام پایا، وہاں سوائے اس کے کوئی نہیں تھا۔ اس نے یہ سوچ کر واپسی کی راہ لی کہ شاید وہ شخص فطری ضرورت کے لیے کسی جھاڑی کے پیچھے بیٹھ گیا ہوگا۔

چوتھے دن اصغر نے تہیہ کرلیا کہ اس عمر رسیدہ شخص سے مل کر ہی جانا ہے۔ وہ وجہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر اس شخص کو مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے؟ جب اصغر اپنے معمول کے مطابق پارک کی اسی جگہ پہنچا جہاں اس کے ساتھ یہ کل پچھلے تین دن سے ہو رہا تھا تو یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ آج اسے وہ شخص نظر نہیں آیا۔

پھر تو آنکھ مچولی شروع ہوگئی جس دن اصغر کو خیال نہ ہوتا کہ اس شخص سے ملنا ہے اسی دن وہ دکھائی دیتا لیکن جس دن وہ گھر سے ارادے کے ساتھ نکلتا کہ آج اس سے بات کرنی ہے تو وہ ناکام ہوجاتا۔ یہی سب کچھ چلتے ہوئے تقریباً ایک ماہ بیت گیا۔

وہ مسلسل ایک ماہ سے اسی سوچ میں تھا کہ آخر وہ ہے کون جو صرف مجھے ہی نظر آتا ہے۔

ایک روز وہ پارک میں اپنے معمول کے مطابق جاگنگ کرتا ہوا اسی جگہ پہنچا تو اسے وہی شخص نظر آیا۔ اس نے سوچے سمجھے اس کا راستہ روک لیا اور اس کے سامنے کھڑا ہوگیا تاکہ اس کی وجہ جان سکے جو اس کے ساتھ مسلسل پچھلے ایک ماہ سے ہو رہا تھا۔

وہ اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر رک گیا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچپن برس ہوگی اس نے اوور کوٹ کے ساتھ اپنے اوپر بڑی سی چادر لپیٹی ہوئی تھی جس نے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

''بابا جی آپ کون ہو؟ روزانہ ہی دکھائی دے کر کہاں غائب ہوجاتے ہو؟'' اصغر نے بنا سوچے سمجھے سوالات شروع کردیے لیکن اس کا جواب سن کر اسے مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس نے سوالوں کے جواب میں صرف ہاں میں سر ہلا دیا تھا۔

اصغر کو اب مزید بے چینی ہونے لگی کیونکہ وہ اس کے منہ سے جواب سننا چاہتا تھا، اس نے پھر اصرار کیا کہ آپ مجھے روزانہ اسی وقت پہ کیوں دکھائی دیتے ہو؟

بزرگ نے ایک بار پھر سوال کے جواب میں سر ہاں میں ہلا دیا۔

اصغر مزید بے چین ہونے لگا اسی بے چینی میں وہ چوتھا سوال کرنے ہی لگا تھا کہ اس کی آنکھیں کھل گئیں، آنکھ کھلتے ہی وہ حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھنے لگا معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں تھا اور الارم بجنے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی، کیونکہ وہ خواب میں اس شخص سے مل رہا تھا جسے وہ مسلسل ایک ماہ سے دکھائی دے رہا تھا اس نے اپنے آپ سے ایک تہیہ کیا کہ آج جو بھی ہوجائے اس شخص سے لازمی ملنا ہے۔

وہ اپنے معمول کے مطابق جاگنگ کے لیے نکل گیا۔ لیکن آج اس کی بے چینی زور پکڑنے لگی کہ آخر وہ شخص صرف مجھے ہی کیوں دکھائی دیتا ہے۔ آج تو خواب میں بھی آگیا تھا جب اصغر اسی جگہ پر پہنچا تو اسے کوئی شخص نظر نہ آیا کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب وہ نہ آیا تو اس نے پھر واپس اپنے گھر کی راہ لی۔ اس نے سوچا چلو وہ تو ملے نہیں پارک میں لگے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں چہل قدمی کی جائے۔ وہ پارک میں داخل ہوگیا جہاں قدرت کے نظارے اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ اس نے سردی میں اپنے جوتے اتار دیئے اور گھاس پہ جمی شبنمی قطروں کو اپنے پیروں پہ محسوس کرنے لگا تھوڑی دیر میں اسے یاد آیا کہ اسے دفتر جانے میں دیر ہو رہی ہے اس نے جوتے پہنے اور پارک سے نکلنے کے لیے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ وہی شخص دوبارہ اس کے پاس سے گزرا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ وہاں پہ موجود نہیں تھا۔

اصغر اسے اپنا وہم سمجھ کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سوچا کہ اس شخص کو مجھ سے کوئی کام ہے جو مجھے وہ بار بار نظر آتا ہے۔

اس نے اپنے دوست ارسلان کو اپنے گھر بلایا اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے جب یہ سنا تو وہ بھی حیران ہوگیا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ارسلان نے اسے سمجھایا کہ یہ کوئی وہم نہیں ہوسکتا یا تو وہ کوئی بہت پہنچی ہوئی شخصیت ہے یا تجھے کوئی بیماری ہے اس لیے تو کسی سائیکاٹرسٹ سے چیک کروا تاکہ اس کا کوئی حل نکلے۔

اصغر اگلے دن جب جاگنگ کرنے گیا تو اسے وہ نہ ملا۔ اس نے پورا پارک دیکھا پارک میں داخل ہونے کے صرف دو دروازے تھے ایک طرف سے وہ خود داخل ہوتا تھا دوسرا اس کی مخالف سمت پہ تھا۔ اس نے پارک کے چوکیداروں سے پوچھ گچھ کی کہ آخر پتا لگایا جائے کہ وہ آخر ہے کون؟ جو صرف اسے ہی نظر آتا ہے۔

اسے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ دونوں چوکیداروں میں سے کسی نے بھی اس عمر رسیدہ شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ اصغر نے بزرگ کا حلیہ وغیرہ سب کچھ بتایا لیکن چوکیدار اصغر کے منہ سے یہ سب سن کر حیران تھے کہ آج تک ہمارے سامنے کوئی ایسا شخص پارک میں داخل نہیں ہوا تو وہ کس کو دیکھتا رہا ہے۔

اصغر پریشان سا اپنے گھر آیا اور دفتر جانے کی بجائے سیدھا اسپتال کی طرف چل دیا اپنا چیک اپ کروانے کے لیے۔

اسپتال پہنچنے سے پہلے اس نے ڈاکٹر سے اپوائمنٹ لے لی تھی۔

ڈاکٹر کامران اصغر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ آخر نوجوان کو کہیں دیکھا ہے لیکن وہ اس پر دھیان نہیں دینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر پوری توجہ سے اصغر کو سننے لگا۔ اصغر نے پوری بات تفصیل سے ڈاکٹر کو بتادی۔ ڈاکٹر صاحب جو پہلے ہی حیرت زدہ تھا اب مزید حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور بے ساختہ اس سے سوال کردیا کہ آپ وہی ہونا جو روزانہ پارک میں جاگنگ کرنے جاتے ہو۔

''جی..... جی ڈاکٹر صاحب میں وہی ہوں۔'' اصغر جو پہلے سے ہی پریشان تھا مزید تجسس سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ڈاکٹر کا سوال سن کر اسے شک ہوا کہ کہیں ڈاکٹر صاحب بھی تو وہ بزرگ نہیں جو اسے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کیسے جانتے ہیں یہ سب کچھ؟ اصغر نے پریشان نظروں سے سوال کیا۔

''اصغر صاحب آپ کو دو تین بار دیکھا تھا پارک کی جانب صبح کے وقت جاتے ہوئے۔ دراصل اسی راستے سے میں اسپتال آتا ہوں۔ آپ کی تصویر میرے ذہن میں نقش تھی لیکن کہاں دیکھا تھا آپ کو یہ یاد نہیں آرہا تھا۔ جب آپ نے اپنے بارے میں بتایا تو میرے ذہن کے نقش میں آپ مکمل طور پر آگئے۔''

ڈاکٹر اپنے نظریے کی مزید وضاحت دیتے ہوئے اصغر کو سمجھانے لگا کہ جو شخص آپ کو دکھائی دیتا رہا۔ وہ نہ تو آپ کا وہم ہے اور نہ وہ کوئی پہنچے ہوئے بابا ہیں۔ سائنسی اعتبار سے اگر اس نظریے کو دیکھا جائے تو یہ ایک بیماری کا نام ہے جس میں انسان کے دماغ میں ایک چیز، انسان یا کوئی جانور جسے اس نے شاید ایک بار دیکھا ہو تو اس کی چھوٹی سی کشش انسانی دماغ کے ایک کونے میں محفوظ ہوجاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس چیز کا نقشہ تیار ہونا شروع ہوجاتا ہے اور پھر وہ چیز یا انسان اس کے سامنے صحیح سلامت بن جاتی ہے، اور یہ بات سچ ہوتی ہے کہ اس کو آپ نے کہیں نہ کہیں دیکھا ہو۔ سائنس نے اس سارے عمل کی تحقیق کرکے اسے ایکوشن نامی بیماری کا نام دیا ہے۔

اصغر حیران کن نگاہوں سے ڈاکٹر کامران کو دیکھے جا رہا تھا اور ان کی باتوں میں مگن تھا۔

ڈاکٹر صاحب مزید اس کی وضاحت دینے لگے۔

''دیکھیں اصغر صاحب پریشان نہ ہوں یہ بیماری صرف آپ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہت سے انسانوں کا مسئلہ ہے۔ اس سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا بس آپ نے تھوڑا زیادہ اس بارے میں سوچنا شروع کردیا جس کی وجہ سے آپ کے دل و دماغ میں وہ عمر رسیدہ شخص چھایا رہا۔ بہت سے لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ جب ہم سو جاتے ہیں تو ہماری روح جسم سے نکل جاتی ہے۔ آپ نے ایک کہاوت تو سنی ہوگی کہ سوئے ہوئے انسان اور مرے ہوئے انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانی روح جب انسان سوتا ہے تو اس کے جسم سے نکل جاتی ہے اور جہاں سے وہ گزرتی ہے وہ چیز یا وہ جگہ انسانی دماغ میں محفوظ ہوجاتی ہے جب انسان اس جگہ اس چیز کے پاس جاتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ میں اس جگہ پہلے آچکا ہوں لیکن حقیقت میں وہ پہلی دفعہ ہی اس جگہ پر آیا ہوا ہوتا ہے، یہ نظریہ زیادہ لوگ نہیں مانتے۔'' ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اصغر کو پانی کا گلاس پیش کیا۔

''ڈاکٹر صاحب کیا اس کا کوئی حل نہیں ہے؟'' اصغر نے سوالیہ نظروں سے ایک بار پھر پوچھا۔

''جی بالکل ہے دنیا میں ہر بیماری کا علاج ہے سوائے موت کے۔ ہم ضرور اس کو حل کریں گے آپ اپنے دماغ کو تھوڑا فریش رکھیں کوئی نئی جگہ وزٹ کریں تاکہ جو نقشہ آپ کے ذہن میں اس پارک کا بن چکا ہے وہ تھوڑا ریفریش ہوجائے تاکہ وہ چیزیں جو آپ نے یہاں دیکھیں تو دوبارہ دیکھنے پر ان کا حسن دوبالا ہوجائے۔''

''ڈاکٹر صاحب کیا میرے جگہ بدلنے سے اس بیماری کا علاج ہوجائے گا؟'' اصغر نے ایک اور سوال کیا۔

''جی بالکل علاج ہوجائے گا۔ اگر انسان ایک ہی جگہ یا ایک ہی شخص کو روزانہ دیکھتا رہے تو وہ اس کے دل و دماغ پر نقش ہوجاتا ہے۔ جگہ بدلنے سے حقیقی طور پر انسان فریش ہوجاتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے بعد اصغر کے ذہن میں جو غبار تھا ختم ہوگیا اب اسے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی اور وہ اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرنے لگا۔

++

چراغِ آزادی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
ارسال کردہ سچ بیانی میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے یہ اس
زخم کی کراہ ہے جو قیامِ پاکستان سے اب تک ٹیس دے رہا ہے۔

تنزیلہ احمد
(اوکاڑہ)

"چنارے کہاں تھیں؟ کھانا نہیں پکایا کیا؟"
کمرے سے نکلتے ہوئے ان کی نظر اس پر پڑی تو پکار کر
کہا۔
"پکا رہی ہوں بی بی۔ بس کچھ دیر میں بنا ہی چاہتا
ہے۔" وہ دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔
"یعنی ابھی وقت ہے۔ آج اتنی دیر کیوں کردی؟"
"زرمینے کی طرف گئی تھی وہاں تھوڑا زیادہ وقت لگ
گیا...... بس ابھی بن جائے گا۔" چہرہ ممکن حد تک جھکاتے
ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔
"تجھے پتا ہے نا آغا جی کو وقت پر کھانا نہ ملے تو ان کی
طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔"
"جی پتا ہے......"
وہ دھیرے سے گویا ہوئی تو انہیں اس کی آواز میں شکستگی
محسوس ہوئی۔ اپنا ٹوٹا چشمہ درست کرتے ہوئے اسے غور سے
دیکھا اور چونک گئیں۔ اس کے عارض پر تو عام دنوں میں بھی
لالی چھلکتی ہے مگر آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے تو کبھی نظر نہ
آئے۔
"میری بچی...... کیا ہوا تیری آنکھیں اتنی کیوں سوجی
ہوئی ہیں؟"
"کچھ نہیں بی بی، بس ایسے ہی...... کافی دیر سے کوشش
کر رہی ہوں۔ لکڑیاں شاید نم ہیں سلگ ہی نہیں رہیں۔ بس
دھواں چھوڑے جا رہی ہیں۔ بہت مشقت کے بعد اب کہیں

جا کر آگ پکڑی ہے۔" بے بسی سے وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔
بوڑھی ماں کو کیسے بتاتی کہ دل سلگ رہا تھا اور آنکھوں
میں ساون بھادوں اتر آیا تھا۔ گرج چمک کے ساتھ ایسا مینہ
برسا کہ اس کا نازک وجود غم کے سیلابی ریلے میں بہتا چلا گیا۔
دکھ بھی تو گمبھیر تھا۔
گزشتہ چند روز سے وادی میں تناؤ کی کیفیت زوروں
پر تھی جب بھی کہیں جھڑپ کی اطلاع ملتی اس کا دل ہولنے
لگتا۔ غاصب فوج نے گزشتہ دو ماہ سے نوجوانوں کی پکڑ دھکڑ کا
سلسلہ دراز کر ڈالا تھا۔ ایک ماہ قبل حراست میں لیے گئے
نوجوان عابد کی تشدد زدہ لاش دو روز پہلے جنگل کے پاس ملی تو
لوگوں کے غم و غصہ کی انتہا نہ رہی۔ گرفتار کیے گئے کم و بیش بھی
افراد غاصب بھارتی فوج کے ہاتھوں انسانیت سوز تشدد کا
نشانہ بنتے تھے۔ فوجی چوکی پر مجاہدین کی طرف سے گزشتہ روز
جوابی کارروائی کی گئی جس میں دو فوجی جہنم واصل ہوئے۔ اس
ذلت کا بدلا انتہا پسند فوج نے آج عابد کی تدفین سے واپس
آنے والوں پر فائرنگ کی صورت لیا تھا جن میں زرمینے کا
بھائی بھی شامل تھا۔
جن روشن آنکھوں میں چنارے نے اپنی شبیہ دیکھی،
اپنے لیے محبت اور کشمیر کی سلگتی وادی کے لیے ہمیشہ آزادی کی
جوت دیکھی وہ اب لہو رنگ تھیں۔ ان میں روشنی کو مات دیتے
ہوئے اندھیرا ڈیرے ڈالنے کو بے تاب تھا۔

☆☆☆

"خود کو غور سے دیکھو۔ اپنے اجڑے روپ، رنگ اور
نوچ کھسوٹے بدن کو دیکھو۔ آفرین ہے کہ ابھی بھی تم میں
میرے مقابل کھڑے ہونے کی ہمت ہے؟ میری طاقت اور
بے رحمی کا مزہ تو خوب چکھ چکی ہو۔ ابھی تک تمہیں یقین ہے کہ
ایک روز تم آزادی سے سانس لوگی؟" اس کے لہجے کا اکھڑپن
اور متکبرانہ الفاظ کافی تلخ تھے مگر وہ ذرا نہیں سہمی تھی۔
"میں جنت ارضی ہوں...... چٹیل پہاڑوں کی قدرتی
فصیل سے گھری سرزمین کے ماتھے کا جھومر...... تم درندے
اور وحشی...... تم نے مجھے نوچا، لہو رنگ کیا، میرے دامن کو داغ
دار کیا، ہر حربہ آزمایا، ہر ظلم ڈھایا مگر میں کمزور نہیں پڑی۔ پوری
قوت سے اپنی شناخت اور برباد ہوتے حسن کی حفاظت کی، ہر
توڑ کوشش کی اور آخری دم تک کروں گی۔" اس نے درد کی
ٹیسیں دباتے ہوئے سر اٹھا کر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔
"جھک جاؤ ورنہ ٹوٹ جاؤ گی۔" وہ غرایا۔
"جھکنا میں نے سیکھا نہیں اور ٹوٹنا میری سرشت میں
شامل نہیں۔ کسی میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ میری حفاظت پر
مامور سنگلاخ پہاڑی سلسلوں کے قدرتی حصار کو سر کر کے مجھے
محکوم بناتا۔ مجھے تو نام نہاد اپنوں نے بے مول کیا۔ خون سے
رنگے ہاتھوں میں مجھے اپنی جاگیر سمجھ کر سونپ دیا۔"
"اس حقیقت پر سر تسلیم خم کرو اور مزاحمت چھوڑ دو۔
تمہاری اپنی اب کوئی شناخت نہیں۔ میری محکوم ہو...... میں
جیسے چاہوں تمہارا استعمال کروں اور جیسے چاہوں سلوک کروں۔"
"میں ارض پاک کے سر کا تاج ہوں۔ کوئی شے نہیں
جیتے جاگتے ان لاکھوں انسانوں کے جینے کی امنگ ہوں، ان
کے زخمی جسموں میں لہو سنگ بہتی اور سانسوں میں مہکتی ہوں۔
تم نے میرے مرغزار اور خوشبو لٹاتے گل پوش میدان اجاڑ
دیے۔ چنار کے درخت جلتے رہے۔ شمشاد اور دیودار نوحہ
کناں ہیں۔ میرے بطن سے پھوٹتے صاف شفاف پانی کے
چشموں کو اپنی کمینگی اور بربریت کی داستانیں رقم کر کے تم نے
آلودہ کر ڈالا۔ دوشیزاؤں کی پاک دامنی کو تار تار کیا۔ جوانوں
کے جوش اور جواں مردی کو للکارا۔ مگر کیا پایا؟"
"تمہیں پایا...... تم میرا حاصل ہو۔ تمہیں پانے کو تو
پاکھنڈ رچایا تھا......"
"نری غلط فہمی...... تم مجھے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ مجھے
لہولہان کر کے سکون سے تو تم بھی نہیں جیو گے۔ تمہارے تمام
وسائل اور لاؤ لشکر بے مول ہو چکے۔ اپنی شکست تسلیم کرتے
ہوئے پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ دنیا میں سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں
رہو گے۔ جو بچی کچی عزت ہے اسے سمیٹو اور رات کے
اندھیرے میں منہ چھپا کر نکل جاؤ۔" اس نے سخت گیر لہجے
میں کہا تو اس کے واہیات فلک شگاف قہقہے گونجے۔ دیکھتے ہی
دیکھتے آگ کی چنگاریاں اس کے پھٹے دامن کو اپنے لپیٹ
میں لینے لگی تھیں۔
"1931ء سے جاری آزادی کی تحریک کو تم طاقت
کے بل پر دبا نہیں سکتے۔ ظلم کے جتنے مرضی پہاڑ توڑ لو میرا
حوصلہ متزلزل نہ ہوگا۔ میرا بچہ بچہ جبر کے خلاف آمادہ بغاوت
ہے۔ آزادی کی تحریک آزادی ملنے تک جاری رہے گی۔" اس
کے چیخنے چلانے کی دل سوز آوازیں واشگاف قہقہوں میں دب
کر رہ گئی تھیں۔
اس خواب نے چنارے کو تڑپا دیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔
اس نے کشمیر کو مجسم دیکھا تھا۔ خوبصورت دوشیزہ کے روپ میں
جس کا انگ انگ خون آلود تھا۔ زخم زخم تھا۔

☆☆☆

لمبی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ گھر کے لیے نکلنے ہی والے تھے کہ ایک میل نرس بھاگتا ہوا آیا۔

"ڈاکٹر صاحب..... جلدی چلیے ایمرجنسی ہے۔"

"اللہ رحم..... کیس کی کیا نوعیت ہے؟"

"تین زخمی نوجوان، پیلٹ گن کا شکار بنے ہیں۔ ایک کی آنکھیں اور دو کے چہرے بری طرح متاثر ہیں....."

"آپریشن کی تیاری کرو میں دو منٹ میں آرہا ہوں۔"

بجلت وہ اسپتال کا لباس پہننے کو بھاگے۔ ڈاکٹر سعید آنکھوں کے جانے مانے سرجن تھے۔

سری نگر کے سرکاری اسپتال ہری سنگھ میں اب تک پیلٹ گن سے متاثر ہونے والے پانچ سو سے زائد کشمیریوں کی آنکھوں سے چھرے نکالنے کے لیے آپریشن کیے جا چکے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں آنکھوں کے ڈاکٹروں کی پہلے ہی کمی تھی اور اب یہ کمی شدت اختیار کرنے لگی تھی۔

2016ء کے بعد سے انتہا پسند فوج نے پیلٹ گن کے اندھا دھند استعمال سے تقریباً تیرہ سو افراد کلی یا جزوی طور پر بینائی سے محروم کر دیے تھے۔ ان میں سے ڈیڑھ سو کے قریب افراد ایسے تھے جن کی دونوں آنکھیں چھرے لگنے سے زخمی ہوئیں اور ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں ڈوب گئیں۔

گزشتہ چند برسوں میں ظالم بھارتی فوج نے نہتے کشمیریوں پر جس طرح پیلٹ گن کا بے دریغ استعمال کیا پوری دنیا میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ امریکا سمیت بھارت میں بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ مگر سوالات اور خدشات کے باوجود بھارت کے بے حس اور انسانیت سے عاری حکمرانوں کے سر پر جوں تک نہ رینگی۔ بھارتی فوج پیلٹ گن سے نہتے کشمیری عوام کے اوپری حصے خصوصاً چہروں کو نشانہ بناتے جس کے باعث اب تک متعدد نوجوان بچے اور عورتیں بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔

بارہ بور کی ایسی بندوق جو جانور اور پرندوں کے شکار کے لیے استعمال ہوتی اس سے مظلوم کشمیریوں کو نشانہ بنایا جاتا۔ پیلٹ گن کے کارتوس میں تین سو سے چھ سو چھرے ہوتے جو کئی میٹر دور تک اپنے ہدف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے۔ 2010ء میں کشمیر میں بدامنی کے دوران انتہا پسند بھارتی فوج نے پیلٹ گن استعمال کی جس کا دل خراش نتیجہ سو سے زیادہ مظاہرین کی موت کی صورت میں نکلا۔

پیلٹ گن سے زخمی ہوئے کشمیریوں کو علاج کے لیے کشمیر کے باہر جانا پڑتا تھا۔ سال بھر قبل بارہ مولہ کے رہائشی کبیر پیلٹ گن سے زخمی ہونے کے بعد دونوں آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ زرمینے کے بھائی کا دوست تھا۔ کبیر کے خاندان کو اس کے علاج کی خاطر کافی رقم کا انتظام کرنا پڑا۔ والد سڑک کنارے ریڑی لگا کر بمشکل گھر چلاتے۔ کبیر کی ماں کو اپنے زیورات بیچنے پڑے، رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے پیسے قرضے لیے تب کہیں جا کر آنکھوں کی سرجری کا انتظام ہو پایا تھا۔ پانچ بار سرجری ہوئی..... سال بھر اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد کہیں جا کر اس کی آنکھوں کی روشنی لوٹی تھی۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کو پیلٹ گن کیا ملیں اس کا غلط استعمال کرتے ہوئے انہوں نے انسانی حقوق کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ "انسانی حقوق" سے یوں بھی انتہا پسند بھارتی فوج اور حکمرانوں کا کوئی واسطہ نہ تھا۔

☆☆☆

"انگ وادیوں نے بارہ مولہ میں سیکیورٹی فورسز کی پر امن چوکی پر گزشتہ روز حملہ کیا تھا۔ حریت پسندوں کی اشتعال انگیز کارروائی میں دو فوجی مارے گئے جب کہ دو شدید زخمی ہوئے۔" یہ خبر ناے کا حصہ تھا اور اس کے ساتھ ایک اور کلپ تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ حریت پسند عابد کی نماز جنازہ سے واپس آتے لوگوں پر پیلٹ گن سے فائرنگ اسی سلسلے کی انتقامی کارروائی بتائی جاتی ہے۔"

موبائل پر چلنے والی ویڈیو دیکھ کر آغا جان نے غصے سے پلنگ سے ملحقہ میز پر مکا مارا۔

"یہ نام نہاد سیکیورٹی فورسز ہی کشمیریوں کی سیکیورٹی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ریاستی دہشت گردی کا شکار ہم ہو رہے ہیں۔ ہماری عزتیں، جان مال آبرو سب داؤ پر ہے اور یہ ہمیں ہی انگ وادی کہتے ہیں۔ کشمیر میں پنپتی آزادی کی تحریک کو جس قدر دبایا جائے گا یہ اتنی ہی شدت سے ابھر کر سامنے آئے گی۔ وادی پر بھارت کے ظالمانہ قبضے کے خلاف احتجاج ہوتا رہے گا۔ بھارت کے آمرانہ اور وحشیانہ قوانین کے خلاف احتجاج کرنے والے مظاہرین گولیاں کھاتے رہیں گے، چھرے لگنے سے زخمی ہوتے رہیں گے۔ اس سب کے باوجود یہ ہمیں ہی دہشت گرد کہتے ہیں۔" آغا جان نے کھل کر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔

دو برس قبل احتجاج کے دوران مظاہرین پر ہوئے تشدد میں وہ اپنی دونوں ٹانگیں گنوا چکے تھے۔

"یا اللہ رحم، چنارے، او چنارے....." آغا جان کی

بات سنتے ہی بی بی نے بیٹی کو آواز لگائی۔

"جی بی بی خیریت" کملائی ہوئی سی وہ وہاں آئی۔

"تم نے بتایا کیوں نہیں کہ آج وادی میں کیا ہوا..... زرمینے کی طرف خیریت سے تو نہیں گئی ہوگی؟" اس کی روئی روئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ کچھ جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"کیا بتاتی بی بی۔ وہ..... وہ زرمینے کے لالہ سمیت چند اور نوجوان چھرے لگنے سے بری طرح زخمی ہیں۔"

"او میرے خدایا..... یہ ظلم اور بربریت تو آئے دن کا معمول ہے۔ کہیں خالد کی آنکھیں....."

انہوں نے زرمینے کے بھائی کا نام لیا اور جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔ جواب میں جس طرح چنارے بلک بلک کر رونے لگی ان کا یقین پختہ ہو گیا تھا۔

"میرے مالک..... ایسا زندگی سے بھرپور جوان۔ تحریک آزادی کا بے لوث سپاہی اور..... اس پر کرم کرنا میرے اللہ....." آغا جان نے یاسیت سے دعا کی اور اس کی سسکیوں میں شدت آگئی۔

وہ سب جانتے تھے کہ پیلٹ گنز لگنے سے بینائی مکمل طور پر چلی جاتی تھی۔ ایسی آنکھیں جنہوں نے دنیا دیکھی ہو، جاگتے میں آزادی کے سہانے سپنے سجائے ہوں وہی آنکھیں اندھیرے میں ڈوبنے لگیں تو قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ ایک لمحے میں زندگی یکسر بدل جاتی تھی۔ جسمانی و ذہنی تکلیف، مایوسی اور ناامیدی میں ایسے ڈوبتے تھے کہ زندگی کی طرف لوٹنا محال ہو جاتا۔

"آپ اپنا دھیان رکھیے گا ہم دونوں زرمینے کی طرف سے ہو کر آتے ہیں۔ ماں بیٹی گھر میں تنہا ہوتی ہیں پریشان نہ ہوگئی ہوں۔" چنارے کے ہاتھ تھامے وہ دونوں پار جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

☆☆☆

"اے میرے مولا ہم بے بس، لاچار اور مظلوم ہیں۔ ہماری مدد کر....." جاء نماز پر وہ دونوں ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے بیٹھی تھی۔ ہچکیاں اور آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ کچھ آنسو شکر گزاری کے اور کچھ انجانے اندیشوں کے زیر اثر بہے جاتے تھے۔

خالد کی آنکھوں کا پہلا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق دو مزید آپریشن کر کے اس کی آنکھوں کو اندھیروں کی نظر ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ یہ تمام عمل بہت اذیت ناک تھا۔

جب سے بھارتی فوج کو خالد سمیت چند اور لڑکوں کے حزب المجاہدین کے ساتھ تعلقات کا اندازہ ہوا انہوں نے گھر گھر چھاپے مارنے اور گرفتاریوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ جہاں نوجوانوں کی جان خطرے میں تھی وہیں لڑکیوں کی عصمتیں داؤ پر لگی تھیں۔ جس گھر میں بھارتی فوجی گھس جاتے ہر طرح کی لوٹ مار مچاتے اور اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کی کئی الم ناک داستانیں چھوڑ جاتے۔

وہ ابھی جاء نماز پر ہی تھی کہ اسے زرمینے کی چیخ نما آواز سنائی دی۔

"چنارے کہاں ہو۔ بی بی..... کوئی ہے؟ فوجی گھروں میں گھس رہے ہیں۔ خود کو بچاؤ، چھپو۔"

بی بی بوکھلا گئیں۔ انہوں نے بجلت ہکا بکا بیٹھی چنارے کو گھسیٹا۔ اسے اور زرمینے کو آغا جان کے کمرے میں دھکیلا۔

وہ جانتی تھیں اب انہیں کیا کرنا ہے۔

خود وہ بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھانے کو بھاگیں۔ کنڈی چڑھا کر وہ باورچی خانے میں گھسیں اور آگ جلانے لگیں۔ کوئی دس ایک منٹ گزرے تھے کہ بیرونی دروازے پر بوٹوں کی ٹھوکروں کی آواز سنائی دی اور دھڑ کی تیز آواز سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔

"رحم میرے مولا..... کیا ہوا..... کیا ہوا....." بوکھلائی ہوئی وہ باورچی خانے سے نکلیں۔

ہاتھ میں چمٹا، منہ پر کالک..... ان کی نظروں کے عین سامنے مکروہ چہروں پر کمینگی سجائے چار مسلح فوجی کھڑے تھے۔

"تیرے گھر میں اور کون کون ہے؟" اکھڑے لہجے میں سوال پوچھنے والا شاید ان کا افسر تھا۔

"میں اور میرا بیمار شوہر ہیں بس۔ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہیں۔ چل پھر نہیں سکتے۔ آج کل زیادہ بیمار ہیں۔ ان کے لیے کھانا بنا رہی تھی....."

"بڑھیا ہم یہاں تیری لن ترانیاں سننے نہیں آئے۔ تیری تو شکل دیکھنے کو بھی من نہیں۔ رام داس اور کمار تم لوگ اندر جا کر گھروں کی اچھی طرح سے تلاشی لو۔ سنا ہے اس گھر میں ایک پری بھی رہتی ہے۔" خباثت سے مسکراتے ہوئے اس نے حکم دیا۔

حکم ملتے ہی چابی کے کھلونے کی مانند دونوں فوجی اِدھر اُدھر ٹھک ٹھک کرنے لگے تھے۔

وہ زیر لب دعائیں پڑھتی رہیں۔ ہر گزرتا لمحہ ان پر اور

اندر موجود تین جانوں پر بھی بھاری تھا۔ برتن گرنے کی آواز پر وہ سہمیں۔ اندر بھاگنے کی کوشش کی تو اسے بندوق دکھا کر وہیں رکنے کا اشارہ کیا گیا۔

پانچ سات منٹ میں ہی دونوں سپاہی جیسے دندناتے ہوئے اندر گھسے ویسے ہی خالی ہاتھ باہر آ گئے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل شکر کا کلمہ پڑھا جب کہ افسر کا منہ اتر گیا۔

"سر بڑھیا سچ کہہ رہی تھی۔ اندر بس اس ایک بوڑھا پڑا ہے...... تکلیف سے کراہ رہا تھا۔"

"حرام خورو...... تقریر بند کرو...... یہ بتاؤ اچھے سے چیک کیا ہے؟ کوئی کونا کھدرا رہ تو نہیں گیا......"

"نہیں سر!" ایک اہلکار بولا۔

افسر نے آنکھیں دکھائیں تو وہ گڑبڑا گیا۔ "میرا مطلب تو سر...... اور کوئی نہیں ہے......"

"اے بڑھیا گھر میں کوئی خفیہ کمرا تو نہیں۔ اگر ملا تو یاد رکھ تیری چمڑی ادھیڑ کر تجھے وہیں گاڑ دوں گا۔ وہ حالت کروں گا کہ نہ جیے گی نہ سکون سے مرے گی۔"

بی بی کی طرف پلٹ کر وہ درندہ غرایا تو انہوں نے بھدے رنگ کی شرٹ پہ لگی اس کے نام کی چھوٹی سی تختی کو بغور دیکھا۔

"چلو یہاں مزید رکنے کا فائدہ نہیں۔" ہوا کے گھوڑے پر سوار وہ جیسے آئے ویسے ہی باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی بی بی نے بیرونی دروازہ بند کیا اور زیر لب "شنکر" کہا۔ رام داس اور کمار وہ نام بھی انہیں یاد تھے۔

آغا جان کے بستر کے نیچے چھوٹا سا تہہ خانہ تھا جو چند برس قبل انہوں نے ہنگامی طور پر کھدوا تھا۔ زمین کے اوپر لکڑی کا پھٹا اور اس کے اوپر دری بچھی رہتی۔ اسی دری پر آغا جان کا پلنگ تھا۔ وہ دونوں گھٹنوں کے بل سانس روکے تہہ خانہ میں بیٹھی دعاؤں کا ورد کرتی رہیں۔ ایک عزت ہی تھی ان کے پاس جس کی حفاظت انہیں جان سے بھی پیاری تھی۔

فوجیوں کو گئے پندرہ منٹ گزر گئے تو انہیں یقین ہوا کہ اب وہ دور نکل گئے ہوں گے۔ انہوں نے آواز لگائی۔

"پریشان نہ ہو، بس ابھی کھانا لائی......"

اندر موجود تینوں افراد سمجھ گئے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔

رات گئے انہیں کئی دل خراش خبریں ملی تھیں۔ کئی نوجوان گرفتار کیے گئے اور چند نوجوان لڑکیاں بھی غائب تھیں۔ انہوں نے تو اپنی چنارے اور زرمینے کو بچا لیا تھا مگر...... وادی کی کئی اور چنارے اور زرمینے بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔

ان دو خاندانوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ چنارے خالد کی منگیتر ہے۔ جب کہ زرمینے کی نسبت چنارے کے اکلوتے بھائی علی سے طے تھی۔ علی دو برس قبل فسادات کے دوران انتہا پسند فوج کی فائرنگ سے شہید ہو گیا تھا۔

☆☆☆

لاکھوں کشمیریوں کو شہید کیا گیا تھا۔ ہزاروں کشمیری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی دانستہ طور عصمت دری کی گئی تھی۔ بچوں اور بوڑھوں کو انسانیت سوز وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا مگر کئی دہائیوں کے بعد بھی شدت پسند بھارت کشمیریوں کے دلوں سے آزادی کے جذبے کو نہیں نکال سکا تھا۔ نہتے کشمیریوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ تو کئی دہائیوں سے ٹوٹتے آئے تھے مگر برہان وانی کی شہادت نے چراغ آزادی کی لو کو اپنے لہو سے ایسی جلا بخش دی تھی کہ اب طاقت کے زور پر انتہا پسند فوج نہ کبھی چراغ آزادی بجھا سکتی تھی۔ اور نہ ہی صبح نو کو طلوع ہونے سے روک سکتی تھی۔

خصوصی اختیارات کے ایکٹ کے تحت کشمیریوں پر بھارتی انتہا پسند فوج وحشیانہ تشدد کرتی۔ زیر حراست اموات کے بعد جنازے دفنانے اور تعزیت کے لیے شہید کے گھر جانے کی اجازت بھی نہ دی جاتی۔

خالد سمیت نوجوانوں کا زخمی ہونا، پھر گھر گھر تلاشی اور عصمت دری کے واقعات سامنے آنے پر اذیت کا شکار کشمیری ریاستی ظلم، جبر و استبداد کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بچے بوڑھے عورتیں ہاتھوں میں پتھر تھامے سڑکوں پر سیلابی ریلے کی صورت امڈ آئے۔ نعرے بازی کرتے ہوئے ایسی سنگ باری کی کہ بزدل گھبرا گئے۔ ان کی حفاظتی شیلڈ بھی کام نہیں آئی تھیں۔

کئی مظاہرین زخمی ہوئے مگر ان کا جوش و جذبہ قابل ستائش تھا۔ غاصب فوج تمام تر سیاسی، سماجی اور فوجی وسائل کو بروئے کار لانے کے باوجود مزاحمت کو دبانے میں مکمل طور پر ناکام رہی تھی۔ زخمیوں کو اسپتال لے جانے کی بجائے جیلوں میں ڈالا جاتا مگر انہیں حراست کا کوئی خوف نہ تھا۔

دو دن بعد کا سورج چڑھتے ہی وادی میں خبر پھیل گئی کہ حریت پسندوں نے جوابی کارروائی میں رات کو ایک بھارتی افسر کو تین اہلکاروں سمیت جہنم واصل کر دیا۔

بھارتی افسر کا نام شنکر بتایا جاتا تھا......

++

سوتیلی ماں

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

میں کہانی کار نہیں ہوں۔ ہاں کہانی پڑھنا ضرور پسند ہے۔ پہلی بار کہانی لکھی ہے جو میری اپنی ہے۔ مجھے یقین ہے قارئین کو پسند آئے گی۔

ڈاکٹر اجالا محمود
(کراچی)

میں اجالا ہوں۔ اجالا محمود۔ میں کراچی میں پیدا ہوئی اور اس وقت میں نے جنم لیا جب ابا اقبال محمود اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر دوستوں کے اصرار پر کراچی آ چکے تھے۔ ان کے دوستوں نے انہیں بتایا تھا کہ کراچی دبئی سے کسی طرح کم نہیں ہے ابا ان کے بہلاوے میں آ گئے اور آبائی سرزمین چھوڑ کر کراچی آ گئے لیکن یہاں آ کر انہیں معلوم ہوا کہ جو کچھ انہیں بتایا گیا تھا وہ صرف خواب تھے۔

آبائی علاقہ میں کچھ زمینیں ابا کو ورثہ میں ملی تھیں اور ان پر کھیتی باڑی کر کے کسی نہ کسی طرح گھر کا خرچ چلا لیا کرتے تھے۔ کراچی پہنچ کر جب ابا پر حقیقت آشکار ہوئی تو

انہوں نے محنت مزدوری کر کے پیٹ کا دوزخ بھرنا شروع کردیا۔ جن دوستوں نے ابا کو سہانے خواب دکھائے تھے ابا نے ایک ایک کر کے ان سب سے تعلق ختم کرلیا۔ ابا کو خواب دکھانے والوں نے بہت کوشش کی کہ ابا ان کے قریب ہی رہیں لیکن وہ ان کی بڑی گاڑیوں کی حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے اس لیے انہوں نے انہیں خیرآباد کہنے میں ہی بہتری سمجھی تھی۔ اسی دوران میں پیدا ہوگئی۔ میری پیدائش کے وقت ابا ایک پیٹرول پمپ پر نوکری کررہے تھے جس کے مالک کا تعلق بھی ہمارے ہی علاقہ سے تھا۔ وہ بہت شریف شخص تھے اور لوگ انہیں حاجی صاحب کے نام سے بلاتے تھے۔ حاجی صاحب اپنے ملازمین سے خوش نہیں رہتے تھے، کسی محنتی اور ایماندار شخص کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اپنے کئی جاننے والوں سے اس کا ذکر کیا تھا۔ انہی میں سے ایک کی سفارش پر حاجی صاحب نے ابا کو ملازمت دے دی۔ میری پیدائش پر حاجی صاحب ہمارے گھر آئے اور ابا کی تنخواہ میں پانچ سو کا اضافہ کرنے کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہزار ہزار کے دو نوٹ بھی تھما دیے تھے جو اس زمانے میں کافی بڑی رقم تھی۔ حاجی صاحب آتے ہوئے مٹھائی کا ٹوکرا بھی لائے تھے جو ابا نے پڑوسیوں میں تقسیم کروادیا لیکن وہاں سے جو باتیں سننے کو ملیں اس نے ابا کو رنجیدہ کردیا تھا۔

"بیٹی کی پیدائش پر بھی کوئی مٹھائی بانٹتا ہے۔" پڑوسیوں نے کہا تھا لیکن ابا صرف یہ کہہ کر خاموش رہے تھے: "بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے میرے گھر کو اللہ نے رحمت کے قابل سمجھا ہے تو میں کیوں نہ خوش ہوں اور آپ سب کو اس میں شریک کروں۔"

میں تین سال کی ہوئی تو ابا جو اب تک پیٹرول پمپ پر نوکری کررہے تھے انہیں سرکاری اسکول میں نوکری مل گئی۔ ابا پہلے بھی فجر کی نماز پڑھ کر پیٹرول پمپ جاتے تھے جہاں سے وہ کبھی بھی رات سے پہلے گھر نہیں آتے تھے۔ اسکول میں چوکیدار کی نوکری کے بعد بھی ان کا یہی معمول رہا۔ وہ فجر کی نماز کے بعد اسکول جاتے اپنی نگرانی میں کلاسوں کی صفائی کرواتے البتہ شام سے پہلے گھر آجاتے تھے۔ میں نے سکینہ کا نام پہلی بار ان کی زبانی ہی سنا تھا۔ سکینہ اس اسکول کی ہیڈمسٹریس تھیں جہاں ابا چوکیدار تھے۔ ابا کی زبانی ہی مجھے سکینہ کے گھریلو حالات سے بھی واقفیت ہوئی۔ ابا جب رات میں اماں سے دن بھر کی مصروفیات کا ذکر کرتے تو کچھ باتیں میرے کانوں میں بھی آجاتی تھیں۔

"ہیڈمسٹریس صاحبہ تو بہت اچھی ہیں لیکن ان کا شوہر عجیب شخص ہے ہر بات پر شک کرتا ہے۔" ایک روز ابا نے بتایا۔ "ہیڈمسٹریس صاحبہ کے شوہر نے اسکول میں بیوی پر ہاتھ اٹھایا اور جب میں نے اسے ایسا کرنے سے روکا تو مجھ سے الجھ پڑا تھا۔"

"بات کیا ہوئی تھی۔" اماں نے سوال کیا تو ابا بولے۔ "ایک اسٹوڈنٹ کے والد آئے تھے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ان کی بچی کو ہیڈمسٹریس صاحبہ نے اپنے پرچہ میں فیل کر کے زیادتی کی ہے۔ سکینہ صاحبہ نے اس بچی کے پرچے ان کے سامنے رکھے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میری بجائے آپ ہوتے تو آپ ان جوابات پر کتنے نمبر دیتے۔ ابھی ہیڈمسٹریس صاحبہ ان صاحب کو یہ سمجھا ہی رہی تھیں کہ ان کے شوہر آگئے اور آتے ہی برہم ہوگئے۔ "گھر سے کہہ کر آتی ہے کہ نوکری پر جارہی ہوں اور یہاں یہ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔" انہوں نے کہا۔ میڈم سکینہ وضاحتیں دینے لگیں تو ان کے شوہر فرید برہم ہوتے چلے گئے بات اس وقت بالکل ہی ہاتھ سے نکل گئی جب لڑکی کے والد نے کہا۔ "مجھے اپنی بچی کی کمزوری کا علم ہے اور میں چاہتا تھا کہ آپ میاں بیوی بچی کو ٹیوشن پڑھا دیں۔"

اس پر ان کا شوہر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "ٹیوشن کے نام پر عیاشی یہ میں نے پہلی بار سنا ہے۔"

اس پر میڈم سکینہ نے کہا۔ "بس اب بہت ہوگیا۔"

یہ سنتے ہی ان کے شوہر نے ایک زوردار تھپڑ مارا اور یہ کہتے ہوئے چلا گیا۔ "میں نے تمہیں طلاق دی...... طلاق دی...... طلاق دی۔" میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے دھکا دے کر کہا۔ "تو بھی اس کاروبار میں برابر کا شریک ہے۔" اور پھر بھنبھناتے ہوئے وہ چلے گئے۔

یہ تمام داستان ابا نے اماں کو سنائی اور اماں اس کہانی سے لاتعلق سی رہیں اور سوال کیا۔ "بچے ہیں ان کے۔" اس پر ابا نے نفی میں جواب دیا۔

"مجھے میڈم سکینہ سے ہمدردی ہوئی تھی لیکن میں نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔"

"اگلے روز ابا مجھے اسکول لے گئے مگر میڈم سکینہ نہیں آئی تھیں دیگر ٹیچرز سے معلوم ہوا کہ انہوں نے چھٹیوں کے لیے اپلائی کردیا ہے۔ اس رات کے بعد میرا میڈم سکینہ کو دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا بہت جی چاہنے لگا۔ چار

مہینے اسی انتظار میں گزر گئے پھر ایک روز ابا نے مجھے صبح تیار ہونے کے لیے کہا اور ہم حاجی صاحب کے پیٹرول پمپ پہنچ گئے۔ حاجی صاحب وہاں موجود تھے۔ ابا نے ان سے میرا تعارف کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا۔ "وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا۔"

اس کے بعد ہم حاجی صاحب کی بڑی سی کار میں بیٹھے اور بڑی سی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ وہیں پر میں نے میڈم سکینہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر کچھ دیر میں ابا اور میڈم سکینہ کی نکاح کی تقریب ہوئی۔ نکاح کے بعد میڈم سکینہ نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور پہلا سوال کیا۔ "اسکول جاتی ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو اگلا سوال کیا۔ "کیوں؟"

میں نے جواب طلب نظروں سے ابا کو دیکھا لیکن ابا کے جواب سے پہلے ہی میڈم سکینہ نے کہا۔ "اقبال تمہاری بچی ہے تو بہت پیاری تم اسے اسکول نہیں بھیجتے۔" ابا سے کوئی جواب نہ بن سکا تو انہوں نے کہا۔ "میڈم چپراسی کی تنخواہ میں اسکول بھیجنا ممکن نہیں ہے۔" ابا کا جواب سن کر وہ مسکرا دی تھیں۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں بچیوں کی تعلیم کا احساس ہی نہیں ہے۔" میڈم سکینہ نے کہا اور ابا خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

وہاں سے نکل کر ہم ایک بار پھر حاجی صاحب کی کار میں بیٹھے اور حاجی صاحب ہمیں لے کر ہمارے گھر پہنچے تو اماں نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا جسے حاجی صاحب نے بمشکل ٹھنڈا کیا۔

"کیا کمی تھی مجھ میں جو تم نے اس چڑیل کو بیوی بنادیا۔" اماں نے کہا اور اس کے بعد ان کے کوسنے شروع ہوگئے۔

حاجی صاحب نے سمجھایا کہ اقبال نے کوئی غیر شرعی کام نہیں کیا ہے ایک مظلوم عورت کو سہارا ہی دیا ہے۔

"اس منحوس کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ میں نے کس تنگ دستی میں اس کے ساتھ گزارا کیا ہے۔" اماں خاموش ہی نہیں ہورہی تھیں۔

ہمارا دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا جس کے باہر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اماں نے سوتن کو اپنا کمرا دینے سے انکار کردیا تو میڈم سکینہ میرے کمرے میں چلی گئی جہاں ایک سنگل بیڈ تھا۔

وہ رات میں نے صحن میں مچھروں کے ساتھ گزاری تھی کیونکہ اماں نے اس نکاح میں شرکت کرنے کے جرم میں میری چارپائی بھی کمرے سے باہر کردی تھی۔ اگلی صبح ابا فجر کی اذان کے ساتھ ہی مسجد چلے گئے تھے اور واپسی پر اسکول جاتے ہوئے وہ میڈم سکینہ کو ساتھ لے گئے تھے اماں نے کرید کرید کر مجھ سے معلومات لینی شروع کی کہ کیا ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے بھی اسکول جانے اور تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا اور میں نے ابا سے اس کا کئی بار ذکر بھی کیا مگر ابا کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ "ہمارے قبیلے میں کوئی لڑکی اسکول نہیں جاتی۔ زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھ لیتی ہے۔" مگر میڈم سکینہ کی آمد کے بعد مجھے ایک موہوم سی امید پیدا ہوچلی تھی۔ پھر اس امید کو پورا ہونے میں چوبیس گھنٹے بھی نہیں لگے۔ میڈم سکینہ نے ابا پر نہ جانے کیا جادو کیا تھا کہ رات میں ہی ابا نے مجھ سے کہا۔ "اجالا صبح تم بھی تیار ہوجانا اور ہمارے ساتھ ہی اسکول جانا۔"

ابا کا یہ چھوٹا سا فقرہ اماں کے لیے ایٹم بم سے کم نہیں تھا انہوں نے شور مچانا شروع کردیا تھا۔ "بے شرم تمام روایتیں بھول رہا ہے۔" مگر ابا خاموش رہے تھے شکر ہے کہ یہ جھگڑا پشتو میں ہورہا تھا اور میڈم سکینہ پشتو سے پوری طرح نابلد تھیں۔

اگلی صبح میں ابا اور آنٹی سکینہ کے ساتھ اسکول چلی گئی۔ میں انہیں امی کہنا چاہتی تھی لیکن اماں کا خوف ایسا تھا کہ میں نے آنٹی پر اکتفا کیا تھا۔

واپسی پر آنٹی نے ابا سے سوال کیا۔ "یہ پلوشہ تمہاری رشتہ دار ہے۔"

ابا نے کہا۔ "میرے چاچا کی بیٹی ہے۔"

"خاندان میں اسی طرح کی بے جوڑ شادیاں زبردستی کردی جاتی ہیں۔" آنٹی نے کہا اور جب میں نے اپنے ننھے ذہن پر زور دیا تو مجھے آنٹی سکینہ کا فقرہ سو فیصد صحیح لگا تھا۔ ابا ایک چھ فٹ کے گھبرو جوان تھے جبکہ اماں تھوڑے بھاری جسم کی سیاہی مائل تھیں۔ یہ بات البتہ ان کی صحیح تھی کہ چاہے جیسے بھی حالات رہے ہوں انہوں نے ابا کے ساتھ گزارا کیا تھا۔ بے جوڑ شادی اس حوالے سے بھی تھی کہ ابا اپنے آبائی علاقہ میں آٹھویں جماعت پاس کر کے آئے تھے اور وہ اردو پڑھ لیتے تھے لیکن اماں نے اسکول صرف باہر سے دیکھا تھا۔ میڈم سکینہ بھی کوئی حسینہ عالم نہیں تھی۔ وہ چھریرے بدن اور اوسط سے کچھ لمبی خاتون تھیں ان کا رنگ بھی کوئی زیادہ صاف نہیں تھا لیکن کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا۔

ان کا آبائی گاؤں لاڑکانہ کے پاس تھا جہاں سے وہ کراچی شفٹ ہوئی تھیں اور بی اے کرنے کے بعد اسکول ٹیچر تعینات ہوئی تھیں اور ترقی کرتے ہوئے ہیڈ مسٹریس ہوگئی تھیں۔ ان کی شادی اپنے ماموں زاد سے لاڑکانہ میں ہی ہوئی تھی۔

ایک قدر مشترک لاڑکانہ سے وزیرستان تک یہ تھی کہ مجھے تیسری جماعت میں داخلہ دیا تھا۔ ابتدا میں کچھ مشکل آئی لیکن سکینہ آنٹی کی وجہ سے دوسری ٹیچرز نے مجھ پر خصوصی توجہ دی اور چھ ماہ بعد میں کلاس کی بہترین طالبہ بن گئی پھر جب سالانہ امتحان ہوئے تو میں نے ٹاپ کیا تھا۔

پہلی رات میں نے برآمدہ میں مچھروں کے ساتھ گزاری تھی لیکن اگلی ہی شام اماں نے میری چارپائی دوبارہ وہیں پہنچادی تھی جہاں اس سے پہلے ہوتی تھی۔ پورا مہینا اسی طرح گزرا تھا کہ اماں سکینہ آنٹی سے بلاضرورت کوئی بات نہ کرتی تھیں مگر جب مہینا بعد ابا اور سکینہ آنٹی کی تنخواہیں آئیں تو اماں کے رویہ میں فرق آگیا تھا۔ سکینہ آنٹی کی تنخواہ ابا سے پانچ گنا تھی۔ ابا کے ساتھ انہوں نے بھی اپنی تنخواہ اماں کے ہاتھ پر رکھ دی تھی اور ساتھ ہی کہا۔ ''باجی میں آپ کی سوکن نہیں بلکہ چھوٹی بہن بن کر آئی ہوں گھر کا تمام انتظام آپ کے ہی ہاتھ میں رہے گا میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ اس رات پہلا موقعہ تھا جب اماں رات کے کھانے میں ہمارے ساتھ شریک ہوئی تھیں ورنہ اس سے پہلے وہ اپنا کھانا اپنے کمرے میں لے جاتی تھیں۔ ایک کام سکینہ آنٹی نے یہ کیا کہ ابا کو حاجی صاحب کے پیٹرول پمپ پر دوبارہ سے کام دلوادیا۔ ابا اب دن میں اسکول کی نوکری کرتے وہاں سے فارغ ہو کر مجھے اور سکینہ آنٹی کو گھر چھوڑتے اور پیٹرول پمپ چلے جاتے جہاں سے بھی وہ رات گئے اور کبھی سویرے آتے تھے۔ اماں اس پر کچھ دن تو جزبز ہوتی رہیں لیکن ابا کا معمول جاری رہا انہوں نے اماں کی اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی کہ ''کچھ تو اپنی صحت کا بھی خیال کرو صبح کے گئے رات میں دیر سے آتے ہو۔ آرام کہاں ملتا ہوگا۔'' مگر چار ماہ بعد یہ راز کھلا کہ ابا جو رات میں پیٹرول پمپ پر ڈیوٹی دیتے تھے اس کی تنخواہ حاجی صاحب کے پاس جمع ہوتی تھی جس سے بعد... ابا نے رکشا خرید لیا تھا۔ ایک اور تبدیلی یہ آئی کہ ہم نے اس نواحی بستی سے گھر تبدیل کرلیا تھا۔ یہ مکان ایک نسبتاً بہتر آبادی میں تھا۔ مکان حاجی صاحب کا ہی تھا اور انہوں نے بغیر ایڈوانس اور معقول کرائے پر دیا تھا لیکن اسکول وہاں سے کافی فاصلہ پر تھا مگر ہمیں اب فاصلوں سے اتنا فرق نہیں پڑتا تھا۔ ابا نے رکشا چلانا شروع کردیا تو سکینہ آنٹی نے اسکول کی ہی کچھ لڑکیوں کو اسکول پہنچانے اور واپس گھر چھوڑنے کی ذمہ داری بھی ابا کو دے دی۔ یہ آمدنی کا بھی ایک بڑا ذریعہ تھا۔ ابا ہر صبح گھر سے نکلتے اور لڑکیوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آتے اور مجھے اور سکینہ آنٹی کو اسکول لے جاتے پھر واپسی پر لڑکیوں کو چھوڑ کر ہمیں لیتے اور گھر آجاتے، کھانے سے فارغ ہو کر دوبارہ سے رکشا لے کر نکل جاتے اور پھر رات تک آتے۔ نئے گھر میں زیادہ کمرے تھے۔ دو بیڈ روم نچلی منزل پر اور ایک بیڈ روم اور ہال اوپری منزل پر تھا اماں نے اپنا سامان نچلی منزل میں رکھا تھا اور آنٹی نے اپنے لیے اوپر کی منزل کا انتخاب کیا تھا۔

غربت کے اندھیرے اب ہمارے گھر سے دور ہو چکے تھے۔ اب کبھی کبھی ہمارے یہاں گوشت بھی پکنے لگا تھا ورنہ دال اور سبزی ہی نصیب ہوتی تھی۔ اگرچہ کہ اماں کے بھائیوں نے ابا کی دوسری شادی کے بعد زمین کی آمدنی بھیجنا بند کردی تھی۔ سود والا نانا اور کھانا بنانا ہمیشہ سے اماں کے ذمہ تھا جس میں انہوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ نئے گھر میں منتقل ہونے کے ساتھ اماں میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ اب ان کا رویہ سکینہ آنٹی سے بھی بہت بہتر ہوگیا تھا۔ اب انہوں نے سکینہ آنٹی کو جلی کٹی سنانا بھی بند کردیا تھا۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں تھی جب اماں نے اسکول سے واپسی پر مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''یہ تم سکینہ کو آنٹی کیوں کہتی ہو۔'' ان کا سوال سن کر میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

''پھر کیا کہوں؟'' میں نے جواب میں سوال کردیا۔

''وہ تمہارے ابا کی بیوی ہیں بالکل میری طرح۔''

اماں نے جواب میں کہا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''مجھے اگر تم اماں کہتی ہو تو انہیں امی تو کہہ سکتی ہو۔'' اماں نے کہا۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ میں بھی انہیں امی ہی کہنا چاہتی ہوں لیکن آپ کی ناراضگی کے خوف سے میں انہیں

آج تک آنٹی کہتی رہی تھی لیکن میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نہیں جانتی کہ اماں میری بے زبانی کی زبان سمجھ سکی یا نہیں لیکن اس روز سے میں نے سکینہ آنٹی کو ''امی'' کہنا شروع کردیا تھا۔ اس شام میں نے ابا سے بھی اس کا ذکر کیا تو وہ مسکرا دیئے تھے۔

''اس بات پر میں تمہیں، تمہاری امی اور اماں کے ساتھ سمندر لے جاؤں گا۔'' ابا نے کہا تھا پھر اگلے روز میں، اماں اور امی ابا کے ساتھ پہلی بار ابا کے رکشے میں کلفٹن گئے تھے۔

اماں اور ابا تو کنارے پر ہی رہے تھے لیکن میں اور امی لہروں سے خوب لطف اندوز ہوتے رہے۔ گھر سے چلتے ہوئے امی نے اپنا اور میرا ایک ایک جوڑا شاپر میں رکھ لیا تھا پھر ہم دونوں نے سمندر کے کنارے بنے گھر میں جا کر گیلے کپڑے تبدیل کیے اور واپس چل دیئے ابا ہمیں برنس روڈ لے گئے جہاں ہم نے منکے والے دہی بڑے اور چاٹ کھائی اور رات کے لیے نہاری پیک کروا کر گھر آگئے۔

میں نویں جماعت میں آئی تو امی نے میرے لیے سائنس کے مضمون کا انتخاب کیا جس پر ابا کو بھی اعتراض نہ تھا بلکہ انہوں نے یہ کہہ کر ہمت بڑھائی کہ ''میرے بیٹی ڈاکٹر بنے گی۔''

امی نے اس پر آمین کہا اور ساتھ ہی کہا۔ ''اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور میں اور آپ اجالا کو ڈاکٹر بنتا دیکھ سکیں۔''

وہ امی کی خواہش تھی لیکن پوری اس لیے نہیں ہو سکی کہ میرے میٹرک کے امتحان شروع ہونے والے تھے کہ ابا کو ایک موٹر سائیکل پر سوار افراد نے گولیوں کا نشانہ بنادیا۔ اتفاق سے یہ واقعہ ایک بینک کے قریب ہوا تھا بینک کے چوکیدار نے رکشا پر فائرنگ کرنے والوں کو نشانہ بنایا اور موٹر سائیکل پر جو پیچھے بیٹھا تھا وہ اس کا نشانہ بن گیا۔ موٹر سائیکل چلانے والا فرار ہوگیا لیکن آٹھ گھنٹے کے اندر گرفتار ہوا۔ اماں کو خبر ملی تو وہ گرفتار ہونے والے سے ملنے اسپتال سے سیدھی تھانے پہنچی تھیں۔ وہ کوئی اور نہیں اماں کا سگا بھائی تھا۔ اماں نے اس سے سوال کیا کہ تم نے یہ قتل کیوں کیا تو اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہماری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اقبال دوسری شادی کر کے عیاشی کرے اور ہماری بہن شوہر کے غم میں سسکتی رہے۔''

''مگر ابا نے تو چودہ برس پہلے شادی کی تھی آپ کی غیرت چودہ برس بعد ہوش میں آئی۔'' میں نے کہا۔

ماموں نے اماں سے سوال کیا۔ ''یہ کون ہے؟''

''یہ اجالا ہے ہماری بیٹی اب میٹرک میں ہے۔'' اماں کا جواب تھا۔

''اسکول جاتی ہے تبھی تو اس میں شرم وحیا نام کی چیز نہیں ہے اسے اسکول میں کوئی نہیں پڑھا رہا کہ بڑوں سے کس طرح بات کرتے ہیں۔'' ماموں نے کہا۔

''اسکول میں یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ باپ کے قاتل کو کس طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔'' میں نے جواب میں کہا تو ماموں سٹپٹا کر رہ گئے۔

پولیس نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ امی کے پہلے شوہر نے ان کی غیرت پانچ لاکھ میں بیدار کی تھی۔ پولیس نے رؤف یعنی امی کے پہلے شوہر کو بھی گرفتار کرلیا تو اس نے بتایا کہ اس نے جب سکینہ کو طلاق دی تو اس کا خیال تھا کہ ایک طلاق یافتہ خاتون سے کوئی بھی شادی پر راضی نہیں ہوگا اور سکینہ در بدر کی ٹھوکریں کھائے گی لیکن جب میں نے ساحل سمندر پر اسے اپنے شوہر اور شوہر کی پہلی بیوی کے ساتھ خوش دیکھا تو میرے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ رؤف نے مزید بتایا کہ سکینہ کو طلاق دینے کے بعد اس نے ایک کم عمر اور ماڈل لڑکی سے شادی کی تھی لیکن سال بھر کے اندر اس نے مجھے کنگال کردیا۔ ہزاروں روپوں کی ہر ہفتے میک اپ اور کپڑوں کی شاپنگ بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ رؤف نے بتایا کہ مونا یعنی اس کی دوسری بیوی میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اعلیٰ درجے کی پھوہڑ تھی۔ کھانا بنانے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ روزانہ وہ کے ایف سی یا میکڈونلڈز سے ڈیل منگوا کر گزارہ کرتی تھی۔ پارٹی پر کیٹرنگ کو آرڈر دیا جاتا تھا اور ہر ہفتہ یا پندرہ روز میں وہ اپنے گھر پر پارٹی ضرور ارینج کرتی تھی۔ جہاں اسی کی طرح خواتین اور مرد مدعو ہوتے تھے جن کی سب سے بڑی تفریح یہ ہوتی تھی کہ وہ سب مل کر میرا مذاق اڑائیں اور مونا کی تعریفیں کریں کیونکہ مونا کی کمزوری اپنی تعریف سننا تھی۔ بقول رؤف یہ پارٹی ہوتی ہی اس لیے تھیں کہ ''آؤ ہم سب مل کر میری تعریف کرو۔''

ان حالات سے تنگ آکر میں نے مونا کو طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا لیکن ہوا یہ کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے فیصلہ پر عمل کرتا مونا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ میں تھانے گیا کہ میری بیوی زیور لے کر گھر سے چلی گئی ہے لیکن دو روز بعد مونا کا فون آگیا۔ ''رؤف میں ہیوسٹن سے بول رہی ہوں اور عادل کے ساتھ رہ رہی ہوں تم مجھے طلاق دے

دو تو ٹھیک ہے ورنہ میں نے خلع کے لیے اپلائی تو کر ہی دیا ہے۔"

ابا کے قتل کے بعد ہمارا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی ختم ہوگیا تھا لیکن امی نے اس کا حل یہ نکالا کہ گھر پر ٹیوشن دینی شروع کردی خود ان کی اپنی ریٹائرمنٹ میں ابھی ڈیڑھ سال باقی تھا۔ ابا کی کمی ٹیوشن سینٹر نے پوری کردی تھی۔ میں نے بھی ان کی مدد کرنی شروع کردی۔ میٹرک میں نے اچھے نمبروں سے پاس کیا تو امی نے سمجھایا۔ "بس یہ دو برس محنت اور کرلو پھر زندگی میں آرام ہی آرام ہے۔"

میں نے دو سال دل لگا کر تعلیم پر توجہ دی اور انٹر سائنس میں میری پوزیشن آگئی جس کے بعد آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔

ابا کا کیس پانچ برس چلا۔ اس دوران اماں نے اپنی ممکنہ حد تک امی اور مجھ پر دباؤ ڈالا کہ ہم ان کے بھائی کو معاف کردیں۔ انہوں نے خود بھائی کو معاف کرنے کا الفی ڈیوٹ عدالت میں جمع کروادیا تھا لیکن عدالت نے اسے تسلیم نہیں کیا کہ سرکاری طور پر ان کے علاوہ ابا کے دو وارث اور بھی تھے یعنی میں ان کی بیٹی اور سکینہ ان کی بیوی۔ پانچ برس بعد عدالت نے فیصلہ سنادیا۔ ماموں کو سزائے موت اور جرم پر اکسانے کے جرم میں رؤف کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

رؤف نے جاتے جاتے ایک اچھا کام یہ کیا کہ اپنا گھر اور کار کا شوروم اپنی پہلی بیوی کے نام کرکر گیا۔ اماں بھائی کی سزا کاٹنے کے بعد چھ ماہ ہی زندہ رہ سکی تھیں۔ ایک رات وہ سوئیں تو سوتی رہ گئیں۔ ان کی تدفین پر میرے اور امی کے علاوہ کوئی نہیں تھا ہم دونوں میں زیادہ رونے کا مقابلہ ہوا تھا جس میں اپنی ہار کا مجھے اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔

میں نے میڈیکل کا امتحان پاس کرلیا اور پھر گائنی میں پوسٹ گریجویشن بھی کرلیا۔ حماد نے جب مجھے پرپوز کیا تو میں نے کہا آپ امی سے بات کرلیں اگر وہ تیار ہوجاتی ہیں تو میں بھی راضی ہوں۔

حماد کا تعلق خیبر پور سے تھا اور وہ مجھ سے سینئر تھے جس وارڈ میں مجھے ہاؤس جاب ملی تھی وہ اس وارڈ کے رجسٹرار تھے۔ حماد نے امی سے بات کی اور ہم زبان کا پورا فائدہ اٹھایا، امی نے مجھ سے بات کی تو میں نے پوری کہانی انہیں سنادی اور یوں ہم رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ امی نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ٹیوشن جاری رکھی لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ رؤف والا مکان ہم نے کرائے پر دے دیا اس طرح سے ٹیوشن جاری نہ رکھنے کا ازالہ بھی ہوگیا۔

حماد کا ایک کزن سی ایس ایس کرنے کے بعد پشاور میں اسسٹنٹ کمشنر لگ گیا تھا پھر ہماری شادی کے بعد اس کا ٹرانسفر وزیرستان میں ہوگیا۔ حماد کے اس کزن کا تعلق صوابی سے تھا اور اس نے پشتو اپنی والدہ سے ہی سیکھی تھی۔ حماد نے جب اپنے اس کزن کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ ہماری کچھ آبائی زمینیں وہاں ہیں میں نے حماد سے ذکر کیا اور اس نے اپنے کزن سے بات کی تو اس نے کہا۔ بات بہت پرانی ہے لیکن اگر تم اور بھابی آجاؤ تو حل نکل آئے گا بلکہ معقول قیمت پر بکوا بھی دوں گا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد میں اور حماد وزیرستان پہنچے اور ہم نے ڈی سی ہاؤس میں ہی قیام کیا جو پہاڑوں کے درمیان بہت بڑا اور اچھا مکان تھا۔ ہم پانچ روز وہاں رہے مگر حماد کے کزن نے بار بار مجھے جتایا کہ یہاں طالبان کا زور ہے ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اغوا یا قتل کردیں۔ حماد کے کزن کی بیوی اس کی خالہ زاد تھی اور پشتو بہت اچھی بولتی تھی۔ ہماری گفتگو بھی پشتو میں ہی ہوتی تھی۔

پانچ روز میں نہ صرف ہم نے زمین کا قبضہ لیا بلکہ حماد کے کزن کے ذریعے ہم نے اچھے داموں فروخت بھی کردی اور واپس آگئے۔ امی اب تک حیات ہیں۔ میں ہر نماز میں ان کی درازی عمر کے لیے دعا کرتی ہوں۔ ان کی رہائش بھی ہمارے ساتھ ہے حماد کے والدین اب نہیں رہے بلکہ ہماری شادی سے پہلے ہی وہ دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔

ہمارے تینوں بچے امی کو نانی کہتے اور سمجھتے ہیں۔ دونوں بیٹیاں تو ان کی اس قدر لاڈلی ہیں کہ ان کے ساتھ ہی سوتی ہیں۔ بیٹا ابھی آٹھ ماہ کا ہے لیکن امی کا وہ بھی لاڈلہ ہے۔ اس کا فیڈر بنانا اور اسے قابو میں رکھنا امی کی ہی ذمہ داری ہے۔

اپنی یہ آپ بیتی میں نے تحریر کرنی اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ وہ جو کہتے ہیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس طرح سوتیلی ماں صرف ظلم کا نام نہیں ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی سوتیلی ماں قسمت بدلنے کا سبب بھی بن جاتی ہے جیسے کہ میری امی ہیں۔

++

موہنی

محترم مدیر
السلام علیکم!
قیام پاکستان سے قبل کی ایک چھوٹی سی روداد ارسال خدمت ہے۔ اس روداد کے آئینے میں بہت کچھ نظر آجائے گا۔ ماہ اگست میں وہ آنکھوں میں خون کے آنسو بھردیتے ہیں یادوں کا ایک قافلہ سا ذہن میں آتا چلا جاتا ہے۔ امید ہے سرگزشت کے قارئین کو یہ چھوٹی سی کاوش پسند آئے گی۔ گوکہ ان کرداروں کا ذکر میں نے اپنے ناول میں بھی کیا ہے۔ لیکن بھرپور تذکرہ اس تحریر میں نظر آئے گا۔

گل بانو
(کراچی)

موہنی ہماری گلی میں رہتی تھی۔ اس کا تعلق اونچی ذات کے ہندو خاندان سے تھا۔ سانولی رنگت اور تیکھے نقوش کے ساتھ غضب کی نمکینیت تھی۔ پلیا پر ہم سب جمع ہو کر گروپ کی صورت اسکول جاتے تھے۔ برسوں ہمارا یہی معمول رہا۔ کچھ عرصے سے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی لڑکا سڑک کے دوسری طرف ہمارے ساتھ چلتا ہے۔ جب بھی اس سے آنکھیں چار ہوتیں وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ موہنی نے بتایا وہ اس کا پڑوسی ہے، اس کا باپ سنار ہے... کیونکہ وہ ذات کا اچھوت ہے اس وجہ سے ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔ پھر ایک دن موہنی نے بتایا۔ "آج جب وہ اسکول سے واپسی پر

گھر کے پاس تھی تو پرکاش اپنی سائیکل پر آیا اور ایک پرچہ
میرے پاس گرا کر چلا گیا۔"
موہنی نے پرچہ مجھے تھما دیا..... "ممی میں اس کا کیا
کروں؟ یہ تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"
پرچے پر ہندی میں لکھا تھا۔ "میں تم سے پریم کرتا
ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
میں نے مشورہ دیا تم لکھ کر کوئی جواب مت دینا۔ کسی
دن اس سے بات کر لیتے ہیں۔ موہنی ابھی بہت چھوٹی تھی
یہی کوئی گیارہ، بارہ برس کی عمر ہوگی۔ پرکاش صرف بات
چیت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پرکاش سے بات کی کہ ابھی اتنے
چھوٹے ہو اپنی تعلیم پر توجہ دو اور یہ بتاؤ پڑھائی میں کیسے ہو؟
اس سے بات کر کے اندازہ ہوا کہ اچھی فطرت کا
مالک ہے اور پڑھائی میں بھی بہترین ہے۔ موہنی نے مجھے
بتا دیا تھا کہ وہ نچلی ذات کا ہے اس لیے میرے گھر والے کبھی
نہیں مانیں گے، تم اسے سمجھا دینا کہ وہ میرے راستے میں نہ
آئے۔
میں نے پرکاش کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ بھی
دھن کا پکا تھا۔
دن گزرتے گئے ایک سال، دو سال، تین سال۔ ہم
سب اپنا بچپن کھوتے ہوئے لڑکپن میں داخل ہو گئے تھے۔
جسم میں عجیب سی تبدیلیاں محسوس ہوتیں جیسے اندر سے کوئی
قوت باہر آنے کو بے تاب ہو۔ مساموں سے روشنیاں سی
پھوٹتی محسوس ہوتیں۔ شنو کا چہرہ تمتمایا ہوا لگنے لگا تھا۔ پنجاب
کا پانی اثر دکھا رہا تھا۔ اب اس کے چہرے پر نظر ٹھہر نہیں
پاتی تھی۔ جسم جیسے کھلتا گلاب بنتا جا رہا تھا۔ موہنی کے گالوں
کے ڈمپل گہرے اور دلکش ہو گئے تھے۔ اس کے اٹالین فیس
کٹ اور ٹھوڑی کی بناوٹ سے وہ صوفیہ لارین لگنے لگی تھی۔
جولی کچھ سنجیدہ سی ہو گئی تھی اور اپنی ذاتی زندگی میں سے کچھ
بھی سامنے نہیں لاتی تھی۔ حالانکہ شنو سے اس کی بہت اچھی
دوستی تھی۔ ایک دن جب وہ بہت خوش تھی تو شنو اس کے
پیچھے پڑ گئی جس کی وجہ سے اسے بتانا پڑا کہ دوسرے شہر سے
اس کی خالہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس کے گھر رہنے آئی تھیں
اور اپنے بیٹے کا رشتہ ڈال گئی ہیں۔ چونکہ جولی بھی مائیکل کو
پسند کرتی تھی اس لیے بہت خوش تھی۔
"اچھا تو اتنی اچھی خبر ہم سے چھپا رہی تھیں۔
ہم.....!" شنو نے اسے خوب چھیڑا۔
ادھر پرکاش بالکل مجنوں بن چکا تھا۔ لمبے لمبے بال،

جیسے تیسے کپڑے۔ بس ایک کاپی ہاتھ میں لیے اسکول جانا،
بلا تکلف سڑک پر بیٹھ جانا اور گھنٹوں آتے جاتے لوگوں کو
تکتے رہنا۔ وہ موہنی کے بندے ماترم اسکول میں ہی پڑھتا
تھا۔ یہ چار منزلہ بلڈنگ تھی۔ پرکاش اکثر اس کی چھت پر
بیٹھا نظر آتا۔ موہنی جہاں بھی ہوتی اس کی نظر اس پر رہتی۔
اسے دیکھ کر غالب کا یہ شعر یاد آتا۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ہم پانچوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے
تھے۔ جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ سالانہ
امتحانات ہونے والے تھے۔ سب اپنی اپنی پڑھائی میں
مصروف تھے۔ ویسے تو معمول کی بات تھی کہ اسکول سے
واپس آنے کے بعد سب اپنے اپنے گھروں سے تازہ دم ہو
کر کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے ہمارے گھر آ جاتے تھے۔
پچھلی طرف والے برآمدے میں بیٹھ کر اپنا اپنا ہوم ورک
کرتے۔ میں سب کی مدد کرتا تا کہ جلدی جلدی کام ختم ہو
اور ہم پارک میں کھیلنے نکل جائیں۔
کئی دنوں سے پرکاش نظر نہیں آ رہا تھا۔ امتحانات
شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ آخری پرچے سے ایک
دن قبل پرکاش کی اماں گھبرائی ہوئی آئیں کہ پرکاش رات
سے گھر نہیں آیا۔ ہم نے بتایا کہ اسے چار دن سے نہیں دیکھا
گیا۔
آخری پرچہ ختم ہوا۔ ہم سب خوشی خوشی اچھلتے کودتے
گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ زور شور سے ایک دوسرے سے
پوچھتے جاتے تھے کہ تمہارا پرچہ کیسا ہوا.....! جیسے ہی ہم
موہنی کے اسکول کے سامنے پہنچے، پرکاش کی زوردار آواز
آئی موہنی ی ی ی ی.....! آواز اسکول کی چھت کی طرف
سے آ رہی تھی۔ ہم سب نے ایک ساتھ سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ
دونوں ہاتھ پھیلائے چھت کی منڈیر پر کھڑا تھا اور بانہیں ہلا ہلا
کر الوداعی اشارہ دے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچانک وہ
چھت سے کود پڑا اور سرخ اینٹوں سے بنے فٹ پاتھ پر
ہمارے قدموں میں گرا۔ اس کی کھوپڑی کے پرخچے
اڑ گئے۔ خون کے چھینٹے دور تک پھیل گئے۔ کئی لڑکیاں سکتے
میں آ کر بے ہوش ہو گئیں۔ پرکاش کا بھیجا ادھر اُدھر بکھرا پڑا
تھا۔ ایک ٹکڑا موہنی کے دامن میں پڑا کلبلا رہا تھا۔ میری
ٹانگیں تبھی کانپ رہی تھیں۔ موہنی نے پھر زندگی بھر شادی
نہیں کی۔

پرکاش کی موت نے ہم پانچوں کے ذہن پر اثر ڈالا
تھا۔ بلو بات بے بات اپنی بہن امریتا سے تو تڑاک کرنے
لگی تھی اور آہستہ آہستہ رنجیت پر مکمل طور پر حاوی ہو گئی تھی۔
شنو کی ماں اور تائی بہت امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔
بہت بڑا زمیندارہ تھا۔ کئی گاؤں میں ہزاروں مربعے کی کھیتی
باڑی تھی۔ ان کے ماں باپ نے بس دہلی اور اپنے کاروبار
کا جان کر دونوں بیٹیوں کی شادی دونوں بھائیوں سے کر دی
تھی۔
ہندو اور سکھ ایک تہوار مناتے ہیں کڑوا چوتھ۔ چاند کی
چودھویں کو شادی شدہ عورتیں ایک دوسرے کو... گجرے
پہناتیں اور رات تک برت رکھتیں۔ جب چاند نکلتا تو ساری
سہاگنیں اپنے منہ پر ساڑی کا پلو ڈال کر چاند دیکھتیں، پھر
اپنے پتی کا منہ دیکھتیں اور اپنا برت توڑنے کے لیے اپنے
اپنے شوہروں کے ہاتھ سے نوالہ لے کر کھانے کا آغاز
کرتیں۔
کڑوا چوتھ کے دن امریتا نے بلو سے کہہ دیا تھا کہ بلو
تو حد سے آگے جا رہی ہے۔ آج میرا دن ہے۔ تو آج
رنجیت کے ساتھ باہر نہ جانا ورنہ ایسی سزا دوں گی کہ یاد
رکھے گی.....!
لیکن جوانی کا نشہ اور بہن سے بغض بلو کے سر چڑھ کر
بول رہا تھا کہ وہ شام کا انتظار کیے بغیر دوپہر کو ہی تیار ہو کر
گلابی ساڑی اور مختصر سے بلاؤز میں متوالی چال چلتی امریتا
کے سامنے خوشبوؤں کا طوفان چھوڑ کر نکل گئی۔ باہر رنجیت کی
بائیک ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ چھپانے والی ساری چیزیں
دکھاتی ہوئی پیسٹیر ساڑی کو درمیان سے پکڑ کر بائیک پر سوار
ہو گئی۔
امریتا نے ہر سال کی طرح اس بار بھی اپنی سہیلیوں کو
مدعو کیا ہوا تھا۔
رات کے بارہ بج گئے، ایک ایک کر کے سب
سہیلیاں چلی گئیں۔ رنجیت اور بلو کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ امریتا
کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ آج بلو کو زندہ نہ چھوڑوں
گی۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے سوچا..... کم سے کم اسے
ناکارہ تو کر ہی دوں گی..... وہ بڑبڑاتی رہی۔ رات کے دو
بج گئے۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ پچھلے کمرے میں گئی جو
صرف رنجیت کے زیر استعمال تھا۔ اس نے یہاں دنیا جہان
کا الم غلم جمع کر رکھا تھا۔ وہ کام سے واپس آتا تو یہاں ایک
دو پیگ چڑھا کر ہز ماسٹرز وائس کے گراموفون کی پوری آواز

کھول کے پنجابی گانوں پر بھنگڑے ڈالتا۔ پھر آ کر امریتا پر
اپنی ساری وحشت انڈیل دیتا۔ امریتا کچھ چیزوں کی تلاش
میں وہاں پہنچی۔ اس کی نظر سامنے دیوار گیر الماری پر پڑی
جس کے نچلے حصے میں عجیب قسم کی بوتلیں رکھی تھیں۔ ان میں
سے ایک بوتل پر سرخ روشنائی سے ایسڈ لکھا ہوا تھا۔ اس نے
کانپتے ہاتھوں سے وہ بوتل اور سامنے پڑی رسی کا بڑا سا گچھا
اٹھا لیا۔ پھر واپس اپنے رہائشی کمرے میں آ گئی جہاں ایک
طرف رنجیت کی بیلٹ ٹنگی نظر آئی..... بس یہ ٹھیک رہے گی
اس نے اسے ہاتھ میں لے کر لہرایا۔ گھڑی تین بجا رہی تھی
جب دور سے ہارلے ڈیوڈسن کی گرجدار آواز سنائی دی جو
قریب آتی گئی۔ بائیک گھر کے سامنے آ رکی۔ امریتا جھپٹ
کر دروازے کے قریب آئی اور جھری سے باہر جھانکنے لگی۔
اسے موٹر سائیکل سے اچھل کر اترتی ہوئی بلو دکھائی دی۔
اونچی ایڑی کے سینڈل کی وجہ سے وہ لڑکھڑائی تو ساڑی کا پلو
ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ چاندنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔
بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بس ایک آخری بٹن نے
بلاؤز کو سہارا دے رکھا تھا۔ دو آتشہ حسن چھلکنے کو بے تاب
ہو رہا تھا۔ اونچی سینڈل نے اس کے جسمانی اتار چڑھاؤ کو
اور بھی واضح کر دیا تھا۔ اس منظر نے امریتا کے اندر بھڑکتی
ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ بلو اپنی ساڑی کا پلو درست
کرتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھی۔
امریتا کو معلوم تھا کہ اب رنجیت گھر کے پچھواڑے
موٹر بائیک پارک کرنے جائے گا اور وہاں تقریباً ایک گھنٹے
تک شراب سے شغل کرے گا۔ امریتا دروازے کے پیچھے
کھڑی بلو کے اندر آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہی
تھی..... جیسے ہی بلو نے قدم اندر رکھا..... امریتا نے جھٹ
سے دروازہ بند کیا اور للکاری..... ! میں نے تجھے خبردار کیا تھا
پر تو نہ مانی..... یہ کہہ کر چمڑے کی بیلٹ سے زوردار وار کیا
پھر دوسرا..... پھر تیسرا..... چوتھا..... اچانک حملے سے بلو
کے اوسان خطا ہو گئے۔ پچھلے کمرے سے آتی گراموفون کی
تیز آواز میں بلو کی چیخیں دب کر رہ گئیں۔ وہ امریتا کے پے
در پے حملوں سے بدحواس ہو کر ایسی گری کہ اس کا سر پختہ
فرش سے جا ٹکرایا اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔
امریتا اسے بازوؤں سے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے
آئی۔ پھر موٹی سی رسی سے اس کے دونوں پیر اور ہاتھ مخالف
سمتوں میں کھینچ کر باندھ دیے۔ پھر احتیاط سے تیزاب کی
بوتل کھولی اور بلو پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ سارے کمرے میں

گوشت جلنے کی بو پھیل گئی۔ بلو کے جسم کو جھٹکے لگنے لگے اور آخر کار ساکت ہوگئی۔ امریتا جلدی سے اٹھی اور بلو کی رسیاں کھولنے لگی۔ اب اسے گھبراہٹ بھی ہونے لگی کہ رنجیت آگیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ انہی سوچوں میں گم تھی کہ رنجیت کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ وہ بھاگ کر برابر والے کمرے میں جا چھپی اور پلنگ کے نیچے پڑا ڈنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ جیسے ہی رنجیت کمرے میں داخل ہوا سامنے برہنہ پڑی بلو کو اس حالت میں دیکھ کر زوردار آواز میں چیخ پڑا اور چیختے چیختے زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔

امریتا کی کچھ جان میں جان آئی۔ وہ بھاگ کر باہر نکلی۔ اتنے میں سامنے سے ریمو آتا نظر آیا۔ اس نے گھبرائی ہوئی امریتا سے پوچھا......! کیا ہوا مالکن! امریتا نے کہا! ریمو تو اندر آکر دیکھ شاید رنجیت کو دورہ پڑا ہے۔ ریمو نے اندر آکر جو دونوں کو یوں پڑے ہوئے دیکھا تو چیختا ہوا باہر بھاگا۔ فجر کی اذان سے فضا گونج رہی تھی۔ نمازی مسجد کو جا رہے تھے۔ ریمو کی چیخ وپکار سن کر پورا محلہ جمع ہوگیا۔ سب نے کہا! پروفیسر صاحب کو بلاؤ، جو وہ کہیں وہی کیا جائے۔

ابا جان فجر کی نماز کے لیے نکل رہے تھے۔ ریمو ہمارے گھر کی طرف بھاگا چلا آرہا تھا۔ پروفیسر صاحب غضب ہوگیا...... رنجیت نے بلو کو مار ڈالا۔ آپ جلدی سے چلیں!

ابا جان نماز چھوڑ کر رنجیت کے گھر پہنچ گئے۔ پولیس بلوائی گئی۔ ریمو سب کو یہی کہتا پھر رہا تھا کہ رنجیت نے بلو پر مجرمانہ حملہ کیا۔ پھر اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ پولیس نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ نشے کی حالت میں رنجیت نے یہ سب کیا اور ہوش میں آنے پر شدید صدمے سے مرگیا۔

یہ ساری داستان امریتا نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھی تھی جو بہت بعد میں ہمیں معلوم ہوئی۔

☆☆☆

ٹرین میں بیٹھی امریتا سوچوں میں گم تھی۔ بہت دور کہیں دھندلکے میں اسے اپنے ماتا پتا کی صورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سکھیاں جن کے سنگ بچپن، لڑکپن اور پھر جوانی کا مختصر عرصہ گزرا تھا ایک ایک کر کے سامنے آنے لگیں۔ جن کے سنگ گڈے گڑیا کے کھیل کھیلے۔ پتنگ بازی کے شوق پورے کیے۔ کھیتوں میں چھپن چھپائی کھیلی۔ ان کی شکایتی نظروں سے ایک ہی سوال جھلک رہا تھا۔ تو اب تک کہاں تھی......؟ پلٹ کر ایک بار بھی نہیں آئی۔ یوں بھی جاتا ہے کوئی...... وہ کیا بتائے گی کہ اس کا سائیں کس قدر ظالم نکلا...... اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے۔ چادر کے پلو سے منہ صاف کیا۔ پندرہ برس کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ماں باپ کے مرگ پر بھی رنجیت نے جانے نہیں دیا تھا۔ وہ کلستی رہی، تڑپتی رہی۔ اور اتنے سے بعد گاؤں لوٹ رہی تھی۔ رنجیت کے دیہانت کو بھی بہت دن ہوچکے تھے اور بلو ہوش وحواس کھو کر ہمیشہ کے لیے پاگل خانے کی مکین ہوگئی تھی۔ زندگی کے اتنے اتار چڑھاؤ کے بعد اب کہیں جا کر سکون ملا تو پچھلی زندگی چھم سے اس کے سامنے آموجود ہوئی۔ دل میں ہوک سی اٹھی کہ اب جا کر اپنا گاؤں دیکھے۔ اپنے خاندان سے ملے جس میں اب ایک موسی ہی بچی تھی۔ اور "دلبر" وہ بھی تو ابھی تک دل کے نہاں خانوں سے نہیں نکلا تھا۔ پتا نہیں اب وہ کیسا ہوگا...... زندگی کے اس کٹھن سفر نے اسے بے تحاشہ تھکا ڈالا تھا۔ ٹرین چلنا شروع ہوئی تو ہوا سے تازگی کا احساس ہوا۔ اس نے میکسی پہن رکھی تھی۔ چوڑی آستینیں پھیلا کر ہوا کو اپنے بازوؤں کے اندر تک محسوس کیا۔ طبیعت میں تازگی در آئی تو پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ ٹرین اسٹیشن سے نکلتے ہی رفتار پکڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بیتے دن دبے پاؤں اترنے لگے۔ دلبر پورے سراپے سے آنکھوں میں آبسا۔

امریتا بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ گلاب سنگھ بہت نیک انسان تھا۔ اس کے قصبے میں اسی کے نام کی ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی مسجد تھی۔ "گلاب سنگھ اللہ والی مسجد" جو ہرے بھرے کھیتوں میں چلتے ہوئے، خود بھی چلتی نظر آتی۔ گلاب سنگھ اکثر یہاں آیا کرتا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی خبریں سناتا، مولوی صاحب کو خرچا دیتا اور واپس چلا جاتا۔ امریتا اپنی حویلی میں شہزادیوں کی طرح پلی بڑھی تھی۔ اس کی بہت سی سہیلیاں اس کے آگے پیچھے رہتی تھیں۔ ہر تہوار خوب کھیل کود کر مناتیں۔ پتنگ بازی کے مقابلے ہوتے۔ لال پری پتنگ پورے گاؤں میں صرف میتو کے پاس تھی۔ اس کی بناوٹ سب سے جدا تھی پوری لال اور دونوں طرف سفید پر بنے ہوئے تھے۔ پورے قصبے میں کوئی اور لال پری جیسی پتنگ نہ اڑاتا تھا۔ وہ پھر خیالوں میں کھوگئی۔

وہ ایک خوبصورت دن تھا جب وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کھیتوں کی پگڈنڈی پر کھیل میں مگن تھی کہ دور سے

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229		
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	واہ کینٹ	0301-5497007
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بانسری کی جادو بھری تان سنائی دی۔ وہ بے اختیار اس آواز کے تعاقب میں چل پڑی۔ ساری لڑکیاں بھی ساتھ ساتھ رہٹ تک پہنچ گئیں۔ سامنے ایک گبرو جوان دنیا و مافیہا سے بے خبر بانسری بجا رہا تھا۔ چوڑے چکلے شانے۔ صحت مند جسم پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ لڑکیوں کی آہٹ سے چونکا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ واہ بھئی خوب...... میتو بولی! تیرے راگ نے تو پیاس بڑھا دی! بجھا دے گا پیاس......؟

نوجوان نے بیزاریت سے اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور ہاتھ سے رہٹ کی طرف اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہاں سے پانی نکالو اور پی لو۔ میتو کو برا لگا وہ گاؤں کی شہزادی تھی۔ اس گاؤں کے مالک گلاب سنگھ کی بیٹی۔ ایسے سلوک کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن۔ اس بانسری کی ایسی دیوانی ہو گئی تھی کہ برداشت کر گئی۔ اور اس نوجوان کے قریب جا کر بولی بہت اچھی بانسری بجاتے ہو! کہاں سے سیکھی؟

اس نے جواب دیا...... اپنے باپ سے...... تو نے بابا جگن مرلی والے کا نام نہیں سنا؟...... بچہ بچہ جانتا ہے۔ راجے مہاراجے ان کو اپنی محفلوں میں بلاتے تھے۔ وہ میرا بابا تھا۔

میتو نے دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا ہاں سنا ہے!

وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔

میتو نے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟

دلبر......

واہ! نام تو بڑا اچھا رکھا ہے۔ وہ اپنی سکھیوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ''ویسے تیرا مالک کون ہے؟''

''وہ جو یہاں کا مالک ہے وہی میرا مالک ہے گلاب سنگھ! بہت نیک بندہ ہے۔''

یہ سن کر امریتا کی شرارتی دوست بولی۔ ''پتا ہے تو جس سے بات کر رہا ہے وہ گلاب سنگھ کی بیٹی ہے۔''

یہ سن کر دلبر کو جیسے کرنٹ لگ گیا، وہ، اچھل کر دور ہٹ گیا اور بھاگ کر کھاٹ اٹھا لایا، اس پر دری بچھائی ''ارے آپ لوگ اس پر بیٹھو! میں آپ کے لیے لسی لاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بھاگا بھاگا رہٹ پر گیا اور کنوئیں میں لٹکی مٹکی کی ہانڈی نکال کر لایا، مٹی کا ایک آبخورہ جھونپڑی میں سے لایا۔ 'لو جی آپ لوگ باری باری پی لو۔ ایک ہی کٹورا ہے۔ اکیلا جو رہتا ہوں۔ بی بی جی لسی ٹھنڈی ہے پر ہے نمکین! جب آپ دوبارہ آؤ گی تو میٹھی پلاؤں گا۔''

لسی پی کر میتو کے کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ ''او دلبرا...... مجھے بانسری سکھا دے میں روز آ سکتی ہوں۔''

''نہیں۔'' اس نے روکھا سا جواب دیا۔

''کیوں نہیں؟''

''کہہ جو دیا نہیں۔'' دلبر کی آواز میں تلخی تھی۔

''ناراض کیوں ہوتا ہے، میں کوئی استاد رکھ لوں گی۔ سیکھنا تو ہے۔ مگر تجھ کو ناراض کر کے نہیں۔''

''تو بانسری ہرگز نہیں سیکھے گی...... ! میں نے کہہ دیا بس...... !''

اچھا جی ابھی ملے ہوئے دو گھنٹے ہوئے نہیں اور اتنا رعب...... ! کیا نام بتایا تو نے؟ ''میتو ! سن میتو...... ! یہ جان لے لیتی ہے۔ تو نہ سیکھنا...... ! میری ماں کی جان بھی اسی نے لی تھی۔ بہت منع کرتا رہا میرا بابا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ میری ماں بانسری کے سُروں پر اپنا گھربار چھوڑ کر میرے بابا کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔ میتو تو مت سیکھنا، مر جائے گی تو......''

''دلبرا، تو مجھ کو بانسری سکھائے گا بس...... ! میں دیکھنا چاہتی ہوں موسیقی کیسے روح کو پاگل بناتی ہے۔ میں نہیں مروں گی دیکھ لینا۔'' میتو اٹھی اور دلبر کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ''تو آج مجھے پہلا سبق سکھا میں یہاں سے جب تک نہیں جاؤں گی جب تک سیکھ نہ لوں۔''

میتو کی ضد کے آگے دلبر کی ایک نہ چلی۔ دلبر نے اسے سوراخوں پر انگلیاں جمانا اور پھونک مارنا سکھایا۔ ''چل آج کا اتنا سبق کافی ہے۔'' دلبر نے کہا...... !'' اس کی دو ہفتے تک دہرائی کرنا اور میری بات یاد رکھنا یہ کام ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے تو انسان بے بس پیدا ہوا ہے لیکن یہ بانسری کا ساز اس کو بالکل ہی بے بس کر دیتا ہے۔'' دلبر میتو کو گھیرے میں لیے ہاتھ گھما کر میتو کے منہ سے لگی بانسری کو ٹھیک سے پکڑنا سکھا رہا تھا۔ میتو کے جسم میں دلبر کے سینے کی گرماہٹ سے ہلچل سی مچ گئی۔ ''سن دلبر! میں کل بھی آؤں گی۔ تیری ماں کی کہانی بھی سنوں گی اور دہرائی بھی ادھر ہی کروں گی۔''

''ٹھیک ہے بی بی جی جیسے آپ کی مرضی! میں کوئی فارغ تو ہوتا نہیں سارے کھیتوں کو پانی دینے میں دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں پودوں کی دیکھ بھال...... دس کام میں لگا ہوتا ہوں، تو چاہے تو ضرور آنا مالک ہو۔'' میتو کی رات کروٹ بدلتے گزر گئی۔

صبح ہوتے ہی وہ رہٹ پر جا پہنچی ساتھ میں پراٹھا، سرسوں کا ساگ اور ایک جگ لسی لے کر۔ دور تک نظر دوڑائی، دلبر کا کہیں پتا نہیں تھا، کھیت میں سرسبز فصل تاحد نظر پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا جھونپڑی کا جائزہ لیا جائے۔ گھاس پھونس سے بنی اس جھونپڑی میں ایک کھاٹ، مٹی کے چند برتنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سوچ کر آئی تھی کہ جھونپڑی کو سجا سنوار دے گی لیکن یہاں تو...... اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی...... سامنے دیوار پر ایک کیل میں بانسری لٹکی تھی۔ اس کو اتار کر اس نے گزشتہ روز کا سبق دہرانے کی کوشش کی۔ انگلیاں سرکائیں پھونکیں ماریں ہلکان ہو گئی پر آواز نہ نکلی اسے پتا نہیں تھا کہ اتنا تھکا دینے والا کام ہے۔ وہ کھاٹ پر لیٹ گئی اور پتا نہیں کب سو گئی۔ دلبر کی آواز سے جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک حسین سپنا دیکھ رہی تھی کہ دلبر دولہا بنا ہوا ہے۔ اسے خواب ٹوٹنے کا بہت افسوس ہوا۔ اس نے دلبر کو بتایا۔ دلبر بولا سپنے تو سپنے ہوتے ہیں پر تعبیر الٹی ہوتی ہے۔

''سن دلبر میں ناشتا لائی تھی، تو کیا کھاتا ہے؟'' وہ جلدی سے باہر گیا۔ رسی پر ایک چھینکا لٹکا ہوا تھا۔ اس میں کچھ کھانے کا سامان تھا۔

''یہ کہاں سے آیا......؟''

''یہ گلاب سنگھ مسجد والے رکھ جاتے ہیں!''

''ارے دلبر تو مسلمانوں کا کھانا کھا رہا ہے؟ توبہ توبہ۔''

''میتو! یہ تو دیکھ وہ کتنی محبت سے لے کر آتے ہیں۔ ایسا نہ کہہ! امام صاحب کہتے ہیں یہ تیرے نصیب کا ہے۔ اللہ کے گھر سے آیا ہے۔''

''اچھا دلبر! یہ بتا تو مجھے بانسری نہیں سکھائے گا......؟''

''میں تجھ کو منع کر رہا ہوں تو کوئی وجہ سے نا...... ! چل تو پہلے میری ماں کا حال سن! میری ماں بہت حسین تھی۔ میرے بابا سے بانسری سیکھنے کی ضد کر کے آخر اس سے شادی کر لی۔

ہمارا گھر راجستھان میں ایک غیر آباد جنگل والے علاقے میں تھا۔ جو مہاراجا جے پور نے میرے بابا کو تحفے میں دیا تھا۔ بہت بڑا گھر تھا چاروں طرف سائبان تھے اور جنگل تھے۔ چند قدم آگے درختوں کے درمیان ایک کھلی جگہ تھی۔ جہاں ایک اونچے سے درخت پر جھولا ڈالا ہوا تھا۔ ماں کا روز کا معمول تھا۔ وہ نہا دھو کر جھولے پر آ بیٹھتی اور بانسری پر راگ الاپتی۔ بابا دن بھر اپنے ساز ٹھیک کرتا رہتا۔ وہ پرانی ستار اور سارنگی لے کر ان کو بالکل نیا جیسا کر دیتا۔ میں کوئی پانچ یا چھ سال کا تھا۔ بابا ہر وقت ماں پر نظر رکھتا۔ مجھ کو کہتا رہتا دیکھ ماں کدھر ہے! اس دن گہرے کالے...... بادل اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے۔ ہوا بھی تیز تھی۔ یہ کہتے کہتے دلبر خاموش ہو گیا...... پھر گہری سانس لے کر بولا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسی کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی ہو۔

''دور کہیں سے بابا کے چلانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی...... رجنی باہر نہیں جانا طوفان آنے والا ہے۔ مگر رجنی تو پیلی ساڑی اور لال بلاؤز پہنے جھولے پر پینگیں لے رہی تھی اور ساتھ ہی جے جے ونتی کے الاپ میں مست تھی۔ جھولے کی چوں چوں کی آواز پر جگن کے کان لگے تھے۔ اچانک بادل گرجے اور بجلی چمکی۔ رات جیسا اندھیرا چھا گیا۔ یکدم بانسری کی آواز بند ہو گئی۔ بابا نے میرا ہاتھ پکڑا اور رجنی رجنی چیختا ہوا جھولے والے درخت کی طرف بھاگنے لگا۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہوا کے جھکڑ دونوں باپ بیٹوں کو ایک قدم بھی آگے جانے نہیں دے رہے تھے۔ جیسے تیسے جھولے کے قریب پہنچے تو کیا دیکھا کہ جھولا خالی جھول رہا ہے۔ رجنی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ جب بجلی چمکتی تو کچھ نظر آ جاتا۔ دھواں دھار بارش ہوتی رہی۔ بابا کئی بار پھسل کر گرا اس کو چوٹ بھی لگی مگر وہ پاگلوں کی طرح چلاتا رہا مگر بے سود۔ آخر کار تھک ہار کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک درخت کی ایک شاخ سے کچھ لٹکتا نظر آیا۔ پکڑنے پر پتا چلا یہ منگل ستر ہے۔ رجنی ی ی ی ی ی ی ی...... بابا چیخا...... اس روشنی میں رجنی کی پیلی ساڑی کا پلو نظر آیا اور جہاں درخت کی شاخیں تنے سے مل رہی تھیں وہاں رجنی کی لاش چت پڑی تھی۔ آدھا جسم ننگا تھا۔ سر نیچے کی جانب جھول رہا تھا۔ کھلی ہوئی آنکھیں پھیل کر ساکت ہو چکی تھیں۔ بابا دھاڑیں مار مار کر روتا جاتا اور بولتا جاتا، دیکھا رجنی تجھ کو کتنا منع کرتا تھا۔ آج ان کو موقع مل گیا...... آج ان کو موقع مل گیا۔''

دلبر نے میتو کو کیا بتایا اور اس نے کیا سنا خود اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بس اس کی بڑبڑاہٹ گونج رہی تھی۔ میری ماں مر گئی! میری ماں مر گئی میتو! بابا نے بتایا تھا! بانسری نے کام دکھا دیا یہ ایک جن تھا جو تیری ماں کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ آج راگ نے اس کو پاگل کر دیا۔ کچھ سال بعد میرا بابا بھی اپنا

وہی تو اڑان کھو کر ماں سے جا ملا۔ اب بتا متو! کیا کرے گی بانسری سیکھ کر؟

متو اس کے گلے لگ کر خوب روئی۔ متو کی پہلی بار غم سے آشنائی ہوئی تھی۔ اس کا کھلنڈرا پن جیسے ختم ہو گیا۔ دن دلبر کے سنگت میں گزرنے لگے۔

اب متو کی زندگی میں بہت تبدیلی آچکی تھی۔ سنجیدگی نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ مسکان اس کے ہونٹوں سے کہیں دور جا بسی تھی۔ ادھر اس کی شادی کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی رشتہ آنے لگا۔ اس کے باپ نے ایک لڑکے کا رشتہ منظور کر لیا۔ اس نے دلبر کو بتایا تو وہ بھی غمزدہ ہو گیا۔

ایک دن وہ دلبر سے بولی میں تیرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی......!

"کیا کہہ رہی ہے جھلیے......! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بس تو ہمت پکڑ، مجھے پتا ہے میرا باپ شہر کے کسی کاروباری بندے سے میری شادی کا سوچ رہا ہے۔ اس کا فیصلہ آخری ہوگا کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا۔ پر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تیرے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔"

"نہیں متو، میں یہ نہیں کر سکتا، گلاب سنگھ میرا مالک ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیا تو میرے بغیر جی لے گا......؟ میں تو مر جاؤں گی......!"

"ذرا سوچ متو میں اپنے محسن کو کیسے دھوکا دے سکتا ہوں! یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"دلبرا......! میری بات کان کھول کر سن......! جب وہ دن آئے گا میری لال پری تیری چھت پر ہوگی اور میں پوٹلی کے ساتھ یہاں آجاؤں گی اور تجھ کو اغوا کر کے بھاگ لوں گی۔" لال پری پتنگ پورے گاؤں میں صرف متو کے پاس تھی۔ اس کا ڈیزائن سب سے جدا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ دلبر صبح سے ہی بے چین تھا۔ گلاب سنگھ کی حویلی کی چھت سے لال پری نے اڑان بھری اور منٹوں میں آسمان کی بلندی پر جا پہنچی۔ پھر غوطہ کھا کر سیدھا دلبر کی جھونپڑی پر۔ دلبر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ کافی دیر ایسے ہی گم صم بیٹھا رہا۔ پھر شام ہو گئی۔ حویلی سے آتش بازی ہوتی نظر آئی۔ ڈاکوؤں کے ڈر سے گلاب سنگھ نے سیکیورٹی کا سخت بندوبست کر رکھا تھا۔ چاروں طرف بندوق بردار بکھرے ہوئے تھے۔ متو کی بارات بینڈ باجے کے ساتھ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

ویسے تو دلبر نے چین کا سانس لیا مگر ایک کانٹا سا دل میں چبھتا رہا۔

صبح وہ حسب معمول کھیتوں میں کام کرنے نکل گیا۔ بار بار اسے متو کا خیال آتا رہا۔ روز جب وہ اپنی جھونپڑی پر واپس آتا تو متو اس کو ہاتھ ہلا ہلا کر خوش آمدید کہتی تھی۔ آج وہاں کوئی نہ تھا۔ اک آہ سی نکلی۔ اور وہ کچھ کھائے پیے بغیر باہر نکل گیا۔ اسے بھوک نہیں تھی۔ کھیتوں کے پیچھے دریا کے کنارے سورج ڈوب رہا تھا اور ساتھ ہی دلبر کا دل بھی۔ وہ کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اس کو لگا متو آواز دے رہی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ کہاں ہو متو......؟ وہ پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا اور پتا نہیں کب سو گیا۔ صبح اٹھا تو اس کے کانوں میں آواز آرہی تھی...... تو میرے بغیر زندہ رہ سکے گا دلبر......؟ اسے لگا متو پاس ہی کھڑی کان میں سرگوشی کر رہی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کافی دیر ایسے ہی بے خیالی میں بیٹھے گزر گئی۔ پھر باہر نکلا، دیکھا تو سامنے رہٹ پر متو کی قریبی سہیلی کھڑی اسے بلا رہی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دلبر کو متو کا پیغام دیا۔ بہت سخت پہرا تھا اس لیے وہ آنہ سکی اور یہ کہ میرا انتظار کرنا میں آؤں گی۔ ساتھ ہی اس نے ایک پرچہ بھی دیا جس میں متو نے اپنے خون سے لکھا تھا۔ "معاف کر دینا۔" اسے دیکھ کر دلبر کا سر گھوم گیا۔ دلبر نے اسے جاتے وقت کہا جب بھی متو اپنے گھر آئے مجھے خبر ضرور کرنا۔ بہ مشکل اس نے کھیتوں میں کام شروع کیا اور پھر پاگلوں کی طرح تیز تیز ہاتھ چلانے لگا اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا حال دن بہ دن بدتر ہوتا چلا گیا۔ دیوانوں کی طرح کام میں جت جاتا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ بس ایک رٹ لگائے رکھتا۔

"وہ آئے گی...... وہ آئے گی۔" اس کی صحت گرتی گئی۔ بیمار رہنے لگا اور بستر سے لگ گیا۔ گلاب سنگھ اس کو اسپتال میں داخل کروا آیا۔ گلاب سنگھ اس کو بہت چاہتا تھا۔ دلبر دس آدمیوں کا کام اکیلے جو کرتا تھا۔ اس کی محنت اور ایمانداری اسے بہت پسند تھی۔ ایک ہفتے میں دلبر کو اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ کوئی بیماری تو تھی نہیں۔ واپس آ کر وہ پھر کام میں لگ گیا۔ اس کو ایک ایک پودے سے محبت تھی۔ وہ اس کی جان تھے۔ خود سے باتیں کرتے کرتے وہ نیم پاگل ہو چکا تھا۔ اس کی دیوانگی نے وہ حال کیا کہ گھنٹوں متو کے خیالی مجسم سے باتیں کرتا رہتا۔ چاندنی راتوں میں وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ پونم کی رات اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگ دھڑنگ کھیتوں میں چھلانگیں لگاتا۔ مہینوں گزر گئے متو کو پکارتا رہا۔ متو نہیں آئی۔ ایک صبح اٹھا تو سر گھوم رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دور دیکھ رہا تھا۔ سبزے کے بیچ میں سفید مسجد۔ اسے یاد آیا وہ اور متو مسجد کے ساتھ جو دریا بہہ رہا ہے وہاں گئے تھے۔ ہوا سبک تھی۔ وہ اور متو کافی دیر دریا کنارے چپ چاپ بیٹھے ہوا کی سرگوشیاں سنتے رہے تھے۔ بہت اچھا دن تھا۔ اس کو متو کی آواز آئی...... تو میرے بغیر کیسے زندہ رہے گا دلبر......؟

"بس وہ جگہ صحیح ہے۔ مجھے مر جانا چاہیے...... متو میں آرہا ہوں......" یہ کہتے ہی وہ کھیت کی پگڈنڈی پر مسجد کی طرف دوڑنے لگا۔ جان اس میں تھی نہیں پر بھاگے چلا جا رہا تھا۔ کہیں ٹھوکر کھائی۔ کہیں گرا، آخر پہنچ گیا۔ سامنے مسجد کی چار دیواری دھندلی پڑ گئی اور وہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا ایک چھوٹے سے کمرے میں لیٹا ہے۔ امام صاحب اس کو ہوش میں دیکھ کر مسکرائے اور ایک کٹورا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "لے یہ دودھ پی لے۔"

دودھ پی کر جب کچھ جان میں جان آئی تو دلبر نے سوال کیا۔ "میں کہاں ہوں؟"

امام صاحب نے کہا۔ "میں اور امام بخش تجھ کو اٹھا کر یہاں لائے ہیں۔ یہ بتا کہاں جا رہا تھا تو؟"

اس نے بتایا کہ دریا میں کودنے جا رہا تھا۔ اس نے متو کا سارا قصہ سنایا اور امام صاحب کو بتایا کہ میں متو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور بیماری سے بھی تنگ آ گیا ہوں۔ اب کوئی راستہ نہیں سوائے مر جانے کے۔ میں اپنے آپ کو آج ختم کر لوں گا۔

امام صاحب دلبر کو برسوں سے جانتے تھے۔ اس کو محنت کرتے دیکھ کر اچھے نام سے یاد کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد کو گلاب سنگھ کے گھر دوڑایا کہ فوراً آئیں۔ گلاب سنگھ آیا تو حیران ہوا۔ "یہ تو میرا بندہ ہے۔ یہ خودکشی کیوں کرنا چاہتا ہے۔"

امام صاحب بولے۔ "کڑی دا چکرا اے!"

"کہڑی کڑی اے؟"

امام صاحب کے منہ سے متو کا نام نکلتے نکلتے رہ گیا۔

"ملا تم اس کو اس کے ڈیرے پر پہنچا دو......! اس کی روٹی شوٹی حویلی سے آیا کرے گی۔ اور دیکھ بھال کے لیے ایک منڈا ابھی رہے گا۔" گلاب سنگھ چلا گیا۔

دلبر نے امام صاحب سے منت کی کہ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ وہاں متو کی آوازیں آتی ہیں۔ آپ میری مدد کریں۔

"میں تو تیری مدد کا ایک راستہ دیکھتا ہوں اگر تو کر سکے تو۔"

"ہاں ہاں میں سب کر لوں گا جو آپ حکم کریں۔"

وہ پہلے ہی امام صاحب کی خوش اخلاقی سے متاثر تھا۔

"مشکل کام ہے سمجھ لے تجھ کو پیدا کرنے والے سے دعا کرنی ہوگی......! تجھ کو اپنا دھرم چھوڑنا ہوگا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونا ہوگا!"

"صرف کلمہ یا اور کچھ بھی؟"

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی، ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2000 روپے
امریکا کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

"نہیں صرف کلمہ، آگے کا میں تجھ کو بتاتا جاؤں گا۔ تیرے دل سے سارا خوف اور ڈر نکل جائے گا روز یہاں مسجد کے مدرسے میں قرآن بھی پڑھنا ہوگا۔ سب سے ضروری پانچ وقت کی نماز ہے۔ مسلم اور غیر مسلم میں فرق نماز کا ہوتا ہے۔ اچھا چل تو کچھ دیر سوچ لے جب تک میں مدرسے ہو آؤں۔"

امام صاحب دو گھنٹے بعد فارغ ہو کر آئے تو دلبر نے کہا۔ "میں تیار ہوں جیسا آپ کہیں۔"

انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "چل تو وضو کر لے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھنا۔ وہیں تیرے اسلام لانے کا اعلان کروں گا۔ آج سے تیرا اسلامی نام دل محمد ہوگا۔"

اس نے مغرب ٹوٹی پھوٹی پڑھی۔ ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا جیسے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہو۔ اور وہ ایک عرصے بعد گہری نیند سو گیا۔ اب وہ دل لگا کر کھیتوں میں کام کرنے لگا۔ بس ایک تبدیلی آئی وہ فجر کی نماز کے بعد میتو کی لال پری کو اڑا کر آسمان کی بلندی پر لے جاتا جہاں سے وہ چھوٹا سا لال ستارہ نظر آتی۔ ڈور کو کاٹ کر کھاٹ کے پائے سے باندھ دیتا اور کھیل کھلیان کے کام میں لگ جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آ جاتا وضو کرتا اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرتا۔ نماز ادا کرتا پھر کام میں جُت جاتا۔ اس کی زندگی اب بہتر انداز سے بسر ہونے لگی۔ اتنے میں گلاب سنگھ کی موت کی خبر آ گئی۔ وہ کریا کرم میں شریک ہوا۔ گھر کے اندر باہر سب بندوبست اسی نے کیا۔ اس کی نظریں میتو کو ڈھونڈتی رہیں پر وہ نظر نہیں آئی۔ وہ حیران تھا اور اس سے زیادہ پریشان کہ میتو خیریت سے ہے بھی کہ نہیں۔ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں کسی نے اس کا کندھا تھپتھپایا، وہ میتو کی سہیلی رملہ تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کونے میں لے گئی اور بتانے لگی میتو کا حال بہت برا ہے۔ اس کا سائیں بہت ظالم ہے۔ اس کو قید کر کے رکھتا ہے۔ اسی کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس کو روز مارتا ہے نشے میں دھت رہتا ہے۔ یہ سب سن کر دلبر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا قریب تھا کہ گر جاتا لوگوں نے اسے سہارا دیا۔ بہت عرصے بعد میتو کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ "میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی دلبر۔"

☆☆☆

ٹرین نے سیٹی بجائی۔ میتو چونک کر سوچوں کی دنیا سے باہر نکل آئی۔ اسے یاد آیا گلاب سنگھ اسٹیشن سے پہلے ٹرین نصف چکر کاٹ کر اسٹیشن میں داخل ہوگی۔ جہاں اس دائرے کے بیچوں بیچ دو بیل ایک چھوٹا سا رہٹ چلاتے تھے، اور اس کا سارا پانی کھیتوں میں جاتا تھا۔ اتنے میں اسے دور سے "اسٹیشن گلاب سنگھ" کا بورڈ نظر آ گیا۔ وہ اپنی پوٹلی تھام کر اترنے کو تیار ہو گئی۔ رہٹ کے قریب گولائی پر ٹرین کی رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ امرتا نے اپنی پوٹلی زمین پر پھینکی اور خود بھی نیچے کود گئی اور لڑھکتی ہوئی دور جا گری لیکن فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے پوٹلی کو ایک ڈنڈے سے باندھ کر کندھے پر لٹکایا اور سامنے والی پگڈنڈی پر چل پڑی۔ یہ اس کا جانا پہچانا رستہ تھا۔ اسے بچپن یاد آ رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کی نظر آسمان پر پڑی...... ارے ے...... یہ لال پری کون اڑا رہا ہے......؟ دلبر ہی ہوگا...... مجھے بھولا نہیں، اتنے برس ہو گئے۔ بہت بلندی پر لال پری صرف نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ تیز قدموں سے چلتی رہٹ پر پہنچ گئی۔ رہٹ سارا زنگ آلود پڑا تھا۔ بیل بھی نہیں تھے۔ ایک ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ سامنے دلبر کی جھونپڑی کی جگہ ایک پکی اینٹوں کا مکان کھڑا تھا۔ مکان کے باہر چارپائی پڑی تھی۔ جس کی ادوائن سے لال پری کی ڈور بندھی تھی۔ اس نے کھیتوں پر دور تک نظر دوڑائی مگر کوئی نظر نہ آیا۔ لال پری کھیتوں کے بیچ اڑ رہی تھی یقیناً دلبر آس پاس ہوگا۔ پانی کی طلب میں چاروں طرف نظریں گھمائیں تو چارپائی کے پیچھے گھڑونچی پر مٹکے رکھے نظر آئے۔ ایک پر مٹی کا کٹورا رکھا تھا۔ اس نے کٹورے میں پانی نکال کر پیا، منہ پر چھپکے مارے، ہوا کے جھونکوں سے طبیعت بحال ہو گئی۔ پھر اس نے زور سے آواز لگائی دلبر!!!!!...... کوئی جواب نہیں آیا...... کچھ دیر انتظار کرتی رہی پھر دبے پاؤں مکان کی طرف بڑھی اور آہستہ آہستہ اندر داخل ہو گئی۔ وہاں ہر چیز قرینے سے رکھی تھی۔ کتابوں کے شیلف بنے ہوئے تھے جن میں کتابیں رکھی تھیں۔ ارے دلبر پڑھنے لگا، اس کا دل خوش ہو گیا۔ گھر کا سلیقہ بتا رہا تھا کہ اس سلیقے میں کسی عورت کا ہاتھ لگا ہے۔ خوشی پر دکھ غالب آ گیا۔ ظاہر ہے دلبر نے شادی کر لی ہوگی۔ ایک لکڑی کا چولہا اور دو چائے کے پیالے...... کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر دبوچ لیا۔ وہ خوشی اور دکھ کا امتزاج لیے گھر سے باہر آ گئی۔ سامنے ہری ہری فصلوں کو چیرتا ہوا دلبر آتا دکھائی دیا۔ پسینے میں بھیگا اس کا جسم دھوپ میں چمک رہا تھا اور کندھے پر پرندوں کو بھگانے والا نقلی گنڈا تھا۔ وہ کھیتوں کے مختلف حصوں میں زور زور سے آوازیں لگاتا چلا آ رہا تھا۔ وہی جوان جہان دلبرا، ویسے کا ویسا...... امرتا کی آنکھوں کے سامنے پہلے دن کی ملاقات کا منظر گھوم گیا جیسے کل کا واقعہ ہو برسوں گزر گئے دلبر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بلکہ جسمانی طور پر کچھ صحت مند اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ دلبر نے جیسے ہی امرتا کو دیکھا۔ کندھے کا سامان وہیں پھینک کر ایک جست لگائی اور سامنے آن کھڑا ہوا...... "امرتا تم!" یہ کہتے ہوئے وہ زور سے لپٹ گیا اس کی بے ساختہ گرفت سے میتو سنبھل نہ سکی اور اس کی بانہوں میں جھول گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ یوں جیسے کہنے کو کچھ نہ ہو...... آخر دلبر بولا مجھے پتا تھا تو ضرور آئے گی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی کی طرف بڑھا...... اچھا تو میرا انتظار اب تک کر رہا تھا......؟ دلبر نے لال پری کی طرف انگلی سے اشارہ کیا...... اففف...... میتو اس کی گود میں گر ہی گئی۔ اپنے اندر کے سارے دکھ قطرہ قطرہ اس کی جھولی میں ٹپکاتی رہی۔ وہ سنتا رہا اور افسوس کرتا رہا۔ آج بھی دلبر ویسا ہی تھا شرمیلا سا، نظریں جھکائے ہوئے۔ پھر وہ چپ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو میتو......؟ بہت کچھ بدل گیا...... تم یہ ٹھنڈی لسی پیو!" وہ بھاگتا ہوا کنویں پر گیا، ایک مٹی کی ہانڈی دو رسیوں سے بندھی کنویں کے اندر لٹک رہی تھی۔ وہ کھینچ کر نکالی اور لا کر میتو کے سامنے رکھ دی بالکل ویسے ہی جیسے پندرہ سال پہلے لایا تھا

"اور یہ بتا دلبرا......! تیرے بیوی بچے کہاں ہیں......؟"

"نہیں ہیں، شادی ہی نہیں کی۔" دلبر نے کہا۔

"اوہ!"

"میتو! اب تیرا دلبر پہلے والا دلبر نہیں رہا۔" اس نے بتایا کہ کیسے اس کے بغیر پاگل ہو کر خودکشی کرنے لگا تھا۔ کیسے اس نے اسلام قبول کیا۔

"اوئے تو مُسلا ہو گیا......؟ یہ مُلا لوگ جادو کر دیتے ہیں۔ میں تیرا جادو جھڑ وادوں گی میری ماسی اتارتی ہے۔"

نہیں میتو ایسی بات نہیں! امام صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ تیری رخصتی کے بعد میری حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے نئی زندگی دی۔ میں حیران تھا کہ انہیں پتا ہے میں مسلمان نہیں ہوں پھر بھی انہوں نے میرا اتنا خیال رکھا۔ میں نے انہیں سچ سچ بتا دیا تھا کہ میرے سینے میں گھپ اندھیرا ہے۔ میرے اندر اب جان بھی نہیں ہے۔ تیری رخصتی کے کچھ عرصے بعد تیرے چاچوں نے تیرے بادا کو قتل کر دیا تھا۔ ساری زمین حصے بخرے کر کے اونے پونے بیچ ڈالی۔ مسجد اور اس کے آس پاس کی زمین حاجی محمود صاحب نے خرید لی ہے، جو بہت پُرخلوص اور اللہ والے بندے ہیں۔

ان دنوں بٹوارے کی باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔ کبھی یہ خبر آتی گرداس پور پاکستان میں شامل ہوگا کبھی یہ خبر کہ امرتسر تک پاکستان ہوگا۔ گلاب سنگھ پنڈ امرتسر سے لگا ہوا تھا۔

حاجی صاحب نے دل محمد کو اپنا دایاں بازو بنا لیا تھا۔ تنخواہ بھی دگنی ہو گئی تھی اور اگلے سال تک پکی اینٹوں کا گھر بھی بنوا دیا تھا۔ حاجی صاحب کی بیٹی کی شادی نہیں ہو پائی تھی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ حاجی کی نظر عنایت دل محمد پر تھی۔

"میتو! میں تجھے امام صاحب سے ملواؤں گا پھر تو خود فیصلہ کرنا۔ تیرا دل ان کی باتوں پر کھلے تو ٹھیک ورنہ تو بے شک اپنے دھرم پر ہی رہنا۔"

دوسرے دن دل محمد نے اسے ایک بڑی سی چادر میں لپیٹ کر امام صاحب سے ملوایا۔ پہلی ملاقات میں امرتا کو ان کی باتیں سمجھ نہیں آئیں الجھن کا شکار ہو کر واپس لوٹی۔ "دلبرا میری بات مان اپنے ہی دھرم پر قائم رہ! بہت مشکل ہے مُسلا ہونا!"

دلبر نے ساری رات اس کو لیکچر دیا مگر وہ ابھی کچا تھا۔ اس نے میتو سے کہا جو جو سوال تیرے دل میں آ رہے ہیں وہ سب امام صاحب سے پوچھ لینا۔ پھر جو تیرا فیصلہ! میتو اگلے دن پوری تیاری کے ساتھ گئی اور جاتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اماں صاحب بولے ایک ایک کر کے پوچھو کوئی گھبراہٹ نہیں۔ اپنی تسلی کر لو۔ آدھے سوالوں کے بعد میتو کا دماغ مثبت سوچنے لگا، ہر بات اچھی لگنے لگی اور آخرکار بغیر کسی دباؤ کے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ امام صاحب نے اس کا نام مہرالنساء تجویز کیا۔ اگلے دن حاجی صاحب نے امام صاحب سے کہا کہ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ دل محمد کے بارے میں!

امام صاحب بولے۔ "میں بھی آپ کو دل محمد کی شادی کی دعوت دینے کے لیے آنے والا تھا۔ ہم نے اگلے جمعے کو اس کا نکاح رکھا ہے!"

حاجی صاحب پر بجلی سی گری مگر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ اسے دل سے پسند کرتے تھے اور اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔

وہ بولے۔ "ضرور ضرور میں اپنے دوستوں کے ساتھ

ول محمد میرا منہ بولا بیٹا
آؤں گا اور ولیمہ میری طرف سے ہوگا،
ہے۔"

میتو نے شنو کو پیغام بھیجا کہ تو خالہ جان اور ممتے کو بتا کے
کریمو کے ساتھ آجا......!

شنو کو یہاں آکر جب ماجرے کا پتا چلا تو اسے بہت
خوشی ہوئی مسلمانوں کے ساتھ رہتے اسلام کے متعلق اچھا
خاصہ سمجھ چکی تھی۔

شنو سے میتو نے بلو کے متعلق پوچھا جو تیزاب سے
جھلس گئی تھی اور سر کی چوٹ سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔
اسے آگرہ کے پاگل خانے میں لاعلاج مریضوں کے وارڈ
میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ شنو نے کہا خالہ میرا گھر خالی پڑا۔
میں ممتے کے یہاں خالہ جان کے پاس رہتی ہوں۔ آئے دن
ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔
قرول باغ شرنارتھیوں سے بھر گیا ہے۔ ممتے وغیرہ سب غیر
محفوظ ہیں۔ بلوائی منظم ہو کر ایک ایک محلے پر حملہ کر رہے
ہیں۔ تائی تو بھی میرے ساتھ چل لیکن میتو اب واپس جانا
نہیں چاہتی تھی۔

انہی حالات میں دل محمد اور مہرالنساء کی شادی ہوگئی۔
دل محمد بہت خوش تھا۔

☆☆☆

آر ایس ایس کی دہشت کاریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔
تقسیم برصغیر کی تاریخ قریب آگئی تھی۔ نقشہ تیار ہو گیا۔ طے یہ
ہوا کہ پورا پنجاب، پورا بنگال اور کابل تک پاکستان کا
ہوگا۔ 12 اگست 1947ء کی رات نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کی
خودساختہ میٹنگ شملہ میں ہوئی اور برطانوی حکومت نے طے
شدہ سرحدی لائین میں راتوں رات ردوبدل کر کے آدھا
پنجاب اور آدھا سندھ یعنی بمبئی والا حصہ پاکستان سے کاٹ کر
بھارت میں شامل کر دیا۔

اسی طرح مشرقی حصے میں بھی کاٹ پیٹ ہوئی۔
پورے آسام سے صرف سلہٹ مشرقی پاکستان کو ملا۔ پورا
مغربی بنگال، دیناج پور، مالدہ، مرشد آباد، مسلمانوں کی اسی
فیصد آبادی کے باوجود بھارت کو دے دیا۔

قائداعظم اور مسلم لیگ نے جب احتجاج کیا تو
برطانیہ سے سخت جواب آیا کہ مسٹر جناح اگر تم کو منظور نہیں تو
ہم انڈیا کو تقسیم کیے بغیر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تمہارے پاس
دو دن ہیں۔

مسلم لیگ کا بہت طویل اجلاس ہوا قائداعظم اور
دیگر لیڈروں نے مجبوراً تقاضا ملتوی کر دیا۔ کیوں کہ
مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور روکنے والا کوئی
نہ تھا۔ یوں بالآخر پاکستان وجود میں آگیا۔

دہلی میں حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ دل محمد
اور مہرالنساء کا دہلی جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ حاجی
صاحب کی زمین پاکستان میں آگئی تھی۔ ان کو یہیں ٹھہرنا
ٹھیک لگا۔

اب سوال یہ اٹھا کہ شنو کیا کرے......! سب نے
فیصلہ کیا کہ وہ دہلی جا کر اپنے گھر پر قبضہ تو برقرار رکھے۔ ورنہ
شرنارتھی قبضہ کر لیں گے۔ وہ بہت سراسیمہ سی حالت میں
دہلی کے لیے روانہ ہوگئی۔ ٹرین خالی تھی کوئی سفر نہیں
کر رہا تھا۔ ان دنوں مسلمان ہندوؤں سے اور ہندو
مسلمانوں سے خوف کھاتے تھے۔ دہلی اسٹیشن پر لگ رہا تھا
جیسے کسی نے جھاڑو پھیر دی ہو، ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔
اس کی نظر کینٹین پر لگی سلور کی ان تختیوں پر پڑی جن پر لکھا تھا
مسلم کھانا، ہندو کھانا۔ مسلم پانی، ہندو پانی۔ اس کی آنکھیں
بھیگ گئیں۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ یہ وقت بھی آئے گا۔ جلدی
سے باہر آکر ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ قرول باغ لے چلو۔
رکشے والا ہندو تھا بولا ادھر کرفیو ہے۔ ہندو راوے پر اترنا ہوگا
بیس روپیا!

اُف اتنا اندھیر۔ چلو جانا تو ہے آگے ایک میل پیدل
سہی۔ سائیکل رکشے والا بالکل لاغر تھا۔ اس کی پنڈلیاں
کانپ رہی تھیں۔ منزل پر اتر کر شنو گلیوں گلیوں چلتے گھروں
کو پیچھے چھوڑتے ہوئے گلی نمبر 19 میں داخل ہوئی، لال
اینٹوں والی اس پلیا پر ٹھہری جہاں ہم سب بچے اسکول
جانے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ پھر اس نے ممتاز کے
دروازے پر دستک دی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ ایسا تو
نہیں کہ یہ لوگ نہ ہوں۔ دروازہ کھلا سامنے ملازمہ اکبری
نظر آئی۔ "بیٹا جلدی آجا، وہ سب اوپر ہیں۔"

کون ہے؟ ارے شنو! اوپر آجا! یہ اماں جان کی آواز
تھی۔ بڑی ہمت والی بچی ہے اللہ اس کے نصیب اچھے
کرے۔

ممتے پتا ہے زندگی میں پہلا سفر تمہارا ہاتھ تھامے بغیر
کیا ہے۔ اس نے اپنی تائی کو مہرالنساء کی داستان سنائی۔
سب خوش ہوئے یہ جان کر کہ وہ مسلمان بھی ہوگئی اور شنو اس
کی شادی میں بھی شریک ہو کر آگئی۔

++